سہ ماہی

دہلی

تاریخ ادب اردو

(علم وادب اور تحقیق وتنقید کا ترجمان)

جلد: ۷ (جنوری تا مارچ ۲۰۲۵) شمارہ: ۱

مدیر

پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

Scanned with OKEN Scanner

سہ ماہی دہلی

تاریخ ادب اردو

(علم وادب اور تحقیق وتنقید کا ترجمان)

جلد: ۷ (جنوری تا مارچ ۲۰۲۵) شمارہ: ۱

مدیر

پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

مینیجنگ ایڈیٹر:

ڈاکٹر محمد طالب

ایسوسی ایٹ ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد بہلول

خط وکتابت/ترسیل وزر کا پتہ

سہ ماہی تاریخ ادب اردو دہلی، ۶۹۴۲، دوسری منزل، پنجابی بستی، سبزی منڈی، گھنٹہ گھر، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۷

2nd Floor, Punjabi Basti, Sabji Mandi, Ghanta Ghar, Delhi-072 ,2496

E-mail: editortau@gmail.com website: tareekheadabeurdu.com

Mobile No.:+91-9968244001

اس شمارہ کے مشمولات سے مدیر/ وابستگان کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ کسی بھی تحریر/اقتباس کے لیے مضمون نگار خود ذمہ دار ہے۔ "تاریخ ادب اردو" سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حق سماعت صرف دہلی کی عدالت میں ہوگا۔

Scanned with OKEN Scanner

سرپرست اعلیٰ

پروفیسر ارتضیٰ کریم

پروفیسر راکیش کمار پانڈے (شعبہ علم طبیعات، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی)

مجلس ادارت

پروفیسر محمد رضی الرحمن (صدر شعبہ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور)

پروفیسر محمد علی جوہر (شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

پروفیسر محمد قمر الہدی فریدی (شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

پروفیسر ندیم احمد (شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

پروفیسر آفتاب احمد آفاقی (شعبہ اردو ،بنارس ہندو یونیورسٹی)

پروفیسر محمد کاظم (شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)

پروفیسر کوثر مظہری (شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

پروفیسر عذرا عابدی (شعبہ سماجیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

ڈاکٹر احمد امتیاز (شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)

پروفیسر ڈاکٹر شاہد رزمی (صدر شعبہ اردو ،مونگیر یونیورسٹی(

پروفیسر ڈاکٹر مشتاق عالم قادری (شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی(

ڈاکٹر محمد محسن (شعبہ اردو ،کروڑی مل کالج ،دہلی یونیورسٹی(

پروفیسر ڈاکٹر سیف الدین احمد (شعبہ تاریخ، دہلی یونیورسٹی)

پروفیسر ڈاکٹر بلرام شکلا (شعبہ سنسکرت، دہلی یونیورسٹی(

پروفیسر پرمود کمار بھارتی (شعبہ سنسکرت، میونسپل پی جی کالج مسوری، اتراکھنڈ)

جناب قیصر رضا(ایجوکیشن آفیسر ،حکومت جھارکھنڈ)

ڈاکٹر قاضی نوید(صدر شعبہ اردو ،مولانا آزاد کالج آف آرٹس ،سائنس اینڈ کامرس ،روضہ باغ ،اورنگ آباد ،مہاراشٹر)

مولانا محمد شاہد عادل قاسمی(پرنسپل مدرسہ یتیم خانہ ،اراریہ)

محمد رفیع(ریاستی کنوینر ،قومی اساتذہ تنظیم بہار)

پروفیسر عمران عندلیب (شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

ڈاکٹر سجاد احمد (شعبہ تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

Scanned with OKEN Scanner

مجلس مشاورت

(اندرون ملک):

ڈاکٹر نوشاد مومن (کولکاتہ)، ڈاکٹر دانش الہ آبادی (الہ آباد)، ڈاکٹر مجیب احمد خان (دہلی)، پروفیسر آلِ ظفر (مظفر پور)، ڈاکٹر محمد افروز عالم (کشمیر)، ڈاکٹر ندیم احمد (دہلی)، ڈاکٹر فیاض عالم (دہلی)، دین رضا اختر (اریا)، ڈاکٹر محمد شہزاد شمس (اریا)، وسیم فرحت علیگ (امراوتی، مہاراشٹر)، شکیبہ عمر (دہلی)، محمد فہیم احمد (کوٹہ، راجستھان)، مولانا رضوان ندوی (پورنیہ)، ڈاکٹر زین شمسی (مونگیر)۔ ڈاکٹر ابو بکر رضوی (ایسوسی ایٹ پروفیسر ،شعبہ اردو ،ٹھاکر پرساد سنگھ کالج ،پاٹلی پترا یونیورسٹی ،پٹنہ،) ڈاکٹر محمد عباس (ایسوسی ایٹ پروفیسر و صدر شعبہ اردو ، سری گرو گوبند سنگھ کالج ،پٹنہ سٹی،)ڈاکٹر محمد محمود عالم ،شعبہ فارسی ،پٹنہ یونیورسٹی،) ڈاکٹر محمد ابوالکلام آزاد ،(شعبہ فارسی ،پٹنہ یونیورسٹی)۔روفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ، پروفیسر جہانگیر احمد وارثی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر عباس رضانیر لکھنؤ یونیورسٹی۔

(بیرون ملک):

پروفیسر یوسف خشک، پروفیسر صوفیہ خشک، پروفیسر ضیاء الحسن، ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی، پروفیسر ثمینہ گل، عظمی نورین، ڈاکٹر ریحانہ کوثر (پاکستان)، پروفیسر احمد القاضی (مصر)، پروفیسر حلیل طوقار، پروفیسر دُرمُش بُلگر، ڈاکٹر ذکائی کارداس (استنبول، ترکی)، فرزانہ اعظم لطفی، ڈاکٹر علی بیات، ڈاکٹر محمد کیومرسی (تہران، ایران)، ڈاکٹر صائمہ نذیر (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو زبان وادب، نمل اسلام آباد)، ڈاکٹر سمیرا اعجاز (شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی)، عائشہ مسعود (صحافی، اسلام آباد)، ڈاکٹر عبدالعزیز ملک (شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، پاکستان)، ڈاکٹر رفعت چودھری (شعبہ اردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ)، ڈاکٹر ہاجر قدری محمد (شعبہ اردو زبان و ادب، کالج آف ہیومینیٹیز، الازہر یونیورسٹی، قاہرہ، مصر)۔

قانونی مشیر:

ایڈوکیٹ انل کمار سنگھ، ایڈوکیٹ سیما سنگھ (دہلی)

زر تعاون:

فی شمارہ-/500 خصوصی شمارہ-/1000

سالانہ-/3000 خصوصی تعاون-/10000

A/C Name: PEACE INDIA FOUNDATION

A/C No.: 51521131001918

IFSC: PUNB515210

مالک، طابع وناشر پروفیسر محمد یحییٰ صبا نے جے کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس، سے چھپوا کر دفتر "تاریخ ادب اردو، ۶۹۴۲، دوسری منزل، پنجابی بستی، سبزی منڈی، گھنٹہ گھر، دہلی۔۱۱۰۰۰۷ سے شائع کیا۔

Scanned with OKEN Scanner

مشمولات

اداریہ	مدیر-	8
1 اردو میں مقبول عام ادب اور ابن صفی کی فکری و فنی انفرادیت	پروفیسر محمد کاظم	12
2- امام الغزالی کے تعلیمی افکار : معلم کی تدریسی خصوصیات اور جدید تعلیمی نظام سے مطابقت	ڈاکٹر سیف الدین احمد	24
3-حسرت کا تصورِ عشق	ڈاکٹر عطیہ رئیس	31
4اردو ادب میں مصنوعی ذہانت کا استعمال: دیگر فوائد و ثمرات	ڈاکٹر فضیلت بانو	37
5 متن میں ترامیم اور تبدیلیاں : نوعیت اور وجوہات	پروفیسر ڈاکٹر محمد خاں اشرف، ڈاکٹر عظمت رباب	44
6 نگاہی بہ شعر طالب آملی در وصف کشمیر و جہ	ڈاکٹر م ہتاب جہاں	51
7-ڈاکٹر معصوم شرقی کی رباعیات فکر و فن کے آئینے	ڈاکٹر محمد اقبال، آئی۔ جرمن	61
8 جھارکھنڈ میں اردو غزل کی منفرد آواز: اختر مدھوپوری	ڈاکٹر جہانگیر احمد	71
9-تانیثی تنقید: نصف آبادی کے ادبی مطالبات	ڈاکٹر نصرت جبین	80
10ڈاکٹر جمیل جالبی بطور محقق و مدوِن	ڈاکٹر عظمت رباب	90
11ٹوبہ ٹیک سنگھ کی کثرتِ تعبیر؛ ابہام کی جمالیات	ڈاکٹر محمد راشد سعیدی	103
12 معاصر اسلامی دنیا اور تصوّف: مابعد نوآبادیاتی تناظر میں	ڈاکٹر الطاف انجم	120
13 راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری کا سرسری جائزہ	ڈاکٹر محمد اقبال، آئی۔ جرمن	127
14 پروفیسر عبدالقادر فاروقی کی ادبی و اصلاحی تحریریں	ڈاکٹر سید علیم اللہ حسینی	135
15 غبار خاطر ایک مطالعہ	ڈاکٹر نازیہ چنے گاؤں	139
16 فنِ افسانہ نگاری اور ممتاز شیریں کی انفرادیت	ڈاکٹر محمد طالب	142
17-اردو کی شعری اصناف کا تحلیل نفسی کے تناظر میں مطالعہ	ڈاکٹر علیشہ خانم	153
18 سر سید احمد خان اور عصری تعلیم	ڈاکٹر نازیہ چنے گاؤں	176
19-ناول "عنبرین"۔ایک تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر کے۔ایچ۔ کلیم اللہ	184
20-ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور اودھ کی اردو شاعری پر اس کے اثرات	مقیم اللہ	188

Scanned with OKEN Scanner

21اقبال کی قافیہ پیمائی عمران اعظم 194

22مذہبی و قومی ہم آہنگی میں سر سید کا کردار محمد محدث 206

23-حسرت موہانی کے سیاسی افکار و نظریات محمد عارف 212

24-عہد حاضر میں سرزمین بہار کے غزل گو شعراء: ایک مطالعہ عصمت خاتون 217

Migration of Indian girl students to the Gulf: A Study-25

233 Dr. Sajjad Ahmad

When Rape Isn't Rape: Justice Restricted in case of Married Women in India-26

250 Kamal Goyal, Dr. Rahul Kumar,

Language, Education, and Nationalism: The Arya Samaj's Role in .....-27

278 Richa Raj

Patriotism in Verse: Allama Iqbal's Poetry and the Awakening .....-28

295 Prof. (Dr.) Md. Yahya Saba

Science in science fictions: putting H.G. Wells' The Time Machine 29

324 Siddhartha Lahon

Museums as Educational Spaces: Connecting the Past with Learning -30

334 Dr. Vikram Singh Chaudhary,Dr. Ruchika Singh

Geopolitics of West Asia and India's Regional Engagement-31

347 Dr. Saiyad Md Shahnawaz, ,Dr. Waseem Ahmad, Dr. Mohammad Suhail,

Right be Forgotten vis-à-vis Right to Privacy Undar Consttution of India -32

377 Rahul Kumar, Dr. Rahul Kumar,

Unique Models for Access to Schools: The Context of text -33

402 Ruchi Payal,Dr. Dushyant Kr. Shah

Scanned with OKEN Scanner

Astrology and Muslims some glimpses from pre – Islamic period -34

417 Dr. Asad Ahmed

Breaking the Barriers: A Critical Reflection of Presence of Women …..-35

426 Dr Pankaj Deep1 and Swarni2

National Human Rights Commission on Institutional Reform and …..-36

445 Dr. Shyam Kumar,Tayenjam Priyokumar Singh

Postcolonial English Literature and the Writings of Kashmiri Pandits-37

458 Mr. Jitendar,Prof. Rekha Shrama

Vidura's Disapproval: A Prelude to the fall of the Kuru Clan -38

472 Dr. Praveen Kumar Anshuman

Beyond Beating Love's Drum: Glimpses of Upanishadic Thought in Mirabai -39

481 Dr. Aditi Govil

Subaltern Struggles and Imperial Designs: The Role of Untouchable ….-40

489 Dr. Ajeet Kumar

Genealogy, Graves, and Global Networks: Exploring the Hadrami ….-41

507 Archana Kumari

Accessible Infrastructural and Learning Environment: Positions and ….-42

519 Dr. Sunil Kumar,Pooja Sharma

History in Religious Performances: A Case Study of Bengal and Odissa -43

534 Ranjan Kumar,Vijaya Laxmi Singh

Scanned with OKEN Scanner

548	Vipul Singh, Aprajita Kimta,Bipin Kumar,Sapna Semwal,	Navigating Economic Growth: Unravelling the Influence of FDI, Exports …-	-44
570	Bhawna Solanki Dr. Lokesh Sharma,	Role of Chat GPT in Supporting Students to Complete Media Production…….	45
597	Tayenjam Priyokumar Sing ,Ningthoujam Koiremba Singh	Illegal Migration in Assam: National Security Issues and…..-	-46
611	Dr. Mahtab jahan,	Tarikh-e-Firoz Shahi of Shams Siraj Afif: An Important Source …..-	-47
621	Dr. Praveen Kumar Surjan, Dr. Suraj Bhan, Dr. Akhilesh Kumar Gautam,	Recent Developments in Teacher Education: An Overview of ….	-48
632	डॉ . सोनिया	नृत्य की वैदिक अवधारणा	-49
639	डॉ. राहतहयात	भारत में मुस्लिम शिक्षा: अभाव औ रअल्प-विकास के ऐतिहासिक संदर्भ	-50
648	डॉ०अनुप्रिया	श्री अरविन्द और वर्तमान शिक्षा नीति एक ध्ययअन	-51
654	डॉ. रेणुबाला	कामायनी मानवीय मूल्य-व्यवस्था बोध	-52
661	डॉ. प्रियंका जैन, डॉ. राजीव रंजन	भारतीय ज्योतिषशास्त्र और ताजिकशास्त्र परंपरा में पारस्परिक विनिमय के विविध आयाम	-53

Editorial

In the wake of the New Education Policy (NEP), the canvas of Urdu language and literature is expanding, both within India and beyond. Once a language of poets and philosophers, Urdu now finds itself at the heart of academic discourse, cultural revival, and international linguistic studies.

Urdu is not simply a language, it is a bridge between histories, a thread weaving together diverse cultural expressions. Recognized as one of the official languages of India, it enjoys a constitutional status under the Eighth Schedule. According to census data, it ranks as the sixth most spoken language in the country, with a substantial number of native speakers, particularly in states like Uttar Pradesh, Bihar, Telangana, Jammu and Kashmir, and Delhi. However, concerns linger about its declining usage, often attributed to misconceptions associating it solely with a particular religious community. The challenges facing Urdu today are not new. Under British colonial rule, conscious efforts were made to weaken the Urdu script and diminish its literary prominence. The British administration, recognizing its deep association with Islamic scholarship, sought to replace it with English and promote other regional languages. This systematic erosion was not just linguistic but culturally aimed at severing the connection between people and their intellectual traditions.

Despite these challenges, the Indians with some support from the government have played a significant role in preserving and promoting the Urdu language.

Scanned with OKEN Scanner

Numerous institutions, academic programs, and literary forums have emerged nurturing its legacy. The commitment to the development of Urdu reflects a broader vision of India's multilingual and multicultural identity, ensuring that languages, particularly one as historically and literarily significant as Urdu, continue to thrive rather than fade into obscurity. A cornerstone of Urdu's literary heritage, Tareekh-e-Adab-e-Urdu has emerged as a distinguished Urdu journal, playing a pivotal role in shaping scholarly discourse across the subcontinent. It reflects the unwavering commitment of eminent Urdu scholars, whose research endeavors and literary criticism have significantly enriched its pages.

Urdu, an Indo-Aryan language with roots stretching from the Mughal era to the modern times, carries within it a legacy of art, culture, and resistance. Its role in India's freedom movement and its association with artistic, cultural, and literary endeavors underscore its enduring significance. Recognized as an Eighth Schedule language in the Constitution, Urdu continues to be a symbol of India's pluralistic heritage. Historically, the evolution of Urdu is intertwined with the development of Hindavi and Hindustani, languages that emerged through cultural and linguistic exchanges. Hindavi, which developed during the Delhi Sultanate, borrowed elements of Sanskrit, Persian, Turkish, and Arabic, forming a rich tapestry of linguistic expression. Poets and mystics, such as Amir Khusrau and Baba Farid, utilized Hindavi to reach the masses, embedding it with themes of devotion and mysticism.

With the expansion of Mughal Empire, Hindavi evolved into Hindustani, a language that became the administrative and cultural bridge of the empire. This

Scanned with OKEN Scanner

period saw the emergence of two distinct registers: Personalized Urdu, favoured in elite and courtly circles, and Sanskritized Hindi, which retained indigenous linguistic elements. Mughal rulers, particularly Akbar, actively encouraged Hindustani as a unifying language, recognizing its potential to foster cultural cohesion. Poets such as Wali Deccani and Fahim Dehalvi further refined the language, blending Persian aesthetics with local idioms.

By the late medieval period, Urdu had emerged as a distinct literary language, particularly in the Deccan under the patronage of the Qutb Shahi and Adil Shahi dynasties. Persian literary forms like the ghazal and qasida found new expression in Urdu, enriching its poetic tradition. Wali Deccani, often hailed as the father of Urdu poetry, demonstrated the language's literary potential, proving that it could rival Persian in both sophistication and artistic depth. The literature of Hindavi, Hindustani, and Urdu has long reflected themes of love, mysticism, and moral values. Sufi traditions heavily influenced these literary forms, emphasizing divine love and spiritual unity. Romantic narratives and didactic literature further expanded the literary scope, making these languages the voices of diverse communities. This era laid the foundation for the poetic contributions of luminaries like Mir Taqi Mir and Ghalib, whose works cemented Urdu's place in South Asia's cultural and intellectual heritage.

Today, Urdu's presence in higher education and research is an area of ongoing investigation. Tareekh-e-Adab-e-Urdu has played a vital role in documenting the language's evolution, readership trends, and academic engagement. The journal has identified key factors influencing Urdu's contemporary status, making it an essential resource for scholars and enthusiasts alike.

Scanned with OKEN Scanner

As part of our mission, we extend a warm invitation to all scholars and authors to contribute to this esteemed journal. Our goal is not only to foster academic excellence but also to create an intellectual space where learning is driven by curiosity and passion. In an era where modern education risks losing its spark, we are committed to reigniting the enthusiasm for Urdu literature and research.

At the heart of our values lies a commitment to kindness, respect, and intellectual integrity. We are launching initiatives to promote these values and seek the support of our readers in making them a success. Urdu literature has always been a medium of social commentary and reform, and we aim to continue this tradition by addressing crucial issues such as education, climate change, gender equality, and social justice.

The role of Urdu in shaping India's literary and cultural identity cannot be overstated. As we move forward, we remain dedicated to publishing research that not only explores its rich past but also envisions its dynamic future. By fostering a learning environment that promotes critical thinking and creative expression, we hope to equip readers with the knowledge and skills needed to meet the challenges of the 21st century.

Urdu is not just a language-it is a legacy, a movement, and a bridge between the past and the future. Let us continue to celebrate and preserve its brilliance together.

Editor

Scanned with OKEN Scanner

اردو میں مقبول عام ادب اور ابن صفی کی فکری و فنی انفرادیت

پروفیسر محمد کاظم

شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

تلخیص :ادب کے مطالعے کے بعد اس کی درجہ بندی تو معیاری اور غیر معیاری بنیاد پر ہونی چاہیے لیکن ہمارے ناقدین اور دانشوران نے بھی ادب کی تقسیم ادب عالیہ اور مقبول عام ادب کی بنیاد پر کی ہے۔ کیا مقبول عام ادب معیاری نہیں ہو سکتا ہے؟ یا جو سنجیدہ اور معیاری ادب ہے اس کو مقبولیت کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا؟ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا کلاسیکی شعری ادب نہ صرف بر صغیر بلکہ پوری دنیا میں کس قدر مقبول ہے۔ میرے خیال سے یہ درجہ بندی ادب کے لیے غیر فطری اور نامناسب ہے۔

کلیدی الفاظ: ناقدین، ادب عالیہ، بر صغیر، مقبولیت، تاریخی، ابتدائی، مغربی ادب، داستان، دانشوران،

ادب کا بیشتر صنفی سرمائے مغربی ادب کے مرہون منت ہیں ۔ بالخصوص نثری اصناف کا سلسلہ یوروپی ادب سے ملتا ہے ۔داستان ،ناول ،افسانہ ،انشائیہ، خاکہ جیسی اصناف کے تاریخی مراحل اور ارتقائی سفر پر نظر ڈالنے سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔ مقبول عام ادب کی جانب اہل ادب نے کم توجہ دی اور لکھنے والوں کی تعداد بالمقابل دیگر اصناف کے کم ہی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حصّے میں مقبولیت تو خوب آئی لیکن وہ وقار حاصل نہیں ہوا جو بقول ناقدین و دانشوران ادب، ادب عالیہ کے حصے میں آئی۔

جب ہم مقبول عام ادب کے ابتدائی زمانے پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سلسلہ یا اصل ماخذ مغربی ادب ہی ہے ۔ سموئل رچرڈسن (Samuel Richardson)کا ناول 1740 “Pamela or Virtue Rewarded” ہیں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔اس ناول کی اشاعت کے تقریباً دو سال بعد 1742 میں ہنری فیلڈ نگ (Henry Fielding) کا ناول جوزف اینڈریوز (Andrews Joseph) شائع ہوا۔ اس ناول کی اشاعت کے ساتھ ہی مقبول عام ادب کا آغاز مانا جاتا ہے۔ اسی سے متاثر ہو کر اردو میں بھی اس طرح کے ناول کی شروعات ہوئی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی سجاد حسین وغیرہ کے ناولوں میں مقبول عام ناول کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ لیکن باضابطہ طور پر عبدالحلیم شرر کے ناول ”فردوس بریں“ کو مقبول عام ادب کا اولین نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس روایت کو آگے بڑھانے میں محمد علی طیب، راشد الخیری، صادق حسین سردھنوی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ان بنیادوں پر نسیم حجازی اور ابن صفی نے وہ عمارت تعمیر کی جس کی بلندی کے سامنے بہت سے نام نہاد شمار کیے جانے والے افسانوی ادیب پستہ قد نظر آتے ہیں۔

Scanned with OKEN Scanner

ادب کی درجہ بندی ادب عالیہ، ادب ادنی یا مقبول عام ادب کی بنیاد پر سمجھ میں نہیں آتی۔ ادب کے مطالعے کے بعد اس کی درجہ بندی تو معیاری اور غیر معیاری بنیاد پر ہونی چاہیے لیکن ہمارے ناقدین اور دانشوران نے بھی ادب کی تقسیم ادب عالیہ اور مقبول عام ادب کی بنیاد پر کی ہے۔ کیا مقبول عام ادب معیاری نہیں ہو سکتا ہے؟ یا جو سنجیدہ اور معیاری ادب ہے اس کو مقبولیت کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا؟ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا کلاسیکی شعری ادب نہ صرف برصغیر بلکہ پوری دنیا میں کس قدر مقبول ہے۔ میرے خیال سے یہ درجہ بندی ادب کے لیے غیر فطری اور نامناسب ہے۔

ہمارے ناقدین اور دانشوران نے اس موضوع پر اچھا خاصا وقت دیا ہے اور خاص و عام قارئین کی ذہن سازی بھی کی ہے اس لیے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادب عالیہ کے ناول اور مقبول عام ناول میں وہ کون سے عناصر ہیں جن کی بنا پر دونوں ایک دوسرے سے الگ گردانے جاتے ہیں اور کن مقامات پر دونوں میں اشتراک ہے؟

ناول، وہ نثری قصہ ہے جس میں ہماری زندگی کی تصویر سازی کی سعی کی گئی ہو۔ ولادت سے موت تک انسان کو جو معاملات پیش آتے ہیں، جس طرح وہ حالات کو یا حالات اسے تبدیل کر دیتے ہیں وہ سب ناول کا موضوعات ہو سکتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہ ناول ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں زندگی کے سارے روپ دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں :

''نثری قصہ جس میں کم و بیش پیچیدہ پلاٹ کے ساتھ حق کی زندگی کے کردار، افعال اور مناظر پیش کیے جائیں''

(قومی انگریزی، اردو لغت، ص:1328)

انگریزی ناول کے عناصر اربعہ میں سے دوسرا عنصر ہنری فیلڈنگ (Henry Fielding) کے ہم عصر اسمولٹ ناول کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

''ناول ایک پھیلی ہوئی بڑی تصویر ہے جس میں ایک مقررہ پلاٹ کے واضح کرنے کے لیے زندگی کے کردار مختلف جماعتوں کے ساتھ رکھ کر مختلف پہلوؤں سے دکھائے جاتے ہیں۔''

(بحوالہ اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی عباس حسینی، ص:36)

اوپر پیش کی گئیں تعریف سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کی نثری بیان والی تحریروں کو ناول کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ انسان داستانوں کے فرضی واقعات اور مافوق الفطرت عناصر اور ان کرداروں سے لطف اندوز ضرور ہوتا ہے لیکن دلی تسلی اور دماغ کو سکون ان سے میسر نہ ہو پاتا اور ایک طرح کی بے چینی ان کے اندر ضرور ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ سائنسی ترقی نے ہر شے کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنے اور اسے سمجھنے کا انسان کو شعور بخشا اور اس طریقے سے انسانوں کی دلچسپی فرضی واقعات سے کم ہوتی گئی اور ایسی کہانیوں نے جگہ بنالیں جو مبنی بر حقیقت ہوتیں۔ نتیجے ہیں ناول نے فکشن سے حقیقت کی جانب کوچ کرنا شروع کیا اور اب ناول میں خیالی دنیا اور مافوق الفطرت عناصر کے ساتھ سماجی حقیقت کے عناصر بھی شامل کیے جانے لگے اور اس طرح

Scanned with OKEN Scanner

ناول ترقی کی منازل طے کرتا چلا گیا۔ لیکن ساتھ میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ مقبول عام ادب اور ادب عالیہ یا سنجیدہ ادب میں کیا فرق ہے؟ جب کہ حقیقت یہی ہے کہ دونوں کا تعلق عوام سے ہے۔ ارباب تحقیق و تنقید نے جن بنیادوں پر ان میں تفریق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ان میں سے چندیوں درج کیے جا سکتے ہیں:

☆ مقبول عام ادب مصنف کی کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے جب کہ سنجیدہ ادب کا تعلق سماجی و ثقافتی روایت سے ہوتا ہے، اس میں اجتماعی شعور کا عمل دخل ہوتا ہے۔

☆ مقبول عام ادب تخلیق کرنے کا مقصد یا تخلیق کار کے پیش نظر عام قاری ہوتا ہے۔

☆ مقبول عام ادب کا مقصد تفریح طبع ہے، اس میں پیچیدگی بالکل بھی نہیں ہوتی اور نہ قاری کو بہت زیادہ الجھن میں مبتلا کیا جاتا ہے۔

☆ مقبول عام ادب کی زبان بھی آسان، صاف، ستھری اور عام فہم ہوتی ہے۔ مشکل اور مغلق الفاظ اور تراکیب سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

☆ مقبول عام ادب کا اثر دیرپا نہیں ہوتا اور نہ قاری عملی طور پر اس سے منسلک ہو پاتا ہے۔

☆ مقبول عام ادب کا اسلوب ادب عالیہ کے اسلوب سے مختلف ہوتا ہے، اس کے پیش نظر ادبی سے زیادہ عوام کی دلچسپی اور اسی کے مطابق جملے کی ساخت ہوتی ہے۔

فکشن کے ہی نہیں بلکہ اردو کے عام قاری کے نکتہ نظر سے ادبی تاریخ میں مقبول عام ادب اور خالص ادب دونوں کی اہمیت ہے۔ حالاں کہ مقبول عام ادب کو ادب میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کا وہ مستحق ہے لیکن زبان کی آب یاری اور فروغ میں اس کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ اپنے موضوع اور پیش کش کی خوبی کی وجہ سے عام قارئین ادب سے بڑی تعداد میں منسلک بھی ہوئے ہیں۔ مقبول عام ادب نے زبان کی ترویج و اشاعت کے ساتھ ادب کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے جس کا اب اعتراف بھی کیے جانے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔

مقبول عام ادب کی ابتدائی شکل تاریخی قصے، حکایات سے لبریز کہانیاں اور غیر یقینی فسانے ہوا کرتے تھی لیکن رفتہ رفتہ سائنسی ترقی کی وجہ سے حقیقت نگاری نے فرضی اور داستانوی واقعات کی جگہ لے لی۔ انگریزی ادب کے ساتھ اردو میں بھی یہی طریقہ رائج ہونا شروع ہوا لیکن انیسویں صدی کے آغاز ہی میں اس صنف نے نئی کروٹ لی۔ زندگی کے تجربات اور حقیقی واقعات کی عکاسی طرب والم کی شکل میں ہو رہی تھی، کچھ حد تک فن مجروح ہو رہا تھا، ضرورت اس بات کی تھی کہ واقعات کو ناول کے قالب میں ڈھالا جائے۔ سر والٹر اسکاٹ (Sir Walter Scott) نے "ویورلے (Waverley)" ناول لکھا جس میں اسکاٹ لینڈ کی ساٹھ سالہ تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ ہنری فیلڈنگ (Henry Fielding) کے ناول "جوزف اینڈریوز (Joseph Andrews)" میں حضرت یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کی بیوی کے واقعات کی عکاسی ملتی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

Scanned with OKEN Scanner

''تاریخ، ماضی اور حال کے درمیان ایک مکالمہ ہے ،اس مکالمے میں حال عملی طور پر زیادہ حصہ لیتا ہے کیوں کہ زمانہ ن حال میں مونرخ ماضی کے واقعات بیان کر کے ان کے رازوں سے پردہ اُٹھاتا ہے جواب تک محققین کو معلوم نہ تھے اور ماضی میں خود اس معاشرے کو بھی معلوم نہ تھے اور اس لیے مونرخ سب سے اہم کام یہ کرتا ہے کہ وہ تاریخ کی تشکیل کر کے ماضی اور حال کو آپس میں ملا دیتا ہے۔''

(ڈاکٹر مبارک علی،تاریخ کے بدلتے نظریات، ص:30)

اسکاٹ لینڈ کی تاریخی ناول نگاری کو انگریزی ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے اور ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے مختلف ناقدین نے مختلف انداز میں یاد کیا ہے ،حالانکہ ان ناولوں میں کردار اور قصے میں توازن کا کافی حد تک فقدان ہے اس کے باوجود ان کے ناول مقبول عام ناول کے نقش اول ثابت ہوتے ہیں۔

اردو ادب ہیں مقبول عام ادب کی جھلک یا اس کی جڑیں عہد قدیم کے مشرقی داستانوں خصوصاً الف لیلہ (بغداد و مصر سے متعلق قصے) طلسم ہوشربا اور بوستاں خیال' تک جا ملتی ہیں۔ مغرب ہو یا مشرق ہر دو جگہ داستانوی واقعات، حیرت و استعجاب سے پر کہانیاں اور اساطیری قصوں کا سلسلہ عرصہ دراز سے چلا آ رہا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کی تحریری قصوں کا رواج قدیم ہے۔ ہورس وال پول (Horace Walpole) نے جب جاسوسی ناول لکھنا شروع کیا تو اسے مغرب میں '' GOTHIC'' ناول لکھنے والا کہا گیا۔ وال پول سے مغرب میں کافی لوگ متاثر ہوئے۔ علی عباس حسینی کے مطابق وال پول کے تتبع میں بیک نے خلیفہ واتھک کی کہانی، مسٹر ویڈ فورڈ نے جنگل کا 'رومان' ،لیوس نے' راہب' ،میری روچ نے' کلیسا' جیسے اہم ناول لکھے ۔امریکی ناول نگاروں میں براونن نے وی لینڈ(VIE LAND)،شیلے نے 'زاسترو(ZASTROZZI) '، مسز شیلے نے فرینک اسٹین(FRANKESTEIN) جیسے اہم اور مشہور ناول لکھے۔ جرمنی میں بھی اس طرح کے ناول کا تجربہ کیا گیا جو بے حد کامیاب رہا تھا

اردو میں جاسوسی ناول کو متعارف کرنے کا سہرا ظفر عمر کے سر ہے جنھوں نے مارس لیبلانگ کے مشہور جاسوسی ناول 'نیلی چھتری' کا ترجمہ کیا،اس کے بعد مرزا ہادی رسوا، تیرتھ رام فیروزپوری،ندیم صہبائی اور پنڈت ملک راج آنند نے اس روش کو آگے بڑھایا۔ عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول بھی اس سلسلے میں اہم تسلیم کیے جاتے ہیں۔ محمد علی طیب ،ڈپٹی نذیر احمد،دل گداز کے پرنٹر اور پبلیشر حکیم محمد سراج الحق نے بھی تاریخی ناول لکھے۔ان کے دو ناول 'فیروز شاہ' اور ' ماہ طلعت' کا تذکرہ ملتا ہے، مونرخ الذکر ناول میں حضرت عمر کے عہد کی فتوحات اور کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ موہن لال فہم نے بھی تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کی لیکن مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت سے ان کی عدم واقفیت ان کے ناول کے معیار کو کم کرتی ہے۔ مولانا صادق حسین سردھنوی اردو کی تاریخی ناول نگاری میں ایک اہم اضافہ ہے۔ انھوں نے عرب کے دور جاہلیت اور دور نبوی کے حالات اور واقعات کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ان کے ناول میں تسلسل ہے، نثر شگفتہ اور پُر اثر ہے۔اس طرح کے ناول کے اثرات کو نسیم حجازی نے قبول کیا۔اس وقت تاریخی ناول نگاری کے سرمایے خاصے تھے۔ یہ دور تحریک آزادی کا دور تھا،اس لیے انھوں نے اس موقع کا فائدہ اُٹھا کر ملت کے نوجوانوں میں حوصلہ ،ہمت، شجاعت، جذبہ جہاد جیسے جذبات پیدا کرنے کے لیے ناول نگاری کا سہارا لیا۔ان کے سامنے انگریزی ادب کے بے

Scanned with OKEN Scanner

شمار ناول، شبلی کے تاریخی کارنامے ،نذیر احمد کی زبان کی چاشنی، مرزا ہادی رسوا کی تہذیب ومعاشرت سے لیس تحریریں موجود تھیں۔ان تمام ادب پاروں سے انھوں نے خوب استفادہ کیا اور ان غلطیوں اور خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جوان سے پہلے کے ناول نگاروں کے یہاں پائی جاتی تھیں،انھوں نے خاص طور پر شبلی،اقبال اور مودودی سے بہت کچھ سیکھا اور ان کی تحریرں سے خوب فائدہ اٹھایا۔اس حوالے سے ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں:

''نسیم حجازی کا طرز تحریر اردو کی بہترین نثر کی ان روایات کا امین ہے جو علامہ شبلی، علامہ ابوالکلام آزاد اور علامہ ابواالاعلی مودودی کے عالمانہ مضامین میں ترقی پاکر اظہار وبیان کا مثالی معیار مقرر کرتی ہیں ،اس طرز تحریر میں نفاست وشوکت اور متانت ودبازت ہے جہاں تک اس میں پائے جانے والے خطابت کے عنصر کا تعلق ہے ،وہ کرداروں کے مکالموں پر مشتمل ہے اور یہ مکالمے متعلقہ ہیروئں کی عظیم شخصیت،ان کے شاندار مقاصد اور سیاق وسباق کے مطابق ہیں۔''

(نسیم حجازی کا فن مشمولہ سیارہ،ڈاکٹر عبدالغنی، ص،352)

نسیم حجازی کی ان خوبیوں اور کمالات کی بدولت ان کا ناول دن بدن بہتری کی راہ پر گامزن ہوتا گیا۔اسلاف کے نقوش سے کسب فیض کیا، عصری تقاضے ،سیاسی حالات اور تہذیبی اقدار کو بھی اپنی تحریروں میں جگہ دی، جس کی وجہ سے کثرت سے ان کے ناول پڑھے بھی گئے اور ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔اس ضمن میں جن ناول نگاروں کو مقبولیت ملی ان میں مقبول عام ادب کا سب سے بڑا نام ابن صفی کا ہے۔

ابن صفی 26جولائی 1928 کو الہ آباد کے ایک گاوں 'نارا' میں پیدا ہوئے۔ابن صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ والد صفی اللہ اور امی نذیرہ نے ان کی تربیت پر خاص توجہ دی۔ابتدائی تعلیم نارا کے ایک اسکول میں ہوئی۔ DAV اسکول الہ آباد سے میٹرک اور ایوننگ کرسچن کالج سے انٹر میڈیٹ کی تعلیم مکمل کی۔ 1947 میں الہ آباد میں بی اے میں داخل ہوئے لیکن جنگ آزادی کے ہنگامے کی وجہ سے اسے مکمل نہ کرسکے۔ بعد میں انھوں نے اسی کورس کو آگرہ یونیورسیٹی سے مکمل کیا۔

ابن صفی کی تخلیقات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف قلم کے دھنی تھے بلکہ ان کے اندر تحریری و تخلیقی صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں ۔ بچپن سے ہی تحریری کاموں میں پیش پیش رہے۔ 1948 میں جب علی عباسی حسینی نے ماہنامہ ''نکہت'' جاری کیا تو شعری گوشہ کا نگراں ابن صفی کو مقرر کیا۔اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ابن صفی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری ہی سے کیا تھا۔اسرار ناروی کے نام سے شعر کہتے تھے۔ شاعری کے بعد ان کو طنز ومزاح سے دلچسپی پیدا ہوئی۔اپنے اس شوق کی بھرپائی کے لیے انھوں نے 'نکہت' ہی میں طنز ومزاح سے لیس مختصر کہانیاں مختلف قلمی ناموں سے لکھیں۔انھوں نے جن ناموں سے یہ کہانیاں لکھیں ان میں سے طغرل، فرغان اور سنکی سولچر جیسے انوکھے قلمی نام شامل ہیں۔

1951 کے اواخر کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ چند قریبی دوستوں کی محفل سجی تھی،ان میں ابن صفی بھی موجود تھے۔ کسی نے کہا کہ اردو میں صرف فحش نگاری ہی مقبولیت حاصل کرسکتی ہے۔ابن صفی نے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی لکھنے والے نے فحش نگاری کے اس سیلاب کو روکنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ دوستوں نے کہا کہ جب تک بازار میں اس کا متبادل دستیاب نہیں ہوگا، لوگ یہی پڑھتے رہیں گے۔ یہی وہ تاریخی محفل تھی جب ابن

Scanned with OKEN Scanner

صفی نے ٹھان لیا کہ اب ایسا ادب ضرور تخلیق کیا جائے گا جو لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے گا۔اس ارادے کے ساتھ اسرار حسین نے ' ابن صفی' کے نام سے قلم سنبھالا اور اسی قلمی نام سے 'انسپکٹر فریدی' اور 'سرجنٹ حمید' کے کردار کے نام سے تواتر سے ایسے ناول لکھے جنھیں عوام وخواص نے نہ صرف پسند کیا بلکہ یہ مقبول عام بھی ہونے لگے۔بعد میں علی عباس حسینی کے مشورے سے اس طرح کے ادب کا نام 'جاسوسی ادب' قرار پایا۔

ان کا پہلا جاسوسی ناول 'دلیر مجرم' کے نام سے مارچ 1952 میں شائع ہوا۔اس کے بعد جاسوسی ناول کا نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔بعد ازاں انھوں نے عمران سیریز کا پہلا ناول ' خوفناک عمارت' کے عنوان سے لکھا۔اس ناول کو راتوں رات وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو اس سے پہلے کسی اور ناول کے حصے میں نہیں آئی تھی۔اس کی ہر سیریز کا لوگوں کو شدت سے انتظار رہنے لگا۔اس سیریز کے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ جب اس سیریز کا ناول 'بھیانک آدمی' 1956 میں شائع ہوا تو ان کے والد صاحب جو برسوں سے ملاقات نہیں کر پائے تھے،اس پر لکھے ہوئے پتے سے اپنے بیٹے سے ملنے میں کامیاب ہو گئے۔دراصل ابن صفی،اپنی ماں اور بہن کے ساتھ 1952 میں کراچی ہجرت ہجرت کر گئے تھے۔حالانکہ ان کے والد صاحب پہلے یہاں آچکے تھے لیکن ان کا قیام کسی دوسری جگہ تھا۔بہر صورت اس جاسوسی ناول کی اشاعت نے فیملی کو آپس میں ملا دیا۔

عمران سیریز کا جب اکتالیسواں ناول 'بے آواز سیارہ' کے نام سے منظر عام پر آیا،اسی وقت ابن صفی نے جاسوسی دنیا کا اٹھاسیواں (88) ناول ''پرنس وحشی'' بھی مکمل کیا۔اس سیریز کے بعد ہی ابن صفی کو ایک ایسی بیماری نے اپنی گرفت میں لے لیا کہ وہ مسلسل تین سال تک بستر استراحت پر پڑے رہے۔لیکن جیسے ہی وہ صحت یاب ہوئے ایک بار پھر اسی توانائی کے ساتھ اسی رنگ میں آگئے۔ایک بار پھر ان کے جاسوسی ناولوں نے پوری دنیا کے ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ان کی کردار نگاری، جزئیات نگاری، تحریر میں چاشنی،لذت، ظرافت،دل بستگی،طنز ومزاح کی بیش بہا آمیزش سے قاری محظوظ ہونے کے بعد دوسری سیریز یا ان کے دوسرے ناول کے منتظر رہنے لگے۔ان کے ناولوں میں تذبذب اور کشمکش کے ساتھ مزاحیہ پہلو بھی خاص رنگ پیدا کرتا تھا۔عمران سیریز کا ناول 'چار لکیریں' کا ابتدائی جملہ پڑھ کر ہی قاری محظوظ ہوتا ہے:

''اس وقت کیپٹن فیاض کی کھوپڑی ہوا میں اُڑ گئی جب اس نے عمران کے ساتھ شہر کی ایک طوائف دیکھی۔''

(چار لکیریں)

'بحری یتیم خانہ' میں ظرافت کی چاشنی اعلی درجے کی ہے۔اس ناول کی ابتدا ایک نائٹ کلب کے پروگرام سے ہوتی ہے۔استاد دلفگار ٹھمری کا آغاز کرتے ہوئے ' نندیا کاہے مارے بول' کی تکرار کرتے رہتے ہیں۔سات منٹ گزر جانے کے بعد عمران استاد کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے: ''حضور !اب آپ کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی،آپ مجھے اپنی نندیا کا پتہ بتائیں،ابھی دوڑ کر پوچھ آتا ہوں کہ 'نندیا کاہے مارے بول'۔۔۔استاد خفا ہو گئے، عمران کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی۔ہنگامہ برپا ہو گیا،عمران نے چلا کر کہا: '' ان کی نندیا میری بھی رشتے دار رہی ہیں'' ۔۔۔استاد دھاڑے مار کر: ''ارے یہ بہرام خاں حرام خان کا کوئی گرگا ہے،ہے حرامی''۔۔اس پر عمران بڑے ادب سے: ''میں آپ کی نندیا کا سالا ہوں۔''

Scanned with OKEN Scanner

حاصل یہ کہ ان کی مزاحیہ نگاری اور ظریفانہ پہلو نے ان کو دوامی شہرت بخشی اور ان کے کردار لازوال ثابت ہوئے۔ اس طرح کے صدہا جملے ان کے ناول میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان کے جاسوسی ناول کی کامیابی کا اہم راز کردار نگاری اور ان کرداروں کے متاثر کن مکالمے ہیں۔ عمران سیریز میں سات مشہور کردار نظر آتے ہیں لیکن ان تمام میں علی عمران کا کردار سب پر فائق اور سب سے متحرک ہے۔ عمران کی شخصیت بہت ہی گنجلک اور ٹیڑھی ہے۔ ابن صفی اسی کردار پر ناول 'گھر کا قیدی' میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لوگ اکثر سوچتے ہیں کہ عمران کی شخصیت اتنی غیر متوازن کیوں ہے، وہ ہر معاملے کو ہنسی میں کیوں اُڑا دیتا ہے؟ والدین کا احترام اس طرح کیوں نہیں کرتا جیسے کرنا چاہیے۔''

(گھر کا قیدی)

اس طرح کے پہلو اُجاگر کرنے کے لیے ابن صفی نے عمران کی زندگی کے ابتدائی تعلیمی حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔ ماں مذہبی بنانا چاہتی تھیں، والد نے مشن اسکول میں داخلہ کرا دیا۔ باہر کا ماحول گھر کے ماحول سے بالکل مختلف۔ اس تضادانہ ماحول نے عمران کو بچپن ہی سے کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ اسی وجہ سے ان کی شخصیت معجون مرکب بن کر رہ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ناول میں یہ کردار نئے آب وتاب، نت نئے رنگ اور نئی اُمنگ کے ساتھ نظر آتا ہے۔

''کبھی وہ پرانی کار میں بیٹھ کر بھیک مانگ رہا ہے۔'' (دوسری آنکھ)

''کبھی پیکسی کے ساتھ سرکس میں مسخرا بن جاتا ہے۔'' (کالی تصویر)

''کبھی وہ اپاہج اور بیوی سے خوف زدہ شوہر بن کر رینالڈ کسن کے گھر پناہ لیتا ہے۔'' (سبز لہو)

اس طرح ان کی کردار نگاری اور منظر نگاری نے ان کے جاسوسی ناول میں ابدی شہرت کی جان پھونک دی ہے۔ ان کے کرداروں میں حمید، فریدی اور قاسم کافی مشہور اور جان دار کردار ہیں۔ ابن صفی کے جاسوسی ناول کی تعداد کثیر ہے جن میں چند بے پناہ شہرت کے حامل ہیں مثلاً خوفناک ہنگامہ، شعلوں کا تاج، دشمنوں کا شہر، لاشوں کا آبشار، پتھر کی چیخ، سائے کی لاش، موت کی آندھی، خطرناک لاشیں، گھر کا بھیدی، ہیروں کا فریب، جہنم کی رقاصہ، صحرائی دیوانہ، سہ رنگا شعلہ۔ وغیرہ

ابن صفی کے ناول صرف مزاحیہ، جاسوسی، جذباتی پہلو سے لیس نہیں ہیں بلکہ جگہ بہ جگہ عصری حسیت کی خوب صورت آمیزش سے بھی پر ہے۔ ان کے مختلف ناول سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''ہیں جانتا ہوں کہ حکومتوں سے سرزد ہونے والے جرائم، جرائم نہیں ہیں حکمت عملی کہلاتے ہیں۔ جرم تو صرف وہ ہے جو انفرادی حیثیت سے کیا جائے۔''

]جونک کی واپسی[

Scanned with OKEN Scanner

''اگر میں اس سڑک پر ناچنا شروع کردوں تو مجھے دیوانہ کہو گے لیکن لاشوں پر ناچنے والے سورما کہلاتے ہیں۔انہیں اعزاز ملتے ہیں،ان کی چھاتیاں تمغوں سے سجائی جاتی ہیں۔''

[خطرناک لاشیں]

''جب کوئی ذہین اور تعلیم یافتہ آدمی مسلسل ناکامیوں سے تنگ آجاتا ہے تو اس کی ساری شخصیت صبر کی تلخیوں میں ڈوب جاتی ہے''

(موت کی آندھی)

اہل ادب اور صاحب تنقید نے ابن صفی کے ناولوں کو ادب عالیہ یا سنجیدہ ادب میں شامل تو نہیں کیا لیکن دبے لفظوں میں ان کے فن کی تعریف ضرور کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی خدمات کو سراہتے بھی ہیں۔اس کے بر خلاف عام قارئین ان کے کردار کے دیوانے نظر آتے ہیں،یعنی کوئی عمران کا دیوانہ ہے تو کوئی فریدی کا دلدادہ، کوئی حمید کو پسند کرنے والا تو کسی کو کوئی اور کردار لبھاتا ہے۔

ابن صفی کے ناولوں کی مختلف سیریز کا جنون لوگوں پر اس قدر تھا کہ لوگ لمبی قطار میں کھڑے ہو کر ناول کے منظر عام پر آنے کے پہلے دن ہی اسے حاصل کرنا چاہتے تھے اور لاتعداد لوگ نہ صرف ناول حاصل کرتے بلکہ اس کے مطالعے کے بعد بے تکلف دوستوں کی محفل میں ان کے موضوع، پیش کش اور کرداروں پر بحثیں کرتے نظر آتے۔ان کی کردار نگاری اور فنکاری کی داد دی جاتی۔اردو جاننے والا شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے ابن صفی کے ناول کا مطالعہ نہ کیا ہو اور زیادہ تر لوگ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے زبان کا اصل لطف ابن صفی کے ناول پڑھنے کے بعد ہی لیا ہے اور انھیں اپنی زبان درست کرنے میں بھی اس سے مدد ملی ہے۔اس کے باوجود ناقدین و دانشوران ادب نے ان کے جاسوسی ناول کو ادب کے زمرے سے الگ رکھا ہے۔یہ آج کی بات نہیں ہے بلکہ ابن صفی کے زمانے میں بھی ان کے ناولوں کا مطالعہ تو شوق سے کرتے تھے لیکن اس کی ادبی اہمیت کا اعتراف کرنے میں عار محسوس کرتے تھے۔اس کا شدید احساس خود ابن صفی کو بھی شدت کے ساتھ تھا لیکن کسی صلہ کی پروا کیے بغیر اپنی تخلیقی ڈگر پر مسلسل گامزن رہے،اردو اور ان کے ناولوں کے چاہنے والوں کو اپنی انوکھی تخلیق سے محظوظ اور مسرور کرتے رہے۔ایک انٹرویو میں انھوں نے اس تعلق سے کھل کر بات کی تھی۔اور تکلیف کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''جب آرٹ اور ادب کے علم بردار مجھ سے کہتے ہیں کہ میں ادب کی خدمت کروں تو مجھے بڑی ہنسی آتی ہے۔تم ہی بتا ¶مشتاق میاں کہ کیا میں جھک مار رہا ہوں،حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو،بس میرا طریقہ کار ہمیشہ عام روش سے الگ تھلگ رہا ہے ،میں بہت اونچی بات کہہ کر محض چند لوگوں تک محدود ہونے کا قائل نہیں ہوں،دوسرے لوگ جو اعلی اور ارفع ادب تخلیق کر رہے ہیں وہ ادب کتنے ہاتھوں تک پہنچتا ہے اور انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کیا انقلاب لاتا ہے۔افسانوی ادب خواہ وہ کسی بھی پائے کا ہو،اس کا مقصد محض ذہنی فرار اور کسی نہ کسی طرح تفریح ہی فراہم کرنا ہوتا ہے لیکن اس سے گنے چنے لوگ ہی محظوظ ہوتے ہیں،میں ان گنے چنے لوگوں کے لیے ہی کیوں لکھوں،میں وہ انداز کیوں نہ اپناؤں جسے لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں۔''

Scanned with OKEN Scanner

اس اقتباس سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ ابن صفی کا مقصد کیا تھا اور انھوں نے سماجی مسائل کو کس انداز سے اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے اور اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہے ہیں۔ابن صفی اردو زبان کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے ایک بڑے حامی تھے۔وہ ادب کے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے غور وخوض کرتے تھے۔انھیں ادب کے معیار کا بھی خیال رہتا تھا اور ادب کے گرتے معیار پر فکر مند ہونے کے ساتھ نالاں بھی رہتے تھے۔ان کے خیال میں ادب محض تفریح کا سامان نہیں بلکہ معاشرتی تبدیلی کا ایک اہم ذریعہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرتی برائیوں اور انسانی کمزوریوں کو طنزیہ انداز میں بیان کرتے تھے جو قاری کے ذہن ودل پر براہ راست اثر انداز ہوتے تھے۔ان کی طنزیہ تحریریں معاشرتی مسائل کو اجاگر کرنے کا ایک پر اثر ذریعہ تھیں۔یہی وجہ ہے کہ ابن صفی سے اس طرح کا سوال کئی دفعہ کیا گیا۔ایک انٹرویو میں ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ ادب کی خدمت کیوں نہیں کرتے؟ انھوں نے جواب دیا کہ آپ تو مجھے صرف اردو کی خدمت کرنے دیجیے۔اس کے باوجود کہ صرف ونحو کی غلطیاں مجھ سے بھی سرزد ہوتی رہتی ہیں۔آپ اس وقت کی میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب مجھے کسی سندھی یا بنگالی کا خط اس مضمون کے ساتھ ملتا ہے کہ محض آپ کی کتابیں پڑھنے کے شوق میں اُردو پڑھ رہا ہوں اور پھر پڑھ کر سنانے والوں کا احسان کہاں تک لیا جائے؟اب بتایئے ادب کی خدمت کروں یا اردو زبان کی خدمت مناسب ہو گی۔ویسے اپنے نظریات کے مطابق میں ادب کی بھی خدمت کر رہا ہوں اور سماج کی بھی۔۔۔میری اس خدمت کا انداز نہ تو بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور نہ وقتی مصلحتوں کے تحت کوئی دوسری شکل اختیار کر سکتا ہے۔

ان کلمات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ابن صفی مثبت فکر اور مضبوط ارادے کے مالک تھے۔وہ اپنی فکر اور ارادے پر مضبوطی سے کاربند رہے اور اپنے طور پر اردو کی بیش بہا خدمت کرتے رہے۔ابن صفی کو قارئین کی دلچسپی،ذہنی فرحت وانبساط کے سامان پہنچانے کی فکر زیادہ ہوتی تھی بجائے اس کے کہ کون کیا کہہ رہا ہے،ان کی تحریر کے بارے میں کس کی کیا رائے ہے۔ان کی ترجیحات میں صرف یہ شامل تھا کہ ان کی تحریر ہر قاری کی سمجھ میں آئے اور ادبی چاشنی کے ساتھ قارئین کی فکری بالیدگی کو وا کرے۔اس کا اعتراف اردو کے نام نہاد ناقدین ودانشوران نے تو نہیں کیا لیکن بہت سے قلم کاروں نے ان کی خدمات کو سراہا ہے اور ان کی تحریروں کو ادب میں اضافہ قرار دیا ہے۔یہاں تک کہ مولوی عبدالحق نے کہا کہ اس شخص کا اردو پر بہت بڑا احسان ہے۔تو سید محمد اشرف نے 'ذہن جدید کے ادب پیا' کے عنوان سے پیش کی گئی فہرست میں اردو کے دس بڑے لکھنے والوں میں ابن صفی کا شمار کیا ہے۔

مغرب کی معروف جاسوسی مصنفہ 'اگاتھا کرسٹا'(AGATHA CHRISTA)سے(کراچی ایرپورٹ پر ان کے مختصر قیام کے دوران) پاکستانی جاسوسی لٹریچر کا ذکر کیا گیا تو مسکراتے ہوئے کہا:

''مجھے اُردو نہیں آتی لیکن برصغیر کے جاسوسی لٹریچر سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتی ہوں۔صرف ایک اوریجنل رائٹر 'ابن صفی' ہے اور سب اس کے نقّال ہیں۔کسی نے بھی اس سے ہٹ کر کوئی نئی راہ نہیں نکالی۔''

ابن صفی نے اپنے منفرد انداز اور غیر معمولی کردار نگاری اور ان کرداروں کے مکالمے کی بدولت ملک وبیرون میں کافی شہرت حاصل کی۔ان کے ناولوں کے مکالمے کرداروں کو زندہ اور حقیقت سے قریب تر بناتے ہیں۔ان میں برجستگی،طنز ومزاح،اور نفسیاتی گہرائی کا امتزاج پایا جاتا ہے،جو نہ صرف کہانی کو دلچسپ بناتا ہے بلکہ قاری کو کرداروں کے ساتھ منسلک بھی کرتا ہے۔ان کے مکالمے کہانی کی رفتار اور اس کے موڑ کو مؤثر طریقے سے سنبھالتے ہیں،

Scanned with OKEN Scanner

اور مختصر لیکن معنی خیز جملوں کے ذریعے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ یہ تمام خصوصیات ابن صفی کی مکالمہ نگاری کو اردو ادب میں منفرد اور یادگار بناتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ابن صفی کی مکالمہ نگاری اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ان کے لکھے گئے مکالمے نہ صرف ان کے کرداروں کی شخصیت کو ابھارتے ہیں بلکہ کہانی کو دلچسپ اور حقیقت پسندانہ بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مکالموں میں ابن صفی کی زبان کا استعمال،ان کی برجستگی،اور طنز ومزاح کا عنصر ان کی تحریروں کو خاص بناتا ہے۔

ابن صفی کے مکالمے بہت برجستہ اور فطری ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کی زبان کو ان کی حیثیت، تعلیم،اور ماحول کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ان کے مکالمے اتنے فطری ہوتے ہیں کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود اس گفتگو کا حصہ ہو۔ مثلاً عمران سیریز کے مکالمے عموماً ہلکے پھلکے اور مزاح سے بھرپور ہوتے ہیں،جو عمران کے کردار کی مخصوص چالاکی اور ذہانت کو ظاہر کرتے ہیں۔ان کے مکالموں کی برجستگی اور فطری انداز کی ایک مختصر ترین مثال ملاحظہ فرمائیں:

عمران: "تمھیں پتا ہے کہ میں تمھارے لیے کتنا خطرناک ہوں؟ "

رفیق: "جی ہاں،اسی لیے تو آپ سے ڈرتا ہوں۔ "

عمران: "ارے،میں تو اپنے آپ سے بھی ڈرتا ہوں۔"

ابن صفی کے مکالمے طنز ومزاح سے بھرپور ہوتے ہیں،جو ابن صفی کے ساتھ ساتھ ان کے کرداروں کی ذہانت اور حاضر دماغی کو ظاہر کرتے ہیں۔ان کے طنزیہ مکالمے اکثر معاشرتی برائیوں یا انسانی کمزوریوں پر لطیف تنقید کرتے ہیں:

فریدی: "تمھیں اپنے کام پر شرمندگی نہیں ہوتی؟ "

حمید: "بالکل نہیں! شرمندہ وہ ہوتے ہیں جنہیں اپنے کام کا یقین نہ ہو۔"

ابن صفی کے مکالمے کرداروں کی نفسیات اور ان کی ذہنی کیفیت کو واضح کرتے ہیں اور وہ اپنے کرداروں کے جذبات اور خیالات کو مکالموں کے ذریعے بہت موثر انداز میں پیش کرتے ہیں:

فریدی: "یہ تم نے کیا کیا،حمید؟ "

حمید: "سر، کبھی کبھار کچھ کرنے کے لیے کچھ نہ کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

جب کوئی فنکار کردار کی نفسیات،اس کی معاشی حالت اور اس کے ذہن ودل کو اچھی طرح سمجھ کر مکالمے تخلیق کر کے اسے کامیابی سے پیش بھی کرتا ہے تو ان کرداروں کے مکالمے فطری ہوتے ہیں، مکالمے کہانی کی روانی کو برقرار رکھتے ہوئے اسے نہایت خوش اسلوبی سے آگے بڑھاتے ہیں اور قاری کی

Scanned with OKEN Scanner

دلچسپی کو برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ایسے مکالمے کہانی کے مختلف منازل اور کلائمکس کو اور زیادہ پر اثر بناتے ہیں۔ابن صفی کے مکالمے اسی زمرے میں شامل ہیں:

عمران: "اب تو بس دو ہی راستے ہیں، یا تو تم ہار جاؤ گے یا میں جیت جاؤں گا۔ "

دشمن: "لیکن دونوں میں فرق کیا ہے؟ "

عمران: "فرق یہی ہے کہ میں ہارنا نہیں جانتا۔"

اب تک جو مکالمے مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں اس سے بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ابن صفی کو مختصر مکالموں کے ذریعے گہری بات پیش کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے صرف مختصر مکالمے ہی تحریر کیے ہیں بلکہ طویل مکالمے بھی خوب ملتے ہیں۔ لیکن ان مکالموں میں بھی وہی خوبی موجود رہتی ہے کہ یا تو وہ کردار کی فکر اور حالات کی عکاسی کرے یا کہانی کے ارتقائی مراحل طے کرنے میں معاون ثابت ہو۔ہم جانتے ہیں کہ مختصر اور موثر مکالمے کی مدد سے وہ زیادہ بات کیے بغیر اپنے کرداروں کے ذریعے بہت کچھ کہہ دیتے ہیں۔ یہ مختصر مکالمے کہانی کی شدت کو بڑھاتے ہیں۔ایک مختصر اور فلسفیانہ مکالمہ دیکھیں:

عمران: "یہ تم کیا کر رہے ہو؟ "

خالد: "وہی جو ہمیشہ کرتا ہوں، یعنی کچھ نہیں۔"

ابن صفی کے کرداروں اور ان کے مکالموں پر طویل گفتگو کی جا سکتی ہے کیوں کہ ابن صفی کی مکالمہ نگاری ان کے افسانوں اور ناولوں کی جان ہے۔ان کے مکالمے کرداروں کو زندہ اور حقیقت کے قریب تر بناتے ہیں۔ ان میں برجستگی، طنز و مزاح، اور نفسیاتی گہرائی کا امتزاج پایا جاتا ہے، جو نہ صرف کہانی کو دلچسپ بناتا ہے بلکہ قاری کو کرداروں کے ساتھ جوڑتا بھی ہے۔ان کے مکالمے کہانی کی رفتار اور اس کے موڑ کو موثر طریقے سے سنبھالتے ہیں، اور مختصر لیکن معنی خیز جملوں کے ذریعے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ یہ تمام خصوصیات ابن صفی کی مکالمہ نگاری کو اردو ادب میں منفرد اور یادگار بناتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ابن صفی کے ناول نہ صرف اردو قارئین کے لیے تفریح و تدریس کا ذریعہ رہا بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کی مدد سے مقبول عام رہا۔ حالانکہ ہندی میں منتقل کرتے ہوئے ان کے ناولوں کے کرداروں میں سے دو کرداروں کے نام بدل دیے گئے یعنی فریدی کی جگہ 'ونود' اور عمران کی جگہ 'راجیش' کر دیا گیا۔ باقی کردار اپنے اصلی نام کے ساتھ آج بھی موجود ہیں۔

مختصراً یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا کہ ابن صفی کے ناولوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ قاری کو تفریح مہیا کرتے ہیں۔ان کے کردار دلچسپ، منفرد اور یادگار ہیں۔ چاہے وہ "علی احمد" ہو یا "شہزاد" یا "شہزادہ زار"۔ ہر کردار کی اپنی ایک کہانی، اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ یہ تفریحی عنصر قاری کو نہ صرف کہانی میں مشغول رکھتا ہے بلکہ ان کی تخلیقی فکر کو بھی پروان چڑھاتا ہے۔اس کے باوجود ان کی تحریریں صرف تفریحی کہانیوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان

Scanned with OKEN Scanner

میں انسانی نفسیات، معاشرتی مسائل، اور اخلاقی اقدار کی عکاسی ہوتی ہے۔ان کی تخلیقات میں کہانی کی پیچیدگی، کرداروں کی گہرائی اور سسپنس کا عنصر ملتا ہے، جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔اس کے ساتھ ان کے ناولوں میں ثقافتی اور سماجی موضوعات کا عمیق تجزیہ ملتا ہے۔انہوں نے مشرقی ثقافت اور روایات کو اپنے ناولوں میں خوبصورتی سے سمویا ہے۔ ان کی کہانیوں میں ہم عصر مسائل، جیسے سماجی مسائل، طبقاتی تفریق، اور انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کی عکاسی کی گئی ہے، جو آج کے دور میں بھی قابل غور اور قابل قدر ہیں۔ابن صفی کے ناولوں کی ایک اور اہمیت یہ ہے کہ وہ نوجوان نسل کے لیے ایک تعلیمی ماخذ بھی ہیں۔ ان کی تحریروں سے زبان، ادب اور بیان کی مہارت کو سیکھا جا سکتا ہے۔ان کے ناولوں کا مطالعہ نوجوانوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارتا ہے اور انہیں بہترین ادب کی قرات اور تخلیق کی طرف راغب کرتا ہے۔

اس کے باوجود ہمارے ناقدین نے ان ناولوں پر غیر جانبدارانہ نظر ڈالنے کی زحمت نہیں کی۔ بلکہ اگر کبھی اس کا ذکر کیا بھی تو مقبول عام ادب کے زمرے میں ڈال کر کہیں دور کسی کونے میں رکھ کر بھول گئے۔ادب کی درجہ بندی اس کے معیار کی بنیاد پر ہونی چاہیے نہ کہ مقام اور علاقے یا موضوعات کی بنیاد پر۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب کسی ادبی فن پارے کی اہمیت سے انکار کرنا ہوتا ہے تو اسے کسی نئے خانے میں ڈال کر مین اسٹریم سے باہر کا راستہ دکھا دیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر مہجری ادب یا مقبول عام ادب یا ادبی اصناف یا اس طرح کے دوسرے خانے یا زمرے بنا لیے جاتے ہیں۔ مجھے یہ مثبت یا ایماندارانہ رویہ معلوم نہیں ہوتا۔ابن صفی اور ان کے ناولوں کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کیا گیا کہ پہلے تو اسے جاسوسی ناول کہہ کر الگ کیا گیا اور بعد میں اس قسم کے ناولوں کو مقبول عام ادب کہہ کر ادب کے مین اسٹریم سے باہر رکھنے کی کوشش کی گئی جب کہ نہ صرف ابن صفی کے دور میں بلکہ موجودہ دور میں بھی ان کے ناولوں کی اہمیت وافادیت کسی بھی طرح کم نہیں ہوئی ہے۔ان کی تخلیقات میں موجود انسانی جذبات، سماجی مسائل، ثقافتی پہلو اور زبان کی چاشنی آج بھی قاری کو متوجہ کرتی ہے۔ آج بھی ان کے ناول کا مطالعہ نئی نسل کے لیے زبان کی تدریس کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔اس لیے اردو ادب کی دنیا میں ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، اور ان کے ناولوں کا مطالعہ نہ صرف تفریحی بلکہ فکری لحاظ سے بھی فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔ ابن صفی کی ادبی وراثت آج بھی اردو ادب کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

امام الغزالی کے تعلیمی افکار : معلم کی تدریسی خصوصیات اور جدید تعلیمی نظام سے مطابقت

ڈاکٹر سیف الدین احمد

شعبۂ تاریخ , یونیورسٹی اف دلی

Abstract: In the Islamic history, many scholars have made significant contributions to various fields of knowledge through their innovative ideas and deep intellectual insights. These contributions have not only shaped the intellectual growth of the Islamic world but have also left a lasting impact on Western scholarly traditions. Among these remarkable figures, Abu Hamid Muhammad al-Ghazali, commonly known as Imam al-Ghazali, stands out as a key thinker whose legacy continues to influence modern Islamic thought.

This paper aims to explore al-Ghazali's views on the curriculum of Islamic education by analysing the evolution of educational frameworks that preceded his contributions. Imam al-Ghazali's views on education covers a wide range of aspects, including the purpose of education, the design of curricula, teaching methods, the role of educators, the responsibilities of learners, and the relevance of his ideas to contemporary educational needs. Central to his educational philosophy is the emphasis on religious knowledge, which he regarded as vital for intellectual growth and spiritual enlightenment. Al-Ghazali believed that true knowledge arises from the integration of reason and intuition. For him, the ultimate aim of education was to achieve human excellence by drawing closer to God and fostering moral and spiritual refinement.

Keywords: Al-Ghazali, curriculum, Islamic education

Scanned with OKEN Scanner

عالم اسلام میں ایسے بے شمار علماء پیدا ہوئے ہیں جن کی تخلیقی خیالات اور گہرے علمی بصیرت نے مختلف علمی میدانوں میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ان کے علمی کارنامے نہ صرف اسلامی دنیا کی علمی ترقی کے لیے اہم ثابت ہوئے بلکہ مغربی علمی روایت پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ان ممتاز علماء میں ابو حامد محمد الغزالی، جنہیں امام الغزالی کے نام سے جانا جاتا ہے،ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں جن کی علمی میراث آج بھی اسلامی مفکرین کے نظریات پر گہرا اثر ڈال رہی ہے۔

تعلیم کے حوالے سے امام الغزالی کے افکار کئی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں، جن میں تعلیمی مقاصد، نصاب کی تشکیل، تدریسی طریقے، اساتذہ کا کردار، طلبہ کی ذمہ داریاں، اور ان کے تصورات کی جدید تعلیمی تقاضوں کے ساتھ مطابقت شامل ہیں۔الغزالی کی تعلیمی فکر کا مرکزی نکتہ دینی علوم پر زور دینا ہے، جنہیں وہ علمی ترقی اور روحانی بصیرت کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے۔ان کے نزدیک حقیقی علم وہی ہے جو عقل اور بصیرت کے امتزاج سے حاصل ہو۔الغزالی کے مطابق تعلیم کا سب سے بڑا مقصد انسانی کمال کو پانا ہے، جس کی معراج خدا کے قریب ہونا اور اخلاقی و روحانی ترقی کے ذریعے اپنی ذات کو سنوارنا ہے۔

جان ایل ایسپوزیٹو نے ابو حامد الغزالی کو ایک ممتاز مسلم متکلم،فقیہ اور قرون وسطیٰ کے صوفی کے طور پر پیش کیا ہے۔اسلامی علمی روایت کی تاریخ میں چند ہی شخصیات ایسی ہیں جنہوں نے الغزالی کی طرح گہرا اور ہمہ جہت اثر چھوڑا ہو۔صرف 52 برس کی عمر میں الغزالی نے اپنی علمی ذہانت اور اسلامی علوم پر گہرے تنقیدی غور و فکر کے ذریعے مسلم اور غیر مسلم علماء کے درمیان بے پناہ عزت اور تحسین حاصل کی ۔

الغزالی کی علمی خدمات کا دائرہ ان کی وسیع تصنیفی میراث سے بخوبی عیاں ہے۔انہوں نے مختلف علوم میں بے شمار اہم کتابیں تحریر کیں۔سید محمد بن محمد الحسینی نے الغزالی کی تصانیف کو حروف تہجی کے مطابق ترتیب وار جمع کیا ہے، جن کی تعداد 70 کے قریب بتائی جاتی ہے)اساری، 2006۔

الغزالی کے اسلامی تعلیمات پر نظریات

الغزالی کے تعلیمی نظریات کو پانچ اہم پہلوؤں کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے :تعلیم کے مقاصد،نصاب کی ترتیب تدریسی طریقے، اور اساتذہ و طلبہ کے اخلاقی فرائض۔یہ تمام پہلو ان کے تعلیمی فلسفے کی گہری تفہیم فراہم کرتے ہیں۔ذیل میں ان پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، جو کلاسیکی کتب اور الغزالی کے افکار پر معاصر مطالعوں سے اخذ کی گئی ہیں۔

تعلیمی مقاصد

تعلیمی مقاصد کی تشکیل دراصل تعلیم کی غایت اور اس کی روح سے متعلق ایک فلسفیانہ نقطۂ نظر کو ظاہر کرتی ہے۔یہ مقاصد تعلیمی عمل کے دیگر اہم پہلوؤں، جیسے اہداف،نصاب،تدریسی طریقے، اور اساتذہ و طلبہ کے کردار کی تشکیل کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔الغزالی کے تعلیمی فلسفے کے تجزیے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تعلیم کے دو بنیادی مقاصد ہیں :پہلا مقصد انسانی کمال کا حصول ہے جو انسان کو خدا سے قریب کرتا ہے،اور دوسرا مقصد ایسی انسانی برتری کا حصول ہے جو دنیاوی خوشحالی اور اخروی کامیابی کو یقینی بنائے۔

Scanned with OKEN Scanner

الغزالی کا تعلیمی نقطۂ نظر دینی اور روحانی اصولوں پر مبنی ہے، جو اسلامی تعلیم کی ایک خاص خصوصیت ہے۔ان کی سوچ تصوف کے فلسفے کے قریب ہے، جو تعلیم کے روحانی اور اخلاقی پہلوؤں پر زور دیتی ہے۔الغزالی کے مطابق، تعلیم کا حتمی مقصد دنیاوی اور روحانی دونوں میدانوں میں انسانی کمال کا حصول ہے۔ان کے نزدیک یہ کمال صرف اس وقت حاصل کیا جاسکتا ہے جب انسان اخلاقی فضائل اور کردار کی بلندی کو پروان چڑھائے جو علم کے ذریعے ممکن ہے۔ایسا علم انسان کو خدا کے قریب لے جاتا ہے، دنیا میں عزت کا سبب بنتا ہے، اور آخرت میں دائمی خوشی عطا کرتا ہے)الغزالی، (1969 ۔

الغزالی نے تعلیم کے مقاصد کو دو اقسام میں تقسیم کیا ہے :طویل مدتی اور قلیل مدتی مقاصد۔طویل مدتی مقصد یہ ہے کہ انسان کو خدا کے قریب لایا جائے اور اسے اپنے خالق کو پہچاننے اور اس سے تعلق قائم کرنے کی طرف رہنمائی کی جائے۔ قلیل مدتی مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنے پیشہ ورانہ امکانات کو ترقی دے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق اپنا کردار ادا کرے۔ یہ دوہری مقاصد الغزالی کے جامع تعلیمی وژن کی عکاسی کرتے ہیں، جس میں روحانی ترقی کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ دنیاوی ضروریات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

نصاب

امام الغزالی کا تصورِ نصاب ان کے علم کے فہم سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔انہوں نے علم کو تین اقسام میں تقسیم کیا ہے :

قابل مذمت علوم :یہ وہ علوم ہیں جو نہ دنیا میں فائدہ دیتے ہیں اور نہ آخرت میں۔ان میں جادو گری، نجوم اور قسمت کا حال بتانے جیسے علوم شامل ہیں۔الغزالی نے ان علوم کو ناپسندیدہ قرار دیا کیونکہ یہ اکثر نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں، نہ صرف سیکھنے والے کے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی۔مثال کے طور پر، جادو گری لوگوں میں اختلاف پیدا کر سکتی ہے، دشمنی کو ہوا دے سکتی ہے اور نقصان و شرارت کو جنم دے سکتی ہے۔ اسی طرح، الغزالی نے نجوم کو دو اقسام میں تقسیم کیا :ایک وہ جو حسابات)حساب (پر مبنی ہے، اور دوسری وہ جو قیاسی پیشن گوئیوں)استدلالی (پر مبنی ہے، جسے انہوں نے بے بنیاد اور گمراہ کن قرار دیا۔

قابل تعریف علوم :یہ وہ علوم ہیں جو عبادات اور اخلاقیات سے قریب ہیں۔ان میں وہ علم شامل ہے جو انسان کو گناہوں سے پاک کرتا ہے، نیک زندگی گزارنے کا درس دیتا ہے اور خدا سے قریب ہونے کا راستہ دکھاتا ہے۔الغزالی- نے ان علوم کو مزید دو اقسام میں تقسیم کیا

فرض عین :وہ دینی علوم جو ہر مسلمان پر لازمی ہیں، جیسے قرآن کو سمجھنا، نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ ۔

فرض کفایہ :وہ علوم جو سماج کی بھلائی کے لیے ضروری ہیں، جیسے طبّی علم جو صحت کے لیے لازم ہے یا حساب جو مالی معاملات، وراثت اور تجارت کے لیے اہم ہے۔الغزالی نے زور دیا کہ اگر ان علوم کو نظر انداز کیا جائے تو پوری امت گناہگار قرار پائے گی۔

متنازعہ علوم :کچھ علوم، جیسے فلسفہ، ایک حد تک قابل قبول ہیں لیکن ان میں گہرائی میں جانا مسائل پیدا کر سکتا ہے۔الغزالی کے نزدیک، فلسفے کا حد سے زیادہ مطالعہ شک، اعتقادات میں خلل اور بعض اوقات کفر کی طرف لے جاسکتا ہے۔انہوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ دینی علوم اور ان کی شاخیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ یہ عقل اور روحانی بصیرت کو پروان چڑھاتی ہیں۔

Scanned with OKEN Scanner

-اپنی مشہور کتاب احیاء علوم الدین میں الغزالی نے علم کے تین پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے

(-**ایپیستمولوجی**) علم کی نوعیت

(-**آنٹولوجی**) وجود کی نوعیت

(-**ایکسیالوجی**) علم کی اہمیت اور مقصد

تدریسی طریقے

الغزالی کا تعلیمی طریقہ کار منظم اور اسلامی اصولوں پر مبنی تھا۔انہوں نے تدریس کے لیے مرحلہ وار حکمت عملی تجویز کی، جس کا آغاز یادداشت اور فہم سے ہوتا ہے، پھر یقین، جواز اور استدلال کی تربیت کے ذریعے علم کو مضبوط کیا جاتا ہے۔یہ طریقہ ان کی صوفیانہ شخصیت کی عکاسی کرتا ہے، جہاں خود پر قابو اور روحانی ترقی مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔الغزالی نے طلبہ کی کردار سازی پر خاص زور دیا۔ان کے نزدیک استاد کا کردار طلبہ کے اخلاق اور فضائل کو سنوارنے میں بنیادی پہلو ہے۔الغزالی کے لیے تعلیم محض ایک پیشہ نہیں بلکہ ایک معزز ذمہ داری تھی، جس کا مقصد انسانی دل کو پاکیزہ بنا کر خدا کی طرف رہنمائی کرنا تھا۔

: **استاد اور طلبہ کے لیے الغزالی کی رہنمائی درج ذیل ہے**

استاد کو نرمی سے نصیحت کرنی چاہیے اور سخت لہجے سے گریز کرنا چاہیے۔

طلبہ کو بری عادتیں ترک کرنے کے لیے فوری طور پر نہیں بلکہ تدریج کے ساتھ ترغیب دی جانی چاہیے۔

اچھے رویے پر انعام دیا جائے، جبکہ غلطیوں پر صبر اور تحمل کے ساتھ اصلاح کی جائے۔

طلبہ کو برے اثرات اور غلط صحبت سے بچایا جائے۔

کھانے، لباس اور نیند میں میانہ روی کی عادت ڈالی جائے۔

جسمانی سرگرمیوں اور تفریحی کھیلوں کو تعلیمی عمل کا حصہ بنایا جائے۔

الغزالی نے تدریسی طریقوں کو طلبہ کی صلاحیتوں اور ضروریات کے مطابق ڈھالنے پر زور دیا اور انفرادی تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

تعلیمی طریقے

الغزالی نے مختلف تعلیمی طریقے متعارف کرائے تاکہ تدریس کو زیادہ مؤثر بنایا جاسکے، جن میں لیکچر کا طریقہ شامل ہیں) طریقہ تلقینیہ :(اس میں استاد علم دینے والا) ملقی (ہوتا ہے، اور طالب علم علم حاصل کرنے والا) متلقی(۔

Scanned with OKEN Scanner

بحث ومباحثہ کا طریقہ) مخاطبہ :(اس طریقے میں مکالمہ طلبہ کی ذہنی استعداد کے مطابق ہوتا ہے۔

سوال وجواب کا طریقہ :الغزالی نے اچھے سوالات) حسن السوٴال (کو گہرے فہم کا ذریعہ سمجھا۔

الغزالی نے نصاب کی تدریس میں اس بات پر زور دیا کہ طلبہ کی فکری صلاحیتوں کو مد نظر رکھا جائے، تعلیم کو ٹھوس سے مجرد موضوعات کی طرف لے جایا جائے،اور تدریس کو تدریجی مراحل میں مکمل کیا جائے۔یہ منظم طریقہ الغزالی کی تعلیم میں توازن قائم کرنے کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے، جس میں عقل اور کردار دونوں کی نشوونما کو اہمیت دی گئی ہے۔

معلم کی خصوصیات

امام الغزالی نے استاد کو تعلیم وتربیت کے عمل میں کلیدی حیثیت دی ہے اور طلبہ کے کردار،اخلاق اور علمی استعداد کو سنوارنے میں اس کے کردار کو بنیادی قرار دیا ہے۔الغزالی نے استاد کے لیے چند اہم خصوصیات اور ذمہ داریاں متعین کی ہیں، جن میں شامل ہیں۔

- استاد کو طلبہ کو اپنی اولاد کی طرح سمجھنا چاہیے اور ان کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آنا چاہیے۔
- تدریس خلوص کے ساتھ ہونی چاہیے، جس کا مقصد صرف اللہ کی رضا ہو،نہ کہ دنیاوی فائدہ یا شہرت۔
- استاد کو طلبہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ تعلیم کا اصل مقصد خدا کے قریب ہونا ہے،نہ کہ دنیاوی مرتبہ یا فخر حاصل کرنا۔
- استاد کو اپنے علم پر عمل کرنا چاہیے اور اپنی تعلیمات کے برعکس عمل سے گریز کرنا چاہیے ۔

الغزالی کے نزدیک ایک مثالی استاد نہ صرف علمی اور ذہنی طور پر ممتاز ہونا چاہیے بلکہ اخلاقی طور پر بھی بلند اور جسمانی طور پر توانا ہونا چاہیے۔ عقل ودانش استاد کو علم میں مہارت عطا کرتی ہے، جبکہ اخلاقیات اسے طلبہ کے لیے ایک مثالی نمونہ بناتی ہیں۔جسمانی قوت تدریسی، تربیتی اور رہنمائی کے فرائض انجام دینے کے لیے ضروری ہے۔

استاد کی مخصوص خصوصیات

الغزالی نے عمومی صفات کے ساتھ چند مخصوص خصوصیات بھی بیان کی ہیں، جو ایک استاد میں موجود ہونی چاہییں۔

- شفقت :استاد کو تدریس اور رہنمائی کے عمل میں ہمدردی اور نرمی سے کام لینا چاہیے۔
- ایمانداری اور خلوص :استاد کو مخلص رہنمائی فراہم کرنی چاہیے اور ساتھ ہی اساتذہ کے ساتھ مقابلے اور تنازعات سے گریز کرنا چاہیے۔
- نرمی کارویہ :استاد کو سختی، طنز یا توہین کے بجائے نرمی اور حکمت کے ساتھ طلبہ کی اصلاح کرنی چاہیے۔
- مثالی کردار :استاد کو ان اقدار پر عمل کرنا چاہیے جن کی وہ تعلیم دیتا ہے،اور دوسرے علوم یا شعبوں پر تنقید سے اجتناب کرنا چاہیے جو اس کی مہارت میں شامل نہیں ہیں۔

Scanned with OKEN Scanner

- طلبہ کی انفرادی صلاحیتوں کو سمجھنا :استاد کو طلبہ کی مختلف صلاحیتوں، ذہنی سطح اور نفسیاتی خصوصیات کو سمجھنا چاہیے اور ان کے مطابق تعلیم دینی چاہیے۔
- طلبہ کی نشوونما پر توجہ :استاد کو طلبہ کی فطری صلاحیتوں اور عمر کے تقاضوں کے مطابق تدریسی عمل کو ڈھالنا چاہیے۔

اپنی کتاب ایھا الولد میں الغزالی نے استاد کے کردار کو پیغمبر یا خلیفہ کے مشابہ قرار دیا، جو انسانیت کو خدا کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ لہٰذا، ایک استاد کو علمی گہرائی، وسیع نظریہ، اور دینی بصیرت سے آراستہ ہونا چاہیے۔

روحانی رہنما کی خصوصیات

الغزالی نے ایک مرشد) روحانی رہنما (کے لیے بھی مخصوص صفات بیان کی ہیں، جن میں دنیاوی لذتوں اور مرتبے کی محبت سے اجتناب شامل ہیں ۔

-ایسے علماء کی پیروی کرنا جن کی علمی سلسلہ نسب نبی اکرم ﷺ تک پہنچتی ہو

-خود کو ریاضت کے ذریعے سنوارنا، مثلاً کھانے میں اعتدال، غیر ضروری باتوں سے گریز، عبادات میں اضافہ صدقہ و خیرات، اور روزے رکھنا۔

-صبر، شکر، توکل، عاجزی، صداقت، وعدہ وفائی، وقار، اور بردباری جیسے اخلاقی اوصاف اپنانا

الغزالی کے نزدیک ایک استاد کو گہرے علمی فہم، بلند اخلاقی کردار، اور پیشہ ورانہ دیانت داری سے آراستہ ہونا چاہیے تاکہ وہ انبیاء کے وارث اور انسانیت کے رہنما کے طور پر اپنی ذمہ داری ادا کر سکے۔

جدید تعلیم میں الغزالی کے افکار کی مطابقت

الغزالی کے تعلیمی افکار، جن میں مقاصد، نصاب، تدریسی طریقے، اور استاد و طلبہ کے کردار شامل ہیں، آج کے تعلیمی نظام کے لیے بھی نہایت موزوں ہیں۔ ان کا طلبہ کی انفرادی خصوصیات کو سمجھنے پر زور جدید نفسیاتی اصولوں کے عین مطابق ہے، جو افراد کی صلاحیتوں، رجحانات، اور رویوں میں تنوع کو تسلیم کرتے ہیں۔ الغزالی کے تدریسی طریقوں کو طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق ڈھالنے کا نظریہ موجودہ تعلیمی نظریات میں ذاتی تدریس کی اہمیت کو تقویت دیتا ہے۔

گریفل (2009) نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ الغزالی کی تعلیمی فلسفہ اساتذہ کی تربیت اور تدریسی عمل پر گہرے اثرات مرتب کر چکا ہے۔ ان کے نظریات نے نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے دور میں بھی تعلیمی نظام کو متاثر کیا) برکی، (1992 ۔

الغزالی نے دینی، علمی، تجرباتی، اور تصوفی علوم کو یکجا کیا، جیسا کہ ان کی مشہور کتاب احیاء علوم الدین میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ جامع نظریہ آج بھی جدید تعلیم کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

حوالہ جات

1. Ashraf, S. A. (1985). New horizons in Muslim education. London: Hodder & Stoughton.
2. Alavi, S.M. Ziauddin. (1988). Muslim Educational Thought in the Middle Ages. New Delhi: Atlantic Publishers.
3. Al-Ghazali, Abu Hamid Muhammad. (1939). Ihyâ' 'Ulûm al-Dîn. Kairo: Mushthafa al-Babi al-Halabi.
4. Berkey, J. (1992). The Transmission of Knowledge in Medieval Cairo: A Social History of Islamic Education. Princeton: Princeton University Press.
5. Esposito L.J (2002). The Oxford Encyclopedia of the Modern Islamic World. Bandung: Mizan.
6. Goldziher, I (1981). Introduction to Islamic Theology and Law, tr. Andras & Ruth Hamori. Princeton: Princeton University Press.
7. Griffel, F. (2009). Al-Ghazali's philosophical theology. Oxford University Press.
8. Whittingham, M. (2007). Al-Ghazali and the Qur'an: one book, many meanings, (Culture and Civilization in the Middle East Series). Routledge, Abingdon 2007.

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

حسرت کا تصورِ عشق

ڈاکٹر عطیہ رئیس،

دہلی یونیورسٹی،دہلی

تلخیص:عشق اور محبت کو انسانی محرکات میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے اس لیے ہمارے بعض شعراء نے عشق اور محبت کو ایک ہی معنی میں استعمال کرکے دونوں کے درمیانی فرق کو ختم کر دیا۔ اردو غزل کے تہذیبی عمل میں عشق اور محبت دونوں کو موضوعاتی طور پر برتا گیا بلکہ اردو شاعری ابتداء ہی سے یہ ایک اہم موضوع کے طور پرشامل رہا۔ اگر کلاسیکی شعری روایت پر نظر ڈالیں تو یہ صاف طور پر نظر آئے گا کہ عشق کا تصور ہجر و وصال، عشوہ و غمزہ، زلف و کاکل، ابرو و مژگاں، وغیرہ تک محدودرہا۔ جدید غزل نے بہت حد تک عشق کے تصور کو بدلنے کی کوشش کی اور اس میں تنوع پیدا کیا۔

کلیدی الفاظ:،اعتبار ،اہلیت،وافقت ، تخلیقی،جماعت ،خلاف ،ناقدین ، مستحکم

رئیس المتغزّلین فضل الحسن حسرت موہانی جدید غزل کے امام کہے جاتے ہیں۔ ان کو سیدلاحرار کے نا م سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اردو غزل کی کلاسیکی روایت کے خلاف جب ناقدین اور نظم نگاروں کی ایک بڑی جماعت صف آرا تھی، اُس زمانے میں یعنی بیسوی صدی کی تیسری چوتھی دہائی میں، جن شعراء نے غزل کی روایت کو مستحکم کیا ان میں حسرت موہانی پیش پیش تھے۔ غزل کے خلاف جن ناقدین اور نظم گو شعراء) حالی / نظم طبا طبائ عظمت اللہ خاں / کلیم الدین احمد (نے محاذآرائی کی تھی اُن کے استدلال کے پیچھے جو فنّی وجوہ کار فرما تھے اس سے کہیں زیادہ نظم کے ساتھ موافقت کا اندھا جذبہ کار فرما تھا۔ وہ غزل گوئی کو نظم کی مقبولیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھ بیٹھے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایسے نظم نگاروں کو اپنی تخلیقی اہلیت پر اعتبار ہی نہیں تھا لیکن دوسری طرف غزل گو شعراء کو اپنی اہلیت پر ہی نہیں بلکہ غزل کی قوتِ تاثیر پر بھی پورا بھروسہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی غزل گو شعراء نے نظم نگاری کو بے وقعت نہیں گردانا اور نہ ہی غزل کو نظم کے مقابلے رکھ کر ایک کو دوسرے سے برتر یا کم تر ٹھہرایا۔ غزل تہمتوں کے باوجود اپنے تہذیبی و لسانی ڈھانچے کے ساتھ زندہ رہی اور اسے زندہ رکھنے والوں میں حسرت نے جو کارہائے نمایاں انجام دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ ایک ایسا وقت تھا جب غزل آہستہ رَو ہوگئی تھی لیکن اِس آہستہ روی نے ثابت قدمی کے نشانات بھی چھوڑے اور کسی قسم کی مفقود کڑی (Missing Link) کو راہ پانے نہیں دیا۔ حسرت نے اپنی غزل گوئی سے نہ صرف کلاسیکی قدروں کی حفاظت کی بلکہ نئے زمانے کے تقاضوں سے بھی غزل کو ہم آہنگ کیا۔ انہوں نے نہ صرف غزل کا دفاع کیا بلکہ اسے فکری اور فنی اعتبار سے بھی ثروت مند کیا اور اپنے انفرادی شعری تجربوں سے غزل کو نئی تازگی دے کر اس کی آبرو رکھ لی۔

Scanned with OKEN Scanner

اردو شاعری میں عشق کے تصور کی تین جہتیں ہیں۔ عشق کی پہلی جہت وہ ہے جس میں براہِ راست خالق کائنات کے ساتھ خالص عشق کا اظہار ملتا ہے جس کی واضح صورت حمدیہ کلام میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ دوسری جہت تصوف کے وسیلے سے عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کے عنوانات سے غزل کا حصّہ بنا۔ تیسری جہت دنیاوی محبوب کے تصور سے ہم آہنگ ہے۔ عشق کے بارے میں عام تصوّر یہ ہے کہ یہ جذبے کی ارتفاعیت کا نام ہے۔ یعنی وجود کو جذبے میں غرق کر دینے کا نام ہے۔ ہم دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عشق، جذبے میں وجود کے گم ہو جانے کا نام ہے۔ اِس لئے عشق کو ایک وسیع تر کیفیت کا نام دیا گیا ہے جبکہ اس کے مقابلے محبت نسبتاً محدود کیفیت کی حامل ہوتی ہے جس میں ایک خاص فرد کو دوسری خاص ہستی سے پیار ہوتا ہے۔ عشق اور محبت کو انسانی محرکات میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے اس لیے ہمارے بعض شعراء نے عشق اور محبت کو ایک ہی معنی میں استعمال کرکے دونوں کے درمیانی فرق کو ختم کر دیا۔ اردو غزل کے تہذیبی عمل میں عشق اور محبت دونوں کو موضوعاتی طور پر برتا گیا بلکہ اردو شاعری ابتداء ہی سے یہ ایک اہم موضوع کے طور پر شامل رہا۔ اگر کلاسیکی شعری روایت پر نظر ڈالیں تو یہ صاف طور پر نظر آئے گا کہ عشق کا تصور ہجر و وصال، عشوہ و غمزہ، زلف و کاکل، ابرو و مژگاں، وغیرہ تک محدودرہا۔ جدید غزل نے بہت حد تک عشق کے تصور کو بدلنے کی کوشش کی اور اس میں تنوع پیدا کیا۔ جدید غزل کے علمبرداروں میں حسرت کا نام صفِ اول میں آتا ہے ۔انہوں نے اپنے تنقیدی اور سیاسی شعور کے ساتھ شعر وادب کی ذمہ داری بھی بخوبی نبھائی،کانگریس کے علاوہ مسلم لیگ سے بھی جڑے رہے ۔تصوف سے لگاؤ کی وجہ سے ان کی غزلوں میں‌جزبہ عشق دل کش انداز میں‌اور مختلف کیفیات کے ساتھ پایا جاتا ہے۔حسرت نے عشق و محبت کی وارداتوں کو نئے اسلوب میں پیش کیا۔انہوں نے عشق و محبت کے ہر اُس زاویے کو موضوع بنایا جن سے عشق و محبت کی وارداتوں کو نئے اسلوب پیش کیا۔ انہوں نے مختلف قسم کی دلی کیفیتوں کی ترجمانی کی اور اس کے نشیب و فراز کی تصویر کشی کی۔ تاہم اِس بات کا بھرپور خیال رکھا کہ جرأتِ عشق، اخلاقی حدوں کو پار نہ کرے۔ حسرت خود اپنے انداز کی تعریف کرتے ہیں:

شعر در اصل ہیں وہی حسرت

سنتے ہی دل میں جو اتر جائے

اختر اور ینوی نے حسرت کی عشقیہ شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ" حسرت کے تجرباتِ محبت میں بڑی نیرگی، تنوع اور وسعت ہے۔ عالمِ عشق کے جدید زاویے اُس کی شاعری سے روشن ہوتے ہیں۔) "قدر و نظر صفحہ(113

سادگیِ عشق کی سب سے بہتر مثال اُن کی وہ مشہور غزل ہے جسے فلم" نکاح "میں گیت کے طور پر شامل کیا گیا تھا یعنی—

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے

ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

Scanned with OKEN Scanner

یہ پوری غزل اپنی عظمت اور ہمہ گیری کی خود مثال ہے۔ ہر وہ شخص جو وارداتِ حسن و عشق کا تجربہ رکھتا ہے وہ اپنا عکس اِس غزل کے کسی نہ کسی حصّہ میں ضرور پاتا ہے۔ عشق اور محبت کے جذبے میں معصومیت اور محبوب کے تصور میں پاکیزگی کے عناصر کو داخل کر کے حسرت نے اردو غزل کو نئے تجربے اور نئے اسلوب سے ہم کنار کیا۔ اگر بغور دیکھیں تو حسرت، حسن و عشق کا بہت صحیح ذوق اپنے اندر رکھتے تھے۔ اُن کے یہاں جسمانی اور غیر جسمانی کے درمیان کوئی تفاوت نہیں تھا۔ انور سدید نے درست لکھا ہے کہ

" انہوں(حسرت)نے حقیقی پردہ دار عورت کو غزل میں محبوب کا درجہ دیا اور جذباتی محبت، دیانت داری اور وفا شعاری کا چلن پیدا کیا" ۔(اردو کی مختصر تاریخ صفحہ352)

نہ بھولے گا وہ وقت رخصت کسی کا
مجھے مڑ کے پھر اک نظر دیکھ لینا
وہ شرمائی صورت وہ نیچی نگاہیں
وہ بھولے سے اُن کا اِدھر دیکھ لینا

حسرت نے ایک جگہ تصوف پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ" میں تصوف کو مذہب کا جوہر سمجھتا ہوں اور تصوف کا ماحصل میرے نزدیک عشق ہے۔ "میں سمجھتی ہوں کہ یہی وہ جذبۂ عشق ہے جو اُن کی شاعری میں بنیادی مرکز و محور بنا ہے۔ اُن کی زندگی پر گہری نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ وہ کس قسم کے ذہنی تضادات کے شکار تھے۔ اُن کی طبیعت میں ضد کا عنصر بھی تھا۔ ایک قسم کے باغیانہ جذبے سے بھی سرشار تھے۔ اس قسم کی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اُن کی زندگی کو ناکامی کی طرف لے گئیں۔ مزاج کے اُتار چڑھاؤ نے کبھی انہیں کسی ایک موقف پر قائم نہیں رہنے دیا۔ جو چیز اُن کی زندگی کا المیہ بنی، وہ اُن کے جذبۂ عشق سے ہم آہنگ ہوگئی اور اسی متضاد کیفیتوں کی ہم آہنگی نے اُن کی غزلیہ شاعری کو دو آتشہ بنا دیا اور وہ حسن و عشق کے تجربات کو دلکش شعری پیکر عطا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حسرت کے جن اشعار میں عارفانہ رنگ گہرا ہے وہ عشق کے حقیقی اور مجازی دونوں صورتوں کے حسن کو بڑھاتا ہے۔

تم پر ٹے تو زندۂ جاوید ہوگئے
ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد
دیکھو جسے ہے راہِ فنا کی طرف رواں
تیری محل سرا کا یہی راستہ ہے کیا

Scanned with OKEN Scanner

حسرت کی عشقیہ شاعری میں جو قوتِ تاثیر ہے وہ اُن کے تصورِ عشق کو پامال نہیں ہونے دیتا۔ اُن کے اظہارِ عشق میں احتیاط رکھ رکھائو اور پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے اُن کی شاعری میں محبت اور محبوب کا تصور معیاری ہے اور عریانیت سے پاک ہے۔ وزیر آغا نے اِن کے تصورِ عشق کی انہیں خوبیوں ے سبب لکھا ہے کہ

" انہوں(حسرت)نے غزل میں زمین پر ننگے پائوں چلنے کی روایت قائم کی۔) "اردو شاعری کا مزاج صفحہ(276

حسرت کے تصورِ عشق کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ انہیں شری کرشن جی سے بڑی عقیدت تھی۔ حسرت کو قریب سے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ وہ جنم اشٹھمی کے موقع پر متھرا ضرور جاتے تھے۔ شری کرشن کا گوپیوں سے عشق، اُن کا بانسری بجانا، ورنداون کے خوبصورت مناظر اور دریائے جمنا کی سبک خِرامی، وہ محرکات ہیں جن سے حسرت نے گہرا اثر قبول یا۔ اگر مذکورہ محرکات کو حسن و عشق کی علامت خیال کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی یہ رواداری عشق کے عالمگیر تصور ہی کو ظاہر کرتی ہے۔ حسرت کا موضوعِ سخن چوں کہ عشق تھا اس لیے آگہی کا ذریعہ بھی وہ عشق ہی کو سمجھتے تھے اور شری کرشن کو وہ عشق کی ایک علامت قرار دیتے تھے۔

متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا
دم بھرتی ہے آرزو اُسی کا
ہر ذرّۂ سَرزمینِ گوکل
دارا ہے جمالِ دلبری کا
بَرسَانہ وہ نندگائوں جاکر
دیکھ آئے ہیں جلوہ ہم کسی کا
پیغامِ حیاتِ جاوداں تھا
ہر نغمہ کشن کی بانسری کا
وہ نورِ سیاہ تھا کہ حسرتؔ
سر چشمہ فروغِ آگہی کا

رشید احمد صدیقی نے حسرت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کئی اعتبار سے درست معلوم ہوتا ہے کہ

Scanned with OKEN Scanner

''حسرت کے یہاں عشق کا تصوّر اتنا مجرّد نہیں ہے جتنا مُشخّص یا مجازی۔ ''یا'' حسرت کا عشق گھریلو ہے بازاری نہیں، انسانی ہے خانقاہی نہیں، مجازی ہے ماورائی نہیں''۔ (کچھ حسرت کے بارے میں، کلیاتِ رشید احمد صدیقی، جلد چہارم، حصہ دوم، صفحہ84-183 ۔)

اس لئے حسرت کے یہاں معشوق کا جو تصور ہے وہ فرضی اور روایتی معشوق کے تصور سے الگ نظر آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کا معشوق مشرقی روایت کا پیکر ہے جس میں حسن، حیا، سادگی، گھریلو پن اور وقار موجود ہے۔ حقیقی اور دنیاوی معشوق کے کردار کو حسرت نے جس اعتبار سے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے وہ خود اُن کی شائستہ مزاجی کا پتہ دیتے ہیں۔ اُن کی نرم گفتاری، بیان کی سادگی، خفا ہونے کا انداز، روٹھنے اور مان جانے کی ادا، جذبۂ ایثار، احترامِ آدمیت، وغیرہ سے نہ صرف اُن کے عشقیہ تصور کا نقش واضح ہوتا ہے بلکہ معشوق کے کردار کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔

دلِ مایوس بھی عجب شئے ہے
پھر اُسی کا خیال کرتا ہے

وہ بگڑا بھی کبھی مجھ سے تو منّے کے لیے
یاد ہے انداز تیرے جَورِ لطف آمیز کا

ملتے ہیں اِس ادا سے کہ گویا خفا نہیں
کیا آپ کی نگاہ سے ہم آشنا نہیں

وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ آغازِ محبت ہیں
نہ چالاکی تجھے اے شوخ آتی تھی نہ عیّاری
ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی اُن کا
جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی

وہ جرمِ آرزو پر جس قدر چاہیں سزا دے لیں
مجھے خود خواہشِ تعزیر ہے ملزم ہوں اقراری

حسرت عشق کے میدان میں بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ غم اٹھانے کو تیار رہتے ہیں اور قربان ہو جانے کے لیے بھی۔ عشق اور محبوب کے جس نئے تصور کو حسرت نے اردو غزل میں رواج دیا وہ عام زندگی کے تجربوں سے

Scanned with OKEN Scanner

بہت قریب تھا۔ اُن کی غزلوں میں عشقیہ خیالات کا یہ انداز اور اسلوب کی سلاست اور روانی، اُن کی غزلوں میں مٹھاس اور معنی خیزی پیدا کرتی ہے۔ قاری کے ذہن و دل کو ایک نئی تازگی بخشتی ہے جس سے قاری خود اپنے تجربوں میں حسرت کو اور حسرت کے تجربوں میں اپنے آپ کو یکساں محسوس کرنے لگتا ہے۔ محبت اور غم کے جذبے کو ہم آہنگ کرکے حسرت نے اپنی غزل گوئی کو منفرد بنا دیا۔ عشق اور محبت تصور کی بازیابی میں حسرت نے جس قسم کے جذبات، قلبی واردات، جوش و شوق، لطافتِ بیان، والہانہ شگفتگی، نزاکت اور بانکپن کا اظہار اپنی غزلوں میں کیا اُن سے جدید غزل کو ایک نئی سمت اور نئی زندگی ملی۔ اردو غزل کے عشقیہ تصور میں مذکورہ تغیرو تبدّل اور تجدیدو تجربے کے لیے حسرت ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

اردو ادب میں مصنوعی ذہانت کا استعمال: دیگر فوائد و ثمرات

ڈاکٹر فضیلت بانو

ایسوسی ایٹ پروفیسر

منہاج یونیورسٹی لاہور

Abstract: Artificial Intelligence is a set of technologies that enable coumputers to perform a variety of advanced functions including the ablelity to see understand and translate spoken and written language analyze data make recommendation, and more Al is the back bone of innovation in modern computing, unloking value for individuals and businesses, Artificial intelligence is a field of science concerned with cumputers and machines. Alis a broad field that encompasses many different disciplines, including computer science, data analytics and statistics liguistics, and even philosophy and psychology. This article highlights the benefits of Al. Al can automate work flows and processes or work independently and autonomously from a human team. Al can help automate aspects of cybersecurity by continuously monitoring and analyzing network traffic.

ہم اپنے ارد گرد بے شمار چیزیں ایسی دیکھتے ہیں جو اصل کی طرح ہوتی ہیں مگر اصل نہیں ہوتی، اصل کی نقل ہوتی ہیں یا اصل کے قریب ہوتی ہیں۔ جیسے آسٹر وٹرف یعنی مصنوعی گھاس جو اس قدر کار آمد ہے کہ اسے کھیل کے میدان میں اصلی گھاس کی طرح ہی استعمال کیا جاتا ہے اور اس پر پیچ تک کھیلے جاتے ہیں۔ اسی طرح میڈیکل کے شعبے میں مصنوعی اعضا بہت کامیابی سے کام کر رہے ہیں یہاں تک کہ مصنوعی مشینی دل بھی آچکا ہے اور کام بھی کر رہا ہے۔ انسان نے مصنوعی چیزوں کے ساتھ ساتھ اب مصنوعی ذہانت کا بھی بہت کامیاب تجربہ کر لیا ہے اور ابتدائی طور پر اس میں اتنی کامیابی حاصل کر لی ہے کہ

Scanned with OKEN Scanner

اب مصنوعی ذہانت کو کسی بھی بڑے منصوبے اور شعبے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۳۵ء سے پہلے کسی کو معلم بھی نہ تا کہ کمپوٹر اور پر کمپیوٹر کیا چیز ہوتی ہے لیفٹیننٹ کرنل غلام جیلانی خان لکھتے ہیں:۔

" مصنوعی ذہانت ایک نئی اصطلاح ہے اور آہستہ آہستہ وائرل ہو رہی ہے۔ لیکن ہم مشرق کے مکین مسلمانوں کی یہ بہت بڑی بھول ہے کیوں کہ اسی مشرق میں جاپان چین، ساؤتھ کوریا، ویت نام، ملائشیا اور تائیوان بھی تو شامل ہیں۔ وہاں ایک عرصہ سے ٹیکنکل روبوٹوں سے کام لے کر بھاری اور درمیانی درجے کے ہتھیار پروڈیوس کیے جا رہے ہیں۔ وہاں کار سازی، ترک سازی ترین سازی، آبدوز سازی، میزائل سازی اور ڈرون سازی کے لیے انسانی ذہانت کی جگہ مصنوعی ذہانت سے کام لیا جا رہا ہے۔ ان مشرقی کا خانوں میں بھی اب انسان بہت کم اور روبوٹ زیادہ نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں انسانی آبادیاں کم ہیں۔ 1

۱۹۵۰ء کے اوائل میں مشینی سوچ کا آغاز ہوا۔ سائنسدانوں نے انفرادی طور پر سائبر ٹیکس، آنومینا تھیوری اور انفارمیشن پروس پر بہت کام کیا۔ ۱۹۵۶ء میں ہونے والی ڈاٹ ماؤتھ کانفرنس میں ڈاکٹر جان میک کارتھی نے سائنسدانوں کے تمام کام کو اکٹھا کرنے کا آئیڈیا پیش کیا جس کو آرٹیفیشل انٹیلی جنس کا نام دیا گیا۔

تھا جو درجنوں حسابی عمل اور ڈیٹا کو حل کر سکتا تھا (Logic Theorist) پروگرام AI دنیا کا پہلا

اور اس پروگرام کو بھی اس کانفرنس میں لکھا گیا۔

مصنوعی ذہانت کمپیوٹر سائنس کا ایک ذیلی شعبہ ہے جس میں ذہانت اور فہم و فراست سیکھنے اور صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے بارے میں رہنمائی مل سکتی ہے۔ عہد حاضر میں مصنوعی ذہانت کے بارے میں بہت کچھ سننے اور پڑھنے کو مل رہا ہے۔ مصنوعی ذہانت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں ہم کمپیوٹر سافٹ ویئرز کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ کسی بھی قسم کی صورت حال کے مطابق خود سے بہتر فیصلہ کر سکیں۔ اس طرح مصنوعی ذہانت سے بہت سے فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم مصنوعی ذہانت کی ابتدائی شکلوں پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انٹرنیٹ، لیپ ٹاپ، موبائل فون، گیٹ اور دروازوں کا آواز اور جس سے کھلنا، ویٹر روبوٹ، شیف روبوٹ تعلیمی میدان میڈیکل کا شعبہ کسٹمر کیئر اور دیگر صنعتی شعبہ جات ہر جگہ مصنوعی ذہانت کا استعمال ہو رہا ہے۔ میڈیکل کے شعبے میں مصنوعی ذہانت کا استعمال حساس نوعیت کے کیسز میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔

۲۰۰۴ء میں جب انٹرنیٹ کی سہولت عام نہ تھی پاکستان ٹیلی کمیونی کیشن کے ٹیلیفون کی تار کمپیوٹر کے لگا کر نیٹ استعمال کیا جاتا تھا دیگر سافٹ ویرز معلومات اور فلموں کے لیے سی ڈیز میسر ہوتی تھیں۔ پھر ایک سافٹ ویئر ٹاک ود الیزا

(Talk with Eliza)

آیا اس میں ایک مصنوعی انگریز خاتون الیز کمپیوٹر سکرین پر موجود ہوتی، جو بات کرتی، مشورے دیتی اور پوچھے گئے سولات میں دلچسپی کا اظہار کرتی۔ الیزا ایک کمپیوٹر پروگرام تھا جس میں انسان اور کمپیوٹر کے مابین فطری زبان میں بات چیت کو ممکن بنایا گیا تھا۔ یہ الیز اسافٹ ویر مصنوعی ذہانت کے ذریعے

Scanned with OKEN Scanner

انسانوں سے گفتگو کرتا تھا۔ یہ مصنوعی ذہانت کے نمونوں میں سے ایک تھا۔ اگر ہم دنیا کے کسی ایسے خطے میں رہتے ہوں یہاں کتابیں، ملکی اور غیر ملکی رسائل و جرائد تعلیمی اداروں کا فقدان اور لائبریریاں ناپید ہوں، جدید تعلیم وتدریس سے آگاہی کم ہوں۔ تو ایسی صورت میں ٹیکنالوجی کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ آن تعلیم و تحقیق کے لیے مصنوعی ذہانت کی بہت سی ایپلی کیشنز موجود۔ جو گفتگو کر سکتی ہیں سوالات کے جوابات دے سکتی ہیں اور زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں معلومات دے سکتی ہیں تحریر اور تقریر دونوں طرں معاون ہوتی ہیں۔ موجودہ گلوبل ولیج کے دور میں مصنوعی ذہانت اور اسکے چیٹ بوٹس تیسری دنیا کے عملے کے لیے بھی نے نہیں ہیں۔ مصنوعی ذہانت کی ایپلی کیشنز نہ صرف بات سمجھنے اور اس کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں بلکہ زبان وادب کی ایسی بہت یں کی خوبیوں سے متصف ہیں جن کی اردو زبان وادب اور اردو داں طبقے کو اب ضرورت ہے۔ مصنوعی ذہانت کے حوالے سے یہ سوچا جاسکتا ہے کہ کیا یا روزبان وادب کی تشریح وتوضیح کی بہتر طور پر صلاحیت رکھتی ہے۔ مصنوعی ذہانت اور تحقیق کے حوالے سے دیکھا جائے تو وہاں . اردو میں تحقیقی مواد نہ ہونے کے سبب زیادہ تر ہمیں انٹرنیٹ پر پھیلا ہوا مواد ہی ملتا ہے۔ اس کے باوجود مصنوعی ذہانت تحقیقی موضوعات سے متعلق بہترین راہنمائی اور عد تحقیقی خاکے مہیا کرتی ہے۔ جس سے تحقیقی میں آگے بڑھنے میں مدملتی ہے۔ البتہ مصنوعی ذہانت کے مہیا کردو متن کے حوالہ جات کا کوئی رائج شدہ طریقہ اردو زبان ادب میں نہیں ملتا اور نہ ہی کوئی طے شدہ ضابطہ تاحال سامنے آیا۔ اس کے حل کی ایک صورت یہ نظر آتی ہے کہ دنیا بھر میں مختلف شعبہ جات میں اب تک ہونے والی تحقیقات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ جس میں مصنوعی ذہانت کے حوالہ جات شامل ہوں۔

" ریسرچ گیٹ ایسی دنیا کے سب سے بڑے تحقیقی فورم (ویب سائٹ) پر اب ایسے بہت سے مقالات دیکھے جاسکتے ہیں جن میں جن میں محققین وناقدین مصنوعی ذہانت کے اشتراک سے تحقیق کرتے ہوئے اس کا نام چیٹ جی پی ٹی اور گوگل بارڈ رجنی کو اس بارڈر محققین کی فہرست میں شامل کرتے ہیں۔ اس طریق کار کو اردو تحقیقین بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن اس ضمن Manual)(APA Research میں عالمی تحقیق مینوئل
اور ہائر ایجوکیشن کی اجازت درکار ہوگی۔"

مصنوعی ذہانت ہر طرح کا متن تخلیق کرنے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہے۔ یہ پلاٹ، کردار اور منظر تخلیق کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ البتہ شاعری اور افسانوی نثر میں یہ صلاحیت ابھی بالکل ابتدائی سطح کی ہے۔ جبکہ غیر افسانوی نثر میں مصنوعی ذہانت بہترین کام کر رہی ہے۔ اردو زبان وادب کے صارفین کی ایک کثیر تعداد انٹرنیٹ استعمال کرتی ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو زبان وادب کے حوالے سے مصنوعی ذہانت استعمال کرنے کی باقاعدہ تربیت کا اہتمام کیا جائے اور گرائمر، رصرف ونحو اور املا کے مسائل بھی حل کر لیے جائیں۔ انغلاط سے بچنے کے لیے ہم آواز الفاظ اعراب کے ساتھ لکھے جائیں۔ مصنوعی ذہانت کی شعری تخلیقات کی بے وزنی اور غیر سنجیدگی کم کرنے کے لیے عروض کے الگورتھم کو سیکھا جاسکتا ہے۔

" مصنوعی ذہانت نے ایسے ریاضیاتی کیسے اور الگورتھم ایجاد کیے ہیں جن کے تحت تخلیق کے عمومی معیارات و نظریات میں تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ زبان کے بہت سے نظریات جن میں سوسئیر، رولنڈ بارتھیز اور جولیا کرسٹوا ایسے معروف نظریہ سازوں کے نظریات بھی شامل ہیں۔ مشینی تخلیق کاری کی صلاحیت کے مقابل نئے امکانات واستفسارات کا سامنا کر رہے ہیں۔ اس سلسلے

Scanned with OKEN Scanner

میں ان نظریات کی تردید وتائید کے لیے نئے مباحث قائم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ لسانیات کے
دامن میں بھی وسعت آئے۔"

تحقیق اور تحقیقی اعتبار سے مصنوعی ذہانت کی موجودہ ترقی بلاشبہ تیز رفتاری کی انتہاؤں کو چھورہی ہے۔ مصنوعی ذہانت کا ذخیرہ الفاظ اور یاداشت انسانی دماغ سے کہیں زیادہ ہے اور متن کی تشریح وتوضیح کی صلاحیت انسانی سوچ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ مصنوعی ذہانت بین العلوم تحقیق اور ترجمہ نگاری میں بھی انسانی صلاحیتوں سے کہیں آگے بڑھ چکی ہے۔ تخلیق تحقیق تنقید اور لسانیات میں بھی معاونت وراہنمائی کے لیے اس میں بہت وسعت ملتی ہے۔اس سے تخلیق کیے جانے والے ادب کو انسانی مشینی ادب کا نام دیا جاسکتا ہے۔ مصنوعی ذہانت اردو کے علاوہ دیگر ایشیائی زبانوں میں بھی معاون ہے۔اردو کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں ہیں بھی نظمیں منزلیں اور مضامین حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ بلاشبہ مصنوعی ذہانت اپنی تحریروں میں ادبی الفاظ کی مدد سے زبان، ذہانت تخیل اور حقیقت کو بیان کرسکتی ہے۔

مصنوعی ذہانت انسانوں سے زیادہ باصلاحیت اور طاقتور ہوسکتی ہے۔اس کے اندر جو بھی ڈیٹا فیڈ کر دیا گیا ہو اس کے مطابق ہم اس سے اپنی ضرورت کے مطابق مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ آج انسان ایک ایسے عہد میں قدم رکھ چکا ہے۔ یہاں ٹیکنالوجی جدید ترقی کے کئی مراحل طے کر چکی ہے۔انسان کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت جس طرح چاہے ٹیکنالوجی سے مدد لے سکتا ہے۔ جدید کمپیوٹر کا خودکار نظام انسانی مدد اور سہولت کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے اس ساری صورت حال میں اگر یہ کہا جائے کہ انسان کی اپنی صلاحیتیں اور قوت دن بدن محدود ہوتی جارہی ہیں۔ تو غلط نہ ہوگا۔

مصنوعی ذہانت کے بہتر استعمال کے لیے ۲۰۲۳ء میں اس پر اٹھانوے ارب امریکی ڈالر کی سرمایہ کاری کر کے اسے انسانوں کے لیے زیادہ موثر اور فعال بنایا جارہا ہے۔ یہ ایپلی کیشن ہماری بات سمجھتی بھی ہیں اور جواب دینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔اس کے علاوہ زبان دانی کی بہتر صلاحیتوں سے بھی متصف ہیں۔

تعمیرات کا شعبہ ہو، زراعت صنعت و حرفت بافت سازی ظروف سازی، لیدر یا پلاسٹک میکنگ غرض کہ مشینی ہاتھ ہمیں ہر وقت اور ہر جگہ دستیاب ہیں۔ تعلیم، بینکنگ، میڈیسن، ٹرانسپورٹ اور تمام دیگر شعبہ جات پوری طرح نہیں تو بہت حد تک وتخلیلائزد ہو چکے ہیں۔ میڈیکل کے شعبے میں معمولی تکلیف سے لے کر پیچیدہ امراض ٹرانسپلانٹیشن انجیو گرافی سٹی سکین، باسیاسی، آؤپسی اور سرجری کا مشکل عمل بھی ٹیکنالوجی نے آسان بنادیا ہے۔دل کے امراض کی تشخیص، دل کی وینز کی سرجری، دل کی ٹرانسپلانٹیشن اور دل کی رگوں میں خون کی روانی کو برقرار رکھنے میں مصنوعی ذہانت کا کردار قابل ستائش ہے۔ میڈیکل کے شعبے میں مصنوعی ذہانت نے امراض کی تشخیص کے بعد علاج کو پہلے کی نسبت بہت آسان بنادیا ہے۔ ہسپتالوں میں اس کا استعمال مریض کی نگرانی، دوائیوں کا صحیح استعمال، نتائج کا درست تجزیہ رپورٹس کا ڈیٹا اکٹھا کرنے اور علاج کے جدید طریقے اخذ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

میڈیکل کے شعبے کی طرح سپورٹس اور کھیلوں کے میدان میں گیمز، ریسلنگ، فائٹنگ میں مصنوعی ذہانت کا استعمال باقاعدگی سے ہورہا ہے۔اس طرح مصنوعی ذہانت کا استعمال بینکنگ میں آن لائن دھوکہ دہی ختم کرنے، ادائیگیوں کے نظام کو بہتر بنانے اور منی لانڈرنگ کے فراڈ کو روکنے میں مدد کرتا ہے۔ چھوٹی بڑی تمام کارپوریشنوں اور حکومت کا اپنا حساس ڈیٹا ڈیجیٹل فارمیٹ میں محفوظ. ہوتا ہے جسے سائبر حملوں اور چوری کا ہر وقت اندیشہ ہوتا

Scanned with OKEN Scanner

ہے۔ یہ بہت کار آمد ڈیٹا ہوتا ہے۔ اس کی حفاظت بہت ضروری ہوتی ہے۔ مصنوعی - ذہانت کے ذریعے اس میں بے ضابطگیوں کا فوری پتا لگا کر حملہ آوروں اور چوروں سے بچایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح گھروں میں عام طور پر استعمال کے لیے ورچوئل اسسٹنٹس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ آواز کی شناخت کا سافٹ ویئیر ہوتا ہے۔ گوگل اور ٹیسلا کی سیلف ڈرائیونگ کاروں کے عالاوہ ریستورانوں اور ہوٹلوں، گھروں اور ہوٹلوں میں بھی روبوٹ کام کر رہے ہیں ۔ یہاں وہ رپورٹ کی تیاری بھینس اور آلات کو کنٹرول کرنے کے کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح انسانی جانوں کی حفاظت جیسے کام مثلاً ہم کو ناکارہ بنانا، آنے والے خطرے سے بروقت آگاہ ہونا وغیرہ میں بھی مصنوعی ذہانت سے کام لے سکتے ہیں۔ حقیقت میں تو یہ سب انسانی محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے

"ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی آٹو گیمز بھی مصنوعی ذہانت ہی کا حصہ ہیں سوچ بچار، گہری منصوبہ
بندی اور چالاکی پر مشتمل تیم خطرنج میں بھی آرٹیفیشل انٹیلی جنس نے عالمی چمپین کو مات دے رکھی
ہے۔"

مصنوعی ذہانت سے یہ توقع کی جارہی ہے کہ آنے والے وقت میں یہ ڈیجیٹل نظام بالکل آزاد صلاحیت کا حامل ہوگا اور اس کے کنٹرول کی قوت زیادہ طاقتور ہو جائے گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ شعبہ حیات میں انسانی عمل دخل کی راہیں محدود ہوتی جارہی ہیں۔ ٹیکنالوجی جیسے جسے خود انحصاری اور خود کاری کی طرف بڑھے گی انسانی صلاحیتیں اور قوتیں اتنی ہی محدود ہوتی جائیں گی اور انسان محنت اور مشقت سے آزاد ہوتا جائے گا۔ اس کے لیے سب کام مشینیں کریں گی۔ آنے والا دور مکمل مشینی ثقافت اور ٹیکنالوجی کی تہذیب کا دور ہوگا۔ دراصل انسان ایک نئی تہذیب کی طرف سفر کر رہا ہے۔ ایسی تہذیب یہاں انسان اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ٹیکنالوجی کا نلام ہوتا جائے گا

آٹو موبائل کی صنعت میں موبائل کی میکنگ کا تمام کام روبوٹ کرتے ہیں۔ اب تو سیلف ڈرائیونگ کمر بھی مصنوعی ذہانت کے تحت چلنے لگی ہیں اور اس طرح جہاز بھی بغیر پائلٹ کے اڑنے اور لینڈ کرنے لگے ہیں۔ شدید موسموں میں جہازوں کو متوازن رکھنے میں مصنوعی ذہانت اعلی صلاحیت کا کردار ادا کرتی ہے۔

انسان ایک مصنوعی دنیا کی تعمیر کر رہا ہے۔ جس میں ایسا مصنوعی انسان کام کرے گا جو گفتگو کی صلاحیت بھی رکھتا ہوگا، سوچ اور خیال کی دنیا سے بھی منظم طور پر وابستہ ہوگا۔ وہ انسانوں سے مکالمہ بھی کرے گا اور سوال و جواب کی صلاحیت بھی رکھتا ہوگا۔ آہستہ آہستہ مصنوعی ذہانت انسانی استعمال کے تمام شعبوں کو تبدیل کر دے گی۔ ہمارے پیداواری نظام، مواصلات، رسل رسائل اور تعلیمی نظام مکمل طور پر مضنوعی ذہانت پر انحصار کرنے لگے گا۔ ترقی یافتہ تمام ممالک اپنے دفاعی اداروں فضائی، بحری اور بری فوج کے شعبوں میں مصنوعی ذہانت سے مدد لے رہے ہیں اور اپنے تمام ہتھیاروں کو اس جدید ٹیکنالوجی سے لیس کر چکے ہیں۔ ہمارا ملک بھی اپنے دفاع کے لیے HAI رون بنانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔

وفاقی اداروں میں AL بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے جس میں Air Defence
system" دشمن کے جہاز کو نشانہ بنانے کے لیے اور Loutering Munitions جو
بادلوں میں چھپے ہوئے اور بادلوں میں چھپ کر مخصوص فاصلوں سے دشمن کے ٹھکانے کو نشانہ بنا

Scanned with OKEN Scanner

سکتا ہے اور Sentry Weapons جو کہ بارڈر کے قریب نصب ہوتی اس میں کیمرہ اور
تھرمل امیج کی مدد سے دشمن کو نشانہ بنا سکتی ہے۔"

مصنوعی ذہانت ایک ایسی سہولت ہے کہ انسان آہستہ آہستہ اس کا عادی ہو جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہم آج گوگل ایپ پر انحصار کرنے لگے ہیں۔ تیزی سے ترقی کرتا اور بڑھتا ہو یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس کے اثرات زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

فوری مطلوبہ نتائج اور وقت کی بچت نے انسانی ذہن کو بہت حد تک سہل پسند بنا دیا ہے۔ مصنوعی ذہانت کے فوائد کو دیکھتے ہوئے۔ مستقبل میں اس کے بارے میں جاننا اور سیکھنا ایک بہتر عمل ہو گا۔ عالمی اقتصادی فورم اور اسی طرح کی بین الاقوامی تنظیمیں مصنوعی ذہانت کے کردار اور اہمیت پر بات چیت کو فروغ دینے میں آگے آگے رہی ہیں۔ مصنوعی ذہانت کی ملٹری اپلی کیشنز اور خاص طور پر کمندید ریانی اور ورچوئل راپلٹی نے دفاعی سرگرمیوں اور حکمت عملیوں انقلاب برپا کر دیا ہے اور ٹیکنالوجیز اور اسٹراٹیجک فوائد بتانے میں پیش پیش ہے۔ ماحولیاتی استحکام کے نظام میں ایندھن کے متبادل تیار کرنے میں مصنوعی ذہانت کی ٹیکنالوجیز کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ متبادل ایندھن کی ایجاد کے لیے بڑے پیمانے پر ڈیٹا سٹیٹس کا تجزیہ کر کے مصنوعی ذہانت قابل استعمال توانائی پیدا کرنے کے طریقوں سے روشناس کروا سکتی ہے۔ مصنوعی ذہانت ایسے طریقوں کی بھی نشاندہی کر سکتی ہے جس سے موسمیاتی تبدیلیوں سے بروقت آگاہ ہوا جا سکتا

چند سیکنڈ میں مفید معلومات حاصل کرنے اور مطلوبہ مواد کی فراہمی کے لیے چیٹ جی پی ٹی 4 کی صلاحتیں حیرت انگیز ہیں جو بہت تیزی سے مصنوعی ذہانت کے شعبہ میں کام کر رہی ہے اور لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہی ہے۔ اس کو استعمال کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ تیزی سے ترقی کرتا اور بڑھتا ہوا ایک ایسا شعبہ ہے جس کے اثرات زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اب یہ کہا جا رہا ہے کہ اس کی تیز رفتار ترقی آنے والے زمانے اور انسان کے لیے ایک بہت بڑے نقصان کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔ ڈاکٹر جیلری مسمن کہتے ہیں:

"ایسا نظام بنانا جو انسانی ذہانت کا مقابلہ کرے یا اس سے آگے نکل جائے نسل انسانی کے لیے تباہ کن
ہو سکتا ہے۔"

مشہور برطانوی سائنسدان اسٹیان ہاکنگ کہتے ہیں:

مصنوعی ذہانت سے انسانیت کو شدید خطرات لاحق ہیں مکمل مصنوعی ذہانت
کی ترقی نسل انسانی کا خاتمہ ایک چنگی میں کر سکتی ہے؟۔

ان سب اندیشوں اور خطرات کے باوجود یہ شعبہ دن رات ترقی کر رہا ہے۔ مصنوعی ذہانت کے تقریبا پچاس قسم کے مصنوعی نواز مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ جس میں ہارڈ اے آئی، جنگ اے آئی ڈیالوجی پی ٹی رسا کرٹینک، چیٹ سونک جیسپر چیٹ، لیمنڈا اور دیگر ٹوٹر شامل ہیں۔ اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے گوگل بھی اپنے سرچ انجن کی بہتری کے ساتھ ساتھ جدید نول بنانے کی تیاری کر رہا ہے۔ جو مکمل طور پر مصنوعی ذہانت پر انحصار کرے گا۔ اس طرح مائیکروسافٹ نے بھی ایک نیا بنگ سرچ انجن بنایا ہے جو کو پائلٹ کے نام سے معروف ہوا ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

مصنوعی ذہانت کے سارے نظام اپنے طور پر کام کرتے ہیں اور انسانوں کو شامل کیے بغیر خود فیصلے کر سکتے ہیں۔ مصنوعی ذہانت سے ہر طرح کے ہتھیار بنائے جاسکتے ہیں۔ ہر طرح کے اور ہر شعبے کے لیے روبوٹ بنائے جاسکتے ہیں۔ انسانی دخل اندازی کے بغیر فوجی اپریشن ترتیب. دیے جاسکتے ہیں۔ مصنوعی ذہانت تیار کیے گئے قول ڈرون پہلے کی نسبت زیادہ کامیابی سے کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض ڈرون ایسے بھی ہیں جو ایک ہی وقت میں سو سے زیادہ اہداف کو نشانہ بنا سکتے ہیں اور یہ ایسے ڈرون ہیں جو فوری طور پر خود مختاری سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

اب ایسے ڈرون بھی تیار کیے جاچکے ہیں جو چہروں کو باآسانی شناخت کر سکتے ہیں ایک بڑے ہجوم میں سے مطلوبہ انسان کو شناخت کرنا اب ڈرون کے لیے مشکل نہیں رہا۔ یہ اعلی قسم کی ذہانت کی خاص ٹیکنالوجی سے بنائی کی مشینیں ہیں اور بہت تیزی اور جلدی سے اپنی صلاحیت میں خود سے بھی اضافہ کر سکتی ہیں۔ یہ اپنی ذہانت میں بے پناہ اضافہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ آنے والے دور میں مشینیں انسان سے زیادہ ذہین ہو جائیں گی۔ ان مشینوں کی یہ ذہانت ہمیں اپنی انڈسٹریز بہتر بنانے میں مدود میں کی وصنعت و حرفت میں وسیع پیمانے پر کام میں بہتری اور پیداوار میں اضافے کا سبب بنیں گی لہذا انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس نظام کو بڑی ذمہ داری کے ساتھ محفوظ بنائیں تاکہ ہم مصنوعی ذہانت کے ان فوائد و ثمرات کے ساتھ ساتھ نقصانات سے محفوظ رہیں۔ اور یہ کام اقوام اور ممالک مل کر بہتر بنا سکتے ہیں۔

اس مصنوعی ذہانت پر انحصار اور اس کے استعمال کے حوالے سے بہت سے اندیشے اور سوالات سر اٹھا رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود مصنوعی ذہانت کے فوائد و ثمرات سے انکار ممکن نہیں۔ شعبہ تعلیم اور شعبہ مالیات میں بھی اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ ٹرانسپورٹ اور نقل و حمل کا شعبہ اس جدید ٹیکنالوجی سے بہت فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مصنوعی ذہانت کی بدولت زندگی کے ہر شعبے انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ اس وقت انسانیت سب سے زیادہ صحت کے مسائل سے دوچار ہے۔ مصنوعی ذہانت کا استعمال صحت و تندرستی کے میدان میں بہت امید افزا ہے۔ کیوں کے اس کے ذریعے بیماریوں کی درست اور فوری تشخیص ہو سکتی ہے۔ مصنوعی ذہانت سے مریضوں میں انفرادی طور پر ان کی میڈیکل ہسٹری اور جنیاتی تشخیص کر کے انفرادی علاج کی منصوبہ بندی کر سکتی ہے

حوالہ جات

1۔ غلام جیلانی خاں مستقبل کی دنیا اور مصنوعی ذہانت مشمولہ، روزنامہ پاکستان، ۱۷ اگست ۲۰۲۳ پس ۴

2۔Qualitance-com-short-history-artificial-intelligenc

3۔Short-history-of- artificial-intelligence-making mythology-a-reality

4۔Edr-magazine-eu-new Loitering munitions -from ia

5۔ ڈاکٹر جیفری ہنٹن، انٹرویو، بی بی سی کیم مئی ۲۰۲۳ء

6۔ اسٹیفن ہاکنگ، انٹرویو بی بی سی ۲۰۱۴ء

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

متن میں ترامیم اور تبدیلیاں : نوعیت اور وجوہات

پروفیسر ڈاکٹر محمد خاں اشرف،

ڈاکٹر عظمت رباب،

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی لاہور

Abstract: Changes, alteration, conversions and perversion of the texts of ancient manuscripts and books is unavoidable. It always occurs in the due course of time because it is in the nature of texts when these come into contact with the dimensions of time, space, people, copying and printing processes. Every society has always maintained a standard procedure to either avoid these factors or to correct them when the changes occur. This is the essence of the science and art of Tadveen e Matn. In this article Dr. Muhammad Khan Ashraf and Dr. Azmat Rubab have pointed out the various causes and reasons which unavoidably cause changes in the texts.

متون میں تبدیلیاں ہونا، ہو جانا یا کر دیا جانا ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس سے فرار یا انکار ممکن نہیں ، علم و ادب کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ متن میں تبدیلی ایک ناگزیر امر ہے (۱)۔ اس سے بچاؤ کا صرف ایک طریقہ ہے: مسلسل احتیاط، تحقیق، تقابل اور تدوین۔ یہ تبدیلیاں ہر قسم کے متون میں پائی جاتی ہیں ۔ مذہبی متون میں تبدیلیاں ہونا یا کر دیا جانا مذہبی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ قرآن پاک کو اس قسم کی تبدیلیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے، جو کہ دیگر مذاہب کے صحیفوں میں پائی جاتی تھیں، خاص طریقہ وضع اور اختیار کیا گیا اور اسے ایک معجزہ قرار دیا گیا (۲)۔ اس کی تاریخ کا مطالعہ ہی ہمیں تدوین کی ضرورت، اہمیت اور ادب کے علاوہ باقی علوم و فنون سے متعلق متون میں تبدیلیوں اور ترامیم سے اور ان سے بچاؤ کے طریقوں سے آگاہ کرتا ہے اور انسانی تہذیب و تعلیم میں تدوین کے عمل کی اہمیت اور معنویت کا احساس دلاتا ہے۔ ”کہا جا سکتا ہے کہ شاید ہی ایسی کوئی کتاب ہو جو تحقیقِ متن کے اصولوں پر بعینہ پوری اترتی ہو۔“(۳)

Scanned with OKEN Scanner

متن میں تبدیلیوں کی وجوہات:

متون میں تبدیلیوں اور ترامیم کی بہت سی وجوہات ہیں ۔ان کا مطالعہ ،تدوین کے عمل کو جانچنے اور درست طریقے سے بجالانے کے لیے بہت ضروری ہے،جب تک ہمیں متون میں ان تبدیلیوں کے اسباب و وجوہات کا علم نہ ہو گا ہم تدوین کے عمل کو درست طریقے سے سمجھنے اور بجا لانے سے قاصر رہیں گے ۔متون میں کچھ تبدیلیاں اور خرابیاں خارجی اور فطری اسباب کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جن میں وقت ، زمانہ اور عناصرِ فطرت بھی شامل ہیں ۔کچھ تبدیلیاں انسانوں کے ہاتھوں سے ہو جاتی ہیں یا کر دی جاتی ہیں، کچھ دانستہ بھی ہوتی ہیں اور نادانستہ بھی(۴)۔چند نمایاں وجوہات واسباب کا ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے:

ا۔وقت،زمانہ اور عناصرِ فطرت:

وقت اور زمانہ انسان کے عمل سے ماورا ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انسان وقت اور زمانے کے ہاتھوں میں اسیر ہے، وقت اور زمانہ سارے ہی انسانی عمل کو متاثر کرتے ہیں ۔ کتنی ہی انسانی تہذیبیں وجود میں آئیں اور مٹ گئیں ، کتنی ہی عظیم الشان سلطنتیں قائم ہو کر فنا ہو گئیں ، کچھ کے آثار بھی باقی نہیں ہیں ۔ہر دور اور تہذیب نے اپنے نقوش چھوڑنے کی کوشش کی لیکن وقت کے بے رحم ہاتھوں نے ان میں سے اکثر کو مٹا دیا۔جو چند باقی ہیں وہ بھی زوال کے اس عمل کی زد میں ہیں ۔جیسے احرامِ مصر یا جنوبی امریکہ میں ''انکا'' تہذیب کے آثار۔

متون تو ہمیشہ ہی اپنے ذریعوں کے مرہون ہوتے ہیں ، وقت کے ساتھ ساتھ ان ذریعوں میں بہت سی تبدیلیاں وجود میں آجاتی ہیں ۔ متن جن اشیا پر لکھے یا کندہ ہوتے ہیں ،ان کی سیاہی، پتھر ، چٹان، دھاتی سطح، ہڈیاں اور کاغذ وغیرہ، متون لکھنے کے لیے ان میں سے جو بھی ذریعہ استعمال ہو،ان سب کی ایک مدتِ حیات ہے،پرانے زمانوں میں متون پتھروں پر کندہ کیے گئے،وہ پتھر گھِس اور ٹوٹ پھوٹ گئے ،چٹانیں نیست و نابود ہو گئیں، کاغذ پھٹ جاتے ہیں ۔ہر ذریعے کی ایک طبعی عمر ہوتی ہے اور اس کا اثر متون پر پڑتا ہے دھات اور فولاد ختم ہو گئے، سیاہیاں اور رنگ اڑ گئے، مٹ گئے، جن لوگوں نے ان متون کو یاد کیا تھا، وہ ختم ہو گئے، کچھ کے حافظے ان کی زندگی میں جواب دے گئے، جن متون کو نقل کر کے کاغذ یا دوسرے ذریعوں میں محفوظ کیا گیا، وہ بھی ختم ہو گئے یا کر دیے گئے۔رسم الخط بدل جاتا ہے اور نئے آنے والے پرانے رسم الخط اور املا کو پڑھنے سے قاصر رہتے ہیں ۔املا بھی مسئلہ ہے(۵)۔زبان بدل جاتی ہے۔انسانی ہجرت، حکومتوں کی تبدیلی، سرحدوں کے بدلنے کا اثر زبان، تحریر اور کلچر پر پڑتا ہے۔

عناصرِ فطرت بھی وقت کے ہاتھوں میں اوزار یا ہتھیار ہیں ۔ سردی، گرمی، بارش، سیلاب، طوفان، زلزلے، انسانی آثار کے مٹانے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں ،خود انسانوں نے دوسرے انسانوں ، تہذیبوں ، شہروں اور آثار کو مٹانے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ جنگوں ، تصادمات اور انسانی ہجرت کے عمل میں متون ضائع ہو جاتے ہیں۔ ہلاکو خان نے بغداد کو برباد کر دیا، اسکندریہ کی لائبریری جلا دی گئی۔اس طرح کے عمل میں متون کے بچنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔

۲۔انسانی تبدیلی:

Scanned with OKEN Scanner

یہ بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ایک دانستہ اور دوسری نادانستہ۔ جان بوجھ کر تبدیلی کرنا بہت عام ہے۔لوگ دوسروں کے متون چرا لیتے ہیں ۔ سرقہ آج بھی عام ہے،لوگ عصبیت یا انسانی فطرت کی کمزوری سے دوسروں کے متن میں ایسی تبدیلیاں کر دیتے ہیں جو مذہبی، سیاسی،ادبی تعصب یا محبت کی پیداوار ہوتی ہیں۔ کبھی نقل کرنے والے فائدہ اٹھانے کے لیے شعوری طور پر اصلاح کر دیتے ہیں یا طرف داری میں کچھ لکھ کر شامل کر دیتے ہیں ،بغیر جانے نادانستہ تبدیلی بھی نقل کی وجہ سے آتی ہے، نقل کرنے والا درست طور پر پڑھ نہیں سکتا یا درست لکھ نہیں سکتا، یا قاری کو مخطوطے کے رسم الخط یا املا سے واقفیت نہیں ہے لہٰذا غلط پڑھ اور لکھ دیتے ہیں ۔ سہوِ کتابت ایک عام غلطی ہے۔

متن میں تبدیلیوں کی اقسام:

مختلف وجوہات کی وجہ سے متن میں کئی قسم کی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو جاتی ہیں۔چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔سرقہ: سرقہ کا لغوی معنی ہے چوری کیا گیا یعنی کسی دوسرے کے متن کو بغیر حوالے اور تذکرہ کے چرا کر اپنا بنا کر پیش کر دیا گیا، سرقہ تصرف کی وہ صورت ہے جہاں کوئی شخص، مصنف، شاعر یا تذکرہ نگار وغیرہ کسی دوسرے کے کلام یا متن کو اپنا بنا کر پیش کرتا ہے۔ سرقہ کی رسم ادب میں کافی پرانی ہے۔اکثر لوگ شہرت یا عزت کے لالچ میں یا اپنے رجحانِ طبع کے باعث دوسروں کے اشعار و تحریر کو اپنا بنا کر پیش کر دیتے ہیں ۔(۶) تحقیق میں سرقہ ایک بڑی بد دیانتی ہے۔

۲۔ترمیم: ترمیم عربی زبان کا لفظ ہے، یہ اسم ہے اور مؤنث ہے۔اس کے لفظی معنی ہیں مرمت کرنے کا عمل، لیکن اردو میں یہ درستی، اصلاح اور تبدیل کرنے کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔تدوین کی اصطلاح کے طور پر یہ کسی متن میں ایسی تبدیلی کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو قدیم زبان کی جدید زبان میں اصلاح یا املا کی تبدیلی کے لیے کیے جائیں ۔تدوین میں ایسی کوئی بھی تبدیلی اور اصلاح درست نہیں سمجھی جاتی اور متن کو بدلنے کا ہر عمل تدوینِ متن کے علم کے مطابق غلط اور نا قابلِ قبول ہے۔یہاں ترمیم کی درج ذیل مثال مناسب ہو گی:

غالب کی مشہور اور مقبول غزل ہے جس کا پہلا مصرع ہے:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک

مولانا حامد علی خاں کو پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر اشاعت کے لیے ”دیوانِ غالب“ کی تدوین کا کام سونپا تھا۔انھوں نے یہ کام بڑی محنت سے انجام دیا اور ان کے مرتب کردہ دیوان کو عموماً ایک مستند دیوان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن انھوں نے متذکرہ بالا غزل کو شامل کرتے وقت اس کی ردیف کو ”ہوتے تک“ کے بجائے ”ہونے تک“ میں بدل دیا اور اسے اس طرح لکھا:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

Scanned with OKEN Scanner

اس کے ساتھ انھوں نے فٹ نوٹ بھی دیا اور لکھا ''گو غالب نے 'ہوتے تک' لکھا تھا لیکن وہ 'ہونے تک' کو 'ہوتے تک' سے بہتر خیال کرتے ہیں لہٰذا اسے استعمال کر رہے ہیں ''(۷)۔اسی طرح امتیاز علی خاں عرشی نے بھی غالب کے ایک شعر میں ترمیم کی ہے (۸) تدوین کے عمل میں ''متن'' کو ہمیشہ اصل سے وفادار ہونا چاہیے۔

۳۔سہوِ کتابت/ سہوِ کاتب: لکھتے وقت یا نقل کرتے وقت اصل عبارت کو غلط فہمی، ناواقفیت، غلط ترجمے کی وجہ سے بدل دینا/ بدل جانا۔ برصغیر میں پریس کی آمد سے پہلے اکثر مسودات خوش خط کاتب نقل کرتے تھے۔ کاتب عموماً کم سواد اور کم پڑھے لکھے ہوتے تھے لہٰذا اکثر مقامات پر الفاظ اور تحریر کو غلط لکھ جاتے تھے۔ یا تو وہ اصل لفظ کو درست پڑھ نہیں سکتے تھے یا جلدی میں ہوتے تھے یا اصل تحریر واضح نہیں ہوتی تھی لیکن سہو کی وجہ سے متن میں تبدیلی ہو جاتی تھی کہ وہ کچھ کا کچھ لکھ جاتے تھے۔ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب ''تحقیق کا فن'' میں اس کی کئی مثالیں دی ہیں۔

روزمرہ زندگی میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم کوئی تحریر پڑھتے ہوئے یا پروف خوانی کرتے ہوئے بعض اوقات نفسیاتی و ذہنی طور پر غلط املا کے حامل الفاظ کو درست سمجھ کر پڑھتے ہیں لیکن املا کے حوالے سے وہ لفظ درست نہیں ہوتا۔ سہوِ نظر کی بنا پر سہوِ کتابت کی غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ڈاکٹر اشرف نے ''دیوانِ ولی'' کی اشاعت کے دوران اس طرح کے سہوِ نظر کی بنا پر سہوِ کتابت کی اغلاط کا واقعہ بیان کیا کہ ان کا خیال تھا کہ جب یہ کتاب پہلی بار مکتبہ میری لائبریری سے شائع ہوئی تو انھوں نے اس کتاب کے پروف خود پڑھے اور بزعمِ خود انھیں یہ یقین تھا کہ اس میں پروف کی اغلاط نہیں ہوں گی لیکن جب چھپ کر آئی تو پتا چلا کہ سہوِ نظر کی بنا پر اس میں کتاب کی بہت سی غلطیاں نظر انداز ہو گئی تھیں اور اسی طرح شائع ہو گئی تھیں ۔ بہر حال اگلی اشاعت میں انھوں نے ان غلطیوں کو درست کر کے شائع کرایا۔اس واقعے کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سہوِ نظر کی بنا پر بہت سے اغلاط کتابت میں شامل ہو جاتی ہیں جنھیں ہم اپنے تئیں درست خیال کرتے ہیں ۔

۴۔املا اور رسم الخط: روایت اور وقت کے بدل جانے سے املا کا بدلنا یا غلط املا کی وجہ سے قابلِ فہم نہ رہنا۔املا اور رسم الخط میں عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ۔اردو املا کی بنیاد حروفِ تہجی پر ہے، یہ حروف اور ان کا املا بہت سے مسائل کا باعث ہے۔اس املا میں نقطوں اور شوشوں کی کثرت ہے جن کی وجہ سے تدوین کے کئی مسائل جنم لیتے ہیں ۔

املا اور رسم الخط کا مسئلہ علیحدہ اور تفصیلی بحث کا متقاضی ہے جس پر اہلِ علم پہلے ہی اظہارِ خیال کر چکے ہیں لیکن اس سلسلے میں مندرجہ ذیل کا خیال ضروری ہے:

الف۔ کسی بھی مصنف کے مختارات اس کی شخصیت کا حصہ ہوتے ہیں لہٰذا ان کو اسی صورت میں بحال رکھنا/ کرنا ضروری ہے۔

ب۔ کسی بھی عہد کے اتفاقیے دوسرے عہد میں اس طرح تبدیل ہو سکتے ہیں کہ نئے پڑھنے والوں کے لیے مشکل کا باعث بن سکتے ہیں لہٰذا انھیں نئے عہد کے مطابق بدلا جا سکتا ہے لیکن ایسا کرنے والے مُدوِّن کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقدمہ میں اس کی وجوہات بیان کرے اور ان کی فہرست بھی

Scanned with OKEN Scanner

مہیا کرے۔ مثلاً ابتدائی عہد میں 'ک'' اور 'گ' کے لیے ایک ہی مرکز استعمال ہوتا تھا، بعد میں 'گ' کے لیے 'ک' کے ایک مرکز میں اور اضافہ کر دیا گیا۔ لہٰذا ایسے املا کو مدون وجوہات بیان کر کے زمانۂ جدید کے مطابق کر سکتا ہے۔

ج۔ مدون جو بھی طریقہ استعمال کرے اس کے لیے مقدمہ میں اس کی وجوہات بیان کرنا ضروری ہے ۔

۵۔ تعبیر: لکھتے یا نقل کرتے وقت مبہم یا مشکل عبارت یا الفاظ کی وضاحت اور تشریح کی خاطر کچھ الفاظ بڑھا دینا۔

۶۔ تنسیخ : نظریات بدلنے یا سوچ بدلنے یا کسی اور وجہ سے کسی مصنف کا اپنے گذشتہ متن کو منسوخ کر دینا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے نظریات اور عقیدہ کی تبدیلی کی وجہ سے اپنے تمام سابقہ متون کو رد کر دیا تھا۔ ان میں ان کی کئی کتابیں شامل تھیں۔

۷۔ تصحیح : اپنے مقاصد یا خواہش کے مطابق کسی متن کی نقل کرتے وقت اس میں درستی کے نام پر تبدیلی کر دینا۔

۸۔ تصحیف: املا اور قرأت کو دانستہ بدل دینا تاکہ مصنف کے نظریات کو کسی اور روشنی یعنی بدلنے والے کے عقائد کے مطابق دیکھا یا سمجھا جائے۔

۹۔ تحریف: متن کے اصل الفاظ یا نقاط کو اس طرح بدل دینا کہ ان کے مفہوم میں فرق پڑ جائے۔

۱۰۔ تمسیخ: بارش/ نمی، کرم خوردگی، وقت یا حادثات کے باعث متن یا اس کے کچھ حصہ کا مٹ جانا، ٹوٹ جانا اور مسخ ہو جانا

۱۱۔ غلط انتساب: کسی ایک شاعر یا مصنف کے کلام یا متن کا کسی دوسرے کے نام سے منسوب ہو جانا۔ ایسا ایک جیسے تخلص، مشترکہ موضوع یا ایک جیسے اسلوب کی وجہ سے ہو جاتا ہے۔ اقبال کے نام کوئی دوسرے شعرا کا کلام منسوب ہو چکا ہے۔

۱۲۔ الحاق: کسی ایک شاعر کے کلام کا متن میں دوسرے کا کلام یا متن شامل ہو جانا یا کر دیا جانا۔ میر اور سودا کے کلام میں بہت سا کلام ایسا ہے جو الحاق شدہ ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے استاد ذوق کا کلام مرتب کرتے وقت کئی غزلیں اپنی طرف سے لکھ کر اس میں شامل کر دیں ۔ مولانا آسی نے ۱۳ غزلیں لکھ کر غالب کے نام سے ان کے کلام میں شامل کر دیں ۔

۱۳۔ جعل: جعل کے لفظی معنی ہیں بدلنا، دھوکا، نقل پر اصل کا دھوکا دینا۔ علمی و ادبی تاریخ میں بہت سے لوگوں نے جعلی اور نقلی متن تیار کر کے اصل کے نام سے چلا دیے ۔ ولی کے کلام میں بہت سی جعلی غزلیں شامل ہو گئی ہیں ۔ تاریخِ ادب میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں ۔ اوپر آزاد اور آسی کی دی گئی مثالیں بھی اسی ذیل میں آتی ہیں ۔

Scanned with OKEN Scanner

۱۴۔انتحال: کسی دوسرے کے متن یا کلام کو چرانا اور اپنا بنا کر پیش کرنا انتحال کہلاتا ہے۔ بہت سے لوگ دانستہ طور پر دوسروں کے متن کو چرا کر اپنا بنا کر پیش کر دیتے ہیں ۔ علم و ادب میں متن چوری کرنے کی روایت کافی پرانی ہے ۔ ابتدائی دور میں علام اقبال کی کئی نظمیں دوسروں نے اپنے نام سے علاقائی رسائل میں چھپوادیں ۔

۱۵۔توارد: توارد کے معنی ہیں وارد ہونا یا ایک جگہ اترنا۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص یا شاعر کا شعر، ترکیب یا خیال ہو بہو کسی دوسرے کے ہاں پایا جاتا ہے،اسے توارد کہتے ہیں ۔

۱۶۔تصرف: تصرف کے معنی ہیں استعمال میں لانا،دست انداز، خرچ کرنا۔اصطلاح میں اس سے مراد ہے کسی متن کے الفاظ یا املا میں جان بوجھ کر ردوبدل کر دینا۔اس طرح کمی بیشی کر کے کسی غلط علمی کام میں لانا۔اکثر لوگ کسی متن کا حوالہ دیتے وقت اس میں کچھ تبدیلی کر کے اقتباس دے دیتے ہیں ۔یہ ایک علمی بد دیانتی ہے۔

۱۷۔نرم سرقہ: یہ بھی سرقہ اور ادبی و علمی چوری کی ایک قسم ہے۔جب کہ کوئی شخص اپنی ہی کسی تحریر یا متن کو اپنے کسی ایک مقالے یا مضمون سے جو پہلے کسی سند یا اشاعت کے لیے پیش کیا جا چکا ہو، لے کر کسی دوسرے مضمون میں بغیر حوالہ دیے اور بغیر عبارت کو تبدیل کیے،استعمال کرتا ہے اور یہ تاثر دیتا ہے کہ یہ ایک نئی تحریر ہے،اکثر سکالر اپنے کسی ایسے مقالہ سے جو ڈگری کے لیے پیش کیا گیا ہو، ہو بہو مضمون نکال کر اور نیا عنوان دے کر یعنی نیا بنا کر پیش کر دیتے ہیں ۔ تحقیقی مقالات میں بھی ایسا کیا جاتا ہے کہ ایم فل والے موضوع ہی کو پی ایچ ڈی میں لیا جاتا ہے اور پہلے والا سارا مواد ڈاکٹریٹ کے مقالے میں شامل کر دیا جاتا ہے۔یہ بھی ادبی و علمی سرقہ ہی کی ایک قسم ہے۔

۱۸۔حذف: حذف کے معنی ہیں دور کرنا یا گرا دینا،اصطلاح میں اس سے مراد ہے کہ کسی لفظ یا عبارت کو اصل متن سے ہٹا دینا یا دور کر دینا۔ یہ غیر ارادی طور پر بھی نقل اور تحریر کرتے وقت بھی ہو سکتا ہے اور ارادی طور پر بھی تاکہ متن کو کسی مخصوص مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکے خاص کر اقتباسات اور مثالوں کے لیے۔ بعض اوقات ایسے مصرعے اور آثار و اشعار کا بھی اکثر حصہ لکھتے وقت حذف کر دیا جاتا ہے جو کہ کثیر الاستعمال ہوں خاص کر مقدس آیات کا شروع کا لفظ لکھ کر اکثر حصے حذف کر دیے جاتے ہیں۔

۱۹۔نظری: نظری کے لفظی معنی ہیں وہ چیز جو نامنظور ہو، نظر سے گرا ہوا، پامال، خیالی اور قیاسی۔اصطلاحی طور پر اس سے مراد وہ متن اور کلام ہے جسے کوئی عالم، ادیب یا شاعر رد کر دے اور اسے منسوخ قرار دے کر اس سے قطع تعلق کر لے۔ یہ عموماً اس وقت ہوتا ہے جب نظریات اور خیالات میں تبدیلی واقع ہو جائے مثلاً مولانا عبدالماجد دریابادی آغازِ جوانی میں آزاد خیال تھے، بعد میں انھوں نے توبہ کی اور اپنی تمام ابتدائی تحریروں کو نظری قرار دے کر منسوخ کر دیا۔(ایسا کلام یا متن جو لکھنے والا رد کر دے(درج بالا سطور میں مختصراً ان تبدیلیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو دورانِ تدوین، متن میں راہ پا جاتی ہیں ۔ان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے :

اشرف اللغات (مؤلفین: ڈاکٹر محمد خاں اشرف،ڈاکٹر عظمت رباب)،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۲۰۱۸ء

Scanned with OKEN Scanner

حوالہ جات

۱۔ڈاکٹر نذیر احمد، مضمون ''تحقیق و تصحیحِ متن کے مسائل''، مطبوعہ ''نقوش'' لاہور، مارچ ۱۹۶۳ء، ص ۵۔۲۰، مشمولہ ''اردو میں اصولِ تحقیق (انتخابِ مقالات) جلد اول مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۳۰۷

''کوئی متن ایسا نہ ہوگا جو ہر قسم کے سقم سے پاک ہو۔''

۲۔ایضاً، ص ۳۰۸

۳۔ایضاً، ص ۳۰۶

۴۔ڈاکٹر گیان چند، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

۵۔اشرف اللغات (ادب، تنقید، تحقیق و تدوین کی اصطلاحات کا تشریحی لغت)، ڈاکٹر محمد خان اشرف، ڈاکٹر عظمت رباب، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۲۴

۶۔ڈاکٹر گیان چند، محولہ بالا، ص ۲۱۸

۷۔مولانا حامد علی خاں، دیوانِ غالب، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء،

۸۔مولانا امتیاز علی خاں عرشی، دیوانِ غالب، مجلس ترقی ادب لاہور، مقدمہ، ص ۷۸

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

نگاهی به شعر طالب آملی در وصف کشمیر و جهانگیر

ڈاکٹر مہتاب جہاں

بخش فارسی دانشگاه دهلی

چکیده : دراین مقاله سعی شده است که اشعار زیادی در بارهٔ وصف کشمیر وستایش جهانگیر آن یک جا جمع بشوند۔ و برای خوانندگان چیز تازه ای راجع به طالب آملی از دوران کودکی به تحصیل دانش وادب پرداخت ودر علوم زمان خود، هندسه، فقه، ادبیات عرب وشعر وحکمت استاد گردید واز خوشنویسان به نام خط نستعلیق زمان خود گردید وآشنائی طالب بازهره آعاز شاعری اور قم می زند وبرای اعتبار وشهرت وبرای رسیدن به عشق خود اولین سفر خود را آغاز وپس از بر گشت از سفر وخیانت زهره، طالب برای همیشه زادگاه خود را ترک وراه سفر در پیش گرفت وباطی مدارج ترقی از کاشان، اصفهان ومرو وهند وباتوانمندی و کیاست خود به بالاترین منصب ادبی زمان خود ملک الشعرائی دربار هند رسید۔

واژه‌های کلیدی : طالب آملی، پادشاه جهانگیر، کشمیر

محمد طالب آملی متخلص به طالب مشهور به ملک الشعرأطالب آملی از شاعران وگویندان بنام قرن یازدهم هجری وازارکان اربعه شعر سبک هندی است۔ طالب در سال ۹۹۴ هجری در آمل متولد شدودر سال ۱۰۲۶ هجری وفات یافت۔ در تاریخ وفاتش اختلافات زیاداند. می گویند مقبره اودر شهر فتح پور سیکهری در شمال هند، درجوار مقبره دوست بزرگوارش اعتمادالدوله تهرانی، صدراعظم مشهور هند قرار دارد۔ طالب آملی در هند به اوج قله شعر رسید و به مقام ملک الشعرایی دربار دست یافت ودر ۴۲ سالگی در اوج شرف واعتبار در گذشت۔

طالب آملی در حدود سال ۱۰۱۶ هـ ق از مرو رهسپار هند گردید وآنجا در حقیقت از سال ۱۰۱۶۔ ۱۰۲۰ هـ ق یعنی در حدود چهار سال در شهرهای هند سر گرداں بود ودر جستجوی کسی که بتواند با برخورداری از حمایت او به زندگی خویش بپردازد به این شهر وآن شهر می رفت۔ در این مدت طالب از شهرهای هند، سرهند، ملتان، لاهور، آگره ودهلی وشهرهای کوچک دیگر که در فواصل آنها قرار گرفته، دیدن کرد ودر هریک شهر چند ماهی اقامت نمود وبا بزرگان و مخصوصاًاد باوشعرای مقیم شهرهای نامبرده ملاقات هایی داشت از جمله در لاهور به خدمت پیشوایان فرقه قادریه یعنی شمس الدین قادری لاهوری وشاه ابوالمعالی لاهوری رسید. طالب آملی قصیده ای در توصیف لاهور وستایش یکی از پیشوایان متصوفه آن شهر به احتمال قوی شاه ابوالمعالی لاهوری سروده است۔ ابیات زیر از آن قصیده است۔

خوشا لاهور وفیض آبِ لاهور به طاعت میل شیخ وشاب لاهور

Scanned with OKEN Scanner

نیابی از اهل هندوستان گروهی به دل نزدیکی ارباب لاهور

به آسایش گرت میل است طالب به روی بستر سنجاب لاهور

میان بگشا و خوش واکش که در هند فراغت نیست جز در خوب لاهور

خدایا زندهٔ جاوید دارش به آبِ خضر یعنی آب لاهور

در این سال ها زندگی طالب به ناکامی می گذشت، شعر و شاعری و هنر او نتوانسته بود نظر بزرگان هند را به خود جلب کند. چون طالب با گذشت مدتی در حدود چهار سال از تلاش های خود در شهرهای بزرگ هند نتیجه ای نگرفت از طرفی آوازهٔ هنر دوستی و سخن پروری میرزا غازی ترخان حکمران سند و قندهار راشنیده و قصیده ای در ستایش او سرود و به قندهار فرستاد اولین بیت قصیده بدین قرار است.

جو گل تکیه بر بستر خار دارم نگاهی ز حسرت گرانبار دارم

صف آرای تیغ و قلم خان غازی که لب در ثنایش گهربار دارم

جدا از آشناش ز اشک دمادم سر آستین رشک گلزار دارم

میرزا غازی پسر مرزا جانی ترخان بود، میرزا جانی حکمرانی سند را در دورهٔ اکبر شاه به عهده داشت و پس از مرگ او میرزا جانی حکمرانی سند را در دورهٔ اکبر شاه به عهده داشت و پس از مرگ او میرزا غازی که دوازده ساله بود. جانشین پدر شد وی در سال ۱۰۲۰ هـ ق به فرمان جهانگیر شاه قندهار را نیز ضمیمهٔ حکومت خود کرد و آن شهر را در فرمانروائی خود قرار داد. در همین شهر بود که طالب به دربار او پیوست. میرزا غازی شاعر توانا و هنرمندی شائسته بود در نواختن آلات موسیقی و آوازخوانی استادی کامل داشت. در نغمه پردازی و طنبور نوازی بی نظیری بود و همه ساز ها را خوب می نواخت. تخلص میرزا غازی در شعر وقاری بود. دیوانی از او باقی مانده که در حدود پنج هزار بیت شعر دارد. نمونهٔ شعرش ابیات زیر حاصل طبع شاعرانهٔ اوست:

بر من دو جهان بی رخ تو حلقه میم است جانی که ندارم ز فراغت به دو نیم است

گریه ام گر سبب خندهٔ او شد چه عجب ابر چون گریه نماید رخ گلشن خندد

در عهد تو مارا همه باغیر خطاب است سرپنجهٔ مژگان و گریبان عتاب است

میرزا غازی پس از مطالعهٔ اشعار طالب و آشنائی با شرح احوال او سخت مایل به هم صحبتی وی شد و شخصاً دعوت نامه ای برای او فرستاد، طالب در آگره در فصل باران نامهٔ میرزا غازی را دریافت کرد و بدون توجه به اشکالات مسافرت درین فصل عازم قندهار شد و درین سفر سختی های فراوان دچار شد. در ان هنگام سختی های را که در ضمن سفر به او رو نموده، شرح می دهد.

Scanned with OKEN Scanner

مشقت سفر ورنج راہ وشدت وی ببست نطق مرادست گوھر افشانی

درین سفر کہ نصیبم مباد دیگر بار بہ گونہ گونہ غمم بود و محنت جانی

تمام راہ بدستور بختیان سحاب در آب دیدۂ خود داشتم قدم رانی

ز آگرہ تا بہ خیابان گلشن لاہور رفیق بودم باابرھای بارانی

چو بخت یافت بہ ملتان سلامتم از رشک چھار ماہ در آن قلعہ داشت زندانی

زمکث ملتان نزدیک شد بدان کہ مرا بدل شود لقب آملی بہ ملتانی

کنون کہ آمدہ ام از تو چشم آنم ھست کہ روی تربیت از بخت من نگردانی

اگرچہ دورۂ اقامت طالب در قندھار و مجالست او با میرزا غازی چند ماہی بیش نبود ولی این دورۂ چند ماھہ از درخشان ترین ادوار زندگی شاعرانۂ اوست۔ توجہ خاص میرزا غازی خان بہ طالب و شعر فہمی او بر آن داشت کہ شب و روز در تکاپو خلق آثار شاعرانۂ نغز و زیبا باشد۔ چندین قصیدۂ بلند و تعداد غزل و رباعی و ترکیب بند محصول این چند ماہ زندگی اوست۔

میرزا غازی در سال ۱۰۲۱ھ ق بہ دست غلامی مسموم و بہ قولی خفہ شد و با مرگ او انجمن ادبی قندھار از ھم پاشید و بار دیگر در پدری طالب آغاز شد در سوگ مرگ میرزا غازی اشعاری غم انگیز دارد :

بہ تن ھر موی طالب را سیہ پوش بہ مرگ نکتہ دان دھر غازی است

چشمہ آفتاب شد ھر چشم کاو بر آن سایۂ خدای گریست

طالب پس از مرگ میرزا غازی بہ آگرہ باز گشت و در این سفر بود کہ در آگرہ با مولف میخانہ آشنا شد۔ طالب بعد ازان بہ دربار چین قلیچ خان حاکم پیشاور منسلک شد۔ حاکم بہ گرمی پذیرائی او کرد و طالب را بہ ھمدمی خود بر گزید و در سفر و حضر ہمیشہ وی را ھمراہ داشت۔ مہربانی و محبت او باعث شد کہ طالب خاطرۂ تلخ مرگ میرزا غازی فراموش کرد و با دل و جان بہ خدمت و ستایش خان پیشاور بپردازد. قصیدہ ای است کہ در توصیف فصل باراں موسمی ھند و ستایش چین قلیچ خان سرودہ است۔

دم صبح و ھوای برشکال است چمن جولانگہ باد شمال است

بیا ساقی تو مطرب شو تو قوال کہ دور صاحب فرخندہ فال است

Scanned with OKEN Scanner

سخندان چین قلیج آن خان جم قدر کہ آب گوھر جاہ وجلال است

نزدیکانش شد۔ واز کار بر کنار گردید و بار دیگر آوارگی طالب آغاز شد و بہ ناچار بہ آگرہ باز گشت و بد بختانہ، چین قلیج خان دچار، اختلاف خانوادگی و دسیسۂ یکی از بزرگان ایرانی دربار جہانگیر یعنی دیانت خان راہ یافت۔

:دیانت خان حامی و مشوق ایرانیان مھاجر بہ ھند و وسیلہ آشنائی آنان با بزرگان ھند بود۔ طبع شاعرانہ ای داشت۔ بیت زیر سرودہ اوست

اشکم دوید و دامن زلفش گرفت و گفت ای تیرہ شب نقاب مشو آفتاب را

دیانت خان پس از آشنائی با طالب و پی بردن بہ قدرت او در سخن آفرینی بہ وی پیدا کرد و او را ھمراہ خویش بہ مجالس بزرگان پای تخت برد۔

بہ زودی اشعار طالب مورد قبول عامہ گرفت و شہرت طالب بہ جایی رسید کہ شاہ جانگیر مایل بہ دیدار او شد، و طالب بہ توسط دیانت خان بہ دربار جہانگیر راہ یافت و در سال ۱۰۲۸ھ ق بہ ملک الشعرائی رسید۔ جہانگیر ھم در این بارہ در توزک خود می نویسد۔" در این تاریخ یعنی روز دھم دی ماہ سال چہاردھم سلطنت جہانگیر مطابق با سال ۱۰۲۸ھ ق طالب آملی بہ خطاب ملک الشعرایی خدمت امتیاز پوشیدہ اصل او از آمل است۔ یک چند با اعتماد الدولہ می بود، " چون رتبہ سخنش از ھمگنان در گذشت در سِلک شعرای پای تخت منتظم گشت۔

جہانگیر، نور الدین محمد پسر اکبر شاہ امپراتور بزرگ ھند بود۔ در دوران ولایت عہدی بہ نام شاھزادہ سلیم معروف بود۔ و بدین جھت او را سلطان سلیم نیز می نامند، مثلاً طالب آملی در جہانگیر نامہ این بیت زیر را سرودہ است۔

سران سپہ را چو شد آگہی چہ سلطان سلیمی چہ اکبر شھی

منظور ش سلطان سلیمی ھمان جہانگیر است۔

جہانگیر از سال ۱۰۱۶ تا ۱۰۳۷ھ ق در ھند سلطنت کرد۔ دورۂ سلطنت او در ھند تصادف با پادشاہی شاہ عباس کبیر در ایران بود۔ او مشوق ادبا و ھنرمندان ایرانی بود۔ ادبیات و شعر پارسی و ھنر ایرانی در ھند در دورۂ سلطنت او بہ اوج اعتلای خود رسید۔ و دوران پادشاہی او در خشان ترین او دار سبک ھندی است۔ از لحاظ کثرت شعرا و تشویق آنان و رواج شعر و شاعری دربار او را میتوان با بارگاہ سلطان محمود غزنوی مقایسہ نمود۔ جہانگیر اشعار زیبای سرود۔ و در این جہانگیر است۔ زمینہ چنانکہ مشہور است شاگرد فیضی ملک الشعرا اکبر شاہ بود۔ ابیات زیر حاصل شاعرانۂ

ساغری می بر سر گلزار می باید کشید ابر بسیار می بسیار می باید کشید

جہانگیر خاطرات دورۂ زندگی خود را با نثری زیبا در قسمت اول کتاب توزک جہانگیری بہ پارسی ثبت نمودہ است۔ این کتاب مجموعۂ مستندی از تاریخ ھند در دورۂ او ست۔ واز مطالعہ آن میتوان بہ افکار و عادات و وضع اجتماعی دوران زندگانی او پی برد۔

Scanned with OKEN Scanner

طالب از سال ۱۰۲۸ تا ۱۰۳۶ اھ ق کہ سال وفات اوست ملک الشعرای جہانگیر بود و سمت ریاست بر مجمع ادبی دربار او را داشت۔ وی در این مقام علاوہ بر شرکت در مراسم رسمی و سرودن قصاید بہ مناسبت جشن ھای مذہبی و درباری وظیفۂ انتخاب و معرفی شعرای تازہ وارد بہ شاہ را نیز بہ عہدہ داشت. وی در رکاب جہانگیر بہ مسافرت در اطراف و اکناف ھند پرداخت، اولین مسافرت او در مقام ملک الشعرائی سفر کشمیر است کہ در سال ۱۰۲۹ اھ ق صورت گرفت طالب از این سفر با خاطرہ ای خوش باز گشت و در اشعار خود از این سفر بہ خوبی یاد می کند۔ ابیات زیر در وصف کشمیر انتخاب شدہ است۔

بیا کہ مجمع خوبان دلبر باا ینجاست کرشمہ ھا ھمہ اینجا و ناز ھا اینجاست

قدم ز خطۂ کشمیر بر نمی دارم مقیم مرکز عیشیم و جای ما اینجاست

مدہ بہ غارت بیگانہ کشور دل خویش کہ ترکتاز نگہ ھای آشنا اینجاست

کجا بہشت و کجا بزم بادۂ ای زاھد تو دل بجای د گر بستہ ای و جا اینجاست

جوان شو از نفسم ھم نشین مرو بہ چمن اگر بہ کسب ہوا میروی ہوا اینجاست

تو فاضلی نظر از قبلہ ای افاضل جو پنای فضل جہانگیر پادشاہ اینجاست

خطہ کشمیر کہ بہ سرزمین ھند نشان بہشت می باشد طالب آملی در بارۂ توصیف کشمیر ابیات فراوان سرودہ است۔ غزل زیر را ھم در مدح جہانگیر و در وصف کشمیر سرودہ است۔ لحن طالب خیلی سادہ است۔

فیض پیالہ بحشند آب و ھوا ہی کشمیر از خشت خُم نہادند گویی بنای کشمیر

چون خاک عشق بازان ھر لحظہ بر مشانم بوی محبت آید از کوچہ ھای کشمیر

شاہنشہ جہانگیر چیدا ز ہوائی او گل خوش مستجاب گردید آخر دعای کشمیر وصف بھشت جاوید از عاشقان آن پرس ما را ز بان نگر در جُز ثنائی کشمیر

ھر کس پی تماشا کردند خوش فضایی رضوان فضای جنت طالب فضای کشمیر۔

زیر ھم در مسافرت کشمیر سرودہ است۔ قصیدۂ

نواع مرغ طرب این بود بہ گاہ صفیر کہ بادہ ای ھند است و گل، گل کشمیر

ز ھند اگرچہ گل و بادہ نافعند و مفید می عراق و گل پارس را بہ مفت مگیر

مرا کہ صورت باغ بہشت در نظر است سزد کہ تازہ کنم روح بلبلان بہ صفیر

Scanned with OKEN Scanner

چون وصف گلشن کشمیر می کنم فرض است که شُویَم این دھنِ تلخ را بہ شکر و شیر

گر این نمونۂ جنت بہ خواب بینید حُور دلش ز لذت سیرِ بہشت گردد سیر

چنانکہ گفتہ شدہ کہ طالب آملی صدھا شعر در وصف کشمر سرودہ در بارہ ای سفر بہ کشمیر ود شوار ھای راہ و زیبای ھا آن قصیدہ آن متجاوز از صد بیت سرودہ۔ ابیات زیر را ملاحظہ بکنید۔

شد آسان طی رہ دشوار کشمیر بہ اقبال شہنشاہ جہانگیر

قدم بر تیغ کوھی گشت گستاخ کہ بروی نگذرد پوینده نخجیر

رھی کردیم طی کز پیچ و تابش بہ دندان لب گزد مارِ شکن گیر

رھی باریک تر از تیرِ مژگان براو چسبیده رھرو چون پرِ تیر

رھی جانسوز تر از برق خنجر رھی باریک تر از نوک شمشیر

بہ ھر منزل غلط گفتم بہ ھر گام ھزاران طفل نابالغ شدی پیر

چرا چون عمرِ اژدھا دراز است کہ کوتہ باد عمر راہِ کشمیر

طالب آملی در ابیاتی بالا راہ ھای دشوار کشمیر تذکر دادہ است ود ر این ابیات تشبیہات و استعارات کہ بکار بردہ است کاملاً جداگانہ نوین ھستند۔

در ابیاتی زیر در بارۂ میوہ ھا و شجر و پرندگان کشمیر با آھنگ خوبی سرودہ است۔

ظھور میوہ و گل با شکوفہ بہ یک موسم در او چون باغ تصویر

بہ ھر سو بیدِ مجنونی نشستہ بہ پا پیچیدہ آبی ھمچون زنجیر

ز یک سو قُمریاں در نالۂ زار ز یک سو بلبلان در نغمۂ زیر

مدام از لالہ و گل تا بود نام بہ گلزار بہشت و باغ کشمیر

گلِ کشمیر و نوروز دل افروز مبارکباد بر شاہِ جہانگیر

ریاحین بر زمینِ پر نگارش چو بر دیبای رنگارنگ تصویر

Scanned with OKEN Scanner

طالب آملی شاعر برجسته بود۔ در اقامت هند سراسر این کشور سفر کرد و در هر شهرهای هند سعی کرد که زیبائی را تلاش کند۔ و آن را در سفرش سُفت۔ ابیات زیر از قصیده زیبائی است در این در مدح جهانگیر اول به وصف حال خود پرداخته و بار دیگر از اقامت طولانی در ملتان شکوه میکند۔ سپس تجدید مطلع نموده به ستایش شاه می پردازد۔

آمیخته برق نفس چون کشم آهی در خرمن گردون نگذارم پر کاهی

از چاک گریبان من آشوب دلم پرس دعوی جنون را به ازین نیست گواهی

ملتان بمثل ششدر و من مهره عجیب نست گر مهره ز ششدر نبرد بیرون راهی

:طالب آملی در قصیده دیگری هم در بارهٔ ملتان و آهویش بد ذکر کرده است

:می گوید

ز ملک ملتان نزدیک شد بر آنکه مرا بدل شد لقب آملی به ملتانی

درین مضیق ملامت چهار ماه بُدم بسان مهره به ششدر تمام حیرانی

طالب آملی همانطور که قبلاً ذکر شد که در مسافرت های جهانگیر که به شهری های تحت فرمان روایش همیشه در ملازمت وی بود و در مدت ملک الشعرایی خود از بیشتر شهرهای بزرگ و نقاط جالب هندوستان دیدن کرد، قطعه زیر را هنگامی که به اتفاق شاه از کابل دیدن می کرد در توصیف بناهای که در آن شهر بر پاشده بود سروده است۔

بحکم شاه نورالدین جهانگیر که هر لب نذر او دارد دعائی

به عیش آبادِ کابل یافت تعمیر همایوں منزلی عالی بنائی

سخن کوته در این شهرِ طرب خیز مهیا گشته خوش دلکش بنائی

نه چون کابل به عالم هست شهری نه زین سان قلعه در آفاق جای

مبارک بر جهاں نداری که مثلش نبود است و نباشد پادشاهی

طالب آملی در جهانگیر نامه هر جا که بنام جهانگیر می رسد از جان و دل به ستایش او می پردازد و در باره مسافرت خود به کابل و جشنی که جهانگیر در باغ مزبور ترتیب داده چنین می گوید۔

Scanned with OKEN Scanner

به کابل برآراست جشنی به باغ که نوروزِ جمشید را کرده داغ

می آمد به مجلس چون رنگین بهار وزد چهره بزم شد لاله زار

می دوستکامی به ساغر پرست گرز دست دادی که از چشم مست

: جای دیگر ابیاتی ستایش جہانگیر

جهاندار عادل جهانگیر شاه که چترش کله گوشه ساید به ماه

زرحمت نشانی به عدل آیتی به خلق خدا از خدا لطف غایتی

اخترِ مردمی شناسندۂ جوهرِ آدمی فرزندۂ

درایام آن عادل دادرس زنوشیروان مانده نامی وبس

نگارندا گرنام او اختران به فیروزه هفتمین آسمان

: طالب آملی نه تنها در قصیده مدح جہانگر ابیاتی سرود بلکه در غزلیاتی خود هم به مدح شاه پرداخته برای نمونہ چند ابیاتی از غزلیاتی وی

بازم زرخ از پیاله چمن در چمن شگفت هر موی من گل شد و بر روی من شگفت

بر هر زمین که سرو قد من قدم نهاد زان خاک دسته دسته گل و یاسمین شگفت

زیر لب از تبسم اورفت نکته ای ناگه مرا چوں غنچه زبان در دهن شگفت

در نو بهار عدل جهانگیر پادشاه گلزار طبع طالب رنگین سخن شگفت

:چند بیت دیگر

شکارگه خوش و صحرا خوش است وراه خوش است

هوا چو عهد جهانگیر پادشاه خوش است

شگفته رویی دهر از نشاط صحبت اوست

جهاں چرا نبود خوش جهان پناه خوش است۔

Scanned with OKEN Scanner

دمید، صبحِ سعادت بنوش، بادۂ عیش

بلی، نشاط صبوحی بہ صبحگاہ خوش است

سرم بہ راہ تو خوشتر بود کہ چشم بہ راہ

تو را گمان کہ مگر چشم من بہ راہ خوش است

مشو جدا نفسی ز آستانِ او طالب

کہ قبلہ نور فشان است و قبلہ گاہ خوش است

:در دیوان طالب آملی رباعیات در حدود ۷۵۰ است، در این هم ستایش جهانگیر وجود دارد۔ برای نمونۂ یک رباعی بدین قرار است

چون شاہ جہانگیر شہ نیک صفات .بنمود عیان چشمۂ نور از ظلمات

خضرش بہ کنار چشمہ چوں دید، بگفت جا کردہ سکندر بہ لب آب حیات

:رباعی دیگر

امروز کہ روز وزن شاهنشاه است

بر خود بالد هر آنکہ دولت خواه است

دلوست ترازوی و شهنشه یوسف

لیک آن یوسف کہ دشمنش در چاه است۔

:نتیجہ گیری

حالا میتوان گفت کہ شاعر ما طالب آملی در وصف وستایش کشمیر صدها شعر سروده است او بر کشمیر از جان فریفته بود علاوه بر این مداح زبردست مختصر سعی کرده جهانگیر پادشاه بود۔ چون در کلیاتش در هر صنف شعر مثلاًدر قصیده، در غزل، در رباعی در ستایش و مداحی شاه وجود دارند۔ بنده در این مقالۂ ام ابیات کہ با موضوع مقاله ام متعلق اند. اشعار زیادی پیدا بکنم وهدف مقاله خودم را کسب بکنم۔ نمی دانم بنده چقدر موفق شده ام۔ بر خوانندگان گرامی و شنوندگان می گذارم کہ منصف بشوند۔

Scanned with OKEN Scanner

: ماخذ و منابع

۔زندگی نامہ و کارنامہ ادبی طالب آملی؛ دکتر فرامرز گودرزی سازمان چاپ و انتشارات، وزارت فرھنگ وارشاد اسلامی، چاپ اول پاییز ۱۳۸۲ھ، ش ۱

۔ملک الشعرا طالب آملی، فکر و فن: ڈاکٹر آصفہ ربانی، طابع نامی پریس، لکھنو ۱۹۷۸ عیسوی ۲

،۔کلیات اشعار ملک الشعرا طالب آملی: بااھتمام تصیح و تحاشیہ ۳

،طاہری شہاب، از انتشارات کتابخانۂ سنائی۔بی تا ۱۳۴۶ھ ش

۔تذکرۂ طالب آملی (معہ انتخاب کلام) لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید، ۱۹۶۵م۔کراچی فیروز سنٹر، کراچی۔ ۴

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

ڈاکٹر معصوم شرقی کی رباعیات فکر و فن کے آئینے میں

ڈاکٹر محمد اقبال، آئی۔ جرمن
اسسٹنٹ پروفیسر، صدر شعبہ اردو
بی۔ شنکر انند آرٹس اینڈ کامرس ڈگری کالج
کڈچی، تعلقہ رائے باغ، ضلع بیلگاوی

تلخیص: ڈاکٹر معصوم شرقی پچاس سے زائد برسوں سے اردو زبان وادب کی خدمات میں مشغول ہیں۔ ڈاکٹر معصوم شرقی نے نثر میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ، تنقیدی، تحقیقی، علمی وادبی مضامین، تذکرہ اور فن و شخصیت پر تصانیف شائع کر کے لائق ستائش کام کیا۔ اسی طرح انھوں نے شاعری میں غزلوں، نظموں اور رباعیوں کے مجموعے شائع کر کے خود کو ادب کا ایک مخلص و بے لوث خادم ثابت کیا۔

اس مقالے میں ڈاکٹر معصوم شرقی کا مختصر تعارف پیش کر کے ان کی رباعیات کو فکر و فن کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ: عصر حاضر کے حالات کے عکاس رباعیات

ڈاکٹر معصوم شرقی کا اصل نام عبد الغفار انصاری ہے لیکن وہ ادب کی دنیا میں اپنے قلمی نام ڈاکٹر معصوم شرقی کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر معصوم شرقی 4 نومبر 1948ء کو باری پاڑہ، کانکی نارہ، 24 پرگنہ (شمالی کلکتہ) میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر معصوم شرقی کے والد کا نام محمد شفقت علی انصاری اور والدہ کا نام زہرہ بی بی ہے۔

ڈاکٹر معصوم شرقی نے ابتدائی وثانوی تعلیم کے بعد اردو و فارسی میں ایم اے پاس کیا اس کے بعد اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر معصوم شرقی کے پی۔ ایچ۔ ڈی کا عنوان "نظیر ثانی اشک امرتسری "تعارف، تنقید اور تدوین کلام" ہے۔ ڈاکٹر معصوم شرقی درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ رہے۔ انھوں نے حمایت الغربا ہائر سکنڈری اسکول کانکی نارہ میں بحیثیت مدرس ملازمت کی جہاں وہ اردو و فارسی زبان وادب کی تعلیم دیتے رہے۔ 2008 میں ڈاکٹر معصوم شرقی نوکری سے سبکدوش ہوئے اور ادبی کاموں میں پہلے سے زیادہ مصروف ہو گئے۔ ڈاکٹر معصوم شرقی کی مطبوعہ تصانیف اس طرح ہیں۔

- عکس تاب (غزلیات کا مجموعہ) اشاعت 2009ء
- نظیر ثانی اشک امرتسری: تعارف تنقید اور تدوین کلام (تحقیقی مقالہ) 2012ء

Scanned with OKEN Scanner

- ادب جہاں(تنقید، تجزیہ اور تفہیم) 2015ء
- ادب واحتساب(تحقیقی علمی،ادبی ، مضامین) 2016
- کلکتے کاادبی ماحول: بیسویں صدی میں(دوسرا ایڈیشن) تذکرہ2016
- تراوش قلم(فن وشخصیت) 2017
- لمحوں کے قدم(نظمیں) 2017
- تنقید و تحلیل(تنقید و تحقیق) 2021ء
- ادب وعصر(تنقید و تجزیہ) 2022
- لذت سنگ(غزلیات)2023
- سخن زار(رباعیات) 2023
- اقبال بحر بیکراں(تحقیق) 2024

ان تصانیف کے علاوہ متعددہ اخبارات ورسائل میں ڈاکٹر معصوم شرقی کے مضامین، تبصرے اور منتخب کلام شائع ہوئے ہیں اور ان کی کچھ کتا بیں ابھی زیر ترتیب ہیں۔ ڈاکٹر یاسمین سلطانہ صدیقی نے ڈاکٹر معصوم شرقی کی شخصیت اور علمی وادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ تحریر کیا ہے:

" معصوم شرقی برسوں تک درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ رہتے ہوئے علمی خدمات انجام دیتے رہے اور ساتھ ہی بحیثیت قلم کارادب کے میدان میں نثری وشعری اصناف سخن کے ذریعے اپنی تخلیقات وتحریروں کے سہارے سماج کی اصلاح کرنے میں مشغول رہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ معصوم شرقی ملنسار، مخلص، ہمدرد ونرم مزاج انسان ہیں اور ان کی تحریریں بھی پاکیزہ و سچے فن کی عکاس ہیں۔"

(عکس ادب(اردو) سہ ماہی اورنگ آباد،اپریل تاجون 2019ء۔ شمارہ نمبر 27۔ صفحہ نمبر 34)

ڈاکٹر معصوم شرقی کی ادبی خدمات کے صلے میں انھیں متعدد اعزاز واکرام اور انعامات حاصل ہوئے جن کی تفصیلات اس طرح ہیں۔

☆اعزاز واکرام:

- سابق رکن مغربی بنگال اردو اکادمی، کلکتہ (34 برس)
- ممبر ایڈوائزری کمیٹی" پریشد بارتا" ویسٹ بنگال بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن، کولکاتا
- سکھشا پرسار سمیتی بھاٹ پاڑہ(شمالی کولکاتا)اعزازی مومنٹو1997ء
- "انشاءایوارڈ برائے کلکتہ کا عصری ادب نمبر" اعزازی مومنٹو2000
- ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن: اعزازی مومنٹو2012
- حلقہ سخنوراں ہوڑہ: اعزازی مومنٹو2013ء
- اردو سوسائٹی مٹیا برج" کلکتہ،اعزازی مومنٹو2013

Scanned with OKEN Scanner

- بزم ادب اور تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، چنئی: کاوش بدری ایوارڈ 2015

☆انعامات:

- علامہ رضا علی وحشت ایوارڈ 2013(مغربی بنگال اردو اکادمی) برائے شاعری
- پرویز شاہدی ایوارڈ 2013(بہار اردو اکاڈمی پٹنہ) برائے تنقید
- قاضی عبدالودود ایوارڈ 2014(بہار اردو اکاڈمی) برائے شاعری
- علامہ رضا علی وحشت ایوارڈ 2015(مغربی بنگال اردو اکاڈمی) برائے تنقید
- شانتی رنجن بھٹاچاریہ ایوارڈ 2016(مغربی بنگال اردو اکاڈمی) برائے تحقیقی خدمات
- ادب واحتساب 2016(اتر پردیش اردو اکاڈمی) برائے ادبی خدمات
- علامہ راشد الخیری ایوارڈ 2020(مغربی بنگال اردو اکاڈمی) برائے فن و شخصیت

ڈاکٹر معصوم مشرقی کی عمر 76 برس کی ہو چکی ہے مگر ابھی وہ تھکے نہیں ہیں وہ خود اس بارے میں کہتے ہیں:

کہنے کو سبکدوش تو ہم ہو گئے معصومؔ
اک لمحہ بھی لیکن ہمیں فرصت نہیں ملتی

75 برس کی عمر میں ڈاکٹر معصوم شرقی نے 'سخن زار' کے نام سے رباعیات کا مجموعہ شائع کیا جو نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ قابل رشک بھی ہے۔ کیوں کہ شعری صنف رباعی کا فن مشکل ہے اسی لئے اکثر شعراء اس خار زار وادی میں جانے سے کتراتے ہیں۔ ڈاکٹر فراز حامدی نے رباعی کے موجد پر بات کرتے ہوئے اس فن کے متعلق ایک جگہ تحریر کیا ہے:

" رباعی کی چار مصرعی صنف سخن دراصل شعرائے عجم کی دین ہے، اسے دوبیتی، ترانہ، جفتی اور چار مصرعی سے موسوم کیا جاتا تھا لیکن اب اردو شعراء اسے "رباعی" کے نام سے جانتے ہیں۔ رباعی کا موجد ابوالحسن رودکی ہے چنانچہ اس سلسلے میں غلام محمد بن عیش خوارزمی رقمطراز ہیں کہ عید سعید کے موقع پر رودکی کہیں جارہے تھے کہ راستے میں چند لڑکوں کو جوز بازی کرتے دیکھا، تماشائیوں کا ایک مجمع کثیر وہاں موجود تھا، گیارہ سال کے ایک لڑکے نے جوز کچی میں ڈالے سب کچی میں جا پڑے مگر ایک باقی رہ گیا اور وہ لڑھکنے لگا جس کو دیکھ کر لڑکا بے ساختہ چلا اٹھا۔" غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گور" رودکی نے اس جملے کو عروض کے مطابق موزوں پایا تو اس کے لئے بحر ہزج سے چوبیس اوزان استخراج کئے اور "دوبیتی" کا نام تراشا ملحوظ رہے کہ بحر ہزج کے علاوہ رباعی اگر کسی اور بحر میں کہی جائے گی تو وہ رباعی قطعہ کے زمرے میں آئے گی۔"

(سہ ماہی توازن مالیگاؤں، سلسلہ نمبر 46 ستمبر تا دسمبر 2001ء صفحہ نمبر ۵۵)

☆ڈاکٹر معصوم شرقی کی رباعیات فکر و فن کے کسوٹی پر:

ڈاکٹر معصوم شرقی نے 2023 میں سخن زار کے عنوان سے رباعیات کا اپنا پہلا مجموعہ شائع کیا (152) صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں ڈاکٹر معصوم شرقی کے (250) رباعیات شامل ہیں جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر معصوم شرقی نے ہر صفحے پر دو دو رباعیات سیٹ کی

Scanned with OKEN Scanner

ہیں اگر وہ ہر صفحے پر تین تین رباعیات شامل کرتے تو یہ مجموعہ اور کچھ کم صفحات پر شائع کیا جا سکتا تھا۔ڈاکٹر معصوم شرقی نے اپنے اس مجموعے کو مرشد فن ، مشہور صوفی شاعر محمد سعید سرمد کے نام کیا ہے، جن کی رباعیات سے وہ بے حد متاثر ہیں۔ڈاکٹر معصوم شرقی نے،ایک رباعی محمد سعید سرمد کی نذر کی اور اپنی محبت وعقیدت کا ثبوت دیا یہ رباعی اس طرح تخلیق ہوئی

بر چرخ ادب مثل قمر تھے سرمد
دریائے رباعی کے گہر تھے سرمد
تھا ان کا تصوف سے تعلق معصومؔ
مجموعۂ خوبی و ہنر تھے سرمد

ڈاکٹر معصوم شرقی کی رباعیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کوثر صدیقی (بھوپال) نے تحریر کیا ہے:

" ڈاکٹر معصوم شرقی کی نگاہ بہت وسیع ہے، خیالات کے اظہار و بیان پر قدرت کاملہ ہے۔ لفظیات کے گنج گراں مایہ کے مالک ہیں۔انہوں نے چاہے رباعیوں کا انبار نہ لگایا ہو لیکن جتنی رباعیاں کہی ہیں وہ رباعی کے فنی تقاضوں کے مطابق ہیں۔ان کا ایک فکری نظام ہے۔ موضوعات میں تنوع ہے۔ معصوم شرقی کی رباعیوں میں موجودہ عصر، اس کے مسائل اور نزدیک و دور رونما واقعات وحوادث کے عکس کے ساتھ ان کی گونج بھی ہے۔"

(سخن زار(رباعیات)ڈاکٹر معصوم شرقی۔2023۔ مطبع ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

صفحہ نمبر ۱۱)

عصر حاضر کے حالات کی ڈاکٹر معصوم شرقی اپنے رباعیات میں عمدہ عکاسی کی ہے۔بطور نمونہ یہ چند رباعیات پیش ہیں: .

سہما ہوا انسان سدا رہتا ہے
کب خوف بھلا دل سے جدا رہتا ہے
کس وقت کوئی حادثہ پیش آجائے
ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا ہے

سہما ہوا ، دبکا ہوا، گھبرایا ہوا
پیچیدہ مسائل میں ہے الجھایا ہوا
زندہ ہے مگر زندہ دلی سے عاری
کیوں آج کا انسان ہے مرجھایا ہوا

Scanned with OKEN Scanner

مطلب کے لئے یاروں کی یاری ہے
اس دور میں مشکوک وفاداری ہے
کس طرح کسی کی ہو محبت پہ یقیں
اظہار محبت بھی اداکاری ہے

معدوم محبت کا نشاں ہے بھائی
ہر گام پہ نفرت کا دھواں ہے بھائی
ہیں آدمی دنیا میں تو لاکھوں لیکن
پر آدمیت ان میں کہاں ہے بھائی

اپنا ہو کوئی یا ہو بیگا نہ کوئی
ہمدرد نظر اب نہیں آتا کوئی

اس دور میں ہے سب کو اپنی ہی فکر
دیتا ہے یہاں کس کو سہارا کوئی

ڈاکٹر معصوم شرقی کے رباعیات میں متعدد موضوعات شامل ہیں۔ مختلف موضوعات نے ان کی رباعیوں کو دھنک رنگ بنادیا ہے۔ ڈاکٹر امیر حمزہ (دہلی) نے ڈاکٹر معصوم شرقی کی رباعیات کے موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

" موضوعات کے اعتبار سے معصوم شرقی کی رباعیات کی بات کی جائے تو ان کے یہاں حمد، شہر کلکتہ، جبر و قدر، خود بینی، فطرت، دنیا، زندگی، لوگوں کے ساتھ معاملات زندگی، حالات وطن و دیگر موضوعات کی رباعیاں ملتی ہیں۔"

(سخن زار (رباعیات) ڈاکٹر معصوم شرقی، 2023ء مطبع: ایچ ایس آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی
صفحہ نمبر 20)

ڈاکٹر معصوم شرقی نے حمدیہ رباعیات بھی تخلیق کی ہیں جو دلوں پر گہرا اثر چھوڑتی ہیں۔ اللہ کی تعریف اردو زبان ادب کا ہر شاعر کرتا ہے اور اپنے انداز سے اسے اشعار میں ڈھال ڈھالتا ہے۔ ڈاکٹر معصوم شرقی نے بھی اپنے انداز سے اللہ تعالیٰ کی رباعیات میں اس طرح تعریف کی ہے:

خورشید کے چہرے پہ چمک تیری ہے
تاروں پہ بھی نورانی جھلک تیری ہے
تیرے ہی کرشمے ہیں جہاں میں ہر سو

Scanned with OKEN Scanner

نوخیز گلوں میں بھی مہک تیری ہے

تخلیق اسی کی ہے زمیں ساری دیکھ
باغات میں پھولوں کی حسیں کیاری دیکھ

اڑتی نظر آتی ہیں جو شاخ گل پر
ان تتلیوں کے جسم کی گلکاری دیکھ

سارا ہی عرب تیرا ، عجم تیرا ہے
ہو دیر و کلیسا کہ حرم تیرا ہے
ہے سب پہ ترے رحم و کرم کی بار
ہم پر بھی اے اللہ کرم تیرا ہے

اللہ تعالیٰ نے بنائی دنیا
ہر طرح کی چیزوں سے سجائی دنیا
ہر سمت تھا ایک عالم ہو جب طاری
فردوس مکینوں سے بسائی دنیا

ڈاکٹر معصوم شرقی نے رباعیوں میں بہترین منظر نگاری بھی کی ہے مثال کے طور یہ رباعی پیش ہے:

سبزے پہ عیاں قطرہء شبنم دیکھا
گلشن میں گل و خار کو باہم دیکھا
شاخوں کی لچکتی ہوئی با نہیں دیکھیں
ہر چیز پہ اک حسن مجسم دیکھا

کلکتہ کے نامور شاعر حلیم صابر نے فن رباعی اور ڈاکٹر معصوم شرقی کی رباعیات کو فکر و فن کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے تحریر کیا ہے:

Scanned with OKEN Scanner

" رباعی واحد صنف سخن ہے جس کے چوبیس اوزان شجرۂ اخرب اور شجرۂ اخرم مقرر کئے گئے ہیں۔ زیادہ تر رباعیاں شجرۂ اخرم کی بحر بروزن " لاحول ولا قوۃ الا باللہ " ملتی ہیں۔ معصوم شرقی نے بھی اسی پر زیادہ تر رباعیاں کہی ہیں۔ لیکن شجرۂ اخرم میں بھی ان کی کچھ رباعیاں ملتی ہیں اس سے بحر رباعی سے ان کی واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔"

(سخن زار (رباعیات) ڈاکٹر معصوم شرقی۔ 2023ء۔ مطبع: ایچ ایس آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی بیک پیج)

ڈاکٹر معصوم شرقی کی رباعیوں میں آسان اور عام فہم الفاظ ملتے ہیں۔ حالاں کہ ان کے خیال کی بلند پروازی اتنی نہیں ملتی جتنی رباعی کے فن کے لئے ضروری ہے۔ رباعی کا آخری مصرع زیادہ اہم ہوتا ہے جب تک کہ اس مصرعے کا حق ادا نہ کیا جائے رباعی دل و دماغ پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر معصوم شرقی کی رباعیات میں سادگی، پاکیزگی، سنجیدگی، شگفتگی، شائستگی اور خلوص کے ساتھ محبت ملتی ہے۔ ڈاکٹر معصوم شرقی نے کولکاتا اور مغربی بنگال کو موضوع بنا کر جو رباعیات تخلیق کی ہیں وہ نادر ہیں اور ان رباعیات سے ڈاکٹر معصوم شرقی کی اپنے شہر اور علاقے کی محبت جھلکتی ہے۔ کلکتہ اور مغربی بنگال پر تخلیق کردہ ڈاکٹر معصوم شرقی کی رباعیات فن کے معیار پر بھی پوری اترتی ہیں اس لئے یہ زیادہ اہم ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر معصوم شرقی نے اپنے مجموعے میں سب سے پہلے اسی موضوع کی رباعیوں کو شامل رکھا ہے، بطور نمونہ چند رباعیات پیش ہیں:

آماج گہہ علم و ہنر کلکتہ
ہے وحشتؔ و پرویزؔ کا گھر کلکتہ
اس شہر سے ہے نسبت قلبی مجھ کو
رکھتا ہے مجھے محوِ سفر کلکتہ

آنکھوں میں ہے آباد سدا خواب جنوں
دیتے ہیں ہمیں داد جو ارباب جنوں
کرتا ہے جہاں اہل جنوں کی تعظیم
بخشا ہے اسی شہر نے آدابِ جنوں

شہر کلکتہ کی نہیں کوئی نظیر
ہر سمت ہے خوباں کی نمایاں تصویر

معروف ہے زلف بنگالہ کی چھاؤں
تھے حسن طرحدار کے غالبؔ بھی اسیر

Scanned with OKEN Scanner

پیارا نہ بھلا کیوں ہم کو ہو بنگال
رکھتا ہے پر سکون جو ہم کو بنگال
ملتا ہے سبق نذرلؔ وٹیگورؔ سے وہ
دیتا ہے ہمیں درس وفا جو بنگال

ہے ہم کو جی جان سے پیارا بنگال
ہے اپنے جینے کا سہارا بنگال
اس بات کو سوچے گا کل سارا جہاں
جو سوچتا ہے آج ہمارا بنگال

ابتدائی وار تقائی دور کے رباعیات تخلیق کرنے والے شعرا میں قلی قطب شاہ، ملا وجہی، میر تقی میر، مصحفی، حسرت لکھنوی، میر انیس، درد، الطاف حسین حالی، امجد حیدر آبادی، جگت موہن لال رواں، جوش ملیح آبادی، یگانہ، فراق، اور عصر حاضر کے شاہ حسین نہری، ڈاکٹر اسامہ ابن آدم، ڈاکٹر یوسف صابرؔ اور ڈاکٹر معصوم شرقی بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر معصوم شرقی نے رباعیات کا مجموعہ شائع کر کے اردو ادب کی تاریخ میں رباعیات کے حوالے سے خود کو درج کر لیا ہے۔ مقبول احمد مقبول، ناوک حمزہ پوری، فرحت حسین خوشدل اور ان جیسے کئی متعدد نامور شعراء ہیں جنوں نے صنف رباعی کی تخلیق میں اپنے انمٹ نشان چھوڑے۔ رباعی گو میں ایسے شعراء بھی شامل ہیں جنہوں نے رباعیوں کے دیوان شائع کئے۔ ان میں شاہ حسین نہری اور ڈاکٹر اسامہ ابن آدم بھی ہیں۔ ڈاکٹر معصوم شرقی نے اپنے رباعیوں میں خود کے اوصاف بھی بیان کئے ہیں، چند رباعیاں بطور نمونہ پیش ہیں۔

نظروں سے زمانے کی نہ مقصود رہا
میں محفل دنیا میں موجود رہا
تھا دل میرا بغض و حسد سے خالی
لیکن اے معصومؔ میں محسود رہا

سانسوں میں مری فکر و تخیل ہے ضم
کرتے ہیں عطا قرطاس و تحریک و قلم
معصوم مری جان ہے تخلیق ادب
لکھوں نہ اگر میں تو نکل جائے دم

Scanned with OKEN Scanner

ڈاکٹر معصوم شرقی نے محنت، محبت، نفرت، تعصب، خودداری، مطلب پرستی، خوش فہمی، انسانی فطرت، جدوجہد اور حوصلے کے علاوہ بھی کئی موضوعات پر رباعیات تخلیق کی ہیں۔ڈاکٹر معصوم شرقی ادب برائے زندگی کے قائل ہیں، ان کی رباعیات بھی ادب برائے زندگی کی عکاس ہیں۔ڈاکٹر معصوم شرقی، حالی سے قریب نظر آتے ہیں۔

تلخیص:(Summery)

ڈاکٹر معصوم شرقی نے پچاس سے زائد برسوں تک اردو زبان وادب کی زلفیں سنواری ہیں۔ڈاکٹر معصوم شرقی ادب برائے زندگی کے قلم کار ہیں۔ان کی رباعیات بھی ادب برائے زندگی کی عکاس ہیں۔ڈاکٹر معصوم شرقی کا کلام مبالغہ آرائی سے پاک نظر آتا ہے۔ڈاکٹر معصوم شرقی کی رباعیات میں پاکیزگی، شائستگی، نرمی، حقیقت نگاری، نصیحت، سادگی، تصوف کا رنگ، فلسفہ، زندگی کے مسائل، زوال انسانیت، فن کی پختگی، سنجیدگی، درس اخلاق اور سماج کے اصلاحی پہلو ملتے ہیں۔ڈاکٹر معصوم شرقی نے اردو زبان وادب کی انتہائی محنت، لگن وخلوص کے ساتھ خدمت کی، وہ خود اس بات کو اپنی ایک رباعی میں کہتے ہیں :

لیلیٰ فن کو بھی نکھارا برسوں
گیسوئے سخن کو بھی سنوا را برسوں
حمد و نعت و قطعہ ، رباعی و نظم
کرتا رہا میں مشق گوارا برسوں

ڈاکٹر معصوم شرقی نے یوں تو متعدد موضوعات پر رباعیات تخلیق کی ہیں مگر حالات حاضرہ پر انھوں نے زیادہ توجہ دی ہے۔ڈاکٹر معصوم شرقی نے سماج میں ہو رہی برائیوں اور غلط کاموں پر چوٹ کی ہے۔ڈاکٹر معصوم شرقی نے دوسرے موضوعات کے مقابلے میں عصر حاضر کے حالات پر زیادہ رباعیاں تخلیق کی ہیں اور سماج کو آئینہ دکھایا ہے، اس موضوع کی پر یہ بھی رباعیات 'سخن زار' میں شامل ہیں۔

نفرت کی وبا دل میں پلے گی کب تک
تخریب کے سانچے میں ڈھلے گی کب تک
لرزاں ہیں در و بام محبت معصوم
آندھی یہ تعصب کی چلے گی کب تک

ماحول محبت کا بنایا جائے
نفرت کے چراغوں کو بجھایا جائے
دینا ہے مساوات و اخوت کو فروغ

Scanned with OKEN Scanner

دنیا سے تعصب کو مٹایا جائے

عاصی کا ہو چہرہ کہ ولی کا چہرہ
مشکوک نظر آیا سبھی کا چہرہ
ہر چہرے پہ اک چہرہ کسی کا دیکھا
ہے آج کہاں اپنا کسی کا چہرہ

"سخن زار" میں اپنی بات کے تحت ڈاکٹر معصوم شرقی نے فن رباعی کے تعلق سے بڑا اچھا بیان رقم کیا ہے۔ اسی بیان کو تحریر کر کے اس مقالے کو ختم کرتے ہیں۔

" رباعی کی دنیا میں قدم رکھنا برہنہ پا ایک خارزار میں پاؤں رکھنے کے مترادف ہے۔ رباعی ایک تخلیقی اور عروضی عمل ہے جس کے اظہار کے لئے سخت ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے اس فن کو فن کی طرح برتا ہے اور بصیرت وبصارت سے انصاف کی پوری کوشش کی ہے۔ ادب کی دنیا میں رباعی ایک مقبول ومشہور صنف ہے اور اس کی مقبولیت وشہرت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مختصر ہونے کے باوجود اس میں معنویت اور جامعیت کا ایک وسیع جہاں پوشیدہ ہوتا ہے۔"

(سخن زار (رباعیات) ڈاکٹر معصوم شرقی۔ 2023۔ صفحہ نمبر ٦)

☆☆☆

☆کتابیات

1. عکس ادب (اردو) سہ ماہی اورانگ آباد۔ اپریل تا جون 2019، شمارہ 27
2. سہ ماہی توازن، مالیگاؤں سلسلہ نمبر 46۔ ستمبر تا دسمبر۔ 2019
3. سخن زار (رباعیات) ڈاکٹر معلوم شرقی 2023ء
4. جدید شاعری کے ارتقار میں غیر مسلم شعراء کا حصہ۔ ڈاکٹر یوسف صابر۔ 2016
5. دیوان حالی۔ پبلشرس: رام نرائن لال کمار۔ 1985ء
6. تاریخ ادب اردو۔ علیم صبا نویدی۔ 2006
7. اسباق ادب۔ ڈاکٹر سید عقیلہ غوث۔ 2020

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

جھارکھنڈ میں اردو غزل کی منفرد آواز: اختر مدھوپوری

ڈاکٹر جہانگیر احمد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو،
آر۔ایس۔مور کالج،
گووند پور، دھنباد، جھارکھنڈ۔

تلخیص: اختر مدھوپوری کی غزلیہ کائنات میں روایت سے جڑاؤ بھی ہے اور نئی راہوں کی تلاش بھی۔ انہوں نے اپنے فکر و فن کے امتزاج سے نت نئے جہان معانی وا کئے اور غزل کو تازگی بخشی۔ ان کو مشرقی اقدار، اپنی مٹی کی خوشبو اور تہذیبی جڑوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان کے شعری نقوش میں عملی زندگی کے وہ صدہا تجربات اجاگر ہیں جن کو انہوں نے زندگی کے تلخ حقائق سے روبرو ہو کر حاصل کئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں یاس و ناامیدی کے ساتھ عزم و حوصلہ بھی ہے۔ ان کی حسیت محض اپنی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں ایک عالم شامل ہے۔ ان کی غزلوں کے موضوعات عام طور پر معرفت و تصوف، حیات و کائنات اور اخلاقیات و فلسفہ پر محیط ہیں۔ اختر مدھوپوری کی غزلوں میں احساسات، خیالات، معنی آفرینی اور طرز بیان کی تازگی قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شاعرانہ تدبیر کاری سے باخبر ہیں بلکہ شاعری کی بھرپور تفہیم، تحسین اور جمالیاتی قدروں سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فحاشی یا سوقیانہ پن کا کوئی گزر نہیں ہے۔ ان کی شعری بساط میں تہ دار اور باالواسطہ اسلوب کے بجائے متوازی بیانیہ اور بظاہر اکہرے اسلوب میں بھی اعلیٰ درجہ کی شاعری کے عناصر موجود ہیں۔ اختر مدھوپوری کا شعری مجموعہ "کلیات اختر" ہے۔

کلیدی الفاظ: غزل، مطلع، قطعہ بند، مقطع، وزن، بحر، قافیہ، ردیف، تغزل

شہود الحق اختر مدھوپوری جھارکھنڈ کے شعرا میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ 18/جنوری، 1929 کو مدھوپور، ضلع دیوگھر، بہار میں پیدا ہوئے اور 7/فروری، 1996 کو اس دار فانی سے کوچ کر کے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اختر مدھوپوری کی طبیعت میں شوخی اور فکر میں رعنائی تھی۔ حق گوئی اور بیباکی ان کی ذات کا غالب عنصر تھا جس کی وجہ سے وہ سچ کے برملا اظہار سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ دوران تعلیم ہی ان کا ادبی ذوق و شوق پروان چڑھنے لگا تھا جس کو شعراء کی صحبتوں اور مدھوپور کی پر کیف و پر بہار فضا نے مرور وقت کے ساتھ اور گہرا کر دیا تھا۔

Scanned with OKEN Scanner

فنون لطیفہ میں ہر فن کی اپنی امتیازی خصوصیات ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ دوسرے تمام فنون سے ممتاز ہوتا ہے۔ شاعری جو لطیف انسانی جذبات و احساسات کی اظہاریہ ہے اور جس کو صدیوں سے کسی قوم کی تہذیبی ارتقاء کا ایک پیمانہ گردانا گیا ہے، اس کی بھی اپنی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ان میں ایک اہم خصوصیت اس کا الہامی ہونا ہے۔ اردو کے عظیم شاعر اسد اللہ خاں غالبؔ شاعری کی اسی خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ، نوائے سروش ہے

لیکن شعر و شاعری میں صرف مضامین ہی اہم نہیں ہوتے بلکہ اس میں الفاظ کا دروبست اور انداز بیان بھی مساوی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ شاعری الفاظ کے توسط سے وجود میں آتی ہے اس لئے اگر خیالات بلند و بالا ہوں مگر اس کو پیش کرنے والے الفاظ سبک و شیرین نہ ہوں یا ان کو سلیقے سے استعمال نہ کیا ہو تو اعلیٰ خیالات بھی وہ لطف و تاثیر پیدا نہیں کر پاتے جو دل کو چھو سکیں۔ شعر و سخن کے اسی اہم نکتہ کو بیاں کرتے ہوئے اردو کے نامور شاعر خواجہ حیدر علی آتشؔ نے، جو اپنی شاعری میں زبان کا حسن اور رعنائی کی وجہ سے جانے جاتے ہیں، کہتے ہیں:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے، آتش مرصع ساز کا

شاعری کی شعریات میں ان دو نکات کا اہم کردار ہے۔ اگر کوئی شاعر و سخنور ان نکات کی روشنی میں اپنے فن کا اعتراف کرا پانے میں کامیاب ہو جائے تو وہ اپنی شاعری میں حیات جاوداں پا سکتا ہے۔ ایک کامل شاعر کی طرح اخترؔ مدھوپوری نے بھی تمام اصناف شعر و سخن میں طبع آزمائی کی اور اپنی جدت طراز خلاقانہ ذہن و دماغ سے کام لے کر شعر و سخن کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔ ان کے اثاثۂ شاعری میں حمد و نعت، منقبت، غزل، نظم، رباعی، قطعہ وغیرہ سبھی شامل ہیں اور سبھی اصناف شاعری کو انہوں نے سلیقہ مندی اور فنی مہارت کے ساتھ برتا ہے۔ لیکن ان کا اصل میدان، غزل گوئی ہے۔ اردو شاعری کی آبرو، غزل اپنے اندر بے انتہار عنائی، دلکشی اور تاثیر رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے کے نامساعد حالات اور تنقید کے تیر و نشتر کے باوجود آج بھی غزل پوری شان و شوکت کے ساتھ عصری حسیت کی معیت میں آگے بڑھنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عوام میں اردو کی مقبولیت بڑھانے میں غزل کے ایجاز و اختصار، رمز و ایما، بلاغت و غنائیت اور دریا کو کوزے میں سمیٹنے کی صفت کا ہی سب سے بڑا کردار ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی:

"غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے اور دونوں کو سمت و رفتار ایک دوسرے سے حاصل ہوئی ہے۔" (1)

غزل کی شدید رمزیت، داخلیت، ماورائیت اور کلیت اسے خاص بناتی ہے۔ غزل کے ہر شعر کے اختصار میں وہ جامعیت ہوتی ہے جو قاری کے لیے مختلف جہان معانی وا کرتی ہے۔ غزل میں بظاہر اجمال و اختصار ہوتا ہے لیکن اس میں پنہا معانی ہمہ گیر ہوتے ہیں۔ جس طرح دیگر اصناف میں تفصیل یا صراحت کامیابی کی شرط ہے، اسی طرح غزل میں اجمال اور کلیت کامیابی کی اولین شرط ہے۔ اسی بات کو وزیر آغا یوں کہتے ہیں:

Scanned with OKEN Scanner

''غزل کے شعر میں بات اشارے کنائے سے آگے نہیں جاتی۔اس میں تخیل اور تجزیئے کا وہ عمل مفقود ہے جو نظم میں ابھرتا ہے۔ یہ غزل کا نقص نہیں بلکہ اس کے مزاج کی ایک کیفیت ہے اور اسی میں غزل کا سارا حسن پوشیدہ ہے۔ ایمائیت اور رمزیت کا یہ عمل خود کو ہزار روابط اور تشبیہات واستعارات میں اجاگر کرتا ہے۔'' (2)

غزل میں تعمیم کا پہلو آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتا ہے جس سے ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق شاعر کی روداد کو اپنی روداد سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ غزل کے دو مصرعوں میں کسی واقعہ کی پوری تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی ہے اس لئے غزل کا شاعر مختلف طریقوں سے اس واقعے کی شدت کو قاری تک منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وزیر آغا کے بقول:

''غزل بت پرستی کی ایک صورت بھی ہے اور بت شکنی کا ایک عمل بھی۔ اس میں جز کا تحرک بھی ہے اور کل کا تھپک کر سلا دینے والا ہاتھ بھی۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ غزل میں ان دونوں پہلوؤں کا بیک وقت وجود ضروری ہے۔ جہاں ایسا نہیں ہوتا اور وہ کسی ایک پلڑے کی طرف واضح طور پر جھک جاتی ہے تو اس سے غزل کا مزاج بری طرح مجروح ہوتا ہے۔ اردو غزل کے تدریجی ارتقا میں ایسے ادوار بھی آئے ہیں جن میں غزل 'توازن' کی اس صفت کو برقرار نہیں رکھ سکی اور اس لیے کبھی تو خالص بت پرستی اور کبھی خالص تخیل پسندی کی رو میں بہہ گئی۔ تاہم بحیثیت مجموعی اس نے اپنی بنیادی صفت سے انحراف نہیں کیا۔ اردو غزل کی کامیابی کی وجہ جواز یہی ہے۔'' (3)

ہیئت کے اعتبار سے غزل ایک پابند نظم ہے جس کے ہر شعر کا دوسرا مصرع ہم قافیہ اور اکثر ہم ردیف ہوتا ہے۔ غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور مردف غزل کی صورت میں ہم ردیف بھی ہوتے ہیں۔ ایک سے زیادہ مطلع ہو تو دوسرے مطلع کو حسن مطلع کہا جاتا ہے۔ غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص شامل کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ غزل کے اشعار اور ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم وزن بھی ہوتے ہیں۔ وزن طے کرنے کے لیے بحریں تخلیق کی گئی ہیں جن میں کچھ بڑی بحریں ہیں اور کچھ چھوٹی بحریں۔ مسعود حسین خان مطلع، ردیف، قافیہ، مقطع اور بحر کو ہیئت کے اعتبار سے غزل کے اجزائے ترکیبی مانتے ہیں۔ یوں تو غزل میں مقطع کا التزام ضروری نہیں ہے لیکن اس کے سرمایے میں بغیر مقطع کی غزلیں بہت کم ہیں۔ مطلع اور مقطع غزل کے لازمی عناصر میں شمار نہ ہونے کے باوجود اس قدر کثیر الاستعمال ہیں کہ ان کے بغیر غزل نامکمل سی محسوس ہونے لگتی ہے اور ان کے وجود سے غزل کی ہیئت کی شناخت میں آسانی ہو جاتی ہے۔

غزل کی ہیئت کو طے کرنے میں وزن اور قافیہ کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ بحر، قافیہ اور ردیف کے امتزاج سے غزل کی زمین تیار ہوتی ہے۔ بحر کے ساتھ قافیہ و ردیف کی نحوی مناسبت سے غزل کی زمین رواں و سبک ہوتی ہے۔ بحر، قافیہ اور ردیف سے غزل کا بنیادی تعلق ہوتا ہے کیونکہ بحر کے صوتی نظام میں ہی قافیہ و ردیف کے صوتی و نحوی تصرف سے غزل کے شعر کی تعمیر ہوتی ہے۔ کلام موزوں کے لیے وزن لازمی ہے اور وزن کی بنیاد ارکان ہیں۔ ارکان کے مناسب امتزاج سے بحر وجود میں آتی ہے۔ اردو شاعری میں بنیادی طور پر عربی ارکان اور ان کے مخصوص امتزاج سے بنی ہوئی بحریں

Scanned with OKEN Scanner

رائج ہیں۔ چونکہ یہ بحریں فارسی شاعری کے توسط سے اردو شاعری میں داخل ہوئیں اس لئے وہی بحریں اردو میں رائج ہیں۔ بحر کے ارکان پنج حرفی یا سات حرفی ہوتے ہیں جنہیں ارکان افاعیل کہتے ہیں۔

جس طرح بحر، قافیہ، مطلع اور مقطع غزل کی ہیئت کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں اسی طرح سے غزل کے کچھ فنی ضروریات بھی ہیں۔ غزل کا ہر شعر موضوعی اعتبار سے مکمل وحدت کا متقاضی ہوتا ہے اور ایک غزل کے تمام اشعار خیال و موضوع کے لحاظ سے متنوع ہو سکتے ہیں۔ غزل کے اشعار کی یہی داخلی خصوصیت غزل کی شناخت کا اہم وسیلہ بنتی ہے۔ غزل کی تمام نازک خیالی اور فنی بلندی تغزل اور اعجاز و اختصار کی مرہون منت ہے جو غزل کی داخلی ہیئت اور شاعر کی فنی صلاحیتوں کے حسین امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی امتزاج سے شعر میں سادگی، اصلیت اور اثر آفرینی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے ایس۔ ساجد بخاری لکھتے ہیں:

> "چونکہ غزل ہمارے جذبات و احساسات کی فطری غماز ہے اور مشرقی جذبات فطری طور پر موسیقیت کی گرفت میں ہوا کرتے ہیں۔ خوشیوں میں گنگنا اور غموں میں بین کرنا مشرقی مزاج کا فطری تقاضہ ہے لہٰذا اوزان و بحر سے پیدا شدہ غزل کی نغمگی جذبات کے اظہار میں انتہا درجہ کی اثر انگیزی پیدا کرتی ہے۔" (4)

غزل ہماری جمالیاتی حسیات کا لطیف ترین اظہاریہ اور ہمارے سماجی و ثقافتی سفر کا ماحصل ہے۔ غزل عربی قصیدہ کے بطن سے پیدا ہوئی۔ عربی قصیدے کے تشبیب کے اشعار عشقیہ مضامین اور غنائیت کی بنا پر بے حد پر کشش ہوتے تھے۔ جب قصیدہ ایران پہونچا تو فارسی قصیدے نے بھی اس کی تقلید کی۔ خصوصا قصیدے کی 'تشبیب یا نسیب' کے مضامین، ایرانیوں کے مزاج کے موافق ثابت ہوئے۔ سب سے پہلے فارسی کے مشہور شاعر رودکی نے ان موضوعات کو قصیدے سے الگ کر کے غزل کو ایک صنف سخن کی حیثیت دی اور اسے غزل کا نام دے کر ادب میں ایک نئی صنف کا آغاز کیا۔ جب اردو شاعری کا آغاز ہوا تو فارسی شاعری کی دیگر اصناف کے ساتھ غزل بھی پوری آب و تاب کے ساتھ اردو ادب میں داخل ہوئی۔ اس کی مسحور کن جذباتیت، داخلیت اور غنائیت نے اردو شعراء کو فورا اپنی جانب متوجہ کر لیا اور انہوں نے ابتدا ہی سے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ غزل کی تخلیق کے دوران، شاعر کو اگر کوئی وسیع خیال اس بات پر مجبور کر دے کہ اس زمین میں اسے ادا کیا جائے مگر دو مصرعوں کا ظرف اس خیال کی وسعت کے لیے تنگ ہو جائے تو شاعر متعدد اشعار میں تسلسل کے ساتھ اس وسیع خیال کو پھیلا کر 'قطعہ بند' کے نام سے شامل غزل کر سکتا ہے۔ ہندو پاک میں غزل کی روایت بہت مستحکم ہے۔ ابوالکلام قاسمی کے بقول:

> "برصغیر میں فارسی اور اردو غزل کی روایت کئی صدیوں کو محیط ہے۔ اس پورے عرصے میں زبان و بیان کے متنوع طریقہ کار کے ساتھ ساتھ، غزل کی شاعری میں فکری اور موضوعاتی تنوع کو بھی خاصا دخل رہا ہے۔ تاہم اس تنوع کو ہم کسی خاص مقام اور علاقے سے وابستگی کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔ غزل ایران میں بھی کہی گئی اور برصغیر کے دوسرے ادبی مراکز میں بھی۔ مگر فنی اور فکری اعتبار سے غزل کی پوری تاریخ میں ایک ایسا تسلسل ملتا ہے جس سے اس صنف سخن کی تہذیبی اور ثقافتی مرکزیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔" (5)

Scanned with OKEN Scanner

اختر مدھوپوری کی غزلیہ کائنات میں روایت سے جڑاؤ بھی ہے اور نئی راہوں کی تلاش بھی۔انہوں نے اپنے فکر و فن کے امتزاج سے نت نئے جہان معانی واکئے اور غزل کو تازگی بخشی۔ان کو مشرقی اقدار، اپنی مٹی کی خوشبو اور تہذیبی جڑوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ان کے شعری نقوش میں عملی زندگی کے وہ صدہا تجربات اجاگر ہیں جن کو انہوں نے زندگی کے تلخ حقائق سے روبرو ہو کر حاصل کئے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں یاس و ناامیدی کے ساتھ عزم و حوصلہ بھی ہے۔ان کی حسیت محض اپنی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں ایک عالم شامل ہے۔یہ ممکن ہو سکا ہے ان کے تجربے، انوکھے لہجے اور نئے طریق اظہار کی بدولت جس میں ایک باشعور فنکار کے احساسات اور غور و فکر کا عکس واضح طور پر عیاں ہے۔ان کی غزلوں کے موضوعات عام طور پر معرفت و تصوف، حیات و کائنات اور اخلاقیات و فلسفہ پر محیط ہیں۔اختر مدھوپوری کی غزلوں میں احساسات، خیالات، معنی آفرینی اور طرز بیان کی تازگی قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ان کی شاعری کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شاعرانہ تدبیر کاری سے باخبر ہیں بلکہ شاعری کی بھرپور تفہیم، تحسین اور جمالیاتی قدروں سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ان کی غزلوں میں فحاشی یا سوقیانہ پن کا کوئی گزر نہیں ہے۔ان کی شعری بساط میں تہ دار اور باالواسطہ اسلوب کے بجائے متوازی بیانیہ اور بظاہر اکہرے اسلوب میں بھی اعلی درجہ کی شاعری کے عناصر موجود ہیں۔اختر مدھوپوری کا شعری مجموعہ ''کلیات اختر'' ہے۔اس کی پہلی غزل کے چند اشعار دیکھئے:

شعاع عقل کا جس سمت انعکاس گیا
ادھر کبھی نہ توہم زدہ قیاس گیا
فریب خوردہ ہے کس درجہ عہد نو کا بشر
بجھانے چاند کے جھرنوں پہ اپنی پیاس گیا
ورق ورق مجھے پڑھنا محال تھا اختر
جو آیا پڑھ کے فقط میرا اقتباس گیا

ان اشعار کو جز کی شکل میں نہیں، بلکہ بصورت کل پڑھئے، انسانی رویہ کا منظر نامہ سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ کس طرح یہ اشعار آفاقی ہو جاتے ہیں اور اختر مدھوپوری کی شاعری کی فکری و تخیلی پرتیں کھلتی ہیں۔چونکہ غزل زمز و ایما کا صنف ہے اور اس کا اعجاز بھی یہی ہے کہ چند لفظوں کے دروبست سے ایک وسیع خیال کو بیان کر دیا جائے، اس لئے غور و فکر اور عقل و خرد کا صحیح استعمال کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرتی ہے۔ان اشعار سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اختر مدھوپوری کی سب سے اہم خوبی سہل و رواں زبان اور محاوروں پر ان کی دسترس اور بندش کی چستی ہے۔ہاں یہ الگ بات ہے کہ اس خوبی کا استعمال رسمی مضامین، خیال بندی اور لسانی ہنر مندی تک محدود ہے۔نیز ان اشعار میں اس تخلیقی حدت کی بھی کمی نظر آتی ہے جو تجربے کی قلب ماہیت کر دے، اس وجہ سے اکثر تجربے محض سماجی یا واقعاتی حوالے بن کر رہ جاتے ہیں۔تاہم یہ بات بھی درست ہے کہ ان میں اختر مدھوپوری کی تخلیقی شخصیت کے نمایاں پہلو بھی دکھائی دیتے ہیں۔

غزل انتہائی ایمائی صنف شاعری ہے۔اشاریت کی بلاغت اور ابہام کی معنی خیزی غزل کا حسن ہے۔اس لئے چھوٹی بحر میں شعر کہنا اور اس کو خوش اسلوبی کے ساتھ نبھالینا کسی بھی شاعر کے لئے ایک آزمائش ہوتی ہے۔اگر وہ اس خاردار وادی سے صحیح سلامت گزر جانے میں کامیاب ہو جائے تو یہ اس کی

Scanned with OKEN Scanner

کامیابی کی ضامن ہے۔ میر و غالب اور دیگر اکابرین شعرا نے چھوٹی بحروں میں لازوال غزلیں کہی ہیں۔ اختر مدھوپوری نے بھی چھوٹی بحر میں اشعار کہے ہیں اور ایسے امکانات کو روشن کیا ہے جو مختلف احساسات کے حامل ہیں۔ ان احساسات میں واردات قلبی کا انداز بڑا دلنشیں ہے۔ دیکھئے چند اشعار:

مظلوموں کی آہ نہ لو تم
قہر و غضب للہ نہ لو تم
تیرہ شبی میں جی لو لیکن
قرض ضیائے ماہ نہ لو تم
غوطہ زنی سے باز نہ آؤ
جب تک دریا تھاہ نہ لو تم
چاروں جانب آگ لگی ہے
تنہا گھر کی راہ نہ لو تم
اختر مہر و ماہ کی صورت
کام کرو تنخواہ نہ لو تم

مذکورہ تمام اشعار میں فکری معنویت پوری شادابیت کے ساتھ اپنا برملا اظہار کر رہی ہے۔ غزل کے مضامین میں رنگا رنگی اور تنوع پیدا کرنے میں تخیل کی جدت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جدت تخیل شاعر کو نئے نئے مضامین کی تلاش میں سرگرداں رکھتی ہے اور نئے انداز بیان پیدا کرتی ہے۔ مذکورہ اشعار میں بھی مضامین کی رنگا رنگی اور جدت تخیل کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ پہلے شعر میں اس اسلامی عقیدہ کی گونج سنئے کہ مظلوم کی آہ سے عرش معلیٰ بھی ہل جاتا ہے اور ظالم پر اللہ تعالی کا قہر و غضب نازل ہوتا ہے۔ اس شعر میں جس طرح مظلوموں کی آہ کے ساتھ قہر و غضب کا استعمال کیا گیا ہے وہ لفظی تلازمات کے اہتمام کا ادراک کراتا ہے اور پورا شعر اپنے آپ میں ایک مکمل استعارہ بن جاتا ہے۔ دوسرے شعر میں بھی بشری انا کے اظہار کے لیے لفظی تلازمات کا اہتمام ملتا ہے اور تیرہ شبی کے ساتھ ضیائے ماہ کا تخلیقی استعمال اس کے معنوی وسعتوں کو وا کرتا ہے۔ تیسرے شعر میں ہمت مرداں اور عزم انساں کی گہرائی و گیرائی کا دلکش بیان تو ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہی ہے نیز غوطہ زنی اور دریا جیسے لفظی و معنوی تلازمات کے اہتمام نے معانی کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے جس کے ساتھ ایک متحرک، حسی پیکر بھی شامل ہو گیا ہے۔ چوتھے شعر کو موجودہ عہد کے نامساعد حالات، فرقہ وارانہ منافرت اور قومی بیگانگی کے پس منظر میں پڑھئے اور یہ محسوس کیجئے کہ کس طرح کوئی اعلی نمونہ فن، زمان و مکان کے حدود سے ماورا ہو کر عالمی و آفاقی بن جاتا ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں بھی اس طرح کے حالات امن و شانتی کے لٹیروں کے ذریعہ پیدا کئے جائیں گے، یہ شعر اپنی معنویت دیتا رہیگا اور غزل کا مقطع Prevailed lethargy یعنی مروج فرض بیزاری کے پس منظر میں پڑھئے تو یہ تلقین کتنا اہم ہو جاتا ہے اور گو کہ اس میں اختر مدھوپوری نے خود اپنی ذات کو مخاطب کیا ہے لیکن یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ یہ خطاب عام ہے جس پر عمل آرا ہو کر ہی کوئی قوم عروج و بلندی کے اعلیٰ مقام پر

Scanned with OKEN Scanner

فائز ہو سکتی ہے۔اس چھوٹی بحر میں بھی استعارہ سازی، لفظی و معنویاتی تلازمات کے استعمال اور متحرک حسی پیکروں کی تخلیق نے ان اشعار کو لازوال بنا دیا ہے۔کچھ اور غزلوں کے نمائندہ اشعار پیش ہیں:

تیرگی میں جدھر جاؤں
روشنی سا بکھر بکھر جاؤں

تو میرا آئینہ ہے سامنے آ
میں تیرا عکس ہوں نکھر جاؤں

جس پہ ہے آشیاں اسی پہ رہوں
میں بھلا کیوں شجر شجر جاؤں

میں ہوں آواز بازگشت اپنی
جس طرف چاہوں میں ادھر جاؤں

اب اسی میں ہے خیریت اخترؔ
میں خموشی سے اپنے گھر جاؤں

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ ان میں نہ تو روایتی معشوق ہے نہ اس کا سراپا بلکہ زندگی کے گہرے تجربے ہیں۔ حقیقی زندگی کا زخم و درد ہے اور اس درد کا احساس ہے جو فرد اور معاشرے سے جڑا ہوا ہے۔ان اشعار میں اسلوب کی تازہ کاری، ندرت خیال اور پرواز تخیل نہایت خوبی سے ادا ہوئی ہے۔ان میں شاعری کی روایتی لفظیات سے استفادہ تو ملتا ہے لیکن شاعر کا انفرادی رنگ بھی نمایاں ہے۔اخترؔ مدھوپوری اردو غزل کے روایتی سرمایے میں عشق و محبت کے متعین رویوں، عشق حقیقی و عشق مجازی کو پیش کرنے کی ہنر مندی، لسانی سطح پر مناسبات لفظی کے اہتمام اور مخصوص موضوعات کی ترجمانی کے لیے متعین لفظیات سے پوری طرح واقف تھے۔ لیکن انہوں نے غزل کی روایت پر عمل کرتے ہوئے جدید تفکرات کو بھی گلے لگایا ہے جس سے ان کی غزلوں میں نئے رجحانات اور عصری مطابقت بھی داخل ہو گئی ہے۔

آپ بیتی کو کہانی لکھ دیا
آگ کو بھی ہم نے پانی لکھ دیا

زخم دل اپنا ہرا تھا اس لئے
ہم نے ہر موسم کو دھانی لکھ دیا

ہم نے ساون کی بھری برسات کو
ہجر کی ماری جوانی لکھ دیا

جس نے اختر اپنی کر لی ہے شناخت

Scanned with OKEN Scanner

وقت نے بھی اس کو گیانی لکھ دیا

ان اشعار میں روز مرہ کے عام انسانی معاملات کا خوبصورت اظہار ہے۔ان میں کوئی فلسفیانہ موشگافی نہیں ہے تاہم اظہار کا انداز اتنا توانا اور برجستہ ہے کہ بے ساختہ شاعر کو داد و تحسین دینے کو جی چاہتا ہے۔ان اشعار کی اشاریت ورمزیت،تاثیری کیفیت اور احساس جمال قاری کو متاثر کرتا ہے۔ان میں مقامی ماحول اور گنگا جمنی تہذیب کا جمالیاتی حسن بھی موجود ہے اور رمزیت،ایمائیت اور مشرقی طرز احساس بھی۔غزل کی ہیئت میں ردیف کے استعمال کا بنیادی مقصد، تمام اشعار کو ایک آہنگ کے تابع کرنا ہے تاکہ ردیف کے باعث غزل کے اشعار کی ریزہ خیالی زیادہ نمایاں نہ ہو اور غزل کے پس منظر کا حصہ معلوم ہو۔اس حوالے سے بھی اگر اختر مدھوپوری کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو بھی وہ اپنے فن میں کھرے اترتے ہیں۔ان کی زیادہ تر غزلیں مردف ہیں۔کچھ اور اشعار ملاحظہ کیجیے:

حصار ذات سے باہر نکل پڑا ہوں میں
سمجھ میں آج یہ آیا بہت بڑا ہوں میں

سنا ہے وقت نے اک موڑ لے لیا ہے نیا
جہاں بھی لشکر حالات سے لڑا ہوں میں

میں برگ سبز تھا کب یوں ہی ٹوٹنے والا
کسی نے ضرب لگائی تو گر پڑا ہوں میں

منار نور کی مانند ہے وجود میرا
اندھیری راتوں میں جلتا ہوا کھڑا ہوں میں

سنبھل کے کام میں لانا خریدنے والے
لگے نہ ٹھیس کہ شیشے کا اک گھڑا ہوں میں

صبا صفت میری خصلت سرشت موم صفت
غلط مزاج کا اختر بہت کڑا ہوں میں

ان اشعار سے عیاں ہوتا ہے کہ اختر مدھوپوری نے محض مروجہ موضوعات کا ہی تتبع نہیں کیا ہے بلکہ اپنے مشاہدے سے نئے امکانات کی طرف بھی قدم بڑھایا ہے۔یہ روش ایک صحت منداور پر عزم ذہنیت کی دلیل ہے جس سے اختر مدھوپوری نے اردو غزل میں اعلیٰ ذوق کی بنیادوں کو مستحکم کیا ہے۔ان کی غزلوں میں علامتوں کا بھی خوبصورت استعمال ہوا ہے جس کو انہوں نے مختلف پیکروں میں کہیں ایک ساتھ اور کہیں علاحدہ علاحدہ بھی فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ان اشعار میں صرف جذبات وتاثرات ہی نہیں ہیں بلکہ نظریاتی رموز و نکات بھی ہیں، نیز جہاں ان میں اسرار ازل کی گرہ کشائی ہے وہیں ہلکی پھلکی فلسفیانہ موشگافیاں بھی ہیں۔ان کی غزلوں میں لفظی توازن، تلازمات کا باہمی ربط اور ڈکشن کا پورا ایک نظام ملتا ہے جو کسی بھی تخلیق کار کی کامیابی کی اولین شرط ہے۔اسی بات کو بیان کرتے ہوئے حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

Scanned with OKEN Scanner

"کسی فن پارہ کی بلند رتبگی کا تعین اس کی زبان کے تخلیقی امکانات سے کیا جاتا ہے لیکن زبان کی تخلیقی برتاو کی شناخت آسان نہیں۔ تاہم لفظ کے ابہام، اسراریت، اختصار اور تحرک سے اسے پہچانا جاتا ہے۔ کولرج نے لکھا ہے کہ اصل میں زبان کا بہترین حصہ صحیح معنی میں بذات خود ذہن کے عمل پر غور کرنے سے وجود میں آتا ہے۔ یہ شعوری طور پر اندرونی عوامل اور تخیل کے عمل و نتائج کو مستقل علامات کے ذریعے تصرف میں لانے سے تشکیل پاتا ہے۔ اس لئے سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ فنکار اپنے داخلی تجربات کو جن کا مستند اور معتبر ہونا شرط پیشین ہے، مناسب و موزوں لفظوں کی گرفت میں لے آئے۔ داخلی تجربہ ایسے لفظ، علامت اور پیکر کی تلاش کرتا ہے جو اس کے لئے ناگزیر ہے۔ شاعر اگر وسیع ذخیرہ الفاظ پر قادر نہ ہو یا ناگزیر لفظ اور مماثل لفظ میں فرق کرنے کا اہل نہ ہو، تو تخلیقی زبان پیدا ہونے سے پہلے ہی معرض ہلاکت میں پڑ جاتی ہے۔ اردو شاعری زبان کے اس غیر تخلیقی انداز کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔" (6)

اختر مدھوپوری نے خود کو ان خامیوں سے بچاتے ہوئے، وقت اور غزل کے تقاضوں کو پوری اہلیت کے ساتھ اپنے فن میں ادا کیا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے شاعری میں نئی تعبیری جہتوں کی تخلیق اختر مدھوپوری کا نصب العین تھا اور اس منصب کی ادائیگی میں ان کی طبیعت و مزاج نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ گو کہ یہ آواز اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی ہے لیکن جب بھی جھارکھنڈ کے شعرا کا تذکرہ کیا جائے تو اختر مدھوپوری کا نام ادب و احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔

حوالجات و مآخذ:

(1) اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب، گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، سال اشاعت 2002، صفحہ 409۔
(2) اردو شاعری کا مزاج، وزیر آغا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، سال اشاعت 1974، صفحہ 239۔
(3) اردو شاعری کا مزاج، وزیر آغا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، سال اشاعت 1974، صفحہ 260۔
(4) آزاد غزل کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ، ایس ساجد بخاری، ایم۔ آر۔ آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی، سال اشاعت 2006، صفحہ 25۔
(5) شاعری کی تنقید، ابوالکلام قاسمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، سال اشاعت 2001، صفحہ 88۔
(6) جدید شعری منظر نامہ، حامدی کاشمیری، ادارۂ ادب، شالیمار، سری نگر، سال اشاعت 1990، صفحہ 13۔
(7) کلیات اختر، ترتیب انعام الحق انعام، لاڈلی ڈجیٹلس، کلٹی، ضلع بردوان، مغربی بنگال، سال اشاعت 2013۔

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

تانیثی تنقید: نصف آبادی کے ادبی مطالبات

ڈاکٹر نصرت جبین،

شعبۂ اُردو مرکزی جامعہ کشمیر، گاندربل۔۱۹۱۲۰۱

تلخیص: تانیثیت بیسویں کے مختلف تنقیدی اور ادبی نظریات کے درمیان ایک اہم نظریہ واقع ہوا ہے۔تانیثی تنقید نے نہ صرف خواتین قلم کاروں کے حوصلے کو مہمیز کیا ہے بلکہ ادب شناسی کے ضمن میں ایک نیا طور بھی سامنے لایا ہے۔ زیر نظر مقالے میں تانیثی تنقید کے تناظر میں اُردو زبان اور اس کے شعری منظر نامے سے بھی عملی تنقید کی مثالیں پیش کی گئیں۔ خواتین کے ساتھ سماجی، اقتصادی اور سیاسی سطح پر ہی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جاتا بلکہ لسانی سطح پر بھی اُن کے ساتھ بھید بھاؤ کو راہ دی گئی۔ اُردو زبان کی لسانی تاریخ اس بات کی غماز ہے کہ اس میں بھی طبقۂ اُناث کے تئیں غیر ذمہ دارانہ رویہ اپنایا گیا ہے جس پر بحث و تمحیص قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح یہ مقالہ اپنی سرشت میں تانیثی تنقید پر ایک اطلاقی نوعیت کی تحریر ہے جس میں اشعار کے حوالے سے اُن کے انسلاک کو سمجھانے کی سعی کی گئی ہے۔ اس مقالے میں اُردو کے معتبر و معروف شعرا میر تقی میر، مرزا غالب، امام بخش ناسخ، احمد فراز، حبیب جالب، فرید پربتی وغیرہ کے کلام کی مثالوں کو پیش کر کے ایک معروضی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے۔ اپنے مشتملات کے اعتبار سے یہ مقالہ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ ادارہ ''تاریخِ ادب اُردو'' کو یہ مقالہ شائع کرتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے اور امید کی جا رہی ہے کہ یہ مقالہ سنجیدہ قارئین سے مناسب انداز میں داد و تحسین وصول کرنے میں کامیاب ہوگا۔

کلیدی الفاظ: تانیثیت، تانیثی تنقید، نسوانیت، مرد حاوی معاشرہ، طبقاتی تقسیم، تہذیبی تغیر، ثقافتی بوقلمونی، ادبی معاشرہ۔

(نوٹ: یہ مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں تانیثیت کے نظری مباحث اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ دوسرا حصہ اس کے اطلاق پر مبنی ہے جس میں اُردو زبان اور شاعری کو معرضِ بحث میں لایا گیا ہے۔)

بیسویں صدی کے ربع آخر میں عالمگیریت اور سائنسی ایجادات کے نتیجے میں جو معاشرتی نظام وضع ہوا اس نے زندگی اور متعلقات زندگی کو قابل لحاظ حد تک متاثر کیا۔ ادبی اور ثقافتی سطح پر اس تبدیلی کو مابعد جدیدیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ ما

Scanned with OKEN Scanner

بعد جدیدیت گزشتہ ادبی اور تنقیدی رجحانات اور تحریکات کی طرح یک رخی نہیں ہے۔ بلکہ یہ اپنی سرشت میں کثیر الجہت اور متنوع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد جدیدیت کو سمجھنے میں اکثر لوگوں کو دشواری کا سامنا ہے کیونکہ وہ مابعد جدیدیت کو ترقی پسند تحریک، سرسید تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کی طرح سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ مابعد جدیدیت میں کوئی بھی نظریہ آخری اور اہم نہیں ہے بلکہ کوئی بھی نظریہ رد بھی ہو سکتا ہے اور اسے قبولیت بھی حاصل ہو سکتی ہے غرض مابعد جدیدت ہر طرح کی جبریت کے خلاف ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مابعد جدیدیت نے نظریات کے رد و قبول کے لیے کشادگی کا ماحول تیار کیا ہے۔ اسی کشادگی، وسعت اور تکثیری مزاج کی حامل مابعد جدیدیت میں مختلف نظریات پنپنے لگے جن میں تانیثیت بھی ایک اہم نظریہ ہے۔ دیکھا جائے تو اردو ادب میں تانیثی مباحث بھی اس دور میں منصہ شہود پر آئے جب مابعد جدیدیت کا سورج اردو کی ادبی اور ثقافتی افق پر طلوع ہوا۔ اس تناظر میں دوسرے نظریات کے ساتھ ساتھ تانیثیت اور تانیثی تنقید ادب شناسی کے ایک جاندار رویے کے بطور سامنے آئے۔

تانیثیت اپنی سرشت میں مرد حاوی معاشرے میں طبقۂ نسواں کی ذہنی بیداری اور اپنے حقوق کے بارے میں آگہی کا نام ہے۔ یوں تو معاشرتی سطح پر خواتین کا شکوہ یہ ہے کہ انہیں زندگی کے ہر محاذ پر نظر انداز کیا جاتا ہے، ان کی حصہ داری جتنی ہر سطح پر ہونی چاہے تھی اتنی نہیں ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر انہیں سرے سے ہی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ انہی شکایات کے ازالہ کے لیے اور اپنے داخلی وجود کو عملی سطح پر منوانے کے لیے عالمی سطح پر بھی خواتین کی کئی تحریکیں سامنے آئیں۔ جن کا پرزور اصرار اس بات پر تھا کہ خواتین کو زندگی کے ہر شعبے میں اپنا جایز حق دیا جانا چاہیے اس طرح حقوق کی حصولیابی کے لیے خواتین مفکرین نے احتجاج اور مزاحمت کے راستے پر چلنے کا ڈھول ڈالا۔ بحیثیت مجموعی تانیثیت کے علمبرداروں کا دعویٰ ہے کہ وہ عورت کو معاشی، سیاسی، ادبی اور ثقافتی سطح پر مرکز میں لانا چاہتے ہیں۔ اس تناظر میں جب ہم تانیثی تنقید کی بات کرتے ہیں تو وہ ہماری روایتی تنقید کو یہ کہہ کر مسترد کرتی ہے کہ اس (روایتی تنقید) نے زکوری نقطۂ ہائے نظر کے مطابق ادبی متون کی تشریح و توضیح کا کام انجام دیا ہے جس کی وجہ سے نسوانی آوازیں ادبی متون میں دب چکی ہیں۔ ویسے بھی خواتین اس کرۂ ارض پر نصف آبادی کے نام سے بھی معنون ہیں۔ اس لیے خواتین کے نقطۂ نظر سے ادب کو جانچنے اور پرکھنے کا رجحان جائز بھی معلوم ہوتا ہے اور مناسب بھی کیونکہ عہدِ وسطیٰ سے لے کر تاحال ادب کو یک طرفہ تنقید یعنی زکُوری نظام کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ مابعد جدید تھیوری کے تحت تانیثی تنقید سابقہ متون کو از سرِ نو تفہیم و

Scanned with OKEN Scanner

توضیح کے لیے اصرار کرتی ہے جن میں وہ اپنے جذبات واحساسات، تجربات ومشاہدات اور تصورات و تفکرات کے اظہار کو راہ دے سکیں۔ پروفیسر انور پاشا نے زکُوری نظام کے حاوی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ :

> ''تانیثی مفکرین مروجہ ادب اور ادبی معیار واقدار اور اُن سے وابستہ تصورات وافکار یا زبان واسلوب کو اس لیے خارج کرتی ہیں اور انھیں تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں کہ اس ادب میں نہ تو ان کی شرکت ہے اور نہ ہی اس میں ان کی ویسی ترجمانی ہے، جس کی وہ حق دار ہیں۔ بلکہ ان کا الزام ہے کہ اس میں ان کی شبیہ کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے مرد اساس نظام کا پروردہ ادب بنیادی طور پر عورت مخالف ہے۔ لہٰذا متبادل ادب کی تخلیق اور متبادل تنقیدی پیمانے اور زاویے کی تشکیل ہی حقیقی تانیثی ادب کی تخلیق و تنقید کا واحد راستہ ہے۔ لیکن بالآخر سب سے اہم سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک ایسے انسانیت اساس نظام کی تشکیل ممکن نہیں جس کا ادب تمام صنفی تعصبات وامتیازات سے پاک ہو اور جو مرد اساس نظام کے جبر اور شدت پسندی سے آزاد ہو۔ اگر ایسا ہو سکا تو یقینا وہ نظام اور اس کا ادب مثالی نظام اور ادب ہو گا''۔ [1]

اردو ادب کے ابتدائی دور میں شعوری طور پر تانیثی فکر ناپید تھی۔ ہمارے یہاں ادب میں فکری سطح پر یہ اِن معنوں میں کبھی نہیں برتی گئی جس طرح مغربی ادب میں اس تحریک نے اپنے پنجے گاڑھے۔ اردو ادب کی تاریخ میں خواتین کے موضوعات، مجبوریوں اور مسائل کو موضوع بنانے والے مرد لکھاری ہی تھے۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور جدید علوم سے اردو داں طبقے کی واقفیت نے اردو میں بھی نئے علوم اور نظریات کو راہ دینے میں مدد کی۔ نتیجے کے طور پر سر سید احمد خان کے پروردہ شیخ محمد عبداللہ المعروف بہ پاپا میاں کی خواتین کے تئیں تعلیمی خدمات سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری، مرزا محمد ہادی رسوا اور سجاد حیدر یلدرم کی خواتین کے تئیں علمی اور ادبی خدمات اردو ادب میں لائقِ تحسین ہیں۔ اردو ادب میں خواتین کی فکری اور تخلیقی آزادی کا دور اٹھارویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل سے شروع ہوتا ہے۔ رسالہ ''تہذیب نسواں'' سے شروعات کر کے آج اس قبیل کے ادب میں وہ تمام اوصاف و خصوصیات موجود ہیں جو کسی بھی ترقی یافتہ ادب یا اعلیٰ ادب تخلیق کرنے والے مرد تخلیق کاروں کے یہاں ہوتا

Scanned with OKEN Scanner

ہے۔خواتین تخلیق کار عورتوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ دیگر سماجی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی موضوعات اور عالمی امور پر ادبِ عالیہ تخلیق کر رہی ہیں۔خواتین قلم کاروں کا یہ قافلہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے آج خواتین کے ادب کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مگر تنقیدی نکتۂ نگاہ سے پرکھنے کے لیے خواتین کا تحریر کردہ ادب ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔پروفیسر انور پاشا مزید لکھتے ہیں:

> ''ادب، تاریخ، تنقید، علوم، سائنس و ٹیکنالوجی، کلچر، سیاست اور اقتصادیات ہوں یا تعلیمی نصابات اور تحقیقی و فکری ادارے؛ یہ سب ہی ہمیشہ مردوں ہی کی گرفت میں رہے ہیں..... وہ جن تخلیقات اور متون کو عالم گیر اور شاہکار بتاتے ہیں ادھوری ہیں کیونکہ اس میں خواتین کہیں نظر ہی نہیں آتی ہیں''۔۲؎

تانیثی تنقید خواتین کی تخلیقات اور ادبی معیارات کو پرکھنے کے لیے ان تمام مروجہ اصول و ضوابط کو رد کرتی ہے جو ادبی دنیا میں مرد اساس معاشرے کے قائم کردہ ہیں۔تانیثی ناقدین کے مطابق ہماری اردو زبان کی جتنی بھی لغات تحریر کی گئی ہیں وہ عورتوں کے تئیں غیر جانبدار نہیں ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں جو زبان مروج ہے وہ مرد اساس اور عورت کی شبیہ کو بگاڑ کر پیش کرتی ہے۔اردو زبان کی لغات میں لفظ عورت اور متعلقاتِ عورت سے وابستہ الفاظ کے جو معنی لکھے گئے ہیں وہ سراسر ناانصافی اور مرد اساس ذہنیت کی نمائندگی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔جب بھی کسی مرد کو کم عقل نااہل یا بزدل ہونے کا طعنہ دینا ہو اسے عورت سے تشبیہ دی جاتی ہے۔علامات، محاورات اور ضرب الامثال صنفی جانبداری کے مظہر ہیں۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) گھوڑا اور عورت ران تلے: دونوں جب تک قابو میں رہیں اپنے ہیں۔۳؎

(۲) بزدلی عورت کا دوسرا نام ہے۔۴؎

(۳) زنانہ لفظ صفت کے اعتبار سے ان معنوں کا حامل ہے:

نامرد، ڈھیلا، سست، زن صفت، بزدل ۵؎

(۴) عورت اور جوتے دونوں برابر۔

Scanned with OKEN Scanner

(۵)عورت کی ذات بے وفا ہوتی ہے۔ عورت سے وفا نہیں ہوتی۔

(۶)عورت کی عقل گدی کے پیچھے۔ عورت بے وقوف ہوتی ہے۔

(۷) عورت کی ناک نہ ہوتی تو گوکھاتی۔ عورت ناقص العقل ہوتی ہے۔۶؎

اردو کی معروف تانیثی تخلیق کار زاہدہ حنا نے عورت کے خلاف مروّج رویوں پر احتجاج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"زبان کو دنیا بھر میں عورت کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔
شاعری، ادب، گالیوں، محاوروں اور ضرب الامثال کے وسیلے سے عورت کا ناقص
العقل ہونا اور اس کے عیاری و مکاری کے قصے نسل در نسل دہرائے گئے۔ یہاں تک
کہ وہ صرف مردوں کے ہی نہیں بلکہ عورتوں کے ذہن میں بھی راسخ ہو گئے اور خود
انہوں نے بھی اپنے آپ کو مردوں کی نسبت کم عقل، بزدل اور کم تر سمجھنا شروع
کر دیا۔ اور یہ عمل ابھی جاری ہے. . . . . زبان کے زخم سے عورت
آج بھی گھائل ہے"۔۷؎

سماج اور معاشرہ مردوں کے حوالے سے جانے اور سمجھے جاتے ہیں سو سائٹی بنیادی طور پر مردانہ ہے اور تمام زمانہ کیفیات کو اسی دائرے میں دیکھا جاتا ہے۔ ہر صحیح اور غلط کو مرد کی سوچ کے دائرے میں ہی جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں تکثیریت نہیں ہے صرف مرد کی وحدانیت ہے مابعد جدیدیت اسی تکثیریت پر ہی زور دیتی ہے۔ عورتوں کے بارے میں جتنے بھی تصورات اور مفروضات قائم کیے گئے ہیں وہ مردوں کے بنائے ہوئے ہیں خواتین کے تخلیق کیے گئے ادب کے ساتھ بھی یہی صورت حال ہے۔ ہماری ادبی تنقید مجموعی طور پر مردانہ تجربات اور محسوسات پر مشتمل ہے۔ خواتین کے احساسات اور اقدار کا اس میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ خواتین کا موقف یہ ہے کہ ادب میں مردانہ قدریں آفاقی اور حتمی بنادی گئی ہیں جب کہ "عورت اساس" قدریں دور دور تک کہیں دکھائی ہی نہیں دیتی ہیں۔ اس لیے اکثر کہا جاتا ہے کہ :

(۱)مروجہ ادب میں عورت کی پیش کش غیر متوازن اور امتیازی نوعیت کی حامل ہے؛

(۲)عورت کے ذریعہ تخلیق کردہ ادب کے تئیں مرد ناقدین اور قارئین کا رویہ متعصبانہ ہے؛

Scanned with OKEN Scanner

(۳)مروجہ تنقیدی زاویئے اور نظریات صنفی جانبداری(Gender Bias) پر مبنی ہیں؛

(۴)مروجہ ادبی ڈکشن، زبان واسلوب، استعارات، علامات، محاورات اور ضرب الامثال صنفی جانبداری کے مظہر ہیں۔

ضمناً یہاں بتاتی چلوں کہ بالی ووڈ کے گیتوں اور نغموں میں اکثر خواتین کے کردار کو فرسودہ اور بے ہودہ(Stereotype) یا صرف جنسی آلۂ کار بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ خواتین پر ایسے گیت نغمائے جاتے ہیں جن کی زبان بدلنے کی ضرورت ہے چند مثالیں میں یہاں پیش کرتی ہوں:

ایک مشہور گانے کے بول ہیں۔

(۱)تو چیز بڑی ہے مست مست

(۲) گرم چائے کی پیالی ہو

عورت کوئی چیز نہیں ہے وہ ایک جیتا جاگتا انسانی وجود ہے۔ افسوس ہے کہ جسم کو شئے میں بدل دیا جاتا ہے عورت کو محض ایک تجارتی آلہ سمجھا جاتا ہے اور یہ بات بھلادی جاتی ہے کہ وہ جسم کے علاوہ روح اور شعور بھی رکھتی ہے۔ واقع یہ ہے کہ :

> ''خواتین کو بنیادی طور پر مجبور اور رومانوی مزاج قرار دیا جاتا ہے اور بہت ہی کم
> حقیقت پسند، فعال یا فیصلہ کن حیثیت رکھنے والی دکھائی جاتی ہیں. . . . . خواتین کا
> حق صرف یہ کہ وہ فیشن ماڈل یا تفریحی شعبوں میں نمایاں ہوں. . . . .
> مصنوعات کی تشہیری مہم میں خواتین کو نیم عریاں کر کے شکار پھانسنے والے
> ''چارے'' کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور ان کی جنسی کشش اور جسمانی نمائش کا
> استحصال کیا جاتا ہے''۔۸۔

اردو شاعری میں معشوق یا عورت کے لیے استعمال کیے گئے سارے صفات، استعارات، تشبیہات مرد کے ذہن کے اختراع اور اس کے عورتوں کے تئیں قیاسات اور فرضی تصورات پر مبنی ہیں۔ مثلاً ظالم، سنگ دل، ہر جائی، بے وفا، بے مروت، بت، قاتل،

Scanned with OKEN Scanner

پتھر کے صنم وغیرہ وغیرہ۔اسی طرح وہ عورت کے جسمانی خدوخال کی تعریف اپنے جمالیاتی ذوق کے اظہار اور تسکین کے لیے کرتا ہے۔چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

(۱) پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے

نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے (میر تقی میر)

(۲) تہہ شمشیر قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ

کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا (امام بخش ناسخ)

(۳) کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

ہائے اُس زُودِ پشیماں کا پشیماں ہونا مرزا غالبؔ

(۴) سُنا ہے اُس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں

سو ہم بہار پہ الزام دھر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اُس کی سیاہ چشمگی قیامت ہے

سو اُس کو سُرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے آئینہ تمثال ہے جبین اُس کی

جو سادہ دل ہیں اُسے بن سنور کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اُس کے جسم کی تراش ایسی ہے

کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں احمد فرازؔ

Scanned with OKEN Scanner

اس کے برعکس عاشق یا مرد کے لیے جو صفات استعمال کی گئی ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں: وعدہ وفا کرنے والا، پرستش کرنے والا، عاجز و انکسار، گداز قلب، انتظار کرنے والا وغیرہ وغیرہ۔ مرد کے لیے یہ القابات حقیقی، مثبت، توصیفی اور قابلِ ستائش معلوم ہوتے ہیں۔ اُردو شاعری میں اس کی مثالیں جستہ جستہ نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر

(۱) جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی

حقِ بندگی ہم ادا کر چلے میر تقی میرؔ

(۲) تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا

تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں علامہ اقبالؔ

(۳) نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز

یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے علامہ اقبال

(۴) واقف میں ہر اک خواب کی تعبیر سے ہوں

میں حُسن ہوں اور حُسن کی جاگیر سے ہوں

کہتے ہیں مجھے یوسفِ ثانی اے دوست

کنعاں سے نہیں وادیٔ کشمیر سے ہوں فریدؔ پربتی

(۵) دیپ جس کا محلات ہی میں جلے

چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر جلے

وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے

ایسے دستور کو، صبحِ بے نور کو

میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا حبیب جالب

Scanned with OKEN Scanner

مرد اور عورت کے حوالے سے ہماری مردوں کی شاعری کی یہ دو متضاد تصویریں ہیں۔اس تناظر میں جب تانیثی ناقدین یا عورت کے شعور نے ہوش کے ناخن لیے تو اپنی شبیہ کو درست کرنے کے لیے میدانِ عمل میں اُتر آئیں۔پروفیسر عتیق اللہ یوں رقم طراز ہیں:

> ''تانیثی نقادوں نے پرانے بھرم توڑ دیے اور یہ بتایا کہ دراصل عورت کے تعلق سے جو تصورات ہم تک پہنچے ہیں وہ تمام مرد اساس معاشرے کا ایک یقینی نتیجہ ہیں۔ان کی تشکیل کے پسِ پشت وہ تذکیری رویہ بر سر کار رہا ہے جس نے ہمیشہ ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے خواہ اس فوقیت کی بنیاد کتنی ہی غیر منطقی، غیر عقلی، رسمیاتی اور مفروضاتی ہی کیوں نہ ہو۔یہی نہیں بلکہ اس نے ہمیشہ کچھ نئے جواز بھی فراہم کیے ہیں''۔۹؎

مذکورہ مباحث کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارے ادب میں عورت کا کردار ایک نئی تفہیم و تعبیر چاہتا ہے۔اب عورت کے تئیں حسن کے معیارات بدل چکے ہیں۔گلاب سی رنگہت، سرو قد اور ہرنی جیسی چال ڈھال کی دوڑ سے عورت بہت آگے نکل چکی ہے۔ظاہری اوصاف کے ساتھ ساتھ قابلیت، ذہانت، خود اعتمادی، علم و آگاہی اور بہادری کو بھی اگر عورت کا حسن مانا جاتا تو بہت بہتر ہوتا۔اسی لیے تانیثی تنقید کے علمبرداروں کا توقف یہی ہے کہ مروجہ ادبی اور تنقیدی زاویوں کے برعکس ادب کے لیے نئے تنقیدی اصول و ضوابط اور نئی شعریات مرتب کرنے کی اشد ضرورت ہے۔میں اس صورتِ حال کی تبدیلی کے لیے علامہ اقبال کے اس شعر کو بطورِ جواز پیش کر کے اپنی بات ختم کرنا چاہتی ہوں ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

حوالہ جات:

۱۔ مضمون: تانیثیت اور ادب، انور پاشا، مرتب: انور پاشا، عرشیہ پبلیکیشنز، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص: ۱۲۶

۲۔ فیمنسٹ ادب کا مسئلہ از ریاض صدیقی مشمولہ تانیثیت اور ادب، مرتب: انور پاشا، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ۲۰۱۴، ص:

Scanned with OKEN Scanner

۳۔فیروزالغات،ازمولوی فیروزالدین، کتابی دنیا،دہلی،۱۹۹۷ءص: ۹۰۶

,Hamlet, Shakespare, Act-1, Scene-II.4

۵۔فرہنگ آصفیہ، ترقی اُردو بورڈ،دہلی، جلد دوم، ص: ۴۱۳

۶۔نوراللغات،انجمنِ ترقی اُردو ہند،دہلی،۱۹۵۷ء، ص: ۵۲۹

۷۔زبان زخم، مشمولہ: عورت زندگی کا زنداں،از زاہدہ حنا، تخلیق کار پبلیشرز،دہلی،۲۰۰۶، ص: ۲۶۳

۸۔ایضاً، ص: ۱۳۲

۹۔تانیثیت تنقیدی تھیوری ازپروفیسر عتیق اللہ، مشمولہ بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب، مرتب پروفیسر عتیق اللہ، طبع دوم،ساہتیہ اکادمی،دہلی،۲۰۱۸، ص: ۹۶

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

ڈاکٹر جمیل جالبی بطور محقق و مدوِن

ڈاکٹر عظمت رباب

ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو

لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی لاہور

تلخیص: جمیل جالبی کا نام اردو تنقید، تحقیق، تدوین اور تراجم میں بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی مختلف جہات کو اپنی تنقیدی و تحقیقی بصیرت کی مدد سے پیش کیا ہے۔ تنقید ہو یا تحقیق، تراجم ہوں یا تدوین ان کا نام ایک معتبر حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ادب کی قدآور شخصیت ہیں ۔اس مقالے میں ان کی ترتیب وتدوعین کو مختلف مثالوں کی مدد سے پیش کیا گیا ہے۔ ایک محقق کو جس جانفشانی اور عرق ریزی سے کام لینا پڑتا ہے اس کا عملی مظاہرہ ہمیں جمیل جالبی کی مرتبہ و مدونہ کتب میں واضح دکھائی دیتا ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی بطور مرتب و مدون خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور ان کے طریق تدوین کو مفصل بیان کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: ڈاکٹر جمیل جالبی، تنقید، تحقیق، تراجم، ترتیب، تدوین، مرتبہ نسخے، تدوین کا طریق کار، تدوین کی روایت میں جمیل جالبی کا کردار

اردو ادب میں محمد جمیل خاں جمیل جالبی کا نام کئی حوالوں سے معتبر و معروف ہے۔ سکالرز اور طالب علمانہ حوالے سے ان کی تاریخ ادبِ اردو اور ارسطو سے ایلیٹ تک کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ اس سے کچھ آگے جایا جائے تو تنقیدی نظریہ سازی اور تدوینِ متن کے حوالے سے ان کا کام دکھائی دیتا ہے۔ تنقید اور تحقیق کے جس امتزاج کو ''تحقید'' سے موسوم کرنے کی جو تجویز انھوں نے دی تھی اس کا عملی مظاہرہ ان کی ہر تصنیف میں نظر آتا ہے۔ تاریخِ ادبِ اردو میں جس طرح انھوں نے جو حوالہ جات استعمال کیے ہیں وہ بیشتر مخطوطوں اور بنیادی مآخذ سے تعلق رکھتے ہیں ۔اسی طرح ان کی مرتبہ کتابوں دیوانِ حسن شوقی، دیوانِ نصرتی اور مثنوی نظامی شامل ہیں ۔ان کے مخطوطوں تک رسائی اور دکنی ادب سے واقفیت ان کا ایک اور علمی و ادبی کارنامہ ہے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ا۔ دیوانِ حسن شوقی

ڈاکٹر جمیل جالبی نے حسن شوقی کے دیوان کو مرتب کیا جو انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ اس کے مقدمے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے بتایا ہے کہ اس سے قبل حسن شوقی کا کتنا کام منظر عام پر آچکا تھا۔ ان کی فراہم کردہ تفصیلات کے مطابق ۱۹۲۹ء میں مولوی عبدالحق نے رسالہ ''اردو'' میں پہلی بار حسن شوقی کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد ۱۹۵۴ء میں سخاوت مرزا نے رسالہ '' اردو'' کراچی میں حسن شوقی کی تین غزلیں اور ۱۹۶۵ء میں حسینی شاہد نے پانچ غزلیں شائع کیں۔ ان چند غزلیات کے علاوہ حسن شوقی کا کلام پہلی بار جمیل جالبی کے مرتبہ دیوانِ حسن شوقی کے ذریعے سامنے آیا۔

Scanned with OKEN Scanner

مقدمے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے بہمنی سلطنت کے زوال کو مختصر آبیان کیا ہے۔اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ نظام شاہی، احمد شاہی اور برید شاہی سلطنتیں زوال آمادہ ہوئیں تو شوقی نظام شاہی سے عادل شاہی سلطنت میں چلاآیا۔

دیوان حسن شوقی دو مثنویوں ''فتح نامہ نظام شاہ''، ''میز بانی نامہ'' اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ فتح نامہ نظام شاہ کو جمیل جالبی نے دو نسخوں نسخہ اول اور نسخہ ثانی کی مدد سے مدون کیا جو موجودہ شکل میں چھ سو بیس(۶۲۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی دکن کی مشہور جنگ تالیکوٹ ۹۷۲ھ (۱۵۶۴ء) کی فتح پر حسن شوقی نے تحریر کی تھی جس میں اپنے مربی حسین نظام شاہ کو فاتح تالیکوٹ قرار دیا۔ یہ جنگ وجیا نگر کے راجہ رام راج اور ابراہیم قطب شاہ، علی عادل شاہ اول، حسین نظام شاہ، برید شاہ کی متحدہ افواج کے درمیان ہوئی جس میں راجہ رام راج کو شکست ہوئی اور وجیا نگر سلطنت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

''میز بانی نامہ'' میں سلطان محمد عادل شاہ(۱۰۳۷ھ۔۱۰۶۸ھ) کی شادی کو موضوع سخن بنایا ہے جو نواب مظفر خان کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق نے نہ معلوم کس بناپر اس شادی کا رشتہ مصطفی خان وزیر اعظم کی بیٹی سے ملادیا ہے۔ یہ شادی جس کا میز بانی نامہ حسن شوقی نے مرتب کیا ہے مصطفی خان کی بیٹی سے نہیں بلکہ نواب مظفر خان کی بیٹی سے شادی کا میز بانی نامہ ہے ۔ میز بانی نامہ دو سو چودہ(۲۱۴)اشعار پر مشتمل ہے اور اسے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مقدمے میں حسن شوقی کی غزلوں کے موضوعات اور فنی محاسن بھی بیان کیے گئے ہیں۔

عادل شاہی دور کا سب سے اہم اور نمائندہ شاعر حسن شوقی ہے، شوقی نے دکنی زبان کو فارسی کے قریب کرنے کی کامیاب کوشش کی، ڈاکٹر جمیل جالبی نے درست کہا ہے کہ

''حسن شوقی کی غزلیں اسی روایت کا حصہ ہیں جس کے فراز پر ولی دکنی کی غزل کھڑی ہے۔''(۱)

گو شوقی کی بہت کم غزلیں محققین کو دستیاب ہوئی ہیں اور جو کچھ ملا ہے اس میں بھی کچھ حصہ کرم خوردہ ہے لیکن اس کے باوجود بھی ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے ماہر محقق اور استاد نے انتہائی عرق ریزی کے بعد اس کا بڑا حصہ محفوظ کیا ہے۔

۲۔دیوانِ نصرتی

بیجاپور کے ملک الشعرا ملا نصرتی کا کلام ''دیوانِ نصرتی'' ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کیا ہے۔ یہ دیوان قوسین لاہور سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ دیوانِ نصرتی کے مقدمے میں جمیل جالبی نے بہمنی سلطنت کے زوال اور گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں کی علم پروری اور ادب وفن کی سرپرستی کو بیان کیا ہے۔ ملک الشعرا ملا نصرتی کے بارے میں جمیل جالبی مقدمے میں لکھتے ہیں کہ اس نے تین بادشاہوں محمد عادل شاہ ثانی شاہی اور سکندر عادل شاہ کا دورِ حکومت دیکھا۔ محمد عادل شاہ کے دورِ حکومت میں اس نے قصیدہ چرخیہ لکھا۔ محمد عادل شاہ کے بیٹے علی عادل شاہ ثانی شاہی کے دورِ حکومت میں نصرتی کی تخلیقی قوتیں اپنے کمال پر تھیں۔ جس میں اس نے متعدد غزلوں، قصائد اور رباعیات کے علاوہ اپنی مشہور عشقیہ مثنوی ''گلشنِ عشق'' اور رزمیہ مثنوی ''علی نامہ'' لکھیں۔ سکندر عادل شاہ کے دور میں نصرتی نے ''تاریخِ سکندری'' لکھی۔

Scanned with OKEN Scanner

گلشنِ عشق اور علی نامہ شائع ہو چکے ہیں جبکہ تاریخ سکندری اور دیگر کلام جو نایاب تھا وہ جمیل جالبی نے ترتیب دیا۔اس کی اہمیت مقدمے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''جیسے دیوانِ حسن شوقی ادبِ اردو کے دورِ قدیم اور قبل ولی کی روایت کے مطالعے کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔اسی طرح ملا نصرتی کا یہ غیر مطبوعہ و نایاب کلام بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔''(۲)

مقدمے کے تیسرے حصے میں نصرتی کی تین تصانیف گلشن عشق (۱۰۶۸ھ) ، علی نامہ (۱۰۷۶ھ) اور دیوانِ نصرتی کے موضوعات اور اسالیب کو مختصر آبیان کیا ہے۔کلام کی خصوصیات میں اہم نکتہ یہ ہے کہ انھوں نے نصرتی کی قصیدہ گوئی کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں۔اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اردو قصائد کے ذکر میں جہاں ہم سودا اور ذوق کا اب تک نام لیتے آئے ہیں وہاں ہمیں دورِ قدیم اور قبل ولی کے مولانا نصرتی کا نام ان کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ان دونوں سے پہلے لینا چاہیے۔ ''(۳)

نصرتی کی غزلیات کا اہم موضوع عورت ہے۔رباعیات میں سے کچھ حمد و نعت اور کچھ ناصحانہ و عاشقانہ موضوعات کے بارے میں ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے دیوان نصرتی کے متن میں سب سے پہلے مثنوی ''تاریخ سکندری'' (۱۰۸۳ھ) کا متن درج کیا ہے۔اس کے بعد قصائد درج کیے گئے ہیں۔ مخمسات میں دو مخمس درج کی گئی ہیں۔اس کے بعد ہجو ہے اور پھر ۲۳ غزلیات ہیں۔ غزلیات کے بعد ۲۸ رباعیات، ۳ قطعات اور ایک غزل فارسی ہے۔آخر میں صفحہ نمبر ۸۱ سے ۹۳ تک فرہنگ دیوان نصرتی دی گئی ہے۔

۳۔ مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ کدم رائو پدم رائو

فخر دین نظامی کی مثنوی کدم رائو پدم رائو کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے ترتیب دیا ہے۔ یہ انجمن ترقی اردو کراچی سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ مثنوی نویں صدی ہجری میں لکھی گئی تھی۔ اس مثنوی کو جمیل جالبی نے اردو کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے۔ مقدمے کی ابتدا میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تاریخ ادب اردو'' کے دوران پیش آنے والی مشکلات اور تحقیقی کاوش کا ذکر بھی کیا ہے۔

''اس تمام عرصے میں میری یہ کوشش رہی کہ نویں اور دسویں صدی ہجری کی وہ تمام تصانیف جو خطی شکل میں طاقِ نسیاں پر دھری تھیں ان کا مطالعہ اسی نقطہ نظر سے کیا جائے اور دیکھا جائے کہ ان تصانیف کی لسانی، تہذیبی و ادبی اہمیت کیا ہے۔ ''(۴)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی کدم رائو پدم رائو کے املا کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نسخہ کا رسم الخط نسخ ہے لیکن یہ نسخ اتنا مشکل ہے کہ اسے پڑھنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا عہدِ قدیم کے کسی رسم الخط کو پڑھ کر مفید مطلب باتیں اخذ کرنا۔ مولوی عبدالحق مرحوم کی یہ بڑی خواہش تھی کہ یہ مثنوی کسی طرح پڑھ لی جائے اور پھر شائع کر دی جائے۔انھوں نے برصغیر پاک و ہند کے ماہرینِ فن کے پاس اس کے عکس روانہ کیے۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کو اس کام پر مامور کیا لیکن ان کی موت کی وجہ سے یہ کام ادھورا رہ گیا۔ جمیل جالبی ۱۹۶۷ء میں اس مخطوطے سے متعارف ہوئے اور اسے پڑھنے کی کوشش کرتے رہے:

Scanned with OKEN Scanner

''ڈیڑھ دوسال کی محنت و کوشش اور لغات کے ساتھ سر کھپانے کے بعد میں اس قابل ہو گیا کہ کسی حد تک میں اسے پڑھ سکوں۔ مجھے اس کا بھی اندازہ ہوا کہ کاتب مختلف حروف اور ان کے جوڑ کی مختلف شکلیں کس طرح لکھتا ہے۔''(۵)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے دوسال کی محنت کے بعد اس مخطوطے کی پہلی نقل اور پھر دوسری اور تیسری نقل تیار کی اور افسر صدیقی اور مشفق خواجہ کو دکھائی اور اس کے بعد اسے اشاعت کے عمل سے گزارا۔ انھوں نے تاریخی واقعات اور شواہد کی بنا پر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مثنوی احمد شاہ ولی بہمنی کے دورِ حکومت (۸۲۵ھ۔۸۳۹ھ) میں لکھی گئی۔

۱۴۲۱ء۔۱۴۳۵ء

مسعود سعد سلمان کے دیوانِ ہندوی، شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر کے کلام کا منتخب حصہ گرو گرنتھ، امیر خسرو، باجن کی فارسی تصنیف ''خزائن رحمت اللہ''، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے بڑے صاحبزادے سید محمد اکبر حسینی کا تین صفحات پر مشتمل ایک رسالہ اور گیسو دراز سے منسوب ''معراج العاشقین'' کے تاریخی حقائق کے حوالے سے کدم رائو پدم رائو کو اردو کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس جائزہ کے بعد اب لے دے کر ''مثنوی کدم رائو پدم رائو'' رہ جاتی ہے جسے اردو زبان کی پہلی تصنیف ہونے کا شرف حاصل ہے اور جب تک کوئی اور تصنیف سامنے نہ آجائے اولیت کے تختِ سلطنت پر ''کدم رائو پدم رائو'' کی حکمرانی رہے گی۔''(۶)

مقدمے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی کے لسانی مطالعہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ مثنوی کا خلاصہ بھی مقدمے میں دے دیا ہے۔ اس کے املا کا طریق کار بھی مقدمے میں درج کر دیا ہے۔ متن کی پیش کش کا طریق کار یہ اختیار کیا گیا ہے کہ صفحے کے دائیں طرف اصل متن کا عکس دیا گیا ہے بائیں طرف اسے خط نستعلیق میں جدید املا کے مطابق اشعار کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ مخطوطہ میں ایک سطر میں شعر اس طرح درج کیا گیا ہے کہ وہ شعری تصنیف کے بجائے نثری تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ جمیل جالبی نے اسے دو کالم میں یوں درج کیا ہے کہ یہ مثنوی کی صورت میں معلوم ہوتے ہیں۔

متون کا تعارف و خصوصیات:

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مرتب کیے ہوئے متون اردو ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے دکن کے ان متون کو مرتب کیا ہے جن کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل ہے۔ دیوانِ حسن شوقی، دیوانِ نصرتی اور مثنوی کدم رائو پدم رائو کی اشاعت سے نہ صرف دکنیات کے ذخیرے میں اضافہ ہوا ہے بلکہ دکنی زبان، محاورات و ضرب الامثال، املا اور صرف و نحو کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں۔ اس طرح لسانیات میں بھی ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

جمیل جالبی نے جن متون کی تدوین کی ہے ان کا تعارف و اہمیت انھوں نے مقدمے میں درج کی ہے۔ دیوانِ حسن شوقی کے مقدمے کی ابتدا میں لکھتے ہیں

''اب سے تقریباً چالیس سال پہلے جولائی ۱۹۲۹ء میں مولوی عبدالحق مرحوم نے رسالہ ''اردو'' میں پہلی بار ایک قدیم شاعر کا تعارف شائع کیا اور اس کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈال کر اس کی دو مثنویوں اور تین غزلوں سے اردو داں طبقے کو روشناس کرایا۔ شاعر کا نام حسن شوقی تھا۔۔۔ ۱۹۵۴ء میں سخاوت مرزا نے رسالہ اردو کراچی میں حسن شوقی کی تین غزلیں اور دریافت کیں اور ۱۹۶۵ء میں حسینی شاہد نے پانچ غزلیں اور شائع کیں۔''(۷)

Scanned with OKEN Scanner

اس کے بعد لسانی مطالعہ، بیاضوں کا تعارف، املا کے بارے میں، ترتیب کے بارے میں عنوانات قائم کر کے اہم ضروری معلومات مقدمے میں درج کر دی ہیں۔

''دیوانِ نصرتی'' کے مقدمے میں گولکنڈہ اور بیجاپور ریاستوں کی علم پروری اور ادب و فن کی سرپرستی کو بیان کر کے نصرتی کے بیجاپور سے تعلق کو بیان کیا ہے۔اس تعارف کے بعد لکھتے ہیں:

''گلشن عشق'' اور ''علی نامہ'' شائع ہو چکے ہیں لیکن تاریخ سکندری اور بقیہ کلام اب تک نایاب تھا۔ ''تاریخ ادب اردو'' پر تن تنہا کام کرتے ہوئے جب میں سینکڑوں بیاضوں اور مخطوطات کے جنگل سے گزرا تو مجھے اکثر ملا نصرتی کا کلام بھی ملتا رہا جسے میں دوسرے شعرا کے نایاب کلام کی طرح جمع کرتا رہا۔تاریخ ادب اردو میں نصرتی پر لکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ریزہ ریزہ کر کے میرے پاس نصرتی کا اتنا کلام جمع ہو گیا ہے کہ اب نصرتی پر لکھنا اور اس کے بارے میں رائے قائم کرنا آسان ہے۔ نصرتی کا یہی وہ نادر و نایاب کلام ہے جسے ترتیب دے کر اب ''دیوان نصرتی'' کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ جیسے دیوانِ حسن شوقی ادب اردو کے دورِ قدیم اور قبل ولی کی روایت کے مطالعے کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔اسی طرح ملا نصرتی کا یہ غیر مطبوعہ و نایاب کلام بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔''(۸)

اس تعارف کے بعد مقدمے کے دوسرے حصے میں نصرتی کے حالات اس کے کلام سے مرتب کیے ہیں۔ مقدمہ کے تیسرے حصے میں نصرتی کی تین تصانیف کا تعارف، موضوعات اور اسالیب کو مختصر آبیان کیا ہے۔ مقدمے کے آخر میں نصرتی کی ادبی حیثیت اور اہم مقام کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''بحیثیت شاعر نصرتی قدیم اردو کے عظیم ترین شاعروں میں سے ایک ہے جس نے بزمیہ اور رزمیہ دونوں قسم کی طویل مثنیوں لکھ کر اپنی شاعرانہ عظمت کا لوہا منوایا ہے۔ قصیدے میں اس کا نام سودا اور ذوق کے ساتھ لیا جانا چاہیے۔''(۹)

''مثنوی نظامی دکنی'' کے مقدمے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس نسخے کی تاریخی اہمیت کا تعارف، رسم الخط کی مشکلات، زمانۂ تصنیف، نام و حالاتِ مصنف، اشعار کی تعداد، املا، لسانی مطالعہ، طریق کار کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ نویں دسویں صدی ہجری کی تصانیف کے تعارف اور ادب میں اس کے ارتقا اور تبدیلیوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''دیوان حسن شوقی'' اسی سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ ''دیوانِ نصرتی'' دوسری کڑی اور مثنوی ''کدم رائو پدم رائو'' اسی سلسلے کی تیسری کڑی ہے۔۔اس مثنوی کو زمانی اعتبار سے ''دیوان حسن شوقی'' سے پہلے شائع ہونا چاہیے تھا لیکن یہ ایک ایسا مشکل کام تھا کہ صرف متن کی تیاری میں پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا۔''(۱۰)

نسخوں کا تعارف:

مقدمہ میں نسخوں کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔انجمن ترقی اردو کی مخزونہ دو بیاضوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ جن کی مدد سے دیوانِ حسن شوقی کو مرتب کیا گیا ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

بیاض نمبر ا مخزون انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی جس میں فتح نامہ نظام شاہ (نسخہ اول) اور میز بانی نامہ ہے۔ ۲/۱ ۹اور ۲/۱ ۵ کی تقطیع پر لکھی گئی ہے۔ متن میں ۱۷ سطریں اور حاشیے پر ۳۴ سطریں ہیں۔ عنوانات فارسی میں ہیں اور سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ خط نستعلیق خوش نما ہے اس میں کل صفحات ۱۰۷ اور دس مثنویاں ہیں۔۔۔۔ فتح نامہ نظام شاہ اور میز بانی نامہ کا متن اسی نسخے سے لیا گیا ہے۔ کاتب کا نام اور سنِ کتابت درج نہیں ہے

۔

بیاض نمبر ۲ مخزون انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ اس بیاض میں فتح نامہ نظام شاہ کا نسخہ ثانی (ناقص) ملتا ہے۔ شروع کے صفحات دست برد زمانہ ہو گئے۔ کچھ ابتدائی صفحات آخر میں لگ گئے ہیں۔ یہ ۲/۱ ۸ × ۵ کی تقطیع پر لکھی گئی ہے۔ صفحات کی تعداد ۱۶۰ ہے۔ ہر صفحہ پر اوسطاً پندرہ سطریں ہیں۔ یہ بیاض بہت کرم خوردہ ہے۔ خط شکستہ ہے۔ جدولیں نہیں ہیں۔ کہیں افقی انداز سے لکھا گیا ہے اور کہیں آڑا ترچھا لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے دیوان نصرتی کے نسخے کا تعارف پیش نہیں کیا۔ مقدمے میں تاریخِ دکن، نصرتی کے حالات اور تصانیف کا تعارف ملتا ہے لیکن دیوانِ نصرتی کے نسخے کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتیں۔ تاریخ سکندری کے متن کے حاشیے میں مولوی عبدالحق کا بیان درج کر دیا گیا ہے کہ تاریخ سکندری کا دنیا بھر میں صرف ایک ہی نسخہ ہے جو ان کے کتب خانہ میں ہے۔ یہ قول مولوی عبدالحق کی کس تحریر سے لیا گیا ہے اس کا تذکرہ بھی نہیں ہے۔

''مثنوی کدم رائو پدم رائو'' کا واحد نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ دنیا کا واحد معلوم نسخہ ہے جس کا سائز ۲×۷ اور ۱×۵ ہے۔ یہ واحد نسخہ بھی ناقص ہے۔ بیچ بیچ میں سے اکثر صفحات غائب ہیں اور آخر میں بھی مثنوی کے کم از کم دو تین صفحات کم ہیں۔ اسی وجہ سے کاتب کے نام اور سنہ کتابت کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اس مثنوی میں اشعار کی تعداد ۱۰۳۲ ہے اور ۱۰۳۲ واں شعر نامکمل ہے۔ اس کے بعد کے اشعار ضائع ہو گئے ہیں۔ ترقیمہ نہ ہونے کی وجہ سے کاتب کے نام کا پتا نہیں چلتا۔

داخلی شہادتوں کی مدد سے شعرا کے حالاتِ زندگی مرتب کیے ہیں:

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جن شعرا کے دیوان مرتب کیے ہیں ان کے حالات انھوں نے شعرا کے کلام ہی سے اخذ کیے ہیں۔ دیوانِ حسن شوقی میں حسن شوقی کا نام، تخلص، فتح نامہ نظام شاہ کا پس منظر، جنگ کے واقعات کو دیوان ہی سے اخذ کیا ہے۔ شوقی کے حالات کسی قدیم تذکرے یا تاریخ میں نہیں ملتے۔ ان کے کلام ہی سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کے حالات زندگی ترتیب دیے ہیں۔ شوقی کے کلام ہی سے ان کا نام شیخ حسن اور تخلص شوقی اخذ کیا ہے اور حسن شوقی کی نظام شاہی دربار سے وابستگی کو بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے حسن شوقی کا سن ولادت تقریباً ۹۴۸ھ اور وفات کا سال ۱۰۴۲ھ اور ۱۰۵۰ھ کے درمیان متعین کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے قیاس کی بنیاد پر قرار دیا ہے کہ جنگ ''تالی کوٹ'' کے وقت اس کی عمر قریب پچیس برس تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''1041 ہجری میں حسن شوقی زندہ تھا۔ اگر جنگ تالی کوٹ کے وقت حسن شوقی کی عمر پچیس چھبیس سال مان لی جائے تو 1041 ہجری میں اس کی عمر 93، 94 بنتی ہے اور اس کی عمر تک کسی شخص کا زندہ رہ جانا اس دنیا میں کوئی عجیب و غریب واقعہ نہیں ہے''(۱۱)

Scanned with OKEN Scanner

اسی طرح مثنوی ''گلشن عشق'' سے نصرتی کا نام، حالات اور آباء واجداد کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ اسی طرح مثنوی کدم رائو پدم رائو کے مطالعے سے فخر دین نظامی کے نام اور تخلص کے بارے میں معلومات اخذ کی ہیں۔

جمیل جالبی نے مثنوی ''گلشنِ عشق'' کے اشعار سے نصرتی کے حالات مرتب کیے ہیں۔ ان کے مطابق نصرتی کے آباء واجداد پیشہ ور سپاہی تھے۔ نصرتی کے سالِ وفات کے حوالے سے تین محققین کی آرا پیش کی ہیں۔

ا۔ ''تذکرہ شعرائے دکن'' میں عبدالجبار ملکاپوری نے نصرتی کا سالِ وفات ۱۰۹۵ھ لکھا ہے۔

۲۔ اردو مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ میں نصیر الدین ہاشمی نے جو قطعہ تاریخ وفات دیا ہے اس سے ۱۰۸۵ھ سال وفات برآمد ہوتا ہے۔

۳۔ ''اردو شہ پارے'' میں پروفیسر محی الدین زور نے سال وفات ۱۰۸۱ھ دیا ہے۔

جمیل جالبی نے اس سلسلے میں یہ دلیل دی ہے کہ ''تاریخ سکندری'' کا سالِ تصنیف ۱۰۸۳ھ ہے اور اس وقت تک یقیناً نصرتی زندہ تھے۔ اس لیے نصرتی کا سالِ وفات ۱۰۸۵ھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

مخطوطہ کے مطالعہ اور اشعار کے حوالے سے جمیل جالبی نے یہ نتائج اخذ کیے ہیں کہ مثنوی کدم رائو پدم رائو کے مصنف کا نام فخر دین اور تخلص نظامی تھا۔ مثنوی میں کئی جگہ اس نے اپنا نام اور تخلص ساتھ ساتھ استعمال کیا ہے اور التزام یہ رکھا ہے کہ ایک شعر میں وہ خود کو اپنے پورے نام فخر دین سے مخاطب کرتا ہے اور ایک یا دو اشعار کے بعد وہ اپنا تخلص لاتا ہے۔

مخطوطوں کا تعارف اور تدوین کا طریق کار:

ڈاکٹر جمیل جالبی نے دیوانِ حسن شوقی کو انجمن ترقی اردو کی مخزونہ دو بیاضوں سے مرتب کیا ہے۔ بیاض نمبر ا کو انھوں نے نسخہ اول قرار دیا ہے۔ بیاض نمبر ۲ کو نسخہ ثانی کا نام دیا ہے۔ اس لے لیے انھوں نے درج ذیل طریق کار اختیار کیا ہے۔

ا۔ فتح نامہ کا مکمل متن نسخہ اول و ثانی کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ جہاں نسخہ اول اور نسخہ ثانی دونوں میں اشعار مشترک تھے وہاں نسخہ اول کے اشعار متن میں لیے گئے ہیں اور اختلافات کو حاشیے میں ظاہر کر دیا ہے۔

۲۔ وہ اشعار جو صرف نسخہ ثانی میں تھے انھیں نسخہ اول میں موضوع کے تسلسل کے مطابق ملا دیا گیا ہے اور یہ عمل مثنوی کے صرف آخری حصہ میں کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ شعر نمبر ۴۴۸ سے شروع ہوتا ہے۔

۳۔ ان اشعار پر جو دونوں نسخوں میں الفاظ و ترتیب کے لحاظ سے قطعی ایک تھے '' صہ '' کا نشان بنا دیا ہے۔

۴۔ میزبانی نامہ کا چونکہ ایک ہی نسخہ تھا اس لیے اختلاف کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

۵۔ حسن شوقی کی وہ غزلیں جو سخاوت مرزا اور حسینی شاہد نے دریافت کی تھیں ان کا اختلاف حاشیے میں ظاہر کر دیا ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

مثنوی نظامی دکنی اور دیوانِ نصرتی کا چونکہ ایک ایک نسخہ تھا اس لیے ان کے اختلافِ نسخ نہیں دیے گئے۔ان کے حواشی بھی مختصر ہیں۔دیوانِ حسن شوقی میں فتح نامہ نظام شاہ کا متن دو نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے اس لیے ان کا اختلاف حواشی میں درج کیا گیا ہے

"تجے جوے دولت کوں جل تھل اہے

جوے اور جل تھل کے الفاظ کا اختلاف حاشیے میں درج کیا ہے

"نسخہ ثانی میں جوے کے بجائے شاہ اور جل تھل کے بجائے جلیل ملتا ہے۔"(۱۲)

بولا بھیجیا، شاہ دانا، دبیر

نسخہ ثانی پہلا مصرع یوں ہے "بولا بھیجیا شہ نے دانائو پیر

دیوان حسن شوقی کی غزلیات جن بیاضوں سے لی گئی ہے ان کے اختلاف بھی حواشی بھی درج کیے گئے ہیں۔کل ۳۰ غزلیات ہیں جو ردیف وار درج کی گئی ہیں۔پہلی غزل کا تعارف حاشیے میں یوں دیا ہے۔

"یہ غزل انجمن کی دو بیاضوں میں ملی۔ایک میں چھ اور دوسری میں سات شعر ہیں۔اسی غزل کو سخاوت مرزا نے کسی اور بیاض سے لے کر رسالہ اردو کراچی اپریل ۱۹۵۴ء میں اور دوسری دو نئی غزلوں کے ساتھ شائع کیا تھا۔اس غزل میں سات شعر ہیں۔ہم انجمن کی بیاض سے ۷ شعر والی غزل یہاں متن میں دے رہے ہیں اور اس کا مقابلہ رسالہ اردو اور دوسری بیاض کی غزل سے کر رہے ہیں۔"(۱۳)

اس غزل کے حاشیے کے طریق کی مثال درج ذیل ہے۔

متن میں غزل نمبر ا کا ایک شعر ہے

تجہ ناز کے بیداد تھی ویراں ہوا ہے کانورو

تجہ لب شکر کے قول تھی معمور بنگالا ہوا

اس کا حاشیہ یوں درج کیا گیا ہے

"کانورو کے بجائے رسالہ اردو میں "گانوار" کا لفظ ملتا ہے اور انجمن کی بیاض میں "گنہ ور" کا لفظ ملتا ہے۔"(۱۴)

اسی طرح غزل نمبر ۹ کا تعارف حاشیے میں یوں درج کیا ہے:

"قدیم اردو جلد اول مرتبہ مسعود حسین خاں میں اس غزل کے ۹ شعر ہیں۔انجمن کی ایک بیاض میں ۹ شعر ہیں اور دوسری بیاض میں ۱۱ شعر ہیں۔ہم نے اسی بیاض کی غزل کو متن بنایا ہے اور ذیل میں دونوں کا مقابلہ کر دیا ہے۔پہلے دو شعر انجمن کی دونوں بیاضوں میں ہیں۔قدیم اردو اول میں نہیں ہیں ۔"(۱۵)

Scanned with OKEN Scanner

غزل نمبر ۲۷ کا تعارف یوں دیا ہے:

''یہ غزل بھی دو بیاضوں میں ملتی ہے۔ دونوں میں ۶ شعر ہیں اور سوائے الفاظ کے اختلاف کے اشعار بھی اسی ترتیب سے ملتے ہیں۔ ''(۱۶)

دیوانِ نصرتی میں تاریخ سکندری کا ایک ہی نسخہ تھا اس لیے اختلاف نسخ تو حاشیے میں نہیں دیے گئے تاہم کتابت کی اغلاط کو حواشی میں درست کر دیا گیا ہے۔

کہ بولے یہ یک بول کا دہر کے (۱) آل

حاشیے میں حوالہ نمبر ا لکھ کر اس کے آگے یہ درج کیا ہے

''اصل میں ''کہ'' تحریر تھا۔'' (۱۷)

ص ۲۹ پر کاتب کی غلطی کی درستی یوں کی ہے

''مخطوطے میں ''آب'' لکھا ہے لیکن یہ سہو کتابت ہے کیوں کہ قافیہ ''باگ'' ہے (۱۸)

مثنوی نظامی دکنی میں متن کے اندر ہی قوسین لگا کر اس کی تصحیح یا وضاحت کر دی ہے۔ ان قوسین کی تقسیم یوں کی گئی ہے:

ا۔ جہاں مصرع کو وزن میں لانے کے لیے کسی لفظ یا حرف کا اضافہ کیا گیا ہے وہاں یہ بریکٹ استعمال کیا گیا ہے () مثلاً

جو مجہ انک دیسے سو مندان تجہ

جو مندا(ن) میں ہوئے بنداں تجہ

پرت پال سنسا(ر) کرتار ادھار

۲۔ جہاں مصرعے میں لفظ یا الفاظ زائد تھے وہاں ان زائد الفاظ کو اس بریکٹ میں دکھایا گیا ہے []

]رتن] گگن سمندر توں گنج تیتا دھرے

دھرتی جیوتی کر سمندر بھرے

۳۔ جہاں مصرع میں کاتب سے کوئی لفظ چھٹ گیا ہے اور کوشش کے باوجود اس لفظ کا اضافہ نہیں کیا جا سکا وہاں سوالیہ نشان بنا دیا گیا ہے؟

کہ بھیتر پھول پھل ہوئے تھی کانٹ کانٹ؟(۱۹)

۴۔ جہاں کرم خوردہ یا مشکوک ہونے کی وجہ سے لفظ نہیں پڑھا جا سکا وہاں نقطے لگا دیے گئے ہیں۔ مثلاً

ص ۷۷ پر ایک مصرع کی جگہ ۔۔۔۔۔۔ کا نشان لگا دیا گیا ہے اور اس پر لکھا ہے ''(۔۔۔۔۔ یہاں سے تسلسل قائم نہیں رہا) ج ج (۲۰)

Scanned with OKEN Scanner

یا مصرعے کے درمیان میں کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے یا پڑھا نہیں جا سکا تو بھی نقطے لگا دیے گئے ہیں

کہ اس آس تھیں پھر بھی۔۔۔ شُکر کر

لسانی مطالعہ:

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جن متون کو ترتیب دیا ہے وہ دکنی دور کے متون ہیں۔ اُس عہد کی زبان آج کی زبان سے بہت مختلف ہے۔ دکن کے ادبی مراکز گولکنڈہ اور بیجاپور تھے۔ قطب شاہی اور نظام شاہی علاقوں کی زبان و اسلوب پر فارسی کا اثر گہرا تھا جبکہ بیجاپور کی زبان و اسلوب پر سنسکرت اور مقامی زبانوں کا گہرا اثر تھا۔ اس دور کا املا کا طریق کار بھی ادبی و لسانی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسے جدید املا کے مطابق نہیں کیا ۔اس ضمن میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''زیادہ تر الفاظ میں نے اصل املا کے مطابق رہنے دیے ہیں۔ صرف ہ اور ھ کو بدلا ہے تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو اور شعر آسانی سے وزن میں پڑھا جا سکے۔ بعض لفظوں کو میں نے صرف الگ کر دیا ہے تاکہ لفظ کو پہچاننے میں آسانی ہو یا پھر میں نے ایسے الفاظ کا املا درست کیا ہے جو اس وقت بھی صحیح نہیں مانے جاتے ہوں گے جیسے غوص اعظم کو غوث اعظم کر دیا ہے حجرت کو ہجرت اور نصل کو نسل۔ '' (۲۱)

دکن کے یہ متون ادبی و لسانی نمونے ہیں۔ ان کی زبان، صرف و نحو، محاورات و ضرب الامثال، تذکیر و تانیث، روزمرہ محاورہ اور تلمیحات کا مطالعہ اردو لسانیات میں قدیم لسانی نمونے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان متون کے لسانی مطالعے بھی تفصیل سے پیش کیے ہیں تاکہ اس دور کی لسانیات سے آگہی ہو سکے۔ دیوانِ حسن شوقی میں شوقی کے کلام کی صرفی و نحوی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ لازم و متعدی، علامتِ فاعل، تذکیر و تانیث، حرفِ ربط، سندھی اور قدیم دکنی کا فرق اور مماثلت کو مثالوں کے ذریعے درج کیا ہے۔ مثنوی نظامی دکنی (کدم رائو پدم رائو) کو جمیل جالبی نے اردو کا قدیم ترین ادبی و لسانی نمونہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے ص ۳۵ تا ۶۰ مثنوی کا لسانی مطالعہ بہت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس مثنوی میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اس میں روزمرہ اور محاورے کی ایسی رچاوٹ ہے کہ اسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مثنوی اس زبان کا پہلا نمونہ نہیں ہے بلکہ اس سے قدیم تر نمونے بھی ہوں گے جو یا تو ضائع ہو گئے یا ابھی تک ہماری نظروں سے اوجھل ہوں۔''(۲۲)

جمیل جالبی نے اس لسانی مطالعے میں درج ذیل عنوانات قائم کیے ہیں اور ان کی مثالیں دی ہیں

روزمرہ محاورہ، تلمیحات، مرہٹی زبان کے اثرات، پنجابی کا اثر، گجراتی اثرات، سرائیکی ہندی اثرات، اسم فاعل، لاحقے، سابقے، نون غنہ کا استعمال، جمع کی شکلیں، ضمیر، اسم ضمیر اور دوسری شکلیں، حرف کی چند مثالیں، فعل و متعلقاتِ فعل، مضارع و امر کی دوسری شکلیں، فعل جمع، مرکب افعال، ماضی مطلق، ''کر'' فعل کا استعمال، چند اور دلچسپ خصوصیات۔

گو شوقی کی بہت کم غزلیں محققین کو دستیاب ہوئی ہیں اور جو کچھ ملا ہے اس میں بھی کچھ حصہ کرم خوردہ ہے لیکن اس کے باوجود بھی ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے ماہر محقق اور استاد نے انتہائی عرق ریزی کے بعد اس کا بڑا حصہ محفوظ کیا ہے۔ حسن شوقی کی غزل کے نمایاں اوصاف میں ایک اہم وصف

Scanned with OKEN Scanner

اس کے منفرد قافیہ کا استعمال ہے۔اس کی غیر مردف غزل میں منفرد قافیہ نے بھی اس کی غزل کو منفرد بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اس غزل میں انہوں نے کھب کھب، غب غب، اب اب، دب دب، کب کب جیسے قافیے استعمال کیے ہیں اور لفظوں کے تکرار سے شعر میں ترنم پیدا کیا ہے

"کُھب کُھب رہی ہے من میں تری زلف کی کھب کھب

مج جیو کے گلے میں پڑیا ہے طوقِ غب غب

تپ تپ ہوا ہوں تب سیں تیرے وصال کارن

جپ جپ کیا ہوں جپنا ہر دم کتا ہوں اب اب" (۲۳)

مثنوی کدم رائو پدم رائو میں روز مرہ اور محاورہ کا ستعمال کثرت سے ہوا ہے۔مثال دے کر جمیل جالبی نے شعر کے آگے متعلقہ شعر نمبر بھی لکھ دیا ہے تا کہ متن میں اسے تلاش کرنے میں آسانی ہو۔شعر نمبر ۵۰۹ میں محاورے کی مثال یوں دی ہے

ٹھکائی کرنا:

کہیں بیس چھجے دیوں بار جگ

ٹھکائیں کروں جو کرے جگ ٹھگ (۲۴)

سب کو ایک لکڑی سے ہانکنا:

نہ سر پار کر دُود کون ہیں تاک

سبھی استریاں ایک لکڑی نہ ہاک (۲۵)

پانچوں انگلیاں کبھی ایک سی نہیں ہوتیں

نہو سی کدھیں پانچ انگل سمان (۲۶)

تلمیحات کا استعمال

بھلے تیں کہیا آج رامان منجہ

کیہا دیکھ توں کال ہنمان منجہ (۲۷)

پنجابی کا اثر

آکھے کدم رائو آکھے سنی بات دھن

Scanned with OKEN Scanner

بدل(بادل) پڑے کیوں نہ بجلی بدل سیس ٹوٹ (۲۸)

دکن کی زبان اور ذخیرہ الفاظ آج کے قاری کے لیے نامانوس ہے اس لیے اس ضرورت کو سمجھتے ہوئے جمیل جالبی نے متن کے آخر میں فرہنگ بھی دی ہے تاکہ متن کو پڑھنے کے لیے جس مشکل کا سامنا انھیں کرنا پڑا قارئین اس سے محفوظ رہیں۔ دیوانِ نصرتی اور مثنوی کدم رائو پدم رائو کے آخر میں بھی فرہنگ دی گئی ہے۔ دیوانِ نصرتی میں ص ۸۱ تا ص ۹۳ اور مثنوی نظامی دکنی میں ص ۲۴۲ سے ص ۲۶۵ فرہنگ دی گئی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے متن کی پیش کش میں ایک اور مفید کام یہ کیا ہے کہ ہر پانچ اشعار کے بعد شعر پر دو مصرعوں کے درمیان شعر نمبر درج کیا ہے۔ اس طرح اس مثنوی کے کل اشعار کی تعداد کا علم تو ہوتا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ کسی شعر کی تلاش میں آسانی رہتی ہے۔ مثلاً مقدمے میں جمیل جالبی نے اگر شعر نمبر ۱۴۲ کا حوالہ تلمیح کی مثال دیتے ہوئے دیا ہے تو اس شعر نمبر ۱۴۲ کو تلاش کرنا بہت آسان ہے جو کہ ۱۴۰ اور ۱۴۵ کے درمیان میں ہوگا۔

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی (مرتب) ،دیوانِ حسن شوقی، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۱ء، مقدمہ

۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی (مرتب) دیوانِ نصرتی، لاہور: قوسین، ۱۹۷۲ء، ص ۲ مقدمہ

۳۔ ایضاً، ص ۱۴ مقدمہ

۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی (مرتب)، مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ کدم راو پدم راو، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۳ء، ص ۹ مقدمہ

۵۔ ایضاً، ص ۱۱، ۱۰

۶۔ ایضاً، ص ۳۵

۷۔ دیوانِ حسن شوقی، ص ایک مقدمہ

۸۔ دیوانِ نصرتی، محولہ بالا، ص ۲ مقدمہ

۹۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۰۔ مثنوی نظامی دکنی، محولہ بالا، ص ۱۰ مقدمہ

۱۱۔ دیوانِ حسن شوقی، مقدمہ

۱۲۔ دیوانِ حسن شوقی، ص ۹۳ حاشیہ

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۴۰ حاشیہ

Scanned with OKEN Scanner

۱۴۔ایضاً، ص ۱۴۰ حاشیہ

۱۵۔ایضاً، ص ۱۴۸ حاشیہ

۱۶۔ایضاً، ص ۱۶۸ حاشیہ

۱۷۔دیوانِ نصرتی، محولہ بالا، ص ۱۹ حاشیہ

۱۸۔ایضاً، ص ۲۹

۱۹۔مثنوی نظامی دکنی، ص ۷۹

۲۰۔ایضاً، ص ۷۷

۲۱۔دیوانِ حسن شوقی، ص ۶۵ مقدمہ

۲۲۔مثنوی نظامی دکنی، ص ۳۶ مقدمہ

۲۳۔دیوانِ حسن شوقی، محولہ بالا

۲۴۔مثنوی نظامی دکنی، محولہ بالا، ص ۳۹

۲۵۔ایضاً، ص ۴۰

۲۶۔ایضاً، ص ۴۱

۲۷۔ایضاً، ص ۴۳

۲۸۔ایضاً، ص ۴۵

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

ٹوبہ ٹیک سنگھ کی کثرتِ تعبیر؛ابہام کی جمالیات

Dr. Muhammad Rashid Saeedi
Lecturer, Department Of Urdu,
The Islamia University Of Bahawalpur, Pakistan

Abstract: Saadat Hasan Manto holds a distinctive place in the tradition of short story writing, celebrated for his unconventional themes and innovative narrative techniques. Like all great writers, Manto infused his texts with layers of complexity and multidimensionality, deliberately avoiding simplicity and linearity. This richness in depth not only enhances the interpretive possibilities of his work but also invites critics from diverse intellectual perspectives to engage with his stories. These critics, through their varied analyses, derive meanings that resonate with their own critical frameworks, thereby enriching the discourse surrounding Manto's literary art. Despite his controversial reputation, Manto remains one of the most extensively critiqued and analyzed authors in Urdu literature.These critics function as interpreters of Manto's fictional universe, contributing significantly to the understanding of his artistic vision, worldview, and the philosophical underpinnings of his work. While some have hailed him as a progressive realist deeply rooted in social

Scanned with OKEN Scanner

realism, others have dismissed him as being indifferent to class consciousness and societal concerns. This divergence gives rise to a pivotal question: what interpretive methods and semantic frameworks have critics employed to extract meanings from Manto's stories?To explore this question, the present paper critically examines select interpretations of Manto's "Toba tek Singh" as a case study to analyze the hermeneutic and semantic strategies employed by critics. This comparative approach sheds light on the interpretive practices applied to Manto's literary oeuvre.

Keywords: Manto, Afsana, Partition, Interpretation, Semantics, Hermeneutics, Multiplicity of Meaning.

کسی بھی زبان کا ادب، اپنے زمانی دائرہ کے مزاج، مسائل اور امکانات کا امین ہوتا ہے۔اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی عہد کی فکریات (episteme) بہر صورت اس دور کی تخلیقات پر اثرانداز ہوتی ہے؛اور تخلیق اس سے کسی طور ماورا نہیں ہوسکتی۔اس نکتے سے فوری طور پر یہ اندیشہ جنم لیتا ہے کہ تخلیقی متن کی معنویت اس عہد کے بعد کیا ہوگی؟تو اس کا جواب کسی بھی متن کو تخلیقی اور ادبی تسلیم کرنے سے مل جاتا ہے۔ ادیب، یا یوں کہیں بڑا ادیب؛ کلی طور پر زمانے کے اثر کے تحت نہیں لکھتا، بلکہ فن کا پختہ اور متحرک شعور اسے وہ کرافٹ، اسلوب اور برتاؤ فراہم کرتا ہے کہ اس کی تخلیق، لمحہ موجود اور عہدِ آمدہ میں بھی بامعنی قرار پاتی ہے۔ [i] بڑا ادیب اپنے متن میں موضوع اور معانی کو واضح، یک رخا اور اکہرا رکھنے کی بجائے تہہ دار اور ہمہ گوں بناتا ہے۔اس عمل سے ادبی متن کی عمر اور اہمیت بڑھ جاتی ہے لیکن یہ گہرائی اور ہمہ گونی کثرتِ تعبیر کا راستہ بھی ہموار کر دیتی ہے۔اسی راستے سے ہمہ قسم کے ناقدین آتے ہیں اور فن پارے سے مطلوب و مقصود موجود معانی اخذ کر کے اپنے تئیں توقیر پاتے ہیں۔

ہمارے ہاں سعادت حسن منٹو کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ کسی نے سماجی حقیقیت نگاری کی بنیاد پر منٹو کو حقیقی ترقی پسند قرار دیا تو کسی نے اسے طبقاتی شعور اور معاشرتی دردمندی سے بے بہرہ سمجھا۔ سماج کو متعین اخلاقی اصولوں پر چلانے کے خواہش مند منٹو کو کبھی قبول نہ کر سکے اور اسے مریض اور فحش نگار ہی سمجھتے رہے۔ وقت بے رحم ہے اور فیصلہ کن بھی؛جب وقت کی روانی منٹو کی افسانوی دھار کو کند نہ کر سکی، گزرتے عہد کی گرد اس کی شبیہ کو دھندلا نہ سکی تو سرحد کی دونوں طرف منٹو کو تسلیم کرتے ہی بنی۔تاہم طرفین کی ضروریات اور ترجیحات کے مطابق مخصوص ''منٹو'' درکار

Scanned with OKEN Scanner

تھاجو متنوع، متضاداور متنازعہ تعبیرات کے ذریعے تشکیل دیا گیا۔ جنس اور تقسیم؛ منٹو کے دو بڑے موضوعات ہیں، ان سے متعلق ان کے درجنوں افسانے موجود ہیں، جن کی سینکڑوں تعبیرات، منٹو کے افسانوں کی تہہ داری، ناقدین کی ان سے دلچسپی، اور شرح و تعبیر کے ہمہ جہت حربوں کی موجودگی پر دال ہیں۔ اس صورت حال میں فی الوقت ہماری دلچسپی صرف دو سوالوں کے جوابات تلاش کرنے میں ہے۔ منٹو کے ناقدین کے ہاں کون سا طریق نقد یا تصورِ معنی یا تعبیری حربہ تھا، جس کی بنیاد پر انھوں نے منٹو کے افسانوں کی تعبیرات کیں؟ دوسرا یہ کہ ان تعبیرات سے منٹو کی افسانوی کائنات پر کیا اثر پڑا؟ ان سوالوں کے درست اور کامل جوابات کے لیے تمام منٹو تنقید کا محاسبہ ضروری ہے، تاہم یہاں ہم منٹو کا افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور اس کی منتخب تعبیرات کا تجزیہ کر کے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کریں گے۔

'' ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کے انتخاب کی کئی وجوہ ہیں۔ یہ منٹو کا معروف، مقبول اور متنازعہ افسانہ ہے، جو موضوع کی بنا پر عوام کو، کرافٹ اور فنی پختگی کی بنیاد پر ناقدین کو عزیز ہے۔ پھندنے (۱۹۵۴ء) میں شامل یہ افسانہ انھوں نے وائی ایم سی اے حال میں منعقدہ ایک تنقیدی نشست میں پیش کیا تھا ،پڑھتے وقت منٹو کا انداز رعونت سے بھرپور تھا، پڑھنے کے بعد منٹو تنقیدی آراء سنے بغیر فوراً اٹھ کر چلے گئے۔ ایک پاگل خانے اور اس میں موجود پاگلوں کی کیفیات پر مشتمل یہ افسانہ، اپنے اندر معانی کی کائنات لیے ہوئے ہے۔ دراصل منٹو اس افسانے کی تخلیق سے قبل دو مرتبہ پاگل خانے میں رہ چکے تھے ۔وجہ ان کی کثرت شراب نوشی بنی، کہ اسے ترک کرنے کے لیے جبراً یہ فیصلہ کیا گیا، اور یہ بھی ہے کہ اس دور میں ترکِ منشیات کے حوالے علیحدہ بحالیِ صحت کے مراکز نہیں ہوتے تھے، چنانچہ ایسے مریضوں کو باقاعدہ ذہنی مریضوں کے ساتھ ہی رکھا جاتا تھا۔ تیقن سے کہا جاتا ہے کہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں کمالِ فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے منٹو کو پاگل خانے کا تجربہ اور مشاہدہ بہت کام آیا ہو گا۔ اپنے تخلیقی سیاق سے قطع نظر یہ افسانہ اپنے اندر ایک تہہ داری اور ایک خاص طرز کا ابہام رکھتا ہے؛ جس کے باعث معنی؛ یعنی مصنف کا نقطۂ نظر واضح، متعین اور ٹھوس ہونے کی بجائے تحلیل اور معلق ہو جاتا ہے ۔اسلوب اور بنت کی بنیاد پر، مصنف کے رکھے ہوئے شعوری رخنے نقاد کو یہ جواز فراہم کرتے ہیں کہ وہ واحد کی بجائے کثیر تعبیرات سامنے لا سکے۔

اس افسانے میں تقسیم ہند کے بعد کی صورتِ حال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ تقسیم اور فسادات کے باعث طرفین سے ہندو، سکھ اور مسلمانوں نے ہجرت کر لی، تو سیمیناروں اور کانفرنسوں میں غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ پاگل خانوں میں موجود وہ پاگل، جن کے رشتہ دار ہجرت کر چکے ہیں، کو ان کے متعلقہ ملک کے پاگل خانوں میں منتقل کر دیا جائے۔ اس منتقلی کے اعلان کے بعد پاگل خانوں میں موجود پاگلوں کی نفسیاتی کیفیات کو '' ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں کمال فن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مختلف پاگلوں کے ہندوستان کی تقسیم اور تشکیل پاکستان کے حوالے سے محسوسات اور ان کا اظہار، اس افسانے میں ایک ایسی فضا تشکیل دیتے ہیں جو اس منظر نامے کا حقیقی اظہار یہ کہلانے کی حق دار ہے، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ آج بھی افسانہ اپنی معنویت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

'' ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا مرکزی کردار بشن سنگھ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا رہائشی ہے جو پندرہ سال سے پاگل خانے میں ہے، ہمیشہ کھڑا رہتا ہے، سوتا بھی کھڑے کھڑے ہے یا کبھی دیوار سے ٹیک لگا لیتا ہے۔ اتنے سالوں میں بڑی ہو جانے والی بیٹی کو پہچاننے سے قاصر ہے، تاہم ہر ماہ اپنے رشتہ داروں کی آمد سے پہلے نہا دھو کر تیار ہو جاتا ہے۔ اکثر لایعنی الفاظ دہراتا رہتا ہے۔ تقسیم کے بعد پاگلوں کی منتقلی کا سن کر فکر مند ہوتا ہے کہ پتہ نہیں اس کا علاقہ ٹوبہ ٹیک

Scanned with OKEN Scanner

سنگھ پاکستان میں ہو گا یا ہندوستان میں۔ منتقلی کے وقت جب اسے پتہ چلتا ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے اور اسے ہندوستان لے جایا جا رہا ہے تو وہ بے چین ہو جاتا ہے اور بالآخر نو میسز لینڈ پر اوندھے منہ گر کر مر جاتا ہے۔[ii] افسانے میں میں فقط بشن سنگھ ہی نہیں، ہر کردار، اس کی کیفیت اور مکالمہ تفہیم و تعبیر کا متقاضی ہے ، راقم کی طرف سے افسانے کی تعبیر کرنے کی کی بجائے افسانے کے چند پہلو درج کیے جاتے ہیں، جن پر مختلف ناقدین کی تعبیری آراء کا جائزہ لیا جائے گا۔

ا۔ باقاعدگی سے زمیندار اخبار پڑھنے والے ایک پاگل سے جب کسی نے پوچھا کہ " مولبی ساب! یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟" تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا، " ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں؟"

۲۔ جھاڑو دیتے ہوئے ایک پاگل درخت پر چڑھ گیا اور وہیں ایک ٹہنی پر بیٹھ کر اس نے تقسیم کے نازک مسئلے پر دو گھنٹے تقریر کی، بعد ازاں اس نے یہ کہہ کر نیچے آنے سے انکار کر دیا کہ نہ وہ ہندوستان میں رہے گا نہ پاکستان میں، بلکہ وہ درخت پر ہی رہے۔ ڈرا دھمکا کر جب اسے نیچے اتارا گیا تو وہ بلا تفریق مذہب ساتھی پاگلوں سے گلے مل کر روتا رہا۔

۳۔ ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے، پاکستان زندہ باد، کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

۴۔ بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے، ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے میں بھجوا دیا تھا کہ وہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔

۵۔ خود کو محمد علی جناح سمجھنے والے موٹے مسلمان اور خود کو ماسٹر تارا سنگھ سمجھنے والے ہندو کے درمیان جھگڑا ہوتا ہے، خونریزی کے خدشے کے پیشِ نظر انھیں الگ کر دیا جاتا ہے۔

۶۔ انھی پاگلوں میں ایک ایم ایس سی پاس مسلمان ریڈیو انجینئر بھی تھا، جس نے اس اپنے تمام کپڑے اتار کر ننگ دھڑنگ پھرنا شروع کر دیا۔

۷۔ ایک نوجوان ہندو وکیل جس کی محبت امرتسر تھی، جب اسے بتایا گیا کہ امرتسر ہندوستان کا حصہ بن گیا ہے تو وہ ہندو مسلم سبھی لیڈروں کو گالی دیتا تھا، لیکن جب منتقلی کی بات آئی تھی تو وہ پریشان ہو گیا کہ وہاں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

اسی طرح کرداروں کی کچھ اور کیفیات اور مکالمے جو افسانے کو ایک نامیاتی کل کی شکل دیتے ہیں۔ اور جن کی بنیاد پر توقع کی جاتے ہی کہ افسانے کی ہر ایک تعبیر میں ان جہات کو پیشِ نظر رکھا جائے گا، نہ کہ افسانے کے متن سے گریز کر کے کسی خیال کو سچ ثابت کیا جائے گا اور اسے افسانے کی (حقیقی) تفہیم و تعبیر کہا جائے گا۔ ذیل میں انھی نکاتِ کے پیشِ نظر "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کی کچھ تعبیرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

بھارت سے متعلق وارث علوی فکشن کے معتبر نقادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا طرزِ استدلال، اور طریقِ تعبیر کافی متاثر کن اور مستند سمجھا جاتا ہے۔ ان کی کتاب منٹو ایک مطالعہ میں ایک مضمون " ٹوبہ ٹیک سنگھ " موجود ہے جو اس افسانے کی باقاعدہ تفہیم، تنقید اور تعبیر پر مشتمل ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

اپنے مضمون کے آغاز میں وہ افسانے کو تہہ دار اور معنویت سے بھرپور قرار دیتے ہیں جس کی تعبیر کی طرف لوگوں نے توجہ نہیں دی۔ وارث علوی بھی افسانے کی تفہیم و تعبیر سے پیشتر اس کا سیاق فراہم کرتے ہیں، جس میں تقسیم اور ہجرت کو انسانوں کی ہیرا پھیری قرار دیتے ہیں جس سے لاکھوں لوگوں کی روح پر چرکے لگے، لوگ بے جڑ ہو گئے، اور انسانوں کے حصے میں تباہی اور رائیگانی آئی، جس کا بوجھ تاریخ نہیں اٹھاتی بلکہ ان '' فضولیات'' کا بوجھ ادب کو اٹھانا پڑتا ہے، اور منٹو نے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کے بشن سنگھ کے ذریعے اس رائیگانی کا اظہار کیا ہے۔ وارث علوی نے ابتدا ہی میں افسانے میں موجود پاگل خانے کو علامت جان کر اس کی تعبیر کر دی اور آج تک اس کا ثبوت فراہم کرتے رہے، لکھتے ہیں:

"وجہ یہ ہے کہ ملک کے تقسیم ہوتے ہی بشن سنگھ جس پاگل خانے میں تھا، اس کے باہر بھی ایک بڑا پاگل خانہ کھل گیا تھا۔ اس پاگل خانے کی تعمیر ملک کے ہوش مند سیاستدانوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ رات کے رات جغرافیہ بدل گیا، روابط اور وابستگیاں بدل گئیں۔ اور لوگ بہ تمام ہوش مندی ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کرنے لگے۔ یہ ایک اجتماعی پاگل پن تھا، جس کی مضحکہ خیز صورتیں ابھی سامنے آنے ہی نہ پائی تھیں کہ جڑوں سے اکھڑنے کے کرب پر ہولناک فسادات کی تاریکیاں چھانے لگیں۔ [iii]"

باقاعدگی سے زمیندار اخبار پڑھنے والے پاگل سے جب کسی نے پوچھا کہ ' مولبی صاحب! یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟' تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا، ' ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں؟'۔ یا نہاتے نہاتے مسلمان پاگل کا زور سے نعرہ لگانا، پاکستان زندہ باد، اور غسل خانے میں گر جانا، افسانے کے قابل غور، لائق تعبیر جملے تھے، جن کی تعبیر وارث علوی نے کچھ یوں کی یہ لاہور کا یہ پاگل خانہ باہر کی دنیا کی علامت نہیں، بلکہ اس کا ہی روپ ہے۔ فرق کیفیت کا نہیں بلکہ کمیت کا ہے باہر بھی لوگ، سڑکوں اور بازاروں میں ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں جیسی کہ پاگل خانے میں۔ وارث علوی متن کو سیاق سے جوڑ کر ہی معنی اخذ کر رہے ہیں لیکن ''لاہور کا یہ پاگل خانہ'' کہنے کے کے بعد 'باہر' کے معنی ہندوستان کے نہیں رہتے، پاکستان کے ہو جاتے ہیں، جو استدلال کو معروضی کے بجائے موضوعی کر دیتے ہیں۔ منٹو کے افسانے میں معنی عمومی ہیں، تعبیر میں خصوصی معنی پہنانے میں بھی ہرج نہیں، لیکن پہلے سے متعین معنی کو افسانے میں سمونا تعبیریت کے اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ متعین معنی کی بنیاد دراصل ان ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت ہے جنھوں نے تقسیم کے وقت پاکستان ہجرت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وارث علوی کے بقول:

"لیکن حقیقت ہے مت سب کی ماری گئی تھی، بہ تمام ہوش مندی لوگ اپنے آبائی گھروں کو ترک کر رہے تھے، اپنی پشتوں کے وطن کو چھوڑ کر جا رہے تھے، گویا زمین کے ساتھ ان کا تعلق ہی نہیں رہا۔ [iv]"

جب ایک نقاد تعبیر کا ارادہ کر کے افسانے کا تجزیہ کرتا ہے تو اس سے افسانوی متن کی تعبیر کی توقع کی جاتی ہے، نہ کہ معنی کے تعین کی مسلسل کوشش۔ وارث علوی بشن سنگھ کی تمام ترکیفیات جنوں کی بنیاد اس کے زمین سے رشتے اور دھرتی سے تعلق کو قرار دیتے ہیں، جس سے جدا ہونے کا

Scanned with OKEN Scanner

احساس ہی اسے موت کے حوالے کر دیتا ہے۔ کھڑے ہوئے شخص کے گر کے مرنے پر وارث علوی کہتے ہیں کہ درخت کا ستعارہ مکمل ہو گیا۔ کوئی بڑا درخت گرتا اسی دھرتی پر ہے جس کی کوکھ سے اس کا بیج پھوٹا ہوتا ہے۔ بشن سنگھ کی موت واقعی ایک تحیر انگیز المیہ بن کر قاری کے سامنے آتی ہے، جو اس نوعیت کے کئی سوال کھڑے کر دیتی ہے، تاہم وارث علوی کو یہ نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ پندرہ سال سے سیدھا کھڑا رہنے والا بشن سنگھ پاگل خانے میں پاگل ہو کر آیا تھا، نہ کہ وہ کوئی قاتل تھا جو پاگل خانے میں آنے کے بعد تقسیم ہند کا سن کر پاگل ہوا تھا۔ وارث علوی کا یہ مضمون دلچسپ ہے، پر لطف ہے۔ نثر لاجواب ہے، لیکن کسی نوعیت کے فنِ تعبیر (Hermeneutics) اور تصورِ معنی سے تہی۔ جس کی قدر کی جا سکتا سکتی، متاثر ہوا جا سکتا ہے لکن اسے معروضی کسی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔

شافع قدوائی بنیادی طور پر ابلاغیات کے آدمی ہیں تاہم پاک و ہند میں ان کی شناخت، تنقید بالخصوص تھیوری اور اس کے اطلاقی شعور کے حوالے سے مسلمہ ہے۔ ان کا ایک مضمون ''نیشن بطور بیانیہ اور منٹو کا افسانوی متن'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ اس میں اگرچہ انھوں نے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کی باقاعدہ تعبیر نہیں کی تاہم میں اس افسانے کا فیصلہ کن تعبیری تذکرہ لائق توجہ ہے، بالخصوص بھارتی نقاد کے طور یہ نقطۂ نظر کئی جہات کو واضح کرتا ہے۔ شافع قدوائی نے اپنے مضمون میں گائتری چکروتی سپیاوک، ہومی کے بھابھا اور ایڈورڈ سعید کے حوالوں سے ریاست و مملکت کے تصور پر بحث کی ہے اور نتیجتاً قومی مملکت (Nation State) کے تصور کو دور رس مخرب، اور مضر استعماری حربہ قرار دیا ہے؛ جس کا درست شعور اور احساس قومی مملکت کے مکین ادیبوں کی تخلیقات میں موجود ہوتا ہے۔ کسی بھی خطے کی تقسیم اور وہاں قومی مملکت کا قیام امن و خوش حالی، اور عوامی آرزؤں کی تکمیل کی بجائے جبر و تشدد اور مسلسل ناانصافی کا بنیادی ثابت ہوتا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اور قیام پاکستان کئی حوالے سے اسی شعور کی مثال کے طور پر انھوں نے منٹو کا افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' پیش کیا ہے۔ شافع قدوائی بشن سنگھ کی کیفیت بارے لکھتے ہیں:

"۔۔۔ بشن سنگھ کے بظاہر بے معنی جملے اور اس کا ایک مقام پر مسلسل ثابت قدمی سے کھڑا رہنا اور تشخص کے نام پر ہر قسم کے تشدد کو روا رکھنے کی روش کی ہولناکی جو NO MANS LAND میں بشن سنگھ کی موت پر منتج ہوئی Nation State ، کے قیام کے وقت ہی اس کی اخلاقی شکست کا اشارہ بن جاتی ہے۔ [۷] "

اگرچہ اس مضمون کو ہم شافع قدوائی کے تصور نقد و تعبیر کی بنیاد کے طور پر نہیں پیش کر سکتے؛ کہ انھوں نے تعبیر سے پیشتر ہی قومی مملکت کے حوالے سے نقطۂ نظر واضح کر دیا تھا، لیکن اس نوع کے تعبیری جملوں سے کم از یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات زمینی حقائق، ریاستی پالیسی اور روایتی تصورات ایک نقاد کو متن کی تعبیر کرنے کی بجائے متن کو متعین نظریے کا ثبوت بنانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

اسی سلسلے میں جگدیش چندر ودھاون کا مضمون '' ٹوبہ ٹیک سنگھ'' بھی اپنی نوعیت کا شاندار مضمون ہے، جس میں توازن دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس مضمون میں افسانے کے فنی و فکری ہر پہلو کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فن کے حوالے سے جگدیش چندر ودھاون افسانے کے پلاٹ، اور بالخصوص برتاؤ کی تعریف کرتے ہیں کہ افسانے میں ایک جگہ بھی تشبیہ و استعارہ استعمال نہیں ہوا، مشکل تراکیب بھی دیکھنے کو نہیں ملتیں، تاہم کرداروں کے منہ

Scanned with OKEN Scanner

سے ملنے والے بظاہر بے معنی،اس قدر جاندار، لیکن حقیقتاً با معنی بلکہ کثیر المعنی ہیں کہ اس میں سے بہت کچھ بر آمد ہوتا ہے۔ مضمون نگار کے بقول منٹو نے اس افسانے میں نہ جذباتیت کا مظاہرہ کیا ہے،نہ جانبداری کا، بلکہ تقسیم ہند سے متعلق اپنا موقف نہایت فنکارانہ اور ماہرانہ طریقے سے پیش کر دیا ہے، لکھتے ہیں:

"اس کا بنیادی خیال کا تھیم یہ ہے کہ عام آدمی ، خواہ وہ پاگل ہی کیوں نہ تھا، ملک کے بٹوارے اور ہجرت کے حق میں نہیں تھا۔ وہ اس دھرتی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا جہاں اس کی نمود اور نمو ہوئی تھی۔ جہاں اس کے آباء واجداد صدیوں سے پر امن زندگی بسر کرتے چلے آرہے تھے ، لیکن سیاسی شاطروں نے ، مذہبی جنون کا سہارا لے کر بٹوارے اوقر ہجرت کو ایک ٹھوس دلخراش حقیقیت بنا دیا۔[vi]"

درج بالا اقتباس میں موجود چند الفاظ کو پڑھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ مضمون نگار جانبداری کا مظاہرہ کر رہے ہیں، کیونکہ تقسیم بر صغیر میں فسادات، مجاہدین آزادی اور تحریکِ آزادی میں حصہ لینے والے لاکھوں لوگوں کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے ؟تاہم اس وقت یہ نکتہ کسی نہ کسی طور سچ بھی نظر آتا ہے جب بات عام آدمی کی آتی ہے، کہ عام آدمی کو نہ ہی سیاست سے سروکار ہوتا ہے کہ نہ آزادریاست سے، بلکہ اس کے نزدیک تو وطن کا تصور اسی مخصوص علاقے تک محدود ہوتا ہے، جہاں اس کا جنم ہوتا ہے، وہ پرورش پاتا ہے۔

اس مضمون میں دو اور بھی قابل توجہ نکات موجود ہیں،ایک تو مضمون نگار کی تعبیری غلطی؛ کہ ان کے نزدیک بشن سنگھ پاگل نہیں تھا، شاید اس کا تعلق ان قاتلوں سے ہو سکتا ہے، جن کے رشتہ دار انھیں پھانسی سے بچانے کے لیے پاگل خانے میں چھوڑ گئے تھے۔ یہ بات قرین قیاس نہیں ، کیونکہ بشن سنگھ کا پندرہ سال سے پاگل خانے میں ہونا، بیٹی کو بھی نہ پہچاننا اور طویل عرصہ کھڑے رہنا اس کے پاگل پن پر ہی دال ہیں۔ دوسرا؛ بشن سنگھ کا یہ بات پتہ چلنے کے بعد کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے، ہندوستان جانے سے انکار کر دینا اور نو میز لینڈ پر گر کر مر جانا، اس کا تقسیم یا تشکیلِ پاکستان سے انکار نہیں بلکہ نئے ملک بننے کے بعد لوگوں کے اپنی جنم بھومی سے دور ہونے پر صدائے احتجاج ہے۔ [vii] اگرچہ مضمون میں اس موقف کی مکمل وضاحت موجود نہیں ہے۔ اور اگر اس بات کو بھی منٹو کے موقف پر محمول کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ منٹو انتظامی بنیادوں پر نئے ملک کی تشکیل کے حق میں ہوں گے لیکن فسادات اور جبری ہجرت کو برا سمجھتے ہوں گے، تاہم بات کا کوئی اشارہ افسانے کے متن میں شامل نہیں ہے۔

کوثر مظہری کی کتاب ارتسام میں ان کے مضمون ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نقاد'' اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد مضمون ہے کہ یہ افسانے کے ساتھ اس کی تنقید کو بھی موضوع بناتا ہے۔ اس مضمون میں بھی جگدیش چندر ودھاون، وارث علوی و دیگر ناقدین کی مذکورہ افسانے پر تنقید کو زیرِ بحث لایا گیا ہے، نیز نقد الانتقاد کے ساتھ اپنی تعبیری رائے کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف کا حوالہ دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ پاگلوں کی کئی اقسام ہوتی ہیں، ان میں سے زیادہ تر مکمل پاگل نہیں ہوتے، بلکہ Mal-adjusted ہوتے ہیں۔ جو کہ ہر فرد ایک خاص حد تک ہوتا ہے، یعنی اگر یہ کچھ جہات میں پاگل ہوتے بھی ہیں تو کچھ ایسی جہات بھی ہوتی ہیں جن کے حوالے سے انھیں کسی حد تک شعور ہوتا ہے۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کے کردار اگرچہ لایعنی گفتگو

Scanned with OKEN Scanner

کرتے ہیں، غور کرنے ان میں ایک طرح کی معنویت بلکہ باقاعدہ نکتۂ نظر سامنے آتا ہے۔ مظہری صاحب نے اگرچہ کئی مضامین و کتب کو موضوع بنایا ہے لیکن تمام مضمون پڑھنے کے بعد ادراک ہوتا ہے کہ نا انھوں نے کوئی واضح نتیجہ بر آمد کیا ہے، نا ہی کوئی واضح تعبیر سامنے لا سکے ہیں۔

جب کوثر مظہری ذاتی نوعیت کی تفہیم و تعبیر کی کوشش کرتے ہیں تو اس طرح کی چند باتیں سامنے آتی ہیں۔ لکھتے ہیں کہ بشن سنگھ دال (Signifier) اور مدلول (Signified) دونوں شکلوں میں ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ کسی بھی فنکار کے لیے یہ آسان نہیں ہوتا کہ وہ دال اور مدلول دونوں کو ایک ہی کردار کے طور پر پیش کر سکے۔ [viii] یہ بات پڑھنے کے بعد قاری کی دلچسپی بڑھتی ہے کہ شاید مضمون نگار ساختیاتی یا پس ساختیاتی تناظر میں افسانے کی پڑھت سامنے لائے گا، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ یہ فقرے لکھنے کے بعد اگلے پیرا گراف میں نئی بات شروع ہو جاتی ہے۔ دراصل ہمارے ناقدین کی اکثریت ایسی اصطلاحات کا استعمال فقط علمیت کے اظہار یا منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے استعمال کرتی ہے؛ اگر وہ کسی نظام فکر کا باقاعدہ اطلاق کرتے تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔ اسی طرح فاضل مضمون نگار کا ایک اور جملہ قاری کو حیرانی سے دوچار کرتا ہے:

> "بشن سنگھ چیخ مار کر اپنے جسمانی وجود کے ساتھ زمین پر گرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے چمکتے ہوئے تہذیبی نشان پر نحوست کے گہرے بادل چھا گئے ہوں۔ بشن سنگھ جو پندرہ سال سے چپ ہے اسے اپنے تبادلے پر اتنی شدید تکلیف ہوئی کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ کیا منٹو کو اپنے اس کردار پر دکھ نہیں ہوا ہو گا؟ [ix]"

درج بالا اقتباس میں چمکتے ہوئے تہذیبی نشان یا نحوست کے گہرے بادلوں سے کیا مراد ہے؟ اس کا نہ مضمون میں کوئی سروغ ملتا ہے نہ افسانے میں۔ یعنی کوثر مظہری کا مضمون اگرچہ دیگر ناقدین کے مضامین سے افسانے کے حوالے سے چند نئے گوشے یکجا کرتا نظر آتا ہے، تاہم اس میں ہمیں کسی خاص تصورِ معنی و تعبیر کا سراغ نہیں ملتا۔

فتح محمد ملک پاکستان میں بطور اقبال شناس، ادبی ناقد اور دانش ور کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب سعادت حسن منٹو؛ ایک نئی تعبیر میں ایک مضمون "ٹوبہ ٹیک سنگھ؛ ایک نئی تعبیر" کے عنوان سے موجود ہے۔ اس کا مطالعہ جہاں پروفیسر فتح محمد ملک کا تصور نقد واضح کرتا ہے وہیں عمومی پاکستانی ناقدین کا موقف بھی سامنے آتا ہے۔ فتح محمد ملک اپنے مضمون کو کئی حوالوں سے مزین کرنے بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ کی تعبیرات کے حوالے سے اپنے شدید تحفظات کا اظہار کرتے ہیں کہ ترقی پسندوں اور وطن پرستوں نے منٹو کے اس افسانے کی تہہ دار پرتوں کی حامل معنویت کو نظر انداز کیا اور من چاہی تعبیرات کر کے گمراہ کن پراپیگنڈا کیا۔ لکھتے ہیں:

> "سعادت حسن منٹو عمر بھر اپنے فن کو کسی سیاسی آئیڈیالوجی کی تبلیغ یا تشہیر کا ذریعہ بنانے سے گریزاں رہے۔ انھیں کسی خاص سیاسی مکتب فکر کا پراپیگنڈا کرنا کبھی گوارا نہ ہوا۔ وہ ہمیشہ ادب میں نظریاتی آمریت سے بغاوت کے راستے پر گامزن رہے۔ اپنے بیشتر معاصرین کے برعکس وہ عمر بھر

Scanned with OKEN Scanner

نظریات کے بجائے تجربات اور رسمیات کے بجائے مشاہدات سے پھوٹنے والی دانش کے موتی رولنے
میں منہمک رہے۔[x]"

فتح محمد ملک مضمون کے آغاز ہی میں مارکسی مفکر طارق علی کی کتاب The Clash Of Fundamentalism کا اقتباس درج کرکے ان پر نکتۂ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ طارق علی نے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں پاگل خانے کی صورتِ حال کو نئی جنم لینے والی ریاست کے جنون سے تعبیر کرکے تخلیقی سیاق سے عدم آگہی اور افسانے کے متن سے ناانصافی کا ثبوت دیا ہے؛ تقسیم کے وقت کے فسادات اور خوں ریزی کسی طرح کی نسل کشی کے بجائے، مذہبی جنون کی کارستانی تھی، جس کے پیچھے اکسانا اور مذموم مقاصد حاصل کرنا تھا۔اس کے بعد انھوں نے وارث علوی کے مضمون سے اقتباسات پیش کیے اور حیرانی اور افسوس کا اظہار کیا کہ نئی ریاست کو پاگل پن قرار دینا کسی طور قرین انصاف نہیں۔لکھتے ہیں:

"برٹش انڈیا کی سامراجی وحدت کے ٹوٹنے اور اسکے اندر سے دو قوموں کی آزاد قومی ریاستوں کا قیام نویدِ مسرت ہے۔یہ قومیں اپنی اپنی اکثریت کے جن جغرافیائی خطوں میں آباد تھیں وہی خطے استعماری چنگل سے آزاد ہو گئے تھے۔اس پہ رونے دھونے اور فساد برپا کرنے کی ضرورت تو صرف استعمار پرستوں کو پیش آنا چاہیے تھی۔آزادی اور خود مختاری کے شائقین کے لیے پاکستان کا قیام فخر و مسرت کا مقام ہے۔[xi]"

فتح محمد ملک کے ان نکات سے شائبہ ہوتا ہے کہ افسانے کی تعبیر میں متن ہی کو بنیاد سمجھتے ہیں تاہم کچھ مواقع پر سیاق سے رجوع کو بھی ضروری سمجھتے ہیں (اور شاید وہ سیاق جو ان کے نزدیک درست ہو) ۔ان کے تصورِ معنی و تعبیر کو سمجھنے کے لیے مضمون کے ان حصوں کو جاچنا ضروری ہے جس میں خالصتاً تعبیر کی گئی ہے۔

پاگل خانے کے ایک پاگل کا خود کو قائداعظم محمد علی جناح اور دوسرے کا خود کو ماسٹر تارا سنگھ سمجھ کر خونریزی پر اتر آنا، جس کے اندیشے میں دونوں کو الگ الگ کر دیا گیا۔۔خود کو خدا سمجھنے والے پاگل کا یہ کہنا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ نہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں کیونکہ ابھی تک اس نے اس بات کا حکم ہی نہیں دیا، جواباً بشن سنگھ کا اسے فقط مسلمانوں کے خدا قرار دے کر اس سے گلو خلاصی کرانا کہ وہ سکھوں کی بات ہی نہیں سنتا، ''اوپڑدی گڑ گڑدی انیکس دی، بے دھیانا دی، منگ دی دال آف واہے گروجی دا خالصہ اینڈ واہے گروجی کی فتح۔'' ان دو حصوں کو درج کرنے کے بعد جہاں قاری کی توقع ہوتی ہے کہ صاحبِ مضمون ان کی تفہیم و تعبیر کرے گا وہیں فتح محمد ملک نے اقبال کے جناح کو لکھے خط کا حوالہ دے کر یہ ثابت کیا انھی واقعات ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ برصغیر میں امن و آشتی کی فضا پیدا کرنے کے لیے مسلمانوں کی جداگانہ، آزاد مملکتوں کا قیام ضروری تھا۔ان کے نزدیک پاکستان کی تحریک اور پاکستان کا قیام، تاریخی شعور اور تہذیبی وابستگی کی دین ہے۔تاریخ و تہذیب کی انقلابی قوتوں سے آگہی کے بغیر نہ تو پاکستان کا تصور سمجھ میں آسکتا ہے، نہ تحریک اور نہ تشکیل پاکستان۔پاگل خانے کے وہ مکین جن کو ان کے لواحقین نے پھانسی سے بچانے کے لیے پاگل خانے میں بھرتی کرایا تھا، جو حقیقتاً پاگل نہیں تھے، وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کہاں ہے اور کیا ہے۔عقل و خرد سے عاری اور حافظہ و تخیل سے محروم پاگلوں کی سمجھ میں پاکستان کیونکر

Scanned with OKEN Scanner

سمجھ میں آسکتا ہے؟ وہ بشن سنگھ کے نو میز لینڈ پر مر جانے کو وحشیانہ عمل قرار دیتے ہیں کہ اس جیسے پاگل ہی خواب و خیال پر کھیت کھلیان کو ترجیح دیتے ہیں ۔فتح محمد ملک کا مضمون ایسے کئی نادر الفاظ و تراکیب کا مجموعہ ہے جو بذاتہٖ قابل تعبیر ہیں۔ فتح محمد ملک کے مطابق پاکستان کی تشکیل نے منٹو کی فکری دنیا کو یکسر منقلب کر کے رکھ دیا اور اس نے پاکستان آنے کے بعد دنیا کو ایک نئے زاویہ نظر سے دیکھنا شروع کر دیا، اور یقیناً ان کے نزدیک وہ زاویہ نظر یہی ہے جس سے فتح محمد ملک افسانے کو دیکھ رہے ہیں۔ مضمون نگار ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کی تعبیر کے حوالے سے اپنا فیصلہ کن جملہ لکھ کر اپنا تصورِ نقد واضح کرتے ہیں:

"منٹو کی زیرِ نظر کہانی کی فقط ایک ہی تعبیر ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ پاکستان کا تصور، پاکستان کی تحریک، اور پاکستان کا قیام بشن سنگھ جیسے پاگلوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا کیوں کہ یہ ایک فوق التہذیب تصور ہے اور یہ لوگ تو منجملہ نباتات و جمادات ہیں۔[xii]"

فتح محمد ملک کی اس ''نئی تعبیر'' کو اور بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن تنقید یا تعبیر ہر گز نہیں۔ دراصل کسی بھی متن کی تعبیر متن سے انحراف کی بنیاد پر نہیں کی جاسکتی۔ فتح محمد ملک کے اس مضمون میں متن میں موجود گرہوں کو کھولنے کی بجائے، متن سے باہر موجود متعین معانی کو لا کر نافذ کرنے کی کوشش کی ہے، جو افسانے اور اس کے نظام معانی سے زیادتی کے مترادف ہے۔

معاصر ادبی منظر نامے کا ایک بڑا حوالہ، فکشن نگار اور فکشن شناس محمد حمید شاہد کی کتاب میں بھی '' ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کی تعبیرات کی تنقید کے حوالے سے ایک مضمون موجود ہے، جو یقیناً فتح محمد ملک کے مضمون کے بعد لکھا گیا ہوا گا۔ اس کا جائزہ لینا اس لیے ضروری اور دل چسپی کا حامل ہے کہ ایک فکشن نگار کس طور فکشن کی تفہیم و تعبیر کا روادار ہو سکتا ہے۔ اپنے مضمون کے آغاز میں انھوں نے پہلے شمیم حنفی کی منٹو کے افسانوں نے حوالے سے رائے درج کی ہے کہ منٹو اندرونی، بے دریغ اور ناقابل فہم طاقت سے مالا مال افسانہ نگار ہے، جس کی تفہیم کے لیے اس کے افسانوں کی تاریخیت، سیاسی و سماجی سیاق پر اصرار سے زیادہ منٹو کی تخلیقی سطح کی تعبیر کی ضرورت ہے۔ یعنی یہ بات درج کرنے کے بات محمد حمید شاہد اس بات کا ادراک کرتے ہیں کہ منٹو کے ان افسانوں کی بھی سیاسی سیاق کے پیشِ نظر تعبیر کی جاتی ہے جن کا بنیادی سروکار انسانی نفسیات کی اتھل پتھل اور خالص انسانی جذبوں کو نشان زد کرنا ہوتا ہے، اس کے ساتھ ہی مضمون نگار یہ بھی کہتے ہیں کہ اس اتھل پتھل کا سبب سیاسی اکھاڑ پچھاڑ ہی ہوا کرتی ہے۔ یعنی مضمون نگار کہ ان آخری نکتے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ منٹو کی سیاسی تعبیر ہی درست تعبیر ہے، تاہم اس کے ساتھ انھوں نے عمومی سیاسی سیاق کی حامل تعبیرات کے متوازی ایک نئی منفرد تعبیر کی راہ بھی ہموار کر لی۔[xiii]

مضمون جب آگے بڑھتا ہے تو ادراک ہوتا ہے محمد شاہد حمید فتح محمد ملک کی تعبیر کے دفاع کی تیاری میں تھے، جس کا انھوں نے ذرا آگے چل کر اعتراف بھی کیا، لکھتے ہیں:

Scanned with OKEN Scanner

"منٹو کی پچاسویں برسی کی تقریب میں گفتگو کرتے ہوئے منشا یاد نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کی یہ تعبیر شاید مشکل سے ہضم ہو پائے۔ کچھ ایسا ہی خدشہ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے بھی ظاہر کیا تھا، تاہم میں ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے تعبیر کو رد نہیں کیا، لائق اعتنا جانا تھا۔[xiv] "

مضمون نگار اپنی اس رائے کی بنیاد یہ بتاتے ہیں کہ مذکورہ تعبیر متن سے اس قدر قریب ہو گئی ہے کہ میں نے اسے لائق اعتنا جانا، اگر فتح محمد ملک کی تعبیر سے ایک دو جملے نکال لیے جائیں تو وہ تعبیر ایسی ہے کہ جس پر دل ٹھکتا ہے۔ محمد حمید شاہد فتح محمد ملک کی آراء درج کرنے کے بعد ان ہی کی طرح یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں، کہ '' ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا موضوع برطانوی ہند کی تقسیم نہیں، نا ہی یہ فسادات کے پس منظر میں تحریر کیا گیا افسانہ ہے؛ بلکہ آغاز میں طارق علی گرفت اس تعبیر کی معنویت بڑھاتی ہے، کہ طارق علی نے اسے تقسیمِ ہند اور نسل کشی کے فسادات کا افسانہ کہا تھا۔ فتح محمد ملک نے تو یہ ثابت کیا ہے برصغیر کی تقسیم برطانوی سامراج ٹوٹنے کا نتیجہ ہے جو دو آزاد قومی مملکتوں کی نوید لے کر آیا۔ اس لیے پاگل خانے کی اندر کی صورتِ حال کو پاگل خانے کے باہر کی صورتِ حال پر منطبق کرنا مناسب نہیں، اور افسانے کا موضوع حافظے کی گمشدگی اور تخیل کی موت ہے۔

محمد حمید شاہد کا مذکورہ بالا مضمون اردو تنقید کا ایک نیا چہرہ سامنے لاتا ہے، جہاں متن کی تعبیر کے بجائے تعبیرات کا محاسبہ کر کے پسندیدہ تعبیر کو سچ ثابت کرنا ہوتا ہے، جس کے لیے کسی نظام فکر سے جڑت کی بجائے، کسی فرد سے قلبی جڑت اور رواں اسلوب کی ضرورت پڑتی ہے۔

یہاں ایم خالد فیاض کے ایک اہم مضمون '' ٹوبہ ٹیک سنگھ ۔۔۔ نئی تعبیر (ایک محاکمہ)'' کو نظر انداز کرنا ناانصافی ہو گی، جو خالصتاً فتح محمد ملک کے مضمون کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ منفرد ادبی مجلہ تناظر کے نوجوان مدیر، ایم خالد فیاض، اردو ادب کے استاد، محقق اور صائب الرائے نقاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں نہ فقط فتح محمد ملک کے مضمون کا محاکمہ کیا، بلکہ ان کی پوری کتاب کو ہدفِ احتساب بنایا۔ فتح محمد ملک کے مضمون میں افسانے کی واحد تعبیر پر اصرار سے نقاد اور قاری کی حق تلفی تھی جو اس مضمون کی بنیاد بنی، لکھتے ہیں:

"سعادت حسن منٹو؛ ایک نئی تعبیر کا موضوع منٹو کی پاکستانیت ہے، اگر یوں کہاں جائے تو زیادہ بہتر ہو گا کہ منٹو کی پاکستانیت تلاش کرنے کی سر توڑ کوشش ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ ملک صاحب کی پاکستانیت، نظریاتی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ نظریہ پاکستان پر صدقِ دل سے ایمان لانا، کشمیر کے حوالے سے پاکستانی بیوروکریسی کی حمایت کرنا اور بس۔[xv]"

ایم خالد فیاض نے واضح کیا ہے کہ فتح محمد ملک کا مارکسی نقادوں پر تقسیم کی مخالفت کرنے کی وجہ سے، اُن کی تعبیر کی بجائے وارث علوی کو بنیاد بنانا، لیکن علوی صاحب ایسے مارکسیت گریز نقاد کے ہاں بھی اسی نکتہ نظر کی تلاش کے بعد اسے یکسر نظر انداز کرنا فہم سے بالاتر ہے۔ خالد فیاض نے ثابت کر دکھایا کہ مارکسیت پسندوں کے علاوہ وارث علوی، ممتاز شیریں اور وزیر آغا تک کے ہاں افسانے کی ایک ہی تعبیر، جس میں افسانے کے اندر، تقسیم کے حوالے تشکیک پائی جاتی ہے، کا اظہار دراصل افسانے کی حقیقی تعبیر ہی ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

فتح محمد ملک کے نزدیک، اردو ناقدین کے ہاں منٹو کی تقسیم مخالف رویے کی بازیافت دراصل منٹو کے قبل از تقسیم افسانوں کی وجہ سے بنے امیج کی بنیاد پر ہے۔ لیکن ایم خالد فیاض نے منٹو کے تشکیل پاکستان کے بعد لکھے گئے افسانوں کی بنیاد پر ثابت کیا کہ ایسا نہیں، بلکہ منٹو تقسیم، اور تقسیم کے بعد سامنے آنے والی انسانیت کے زوال کی صورتِ حال کے حوالے سے شاکی رہے۔ اس کے لیے انھوں نے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کے علاوہ ''سڑک کنارے''، ''دیکھ کبیر ارویا''، ''خدا کی قسم'' ''نمرود کی خدائی'' اور ''یزید'' ایسے افسانوں کے متن کو بنیاد بنایا ہے۔ ایم خالد فیاض کے مضمون سے فتح محمد ملک کا ایسا تصور ابھرتا ہے جو ایب کی آزاد حیثیت کا قائل ہی نہیں مخالف ہے، جس کے نزدیک ریاست کی تشکیل کے بعد ادیبوں کی ذمہ داری فقط ریاست کی نظریاتی بنیادوں کی حفاظت اور تشکیلی ریاستی ایجنڈے کی تشکیل و ترویج ہی ہے، اسی طرح ناقدین کا کام بھی انھی مقدس معانی کو آشکار کرنا ہے اور بس۔

ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو سے متعلق ایک محقق اور نقاد ہیں، جنھوں نے نفسیاتی نظریات بالخصوص تحلیل نفسی کے ادب پاروں پر اطلاق سے شہرت اور اعتبار حاصل کیا۔ ان کا انگارے (مدیر: ڈاکٹر سید عامر سہیل) میں شامل مضمون '' تنقیدی محدودات اور ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اس حوالے سے لائق توجہ ہے کہ اس میں افسانے کی تعبیر نفسیاتی پیمانوں پر کر کے کچھ نئے پہلو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم مضمون کے آغاز ہی میں انھوں نے اس بات کا واشگاف انداز میں اعتراف کیا ہے کہ ہر تنقیدی دبستان کی کچھ حدود و قیود حدوود ہوتی ہیں جن کی بنیاد پر وہ حقیقت کو بحیثیت کل کی بجائے، حقیقت کو الگ الگ زاویوں سے دکھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ تحلیلِ نفسی بھی حقیقت کا ایک ہی رخ پیش کر سکتی ہے، مکمل حقیقت نہیں۔

ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی کے بقول خالص تحلیلِ نفسی کے پیمانوں پر افسانے کو جانچنے سے، بشن سنگھ، جس میں بلاہتی انشقاق (Catatonic Schizophrenia) کی سی علامات واضح دکھائی دیتی ہیں؛ کا ہندوستان جانے سے انکار اور اپنی جنم بھومی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے محبت، دراصل ماں سے محبت اور سخت گیر باپ سے نفرت کی علامت بن کر سامنے آتی ہے؛ اور اس تعبیری نکتے کی بنیاد خالق متن یعنی سعادت حسن منٹو کے بچپن میں پوشیدہ ہے کہ ان کی ماں کا شفیق امیج ماں سے منٹو کی محبت سبب بن گیا جب کہ سخت گیر باپ سے منٹو کی نفرت گہری ہوتی گئی جس کا اظہار بشن سنگھ کے ہندوستان جانے پر سامنے آتا ہے۔ [[xvi] بظاہر دیکھا جائے تو اس نوع کا کوئی اشارہ کوئی واضح علامت قاری کے سامنے نہیں آتی، لیکن نفسیاتی تنقیدی حربوں میں مصنف کے فن کو نظر انداز کر کے اس کی ذات کی گہرائیوں میں تخلیق کا جواز ڈھونڈ کر ایسے معانی برآمد کیے جاتے ہیں۔ یعنی متن میں موجود واضح اور ٹھوس عوامل کو نظر انداز کر کے اس نظام عمل تک رسائی کی کوشش کی جاتی ہے جو مصنف کی باطنی دنیا میں تلاطم ریز رہتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "تحلیل نفسی کو پاگلوں کے سیاسی عوامل کی نسبت منٹ کے بچپن اور لڑکپن کے ان تجربات سے سروکار ہو گا جو اس افسانے کی فضا کے پس پردہ کارفرما رہے۔ [xvii]"

Scanned with OKEN Scanner

ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی نفسیاتی تنقید کے محدودات واضح کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا بنیادی موضوع تقسیم کے وقت مہاجرین کے لیے پاکستان اور ہندوستان کی الگ الگ وجود کو فوری طور تسلیم کرنے کے حوالے سے ذہنی الجھن کا ظہار ہے۔تاہم یہ الجھن اور کش مکش خود منٹو در پیش تھی، جو ہجرت کرنے کے بعد میں تشخص اور قبولیت کی الجھن سے نہ نمٹ سکا۔تاہم باریک سیاسی نکات پر فیصلہ کن رائے دینے کی بجائے اپنے تہہ دار ارفسانوی متن میں منٹو نے اپنے نکتۂ نظر کو پیش کرنے کے لیے فہیم اور ذکی لوگوں کی بجائے مخبوط الحواس پاگلوں کی موضوع بنیایا جو اپنے بڑی سادی سے موٹے موٹے نتائج اخذ کیے بیٹھے تھے۔یعنی دیکھا جائے تو اپنے مضمون میں ڈاکٹر خالد محمود شیرانی نے ایک دلچسپ نکتی ضرور دی اہے تاہم متن میں موجود ابہام کے حوالے سے کوئی فیصلہ کن رویہ اختیار نہیں کیا۔بلکہ تعبیرات کے حوالے یہ ضرور واضح کیا ہے مختلف نظریات کی بنیاد پر کی جانے والی تعبیرات درست معنی کو سامنے لانے کی نجائے الجھاؤ پیدا کریں گی لہٰذا نفسیاتی، مارکسی، ساختیاتی اور دیگر تنقیدی دبستانوں کے امتزاج سے کی جانے والی تعبیر ہی افسانے کا درست سامنے لا پائے گی۔

پرویز انجم منٹو شناسی میں منفرد مقام کے حامل محقق اور نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ان کی کتاب سعادت حسن مر گیا، منٹو نہیں مر امیں شامل مضمون '' سرزمین پنجاب کا قد آور افسانہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اپنی حیثیت میں اس طرح دلچسپ ہے کہ اس میں افسانے کو ایک اور زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کو سیاق اور سیاسی و تاریخی تناظر میں دیکھنے والے ناقدین کو بالعموم دو حصوں میں منقسم کی جاسکتا ہے؛ایک تقسیم کو روا اور وقت کی ضرورت سمجھنے والے ناقدین اور دوسرے تقسیم کو سب سے بڑا سانحہ سمجھنے والے۔اگرچہ ہر دو تقسیم کے وقت ہونے والے بے پناہ خوں ریزی کو انسانیت کا بہت بڑا المیہ سمجھتے ہیں۔ان دو کے علاوہ وہ چند جن کے تناظرات مختلف ہیں۔پرویز انجم اگرچہ ایک طرح سے تاریخی سیاق ہی کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، تاہم جو چیز ان کے ہاں نئی ہے، وہ ہے قوم پرستی۔جیسا کہ مضمون کے عنوان سے ظاہر ہے '' سرزمین پنجاب کا قد آور افسانہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ '' ، کہ صاحبِ مضمون ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کی عظمت کو پنجاب سے منسوب کر دیکھتے ہیں، اسی طرح وہ افسانے میں موجود عوامل، گرہوں اور الجھنوں کو بھی پنجابی نسل پرستی ہی کی بنیاد پر تعبیر کرتے ہیں۔ مضمون کے آغاز ہی میں رقم طراز ہیں:

"پنجاب ۔۔۔ مشرقی پنجاب ، مغربی پنجاب ۔۔۔ ہندوستانی پنجاب ، پاکستانی پنجاب ۔۔۔۔ ہریانہ پنجاب ، خالصہ پنجاب ۔۔۔ سرائیکی پنجاب ، وسطی پنجاب ۔۔۔ دیس پنجاب ۔۔۔ پنجابی عوام الناس کا سماج، تقسیم در تقسیم ۔۔۔[xviii]"

ٹوبہ ٹیک سنگھ کا علاقہ قصبہ جھنے اور ساندل بار کے بیچ واقعہ ہے۔پرویز انجم نے اس قصبے وجہ تسمیہ بتائی کہ یہ ٹیک سنگھ نامی ایک بابا کی وجہ سے علاقے کا یہ نام پرا جو بلا تخصیص ہندو اور مسلمان، مسافروں کی تواضع پانی اور بھنے ہوئے چنوں سے کرتا تھا، مضمون نگار کے مطابق پورے پنجاب پر فرنگی تسلط کے باوجود اس علاقے کے لوگوں نے غلامی کو کبھی قبول نہ کیا تھا، کہ بھگت سنگھ اور جگا بھی اسی علاقے سے تھے۔ منٹو کے اس افسانے میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کی ترکیب؛ قوت، جرأت اور بغاوت کی علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ [xix] نہ جانے اس نوع کی معلومات کا افسانے کی تفہیم و تعبیر سے کیا

Scanned with OKEN Scanner

تعلق ہے اور اس تعبیر کے یہ معانی پیش کرنے کے پیچھے مضمون نگار کی کیا منطق رہی ہو گی، تاہم یہ بات واضح ہے کہ اس نوع کی باتیں تنقید و تعبیر کو معروضی کے بجائے موضوعی بناتی ہیں۔

پرویز انجم بشن سنگھ کی نو میمز لینڈ ہر وفات کا ذکر کر کے بتاتے ہیں، منٹو جب شراب چھوڑنے کی غرض سے پاگل خانے مین تھے تو ان پر عجیب و غریب کیفیت اور نیم بے ہوشی کا عالم طاری رہتا اور وہ اس عالم میں تقسیم کے معاملے پر سوچتے ہوئے خود کو نو میمز لینڈ پر محسوس کرت تھے، جس کا اظہار منٹو نے افسانے میں کیا۔ بشن سنگھ " ونڈ" کے خلاف تھا، جو دھرتی سے محبت کرنے والے فرد کو اس کی جڑوں سے اکھاڑ کر دور پھینکنا چاہتی تھی۔ اپنی مٹی، سے محبت کو چھوڑ کر ایک سیاسی تشکیل، ایک قومی مملکت میں جانا ایک بے عقل مگر مٹی سے محبت کرنے والے فرد کے لیے کسی طور قابل قبول نہ تھا، اور مضمون نگار کے نزدیک یہی دراصل منٹو کی سوچ تھی۔ لکھتے ہیں:

"آزادی کی تعبیر نے فرد کی نفسیاتی کیفیت درہم بر ہم کر دی اور تقسیم کے بعد معاشی و سماجی، نفسیاتی و سیاسی، جنس ور عقائد کی بنیاد پر جاری تقسیم نے ذہنی پاگل پن پیدا کر دیا تھا۔ یہاں تو بہ ٹیک سنگھ آزادی کے خلاف نہیں، تقسیم کے خلاف ضرور ہے، جو فرد سے اس کی شناخت چھین لیتی ہے۔ "

[xx]

متذکرہ بالا مضمون کو کسی بھی طور پر ایک مکمل مضمون اور اور معتبر تعبیر نہیں کہا جاسکتا۔ جونکتہ مضمون کے آغاز میں اٹھا کر بات شروع کی گئی ہے، آگے چل کر اسے ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ افسانے میں کئی ایسی جہات، علامتیں اور گرہیں موجود ہیں جن پر بات ہو سکتی تھی، لیکن ان سب کو نظر انداز کر کے صرف بشن سنگھ کی کیفیت اور موت سے معنی اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو پہلے سے متعین اور طے شدہ ہیں، جن کے شواہد متن سے برآمد ہونے کے بجائے درآمدی محسوس ہوتے ہیں۔

ن۔م۔ دانش کا مضمون " منٹو ٹوبہ ٹیک سنگھ اور شناخت کا بحران" میں منٹو اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کو تنقیدی تھیوری کے مختلف تناظرات کے تحت سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مضمون کی ابتدا میں منٹو اور فحش نگاری کے مسئلے پر چند باتیں کرنے کے بعد مابعد نو آبادیاتی تنقید، نو آبادیات میں نو آبادکاروں کے ہتھکنڈے اور ان کے نو آبادیاتی باشندوں پر اثرات کو مفصل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مضمون نگار کے مطابق منٹو چونکہ نو آبادیاتی دور سے متعلق افسانہ نگار ہیں، اس لیے نو آبادیاتی اثرات کے صرفِ نظر کر کے ان کے افسانوں کی تفہیم فقط فسانہ ہی قرار پائے گی۔ برطانوی استعمار کاروں نے ہم برصغیر کے لوگوں کو the other قرار دے کر حاشیائی قرار دے دیا۔ جب کہ منٹو کا خاصہ یہ ہے کہ وہ پورے حاشیائی طبقے میں سے بھی مزید حاشیائی (other) کردار منتخب کر کے ان پر افسانے بُنتے ہیں۔[xxi] چاہے یہ کردار ادنی، بدکار، بے ایمان کا ہو، طوائف کا یا پھر پاگل کا، منٹو انھیں حاشیے سے مرکز میں لانے کی اپنے طور سعی ضرور کرتے ہیں۔

Scanned with OKEN Scanner

مضمون میں بات نو آبادیات سے شروع ہوتی ہے، ایڈورڈ سعید، فرانز فینون اور گائتری چکرورتی سے ہوتی ہوئی ساختیات اور پھر ایک دم دریدا کی رد تشکیل تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد فوکو کی کتاب ''دیوانگی کی تاریخ'' پر پہنچ کر عقل، منطق، معقول اور غیر معقول کی بحث چھیڑنے کے بعد ایک ہی صفحے پر ڈیکارٹ، ہیوم اور کانٹ ایسے کئی فلسفوں تک چلے جاتے ہیں لیکن اس دوران میں مضمون کے عنوان، یعنی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' پر بات نہیں پہنچتی۔ گنجلک نظری حصہ گزر جانے کے بعد جب افسانے پر بات آتی ہے تو وہ باریک بینی سے، نکات اور کلیدی الفاظ میں منقسم کر کے افسانے کی تفہیم و تعبیر کی کوشش کرتے ہیں۔

"ماہر نفسیات آر۔ڈی لینگ کے مطابق شیزوفرینک Schizophrenic کی بظاہر نا قابلِ فہم اور خود متناقض زبان اکثر twisted سچائی کا gnomic اظہار ہے جس کو مریض ویسے بیان کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں معاشرے کی اسی twisted سچائی کا بیان ہے ۔" اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستاب آف دیٔ در فٹے منہ "اتنی بے معنی نہیں۔ یہاں کوئی بات سمجھ میں آئے نہ آئے مگر اتنی بات صاف ہے بشن سنگھ پاکستان اور ہندوستان دونوں کو در فٹے منہ کہہ رہے ہیں۔[xxii]"

ن۔م دانش نے مذکورہ افسانے کو بین المتونیت کے تناظر میں دیکھا، افسانے کے مرکزی اور ذیلی موضوعات کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک تعبیرات کے ذریعے منٹو کی قبل از تقسیم تشکیل پانے والی تصویر کو مسخ کرنے کی کوشش بھی اتنی ہی غلط ہے جتنی منٹو کے پاکستان کے منتخب کرنے کے فیصلے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش۔ تاہم مضمون نگار نے اس مضمون میں اپنی طرف سے بھی فیصلہ سنا دیا ہے۔

ن۔م دانش کے مطابق منٹو کے حاشیائی طبقے کو حاشیے پر ہی کھڑے ہو دیکھا، نہ کہ کسی مرکز کے تحت۔ کیونکہ تقسیم کے بعد فریقین نے خود مرکز مان لیا اور ایک دوسرے کو اپنا حریف، ان کے نزدیک ہر وہ فرد جو مرکز میں نہیں معقل نہیں، تاہم منٹو نے پاگل خانے کے منظر سے یہ دکھایا کہ پاگل خانہ تو ہا گل خانے کے باہر بھی ہے، اور یہ اس نے پاگلوں ہی کے ذریعے دکھایا ہے۔

"ٹوبہ ٹیک سنگھ کو مرکز سے بیان کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ مرکز ''طاقت ور'' اور ''معقول'' لوگوں کی آماجگاہ ہے۔ جہاں ہندو، سکھ، گاندھی، جناح، پاکستان، ہندوستان، زندہ باد، مردہ باد اور بے گناہ انسانوں کے خون اور عورتوں کی عصمت دری کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اور وہاں معقول وہی ہے جو کسی ایک طرف ہے۔ بصورتِ دیگر وہ دونوں کا ہدف ہے۔ [xxiii]"

Scanned with OKEN Scanner

درج بالا مضمون کے جائزے سے یہ بات واضح ہوئی کہ اس میں جدید تھیوری کو بطور تعبیری حربے کے برتا گیا ہے، لیکن یہ بات بھی عیاں ہے کہ پورے مضمون میں تھیوری کے ضمن میں آنے والے کسی ایک نظریے کو بطور تناظر نبھایا نہیں گیا۔ کسی ایک کا اطلاق بھی مبسوط طور پر مکمل نہیں ہو پایا۔ تاہم اس مضمون میں حتیٰ المقدور کوشش کی گئی ہے کہ تعصب اور جانبداری سے بچا جائے، اور مضمون نگار اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

درج بالا سبھی تعبیرات کا مختصر محاکمہ کیا جائے تو ایک بات واضح ہوتی ہے کہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' ایک ایسا گتھا ہوا اور گندھا ہوا متن ہے جس کے بنیادی اجزا میں اس کا تاریخی و سیاسی سیاق شامل ہے؛ جسے کوشش کے باوجود نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تاریخ اور سیاسی سیاق کے دو بڑے ورژن موجود ہیں، جو سرحد کے دونوں اطراف مقبول بھی ہیں، جنھیں شاید بطور شہری اور محبِ وطن نظر انداز کرنا معبرین کے لیے ممکن نہ تھا، اس کے لیے اکثر معبرین نے اپنے تنقیدی منصب کی قربانی دینا گوارا کر لی۔ ایک مسئلہ یہ بھی سامنے آیا کہ افسانے کی تعبیر منٹو کا نکتۂ نظر تلاش کرنے کے لیے کی گئی، بشن سنگھ کو بطور ایک افسانوی کردار کے دیکھا ہی نہیں گیا، بلکہ اسے منٹو کی فکر کا مظہر اور فکری نتیجہ سمجھ کر جانچا گیا۔ کردار صورتِ حال سے جڑا ہوتا ہے اور بعض اوقات مصنف کی ادعائی گرفت سے آزاد بھی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بشن سنگھ، جو ایک مخبوط الحواس سہی، تاہم ایک عام ہندوستانی کا استعارہ ہے، اور وہ کسی طور تقسیم اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال سے مطمئن نہیں، کے ساتھ منٹو سمجھ کر ہی کیوں رویہ رکھا جاتا ہے۔ افسانے میں ابہام کچھ ایسی جمالیاتی صورت میں موجود ہے، کہ وہ کثرتِ تعبیر کی ہر ممکنہ توجیہہ پیش کر رہا ہے۔ مذکورہ سبھی تعبیرات نے اسی ابہام کی جمالیات ہی کی بنیاد پر متنوع معانی برآمد کیے۔ لیکن جہاں تک کسی باقاعدہ تنقیدی نظام فکر کی تقلید اور اس کے اطلاق کی بات ہے، وہ کسی نقاد کے ہاں نظر نہیں آیا، کجا اس کے اطلاق کی درستی کا جائزہ لیا جاتا۔

حوالہ جات:

- افضال حسین، قاضی، ''منٹو کی نئی قرأت کی ضرورت'' مشمولہ سعادت حسن منٹو ایک صدی بعد، مرتب: پروفیسر قاضی افضال حسین، علی گڑھ: سنٹر آف ایڈوانس سٹڈی، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۲۰۱۳ء، ص ۷
- منٹو، سعادت حسن، پھندنے، نئی دہلی: ساقی بک ڈپو، ۱۹۹۱ء۔ ص ۲۰
- وارث علوی، منٹو ایک مطالعہ، نئی دہلی: وجے پبلشرز، ۱۹۹۷ء، ص ۲۰۲
- وارث علوی، منٹو ایک مطالعہ، ص ۲۰۶
- شافع قدوائی، ''نیشن بطور بیانیہ اور منٹو کا افسانوی متن'' مشمولہ سعادت حسن منٹو ایک صدی بعد، مرتب: پروفیسر قاضی افضال حسین، علی گڑھ: سنٹر آف ایڈوانس سٹڈی، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۲۰۱۳ء، ص ۶۶
- جگدیش چندر ودھاون، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، مشمولہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ کا منٹو، مرتبہ: ڈاکٹر طاہر عباس، لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص ۵۴
- ایضاً ص ۵۶

Scanned with OKEN Scanner

- کوثر مظہری، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نقاد''، مشمولہ ارتسام، چندن بارہ بہار: مظہر فاؤنڈیشن، ۲۰۱۷ء، ص۳۹۹
- ایضاً ص۴۰۰
- فتح محمد ملک، سعادت حسن منٹو؛ایک نئی تعبیر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء ص۷۶
- ایضاً، ص۴۷
- ایضاً، ص۸۷
- محمد حمید شاہد، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ؛ کچھ نئی پرانی تعبیریں'' مشمولہ سعادت حسن منٹو جادوئی حقیقت نگاری اور آج کا افسانہ، کراچی: شہرزاد پبلی کیشنز، ۲۰۱۳، ص۱۱۳
- ایضاً ص۱۱۷
- ایم خالد فیاض، '' ٹوبہ ٹیک سنگھ۔۔۔ نئی تعبیر (ایک محاکمہ)'' مشمولہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا منٹو،، ص۱۹
- خالد محمود سنجرانی، '' تنقیدی محدودات اور ٹوبہ ٹیک سنگھ''، مشمولہ انگارے، کتابی سلسلہ ۲۵، سعادت حسن منٹو نمبر، ملتان: عاتکہ پرنٹنگ پریس، جنوری ۲۰۰۵ء، ص۱۰۳
- ایضاً ص۱۰۶
- پرویز انجم، '' سرزمین پنجاب کا قدآور افسانہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ'' مشمولہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا منٹو، ص۴۴
- ص۴۶
- ص۵۲
- ن۔م۔دانش، '' منٹو ٹوبہ ٹیک سنگھ اور شناخت کا بحران'' مشمولہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا منٹو، ص۱۵۱، ۱۵۲
- ایضاً، ص۱۶۰، ۱۶۱
- ایضاً، ص۱۷۸

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

معاصر اسلامی دنیااور تصوّف: مابعد نوآبادیاتی تناظر میں

ڈاکٹر الطاف انجم

اسسٹنٹ پروفیسر اردو

کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

تلخیص: یہ مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے جس کے پہلے حصہ میں عالمِ اسلام کی خونین صورتِ حال کااِجمالی خاکہ کھینچا جائے گا جب کہ دوسرے حصہ میں معاصر اسلامی دنیا میں تصوّف کے پھیلاؤ کے محرکات اور اس کے اثرات پر بحث ہو گی۔ بظاہر یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ضروری متصور کی جارہی ہیں بلکہ ایک دوسرے کی ترقی اور توسیع کے لیے اہم سمجھے جاتے ہیں جب کہ ایسا نہیں ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں معاصر اسلامی دنیا کی ناگفتہ بہ صورتِ حال اور تصوّف کے پردے میں اسلام دشمن سرگرمیوں کے عروج کے جملہ ابعاد کااحاطہ کرنے کوشش کی گئی ہے۔

کلیدی لفظیات: اسلامی اقدار، تصوف، مشرقیت، اسلام دشمنی، مغربیت، اطلاعاتی تکنالوجی، تہذیب وثقافت، نوآبادیات، عالمگیریت، فنافی الذات، فنافی الشیخ۔

عصرِ حاضر کا مسلمان اغیار کی فتنہ سامانیوں اور اپنی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے اس قدر مقہور و مظلوم ہے کہ عالمی سطح پر اُس کی بربادی کے چرچے ہر قصر وایوان کے مستقل موضوعات بن چکے ہیں۔ عالمی سطح پر اسلام دشمن طاقتوں نے اپنی قیامت زدہ چالوں سے کم و بیش ہر اسلامی ملک کو زِیر کر رکھا ہے۔ مابعد نوآبادیات کا ہر طالبِ علم اس بات سے بہ خوبی واقف ہے کہ سامراجی طاقتیں تیسری دنیااور بالخصوص ترقی پذیر ممالک کو اپنی نوآبادیات بنانے میں کوئی بھی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتیں بلکہ ذرائع ابلاغ کے مختلف اور متنوع وسائل کو کام میں لاکر ہر دم اُنہیں رام کرنے کی کوششیں جاری و ساری ہیں۔ اطلاعاتی تکنالوجی کی بے حد وحساب ترقی اگرچہ طلسم نہ سہی لیکن ہوش رُبا ضرور ہے جس نے ایک طرف مسلمانوں کی پستی میں قابلِ لحاظ حد تک اضافہ کیا ہے تو دوسری جانب اسلام دشمن طاقتوں نے اس کے استعمال سے اسلام اور مسلمان کی ایک ایسی ہیبت ناک تصویر پیش کی جو کسی بھی سادہ لوح انسان کو ڈرانے اور دھمکانے کے لیے کافی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کہیں کہیں پر مسلمان بہک کر اپنے دشمن کی صفوں کو مضبوط کرنے کے لیے مہرے کا کام کرتا ہے اور اس طرح وہ بذاتِ خود اغیار کے حلقۂ دام میں آکر اُن کے عزائم کی تکمیل کر رہا ہے۔ ہم اگر اپنے پڑوس تک ہی نظر دوڑائیں تو پاکستان کی مثال ہم سب کے لیے چشم کشا ہے جہاں پچھلی دہائی میں ''ضربِ عضب'' کے نام پر کلمہ خواں مسلمانوں نے دوسرے کلمہ خواں مسلمانوں کو تہہ و تیغ

Scanned with OKEN Scanner

کر کے اپنے ہاتھ لہو سے دھو دیے ہیں اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی نام پر تا حال جاری ہے۔ اب یہاں پر اہلِ نظر حضرات مخمصے کا شکار اس لیے ہیں کہ مارنے والا اللہ اکبر کہہ کر تیر و تفنگ کی مشق کرتے ہوئے غازی کا لقب حاصل کرتا ہے اور مرنے والا کلمۂ حق لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ ﷺ ادا کر کے جامِ شہادت نوش کرتا ہے۔ غرض کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قاتل کو غازی اور اس کے مقتول کو شہید کا درجہ دینے والوں نے اسلام کے کس پیغام کو سمجھا ہے اور وہ کس اسلام کی تتبع میں اپنی صبح کو شام کرتے ہیں۔ افغانستان کی صورتِ حال بھی پاکستان سے مختلف نہیں ہے۔ یہاں روسی اور امریکی سامراجی طاقتوں نے بالترتیب جو خون کا رقص گزشتہ نصف صدی سے جاری رکھا ہوا تھا اور جس کی نذر لاکھوں معصوم اور نہتے انسان ہو چکے ہیں۔ یہ سب عالمی جمہوری اداروں کی غیر جمہوری، غیر قانونی اور غیر انسانی کارستانیاں اور نارسائیاں ہیں۔ جو حضرات عالمی سیاسیات سے معمولی دلچسپی بھی رکھتے ہوں اُن کو یہ معلوم ہو گا کہ لیبیا شمالی افریقہ کا ایک ایسا متمول ملک رہا ہے "جہاں بجلی مفت تھی، تعلیم مفت تھی، اور طبّی سہولیات مفت تھیں، جہاں عوام کو سود سے پاک قرض دیا جاتا تھا، جہاں کار کی خریداری پر حکومت ۵۰ فیصد کی رعایت دیتی تھی، جہاں بے روزگاروں کو بھتہ ملتا تھا،" امریکہ اور اس کے حلیف ممالک نے کرنل قدافی کی سربراہی والی سرکار کے خلاف درپردہ سازشیں رچائیں، عوامی سطح پر بغاوت کی علم بلند کرائی گئی اور بالآخر قدافی کی موت اور جمہوریت کے نام پر ملک کا سیاسی نقشہ تبدیل کر دیا گیا اس طرح نتیجے کے طور پر یہ ملک آج خانہ جنگی کی وجہ سے کسمپرسی کی حالت میں ترقی یافتہ ممالک کے سامنے کشکول لے کر کھڑا نظر آتا ہے۔ اسی طرح مصر میں ڈاکٹر محمد مرسی کی سربراہی والی اخوان المسلمین کی جمہوری حکومت کی بیخ کنی کی گئی اور ڈرامائی انداز میں عبدالفتح السیسی کو تخت نشین کر دیا گیا، شام میں جہاں ایک طرف شیعہ نواز مسلح تنظیم حزب اللہ اور ایران و روس کی پشت پناہی والا بشار الاسد کا غیر اخلاقی اور غیر جمہوری آمرانہ اور جابرانہ طرزِ حکومت کے تحت معصوم و مظلوم رعایا کے نفس پر گراں بار ہوتا جا رہا تھا وہیں دوسری جانب اسلامی نظامِ حکومت (خلافت) کی تشکیل و تنظیم کے حامی متحارب گروہ ایسی مذموم حرکتوں کے مرتکب ہو رہے تھے جن سے انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے، اب سالِ گزشتہ (۲۰۲۴ء) کے اختتام کے ساتھ ہی بشارالاسد کے اقتدار کا سورج بھی لبِ بام آگیا اور وہ جان کی امان کے لیے سرزمین روس کو سُدھارے۔ عراق میں عوامی تباہی کے ہتھیار (Weapons of Mass Destruction) کے منظّم اور بدنام ڈرامے کے نتیجے میں تقریباً تین لاکھ بے گناہ شہریوں کو جرمِ بے گناہی میں موت کی آغوش میں سلایا گیا اور بعد ازاں شیعہ اور سُنی مسالک کی دیوار کھڑا کر کے غیر مختتم خانہ جنگی اور آپسی دشمنیوں کو جنم دے کر نورالمالکی کی کٹھ پُتلی سرکار کو استحکام بخشنے کی ناکام کوششیں کی گئیں، اب نہ صرف عالمِ عرب بلکہ شمالی افریقہ کے لیبیا میں جہاں عوام کو دولتِ اسلامیہ فی العراق و شام (داعش) کی غیر اسلامی اور مذموم حرکات، یمن میں حوثی باغیوں کی غیر معمولی قوتِ مزاحمت اور سعودی عرب اور اُس کے اتحادی طاقتوں کے پُر عزم خلائی حملے، ترکی میں حالیہ انتخاب میں رجب طیب اردگان کی اسلام پسند جماعت کے مقابلے میں کُرد نواز سیکولر گروہ کی قابلِ لحاظ کامیابی، جزیرہ ئ عرب میں ایران کی مبینہ دہشت گردی اور فتنہ پروری کی سازشیں؛ یہ اور اس طرح کی بہت سی مثالیں سامنے ہیں جہاں ہم یوروپ اور امریکہ کی بالواسطہ اور بلاواسطہ شر انگیزی اور مسلم دشمن کارروائیوں کو محسوس اور غیر محسوس طریقے سے دیکھ سکتے ہیں۔ واقع یہ ہے کہ چی گویرا، یاسر عرفات، نیلسن منڈیلا، مارٹن لوتھر کنگ، جیسے راہ نما دنیا کو روز روز نصیب نہیں ہوتے بلکہ یہ دیدہ ور بڑی مشکل سے چمن میں پیدا ہوتے ہیں جب کہ سامراجی طاقتوں کے خاکوں میں رنگ بھرنے کے لیے ہر دور میں عبدالفتاح السیسی، نورالمالکی، حامد کرزئی کے روپ میں لوگ

Scanned with OKEN Scanner

سامنے آتے رہتے ہیں۔ غرض عصرِ حاضر کا سیاسی ڈسکورس اسلامی ممالک کی تنزلی، یہودی اور عیسائی گروہوں کی ریشہ دوانیوں، مسلمانوں کی آپسی چپقلش اور خانہ جنگی، غیر اسلامی نظام کی توسیع، اسلحہ کی دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت جیسے بیانیات (Narratives) سے عبارت ہے۔

معزز قارئینِ کرام؛ آیئے اس طولانی تمہید کے بعد اِن مسائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے نظریہ تصوف کا یک تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ کل حالیہ برسوں میں اہلِ قلم نے تصوّف کی مختلف صورتوں اور اس کی ابتدا کے بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے لیکن میں یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ عالمِ اسلام کی ناگفتہ بہہ صورتِ حال کو سدھارنے اور بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو راہِ راست پر لانے میں تصوّف کے موئدین اور پیروکار اپنا وہ مخصوص کردار ادا کیوں نہیں کرتے ہیں جس کے لیے اُن کے چرچے ہر مذہبی، نیم مذہبی اور غیر مذہبی مجالس میں ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ صوفی حضرات بنی اُمیہ کے دور سے اسلامی اقدار و روایات کی شکست وریخت کے چشم دید گواہ رہے ہیں تو اُن کی موجودگی میں خلافت کے بجائے طوائف الملوکیت کا بازار ہی کیوں گرم ہوتا رہا؟ اسلامی نظامِ حکومت کے استحکام کے لیے صوفیوں کا تاریخ میں کیا کوئی قابلِ ذکر کردار بھی رہا ہے یا وہ صرف کشفِ قبور، تصوّرِ شیخ، فنافی الذات، فنافی الشیخ، فنافی اللہ، ذکرِ دائمی، مناقشہ، مراقبہ، مجاہدہ جیسے تصورات اور حرکات تک ہی خود کو محدود رکھنے میں عافیت سمجھتے رہے ہیں۔ اسی طرح سماع کی محفلیں پانچ ستارہ ہوٹلوں میں منعقد کی جاتی ہیں، دھمال ڈالے جارہے ہیں، قونیہ سے لے کر نیویارک تک، بیروت سے لے کر قاہرہ تک اور استنبول سے لے کر دہلی تک سفید رنگ کے مخصوص ملبوسات میں رقصِ رومی کے محیر العقول مناظر پیش کیے جاتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر نومبر ۲۰۱۴ء میں استنبول (ترکی) جانے کا موقع ملا۔ اس علمی سیاحت کے دوران ایک دن میں نے قونیہ کا رختِ سفر باندھا۔ قونیہ ساری دنیا میں رومی اور اس کے مرشد شمس تبریزی کی آخری آرامگاہ کے طور پر مشہور ہے۔ اِن دونوں صوفیوں کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے دوران میں نے ارد گرد کے ماحول کا بھی حتی المقدور جائزہ لیا۔ اس جائزہ کے دوران جو کچھ میرے حیطیہ ئ ادراک میں آیا، اُس نے مجھے شرعی اعتبار سے بہت مایوس کیا۔ مزارِ رومی سے ملحق بازار میں رومی کے مجسمے مختلف انداز میں دکانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں اور جو خریداروں کے لیے خصوصی دلچسپی کا مرکز بھی ہیں۔ یہ وہی مجسمہ سازی ہے جو بتانِ آذری کی یاد تازہ کرتے ہیں اور جنہوں نے احکامِ الٰہی کو للکارتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے غیض وغضب کو دعوت دی تھی ؎

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

اس کے ساتھ ہی قونیہ میں رومی کے نام پر بین الاقوامی مراکز قائم کیے گئے ہیں جہاں رقصِ رومی کی مجالس منعقد کی جاتی ہیں اور محافلِ سماع کا اہتمام پابندی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ مولانا جلال الدین رومی کو ترکی اور بالخصوص قونیہ میں ''میولانا'' کے نام سے پکارا جاتا ہے جہاں اِس نام سے ایک شاندار بین الاقوامی نوعیت کی یونیورسٹی بھی قائم ہے جہاں رومی کی تعلیمات کی طرف کم ہی توجہ دی جاتی ہے اور دوسرے جدید علوم کی درس و تدریس کا نہایت ہی موثر انتظام ہے۔ مختصر یہ کہ قونیہ میں رومی کا مزار مختلف غیر شرعی رقص و سرود اور سماع کی محافل کا گہوارہ بنا ہوا ہے جس نے نہ صرف گرد و پیش کے ماحول کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے بلکہ سیاح بھی منفی اثرات کے ساتھ وہاں سے نکلتے ہیں۔ اس طرح قونیہ کے شہر کے یہ مناظر

Scanned with OKEN Scanner

دیکھ کر کسی بھی باغیرت مسلمان کا اضطراب وانتشار میں مبتلا ہونا طے ہے۔ غرض رقص، سرود، دھمال اور سماع کی مجالس کا انعقاد اپنی سرشت میں غیر شرعی ہے ہی اور اِن میں مخلوط مرد وزن کی موجودگی اُس پر مستزاد ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کی حرکتیں عصرِ حاضر کے صوفیوں کے محبوب اور مشتاق مشغلے ہیں۔ کیا دورِ حاضر کے صوفیوں کو عالمِ اسلام کی خون ریز صورتِ حال کی طرف ایک لمحہ بھی توجہ کرنے کی فرصت نہیں؟ کیا اُن کو اِٹلی کے ساحل پر شام کے تارکینِ وطن کا وہ کریہہ المنظر واقعہ بھی نہیں جھنجھوڑتا ہے جس میں کشتی اُلٹنے سے تین سالہ ایلان الکردی نے اوندھے منہ گر کر اپنی جان بے کسی اور مجبوری کے عالم میں جانِ آفرین کے حوالے کر دی۔ ۲ ستمبر ۲۰۱۵ء کو پیش آئے اس واقعہ نے عالمی سطح کے حکمرانوں، رضار کار تنظیموں اور اہلِ دل حضرات کو ششدر کر دیا لیکن صرف صوفیا ہیں جن کو یہ واقعہ متاثر نہ کر سکا۔ حالیہ مہینوں میں اسرائیل نے مغربی ممالک کی سرپرستی میں جس طرح فلسطین کے لاکھوں گھروں کو نیست ونابود کر کے لاکھوں نفوس پر مشتمل آبادی کو بے کسی اور بسی کی مثال بنا دیا اُس کا نظارہ تا حال چشمِ فلک نے نہیں دیکھا ہوگا۔ اِن عالمی مسائل اور حادثات کو نو آبادیاتی صحافت نے مسلمانوں کی دہشت گردی سے موسوم کر دیا ہے اور ہمارے علما وائمہ دین کی صوفیانہ تعبیر و تفسیر میں مصروفِ عمل ہیں۔ اگر تصوّف یہی ہے تو اسلام کو ہر گز اس کی ضرورت نہیں ہے اور اس طرح کے مخربِ اخلاق مناظر اور حرکات کا کسی اِزم، دین، نظام یا عقیدہ سے تعلق ہو تو ہو لیکن یہ کسی بھی صورت میں اُس اسلام سے منسلک نہیں ہو سکتا ہے جس کے مکمل ہونے کی بشارت نبی برحق حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع کے موقع پر قرآن پاک کی آیت الیوم اکملت لکم دینکم (ترجمہ: آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا) فرما کر دی تھی۔ اگر تصوّف واقعی اسلام کے لیے کسی بھی صورت میں فائدہ مند ہوتا تو قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ کیوں کر اِس کے مباحث سے خالی ہوتے؟ کیا ربِ ذوالجلال (جلہ شانہ) اِن کو اسلام کا حصہ نہیں بناتے؟ اسلامی تعلیمات کی معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا ہر انسان جانتا ہے کہ جہاں قرآنِ پاک میں چیونٹی، مکھی اور مکڑی جیسے حشرات الارض جانداروں کا ذکرِ جمیل موجود ہے لیکن تصوّف کے بارے میں کوئی تاکید یا اطلاع نہیں ہے۔ جس طرح دورِ حاضر میں مختلف مسلم دانشورانِ کرام بالخصوص تصوف کے ماہرین نے لفظ ''احسان'' کے توسط سے ''تصوّف'' کو قرآن وحدیث سے جوڑا، تو اُن سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر ''احسان'' کے حوالے سے ''تصوّف'' کو اسلامی نظریہ تصور کیا جائے تو پھر اس طرح بہت سے غیر ضروری تصورات کو اسلام کا جزو بنانے میں کیا حرج ہے؟ بہر حال تصوّف کو کتنا بھی اسلامی قرار دیا جائے، یہ بات تو طے ہے کہ خود حضورِ اقدس محمد مصطفےٰ ﷺ اور ان کے صحابہ کبار کے دور میں نہ تو تصوّف تھا اور نہ اُس سے ملتی جلتی کوئی چیز تھی۔ عہد حاضر کے ایک اسلامی اسکالر راشد شاز نے لکھا ہے کہ:

> ''محمد رسول اللہ ﷺ صوفی نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے متصوفین کا کوئی گروہ تشکیل دینے کی کوشش کی۔ صدرِ اول میں کسی ایسے حلقۂ باصفا کا سراغ نہیں ملتا جس نے وہی سے ماورا معانیٔ وحی کی دریافت کی کوشش کی ہو، یا جس نے اوراد و وظائف کے ذریعے عملی زندگی کا کوئی دستور العمل مرتب کیا ہو۔ دین کا متصوفانہ تصور اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جو غلو فی الدین کے راستے داخل ہوا اور جس نے آگے چل کر دینِ مبین کی شکل ہی بدل

Scanned with OKEN Scanner

ڈالی۔سچ تو یہ ہے کہ اسلام میں تصوّف کی پیدائش ایک بڑی جسارت سے عبارت ہے جو شقی
القلبی کے بغیر انجام پاسکتا تھااور نہ ہی شاطرانہ گوسفندی کے بغیر اس کی تعمیر ممکن تھی۔''[۱]

جیسا کہ بعض دانشوروں نے اکیسویں صدی میں تصوّف کے بے حد وحساب پھیلاؤ کو نوآبادیاتی نظام کی کوئی سازش ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک اہم بات کی طرف ہم سب کی توجہ مبذول کرائی ہے۔میں یہاں پر غیر شعوری طور پر اُن کی تائید میں عرض کرنا چاہوں گا کہ دنیا کے مختلف ممالک میں رومی کے نام پر کئی بین الاقوامی نوعیت کے مراکز قائم کیے جاچکے ہیں جہاں غیر اسلامی نوعیت کی حرکات کو پذیرائی عطا کر کے اُنہیں اسلام کے متبادل کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔اسی طرح استنبول، انقرہ اور دنیا کے بیشتر شہروں میں بدیع الزماں سعید نورسی کے نام پر نہایت ہی تزک واحتشام کے ساتھ متواتر بین الاقوامی سمینار اور مجالس منعقد کی جاتی ہیں جہاں اُن کے ''رسالۂ نور'' کا زور وشور سے پرچار تو کیا جاتا ہے لیکن اِس کے ماننے والوں کی ظاہری وضع قطع اور نشست وبرخاست کے آداب سے کم سے کم دینِ محمدی ﷺ کی تتبع کا کوئی گمان نہیں گزرتا۔راقم کو ایک بار اُن کی نشست میں بیٹھنے کا موقع ملا جہاں شرکائے مجلس مغربی طرز کے سوٹ بوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھے اور وہ ترکی زبان میں ''رسالۂ نور'' کی تعلیمات بیان کرتے،اس مجلس کے ایک متہم پروفیسر فرئیس کایا نے مجھے ''رسالۂ نور'' کی ایک جلد مع انگریزی ترجمہ تھمائی جس کا میں نے اس دوران مطالعہ کیا۔اِن مجالس سے اسلام کو کوئی فائدہ پہنچے یا نہیں البتہ یہ بات طے ہے کہ ایک مخصوص طبقے کے لوگوں کو کئی اعتبار سے مالی اور دوسری نوعیت کے فائدے ضرور پہنچ رہے ہیں۔یہ مخصوص طبقہ اپنے وضع کردہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کیا کیا حربے اختیار کر رہے ہیں اُن کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے جس میں ایک قطب الاقطاب اپنے حواریوں کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے

''ہم نے خود کو اولیا اللہ کی فہرست میں شامل کرلیا اور اپنے اکابرین کی قبروں کو فیوض و
برکات کے کارخانے قرار دے کر انہیں فتوحات ونذرانے کا ذریعہ بنایا۔دیکھتے دیکھتے قرآن
کی اکتشافی تحریک قبّوں اور قبرستانوں کی تہذیب بن گئی۔دنیا کی کسی بھی تنظیم کے پاس اتنے
بڑے پیمانے پر ایسے کارگر تنظیمی دفاتر نہیں ہیں جن پر معاشی طور پر خود کفالت بلکہ مرفہ
الحالی کا دور دورہ ہو۔بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ مجموعی آمدنی اور assests کی شکل میں جو
کچھ ہم درویشوں کے پاس ہے اس کا مقابلہ دنیا کی امیر ترین حکومتیں، نامی گرامی سرمایہ دار
اور Billionaire Club کے اراکین بھی نہیں کر سکتے۔''[۲]

مذکورہ اقتباس ہم طالبانِ علم وادب کے لیے کئی اعتبار سے چشم کشا ہے۔مجھے ذاتی طور پر تصوّف یا صوفیہ سے کوئی دل چسپی ہے اور نہ ہی تعلق،البتہ ہم عصر دنیا میں جس نوعیت کا شور وغوغا تصوف کے نام پر برپا کیا جارہا ہے وہ ایک سنجیدہ اور ذی ہوش مسلمان کے لیے پریشان کن ہے۔اکثر صوفیا کی مجالس میں صوفیائے کرام سے منسوب نیم حقیقی اور غیر شرعی واقعات بیان کر کے حاضرینِ مجلس کو اللہ تعالیٰ جلہ شانہ کے مقابلے میں اُن کی مخلوق کے گھڑے

Scanned with OKEN Scanner

ہوئے قصے سنائے جاتے ہیں۔ یہاں پر میں صرف ایک قصہ کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ ایک حکایت میں آیا ہے کہ ابوالحسن قرقانی(۹۷۱ءتا۱۰۳۰ء) ایک دن اپنے مریدوں کے ساتھ سرمستی میں محو تھے کہ نِدا آئی:

"کیا میں تمہارے چاہنے والوں کو بتادوں کہ تم اپنے عشق میں گرفتار ہو کر شریعت کو بھول گئے ہو تاکہ وہ تم پر پتھر برسائیں۔"

حضرت نے فوراً ہی جواب دیا:

"اے غفور الرحیم، تم سے بے حساب رحم و کرم پانے والوں کو کیا میں بتادوں کہ تمہارا ارادہ کیا ہے تاکہ پھر کبھی تمہاری عبادت میں سر نہ جھکائیں"۔[۳]

اس نوعیت کی بیسیوں حکایتیں عوام و خواص کے حلقوں میں مقبول ہیں جنہوں نے دینِ اسلام کے ایک نئے ایڈیشن کو متہم بالشان انداز میں پیش کیا اور اس طرح قرآنی الفاظ اور تراکیب کو صوفیائے کرام نے مخصوص معانی و مطالب پہنائے جس کا رفتہ رفتہ یہ اثر ہوا کہ قرآن پاک پر دبیز پردے ڈال کر اُسے صرف صوفیا کی جاگیر قرار دیا۔ آج کے پُر انتشار معاشرے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک انسان کو یہ سمجھایا جائے کہ معبودِ برحق اللہ جلہ شانہ اور اُن کے رسول حضرتِ محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ ﷺ اُن سے اتنے ہی نزدیک ہیں جتنے صوفیا یا دوسری مخلوقات ہیں۔ اسی طرح وہ قرآنِ پاک اور احادیثِ مبارکہ کا متن جس ذہن، ذوق، ظرف اور عقیدے کے ساتھ پڑھیں گے، اُن کے لیے وہ ہدایت، نجات اور کامیابی و کامرانی کا ذریعہ ہوگا۔

اسلام کی اشاعت اور ترسیل کے کام میں صوفیائے کرام کے خدمات ہماری اسلامی تاریخ کا ایک مستقل باب بن چکا ہے۔ اس ضمن میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آیا بزرگانِ دین اور اولیائے کرام کو ہی صوفیا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یا صوفیا اولالذکر سے مختلف کوئی گروہ ہے۔ میں اپنے اس مقالے کا اختتام مسجدِ نبوی ﷺ کے خطیب شیخ ابو بکر الجزائری کے اس قول پر کرتا ہوں کہ:

"تصوّف یا تو عین اسلام ہے یا غیر اسلام..... عین اسلام ہے تو ہمارے لیے اسلام ہی کافی ہے۔ غیر اسلام ہے تو اس کی ضرورت نہیں۔[۴]"

اس بات سے ہم سب تقریباً متفق ہیں کہ ہمارے اپنے علمی ذخائر اور روایات نوآبادیاتی دور میں اس طرح پیش کیے گئے گویا کہ وہ کوئی اہم چیز نہ ہو کر متعفن زدہ اور حقیر بن کر رہ گئے ہیں۔ مذکورہ بالا سطور میں تصوف کے جس پہلو پر خامہ فرسائی کی گئی ہے وہ تصوف کے اُس گہرے رنگ سے قریب قریب خالی نظر آتا ہے جو ہمارے اسلاف کے پاکیزہ اور تطہیری اوصاف سے معرضِ وجود میں آچکا تھا۔ غور کرنے پر ہر ایک قاری اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جس طرح نوآبادیاتی عہد میں ہمارے علوم اور فنون کو بہ چشمِ کم دیکھا گیا ہے اور اُن کو مسخ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے عین اسی طرح تصوف کے میدان میں بھی نئی بدعات کو مغربی علما نے رواج دیا۔ جنہوں نے روح کی تطہیر کے بجائے ظاہری عوامل پر زور دینا شروع کر دیا۔ اس طرح حالیہ دہائیوں میں تصوف وہ اصلی صورت بگڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس کی آبیاری محی الدین ابنِ عربی، مولانا جلال الدین رومی، حضرت جنید بغدادی، حضرت رابعہ

Scanned with OKEN Scanner

بصری، شیخ علی ہجویری جیسے اکابرین نے اپنے اپنے طور پر کی ہے۔ غرض تصوف میں داخلی میلانات کے بجائے خارجی عوامل کے اظہار کو تقویت ملتی گئی جس کا بنیادی مقصد اس کو اپنی روح سے عاری کرنا سمجھا جارہا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ راشد شاز، ادراکِ زوالِ اُمت، ملی پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2005ء، ص۔ ۳۱۴

۲۔ راشد شاز، لستم پوخ، ملی پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2013ء، ص۔ ۰۲۲

۳۔ بحوالہ تصوّف بہ یک نظر، از قدیر زماں، فورم فار ماڈرن تھاٹ اینڈ لٹریچر، حیدر آباد، 2006ء، ص۔ ۷۲۔ ۸۲

۴۔ ایضاً۔ پچھلا سرورق

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری کا سرسری جائزہ

ڈاکٹر محمد اقبال، آئی۔ جرمن
اسسٹنٹ پروفیسر، صدر شعبہ اردو
بی۔ شنکرانند آرٹس اینڈ کامرس ڈگری کالج
کڈچی، تعلقہ رائے باغ، ضلع بیلگاوی

تلخیص: راجندر سنگھ بیدی نفسیات اور جذبات نگاری کے نہایت عمدہ فکشن نگار تھے، ناول نگاری اور ڈرامہ نویسی میں بھی ان کی خدمات لائق ستائش ہیں لیکن راجندر سنگھ بیدی افسانہ نگاری کے بادشاہ تھے اسی وجہ سے انھیں نہ صرف صف اول کا افسانہ نگار تسلیم کیا گیا بلکہ انھیں منشی پریم چند کا ہم پلہ بھی قرار دیا گیا۔ اس مختصر مقالے میں راجندر سنگھ بیدی کا مختصر تعارف اور افسانہ نگاری کا سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: راجندر سنگھ بیدی منشی پریم چند کے ہم پلہ افسانہ نگار

راجندر سنگھ بیدی کی پیدائش 1 ستمبر 1915ء کو سیالکوٹ میں ہوئی اور 11 نومبر 1984ء کو 69 سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ راجندر سنگھ پیشے سے ڈرامانگار، فلم ہدایت کار، منظر نویس اور مصنف تھے۔ اردو زبان وادب ان کا شوق بھی تھا اور روزی روٹی کا ذریعہ بھی۔ راجندر سنگھ بیدی کا پہلا افسانہ ' مہارانی کا تحفہ ' لاہور کے ادبی دنیا میں شائع ہوا تھا جسے سال کا بہترین افسانہ قرار دیا گیا تھا۔ راجندر سنگھ بیدی کو 1965 میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا اور انہیں ادب اور تعلیم کے زمرے میں پدم شری اعزاز بھی حاصل ہوا۔ راجندر سنگھ بیدی کا ناول ' ایک چادر میلی سی ' 1962 میں شائع ہوا اور بہت مقبول ہوا، اس پر فلم بھی بنی اور اس کا انگریزی، ہندی، کشمیری اور بنگالی میں ترجمہ بھی ہوا۔ راجندر سنگھ بیدی نے ڈرامانگاری میں بھی نام کمایا۔ ڈراموں کا مجموعہ 'بے جان چیزیں' لاہور سے 1943 میں شائع ہوا اور 'سات کھیل' 1946 میں لاہور سے ہی شائع ہوا۔ راجندر سنگھ بیدی کا اصل میدان افسانہ نگاری تھا۔ اس میدان میں انہوں نے اپنی گراں قدر خدمات انجام دی اور نہایت بلند مقام حاصل کیا۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوی مجموعوں کی تفصیل اس طرح ہے۔

- افسانوی مجموعہ ' دانہ ودام' 1936 میں لاہور سے شائع ہوا۔
- افسانوی مجموعہ 'گرہن' 1942 میں لاہور سے شائع ہوا۔
- افسانوی مجموعہ ' کوکھ جلی' 1949 ممبئی سے شائع ہوا۔
- افسانوی مجموعہ ' اپنے دکھ مجھے دے دو' 1965 دہلی سے شائع ہوا ۔
- افسانوی مجموعہ ' ہاتھ ہمارے قلم ہوئے' 1974ء میں دہلی سے شائع ہوا۔

Scanned with OKEN Scanner

- آخری افسانوی مجموعہ 'مکتی بودھ 1982'ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ جس میں مضامین اور خاکے بھی شامل ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں حقیقت نگاری کا عکس ملتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے زندگی کے چھوٹے بڑے حقائق کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانہ حقیقت نہیں ہوتا ہے لیکن کئی حقیقوں پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔ خود اپنی افسانہ نگاری کے متعلق راجندر سنگھ بیدی نے تحریر کیا ہے:

"جب کوئی واقعہ، مشاہدے میں آتا ہے تو میں اسے من و عن بیان کر دینے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے، اسے احاطہ تحریر میں لانے کی سعی کرتا ہوں۔ میرے خیال میں اظہار حقیقت کے لیے ایک رومانی نقطہ نظر کی ضرورت ہے۔ بلکہ مشاہدے کے بعد پیش کرنے کے انداز کے متعلق سوچنا، بجائے خود کسی حد تک رومانی طرز عمل ہے اور اس اعتبار ہے، مطلق حقیقت نگاری بحیثیت فن غیر موزوں ہے۔"

(راجندر سنگھ بیدی (ایک سماجی و تہذیبی مطالعہ) ڈاکٹر سید محمود کاظمی۔ 2011۔ مطبع عفیف آفسٹ پرنٹرس دہلی۔ صفحہ نمبر (4

☆ راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری:

راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری میں وہ تمام لوازمات شامل ہیں جو ایک بلند پایہ افسانہ نگار کے افسانوں میں ہوتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے پہلے افسانوی مجموعہ ' دانہ ودام' میں جو افسانے شامل ہیں ان کے عنوانات اس طرح ہیں۔

(۱) بھولا (۲) ہمدوش (۳) من کی من میں (٤) گرم کوٹ (٥) چھوکری کی لوٹ (٦) پان شاپ (۷) منگل اشٹکا (۸) کوارنٹین (۹) تلادان (۱۰) دس منٹ بارش میں (۱۱) حیاتین 'ب' (۱۲) لچھمن (۱۳) ردعمل

(۱٤) موت کا راز

راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ 'گرم کوٹ' بہت مقبول ہوا یہ قربانیاں دینے والے میاں بیوی کی پر اثر کہانی ہے۔ اک شخص جسے گرم کوٹ کی سخت ضرورت ہوتی ہے وہ پرانے کوٹ سے ہی کام چلاتا ہے اور اسے پیوند لگا لگا کر استعمال کرتے رہتا ہے۔ ایک روز بازار جاتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ دس کا نوٹ جیب سے گر گیا ہے مگر نوٹ جیب سے کھسک کر دوسری طرف چلا جاتا ہے اور اسے مل جاتا ہے، اگلی بار وہ اپنی بیوی کو دس کا نوٹ دے کر سامان لانے کے لئے بازار بھیجتا ہے لیکن اس کی بیوی سامان لانے کی بجائے اپنے شوہر کے لئے کوٹ کا نیا کپڑا خرید کر لاتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے اس افسانے کا اختتام اس طرح کیا ہے:

" شمی اندر آتے ہوئے بولی" میں نے دو روپے کھیمو سے ادھار لے کر خرچ کر ڈالے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔ پھر بچے، پوپی منا اور میں تینوں شمی کے آگے پیچھے گھومنے لگے۔ مگر شمی کے ہاتھ میں ایک بنڈل کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے میز پر بنڈل کھولا۔ وہ میرے کوٹ کے لئے بہت نفیس ورسٹڈ تھا۔

پیچھے سے منی نے کہا" بی بی، میرے گلاب جامن"

شمی نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگا دی! "

(افسانوی مجموعہ ' دانہ ودام'۔ راجندر سنگھ بیدی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ صفحہ نمبر 69)

Scanned with OKEN Scanner

راجندر سنگھ بیدی نے منشی پریم چند، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر کے مقابلے میں افسانہ نگاری کے لئے کم وقت دیا لیکن معیار کے معاملے میں وہ ان تینوں سے کم نظر نہیں آتے۔ راجندر سنگھ بیدی کا تعلق فلمی دنیا سے زیادہ رہا انہوں نے فلمی دنیا میں بہت نام کمایا اور انعامات بھی حاصل کیے۔ فلمیں فکشن کا ہی حصہ ہوتی ہیں اس حساب سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو زبان میں افسانوی ادب راجندر سنگھ بیدی کا اوڑھنا بچھونا رہا۔' گرہن' راجندر سنگھ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں چودہ (14) افسانے شامل ہیں، یہ افسانے زندگی کی چھوٹی بڑی خوشیوں کو موضوعات بنا کر تخلیق کئے گئے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے تیسرے افسانوی مجموعے کا نام' کوکھ جلی' ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں جملہ تیرہ (13) افسانے شامل ہیں۔ یہ افسانوی مجموعہ 1949ء میں شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوی مجموعہ' اپنے دکھ مجھے دے دو' 1965ء میں شائع ہوا تھا اس مجموعے میں بھی جملہ دس (10) افسانے شامل ہیں۔ افسانوی مجموعہ' ہاتھ ہمارے قلم ہوئے' 1974ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں راجندر سنگھ بیدی کے دس (10) افسانے شامل ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کی ایک کتاب' مکتی بودھ' ہے جس میں مضامین اور خاکوں کے ساتھ (5) افسانے بھی شامل ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوی مجموعوں میں (60) سے زائد افسانے ملتے ہیں اور کچھ افسانے ایسے بھی ہیں جو مجموعوں میں شامل نہیں ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانے فن افسانہ کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کے تعلق سے پروفیسر آل احمد سرور نے ایک جگہ تحریر کیا ہے:

> "بیدی کہانی لکھتے ہیں۔ نہ سیاست بگھارتے ہیں نہ فلسفہ چھانٹتے ہیں، نہ شاعری کرتے ہیں، نہ موری کے کرے گنتے ہیں۔ عام زندگی، عام لوگ، عام رشتے ان کے افسانوں کے موضوع ہیں مگر ان میں وہ ایسی طاقت اور توانائی، زندگی اور تابندگی، معنویت اور انفرادیت بھر دیتے ہیں کہ ذہن میں روشنی ہو جاتی ہے۔ ان کے یہاں اسطور سازی اور جنس کی واقعی اہمیت ہے مگر اس سے زیادہ اہمیت زندگی کے وژن کی ہے۔"
>
> (اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔ سنبل نگار۔ 2001- مطبع ایم کے آفسٹ پرنٹرس، دہلی صفحہ نمبر 170)

راجندر سنگھ بیدی کی زبان کے بارے میں کچھ تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ پنجابیت کی آمیزش کی وجہ سے ان کی نثر ناہموار اور کھردری ہو گئی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ راجندر سنگھ بیدی نے جب مکالموں میں پنجابی کردار افسانوں میں پیش کئے تب پنجابی مکالموں میں در آئی اور یہ عیب کی بجائے ہنر ثابت ہوا۔ کیوں کہ مکالمہ نگاری کا یہی تقاضہ ہوتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے اکثر افسانوں میں الفاظ کا نہایت عمدگی سے استعمال کیا ہے۔ 'گرہن' راجندر سنگھ بیدی کی ایک ایسی کہانی ہے جس میں پہلی بار ہندو دھرم کے تناظر میں افسانے کا پلاٹ تیار کیا گیا۔ راجندر سنگھ بیدی نے افسانے کے موضوع کے اعتبار سے استعارات اور اشارات و علامات استعمال کئے ہیں۔

افسانہ 'لاجونتی' محبت کی دلکش کہانی ہے۔ لاجونتی افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ لاجونتی، سندر لال سے دل و جان سے محبت کرتی ہے اور سندر لال بھی لاجونتی کو بے حد چاہتا ہے لیکن پاکستان بننے کے بعد کچھ مسلمان لاجونتی کو پاکستان لے کر چلے جاتے ہیں پھر بعد میں مہاجرین کی ادلا بدلی میں لاجونتی واپس سندر لال کے پاس آجاتی ہے۔ افسانہ' اپنے دکھ مجھے دے دو' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنے شوہر کے سارے دکھ درد اپنے نام کر لیتی ہے اور اس کے بدلے میں کچھ نہیں لیتی، یہ ایک عورت کے ایثار و بے لوث محبت کی سبق آموز داستان ہے۔ اس افسانے کو راجندر سنگھ بیدی نے اس طرح انجام تک پہنچایا ہے:

Scanned with OKEN Scanner

"کچھ دیر بعد مدن کے ہوش ٹھکانے آئے اور وہ وہ بولا" میں سمجھ گیا اندو" پھر روتے ہوئے مدن اور اندو ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایسی دنیاؤں میں لے گئی جہاں انسان مر کر ہی پہنچ سکتا ہے۔"

(افسانہ " اپنے دکھ مجھے دے دو")

افسانہ ' کوارنٹین' ایک جان لیوا وبا کی داستان ہے۔ ایک خطرناک بیماری سارے علاقے میں پھیل جاتی ہے اور لوگ لگاتار مرتے رہتے ہیں ۔ایسے حالات میں ڈاکٹرس کی خدمات قابل ستائش نظر آتی ہے۔ یہ افسانہ حال ہی میں پھیلی وبا کورونا کا بھی بہترین عکاس ہے۔ افسانہ " ایک باپ بکاؤ ہے" میں ایک باپ کو بیچنے کا واقعہ ہے۔ اخبار میں ایک اشتہار ہوتا ہے جس میں ایک باپ کو بیچنے کی خبر ہوتی ہے۔ اشتہار پڑھنے کے بعد کچھ لوگ اسے خریدنے پہنچتے ہیں مگر اس باپ کے عیب جاننے کے بعد وہ وارادہ بدل دیتے ہیں۔ افسانہ ' گھر میں بازار' عورتوں کے مسائل کی داستان بیان کرتا ہے۔ شادی سے پہلے لڑکی ضرورت کے مطابق اپنے باپ کی جیب سے روپے نکال کر اپنی ضرورتیں پوری کر لیتی ہے مگر شادی کے بعد وہ اپنے شوہر سے خرچ کرنے کے لئے روپے لینے میں شرماتی ہے۔ افسانہ ' دس منٹ بارش میں' برسات میں بھیگی ہوئی ایک غریب و بے بس عورت کی کہانی ہے جسے اس کا شوہر چھوڑ چکا ہے۔ افسانہ 'پان شاپ' اپنی پسندیدہ چیزوں کو پان شاپ پر گروی رکھ کر قرض لینے کی کہانی ہے۔ فوٹو اسٹوڈیو اور جاپانی گفٹ شاپ کے مالک ہمیشہ پان شاپ کے مالک کی برائیاں کرتے رہتے ہیں مگر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ انھیں بھی قرض لینے کے لئے پان شاپ پر ہی جانا پڑتا ہے۔ افسانہ ' آلو' ایک انتہائی غریب آدمی لکھی سنگھ کی کہانی ہے۔ یہ کہانی درشاتی ہے کہ پیٹ کی آگ کس طرح انسان کو اپنا نقطہء نظر تبدیل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ افسانہ ' دوسرا کنارہ 'تین مزدور پیشہ بھائیوں کی جد وجہد کا قصہ ہے۔ ان تینوں بھائیوں کا باپ اپنے بیٹوں کی نفسیات کو سمجھ نہیں پاتا ہے۔ افسانہ 'منگل اشٹکا' ایک برہمچاری کا قصّہ ہے جو اپنے برہمچریہ پر ناز کرتا ہے مگر اسے اس کی تنہائی کا دکھ بھی پریشان کرتا رہتا ہے۔ افسانہ 'مقدس جھوٹ 'ایک بچے کے جذبات واحساسات کی کہانی ہے۔ ایک بچہ اپنے ہی گھر میں چوری کر کے پکڑا جاتا ہے، جس کے بعد اس کی ماں اس کی خوب پٹائی کرتی ہے جس کی وجہ سے بچہ بیمار ہو جاتا ہے۔ افسانہ 'لمس' راجندر سنگھ بیدی کا ایک ایسا افسانہ ہے جو طبقاتی کشمکش پر مبنی ہے۔ افسانہ ' لچھمن 'ایک کنوارے انسان کے جذباتی استحصال کی داستان ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ' مکتی بودھ' ایک ایسے آدمی کا قصہ ہے جو فلموں میں پلے بیک سنگر بنا چاہتا ہے جس کے لئے وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں روس کے افسانہ نگار چیخوف کا رنگ ملتا ہے۔ جن میں عام واقعات کو نہایت موثر انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے اکثر افسانوں کے کردار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ راجندر سنگھ نے پنجاب کے لوگوں کی جتنی سچی اور اچھی تصویر کشی کی ہے وہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے اکثر افسانوں میں ایسے کردار ملتے ہیں جن کے دلوں میں خواہشات جنم لیتے ہیں مگر وہ پورے نہیں ہو پاتے۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں سادگی ملتی ہے، ان کی یہ خوبی انہیں منشی پریم چند سے قریب کرتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں سادگی کے ساتھ ساتھ علامت نگاری اور استعاراتی پہلو بھی ملتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی نے اپنے افسانوں میں بچوں کی نفسیات کو بھی عمدگی سے برتا ہے۔ بھولا، تلادان اور چھوکری کی لوٹ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی نے منشی پریم چند کی طرح دیہاتوں کی منظر کشی بھی نہایت عمدہ کی ہے۔ فسادات کے موضوع پر راجندر سنگھ بیدی منٹو کے اسلوب تک تو نہیں پہنچ سکے مگر اس موضوع پر ان کے فکر کی گہرائی افسانہ 'لاجونتی' میں پڑھنے کے بعد دل میں اتر جاتی ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

راجندر سنگھ بیدی نے عام انسانوں کی زندگی کے دکھوں کو افسانوی رنگ میں ڈھالا ہے اور غریب مجبور بے سہارا و غم زدہ مرد و خواتین کے کردار بڑے موثر انداز سے اپنے افسانوں میں پیش کئے ہیں۔ مختار احمد نے ایک جگہ تحریر کیا ہے:

" غربت، تنگدستی، مجبوری اور لاچاری کی زندگی گزارنے والوں کے حالات کو بیدی نے بخوبی قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے، کچلے ہوئے ہزاروں لوگوں کی ازدواجی زندگی کے متعلق بیدی نے متعدد افسانے تخلیق کئے ہیں جن میں " گرہن " ،"لاجونتی" ،"اپنے دکھ مجھے دے دو" ،"صرف ایک سگریٹ"، " رحمان کے جوتے" اور " گرم کوٹ" وغیرہ شامل ہیں۔ اگرچہ ان افسانوں کا پس منظر عورت اور مرد کے باہمی تعلقات اور کشمکش جیسے حالات کو وضع کرنے کا ہے، لیکن ان میں کہیں نہ کہیں زندگی کی سچائی بھی ہے۔"

(عکس ادب (اردو) سہ ماہی اورنگ آباد، اکتوبر تا دسمبر۔2015۔ شمارہ 13 صفحہ نمبر 49)

راجندر سنگھ بیدی جدید افسانہ نگاروں کے علم برداروں میں شامل ہیں اور نمایاں ہیں۔ حالاں کہ افسانے کی ابتداء بیسویں صدی کے ابتدا سے ہوئی جو اردو ادب کے جدید دور میں شامل ہے لیکن جب افسانے کی ابتدا ہوئی اکثر افسانے نئے پن سے عاری نظر آتے ہیں کیوں کہ ان میں سماجی معنویت کی جانب توجہ نہیں دی گئی، راشد الخیری ہو یا نیاز فتح پوری ان کے یہاں افسانوں میں رومانی رنگ ملتا ہے۔ دراصل منشی پریم چند ہی وہ افسانہ نگار تھے جھنوں نے سماجی معنویت کو اپنے افسانوں میں مرکزی حیثیت دی۔ ڈاکٹر عبدالرشید منہاس نے ایک جگہ تحریر کیا ہے:

" پریم چند کے بعد کہانی میں ایک نیا موڑ آتا ہے، اردو افسانہ حقیقت نگاری کے رجحان سے روشناس ہو جاتا ہے اور اس طرح اردو افسانے کے باب میں ایک اضافہ بھی ہوتا ہے پھر اس کے بعد جتنے بھی افسانہ نگار منظر عام پر آئے چاہے وہ سدرشن ہوں، کرشن چندر ہوں، بیدی ہوں، عصمت چغتائی ہوں یا سعادت حسن منٹو ان کے ہاں کہانی ایک نئے رنگ و آہنگ میں داخل ہوتی ہے۔"

(عکس ادب (اردو) سہ ماہی اورنگ آباد، جولائی تا ستمبر 2016۔ شمارہ نمبر 16۔ صفحہ نمبر 57)

افسانہ نگاری میں زبان و بیان کافی اہمیت کی حامل ہیں، مشکل اور غیر مستعمل الفاظ افسانے کو کمروز کر سکتے ہیں یا رفتار کو دھیما کر سکتے ہیں، آسان اور عام فہم الفاظ افسانوں کو مقبول بنانے میں اہم حصہ دار ہوتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں زبان و بیاں کے تعلق سے سنبل نگار نے ایک جگہ تحریر کیا ہے:

"بیدی کی زبان تو دراصل مشکل فارسی آمیزہ زبان ہے جس سے ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوا لیکن فلم کی دنیا میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی انھوں نے سمجھ لیا کہ یہاں یہ زبان چلنے والی نہیں۔ انھوں نے نامانوس ثقیل الفاظ کو ترک کر دیا۔ ہندی الفاظ کو فارسی الفاظ کے ساتھ اس طرح شیر و شکر کر دیا کہ زبان میں ایک طرح کا لوچ اور ایک طرح کی رعنائی پیدا ہو گئی۔ تشبیہوں، استعاروں، پر لطف مختصر فقروں سے انھوں نے اپنی زبان میں دلکشی پیدا کی۔ انھیں زبان پر دسترس حاصل ہے اس کے باوجود بعض جگہ زبان ناہموار ہو جاتی ہے۔"

(اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔ سبل نگار۔ 2001۔ مطبع ایم کے آفسٹ پرنٹرس نئی دہلی۔ صفحہ نمبر 173)

تلخیص (Summery) :

Scanned with OKEN Scanner

راجندر سنگھ بیدی نے جس دور میں افسانے تخلیق کئے وہ افسانہ نگاری کے لئے سنہری دور تھا۔ افسانے تخلیق کرنے والوں سے زیادہ افسانوں کے قاری موجود تھے۔ بلند معیار کے متعدد افسانہ نگار ادب کے آسمان پر ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ راجندر سنگھ بیدی 1915ء میں پیدا ہوئے جدید افسانے کا آغاز بھی کم و بیش یہیں ہوا۔ راجندر سنگھ بیدی کی عمر کے ساتھ ساتھ افسانے کا فن بھی پروان چڑھتا رہا۔ جب راجندر سنگھ بیدی جوان ہوئے اور افسانے تخلیق کرنے لگے تو افسانے کا فن بھی اپنے عنفوان شباب پر تھا۔ راجندر سنگھ بیدی کو افسانہ نگاری کے لئے نہایت سازگار ماحول ملا۔ را جندر سنگھ بیدی نے اردو زبان وادب کی خدمات کو اپنے شوق کے ساتھ ساتھ روزی کا ذریعہ بھی بنا دیا۔ راجندر سنگھ بیدی نے فلمی دنیا میں بھی اردو زبان وادب کے معیار کو قائم رکھا۔ انھوں نے کئی فلموں کے لئے مکالمے تحریر کئے۔ منظر نویس بھی رہے اور فلم کے لئے ہدایت کاری بھی کی۔ ڈرامے بھی تخلیق کئے اور ناول بھی تخلیق کیا اور ساتھ ہی افسانے بھی تخلیق کرتے رہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے پچاس سے زائد برسوں تک اردو زبان وادب کی خدمت کی جس کے عوض انھیں، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے' ایک چادر میلی سی'، افسانہ' مہارانی کا تحفہ' کے لئے ادبی دنیا (لاہور) سال کا بہترین افسانہ کا انعام، فلم 'ستیہ کام' میں بہترین مکالمہ نگاری کا فلم فیئر ایوارڈ، فلم' مدھومتی' کے لئے بہترین مکالمہ نگاری کا فلم فیئر ایوارڈ اور ادب و تعلیم کے لئے پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ راجندر سنگھ بیدی نے (63) افسانے ایسے تخلیق کئے جو افسانوی مجموعوں کی صورت میں موجود ہیں اور (7) افسانے ایسے بھی تخلیق کئے جو ان افسانوی مجموعوں میں نہیں ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقات کو اختصار کے ساتھ اس طرح تحریر میں لایا گیا ہے۔

❖ **افسانوی مجموعے**

- **"دانہ ودام"۔1936ء(لاہور)**
- **" گرہن"۔1942(لاہور)**
- **"کوکھ جلی۔ 1949" (ممبئی)**
- **" اپنے دکھ مجھے دے دو" ۔1965۔(دہلی)**
- **"ہاتھ ہمارے قلم ہوئے۔1974۔(دہلی)**
- **" مکتی بودھ" ۔1982(دہلی)**

❖ **ڈراموں کے مجموعے**

- "بے جان چیزیں"۔1943(لاہور)
- " سات کھیل"۔1946 (لاہور)

❖ ناول:

- "ایک چادر میلی سی"

❖ فلم اسکرپٹ

- "دستک"۔1971،(دہلی) دیوناگری رسم الخط میں

Scanned with OKEN Scanner

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں سادگی کے ساتھ نفسیاتی عمل اور جذبات نگاری ملتی ہے۔ تشبیہات، استعارات اور علامات سے نہایت چابکدستی سے راجندر سنگھ بیدی نے کام لیا ہے۔ رابندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں زندگی کے چھوٹے بڑے واقعات کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے اکثر کردار متوسط طبقے کے ہیں۔ عام انسانوں کے دکھوں، غموں، مجبوریوں اور لاچاریوں کو راجندر سنگھ بیدی نے افسانوی شکل وصورت عطا کی ہے۔ اور اس کام میں انھوں نے اچھی مہارت دکھائی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی، منشی پریم چند اور سعادت حسن منٹو کی طرح بہترین حقیقت نگار تھے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری کے حوالے سے سنبل نگار نے اپنی تصنیف میں ایک جگہ تحریر کیا ہے:

"حقیقت نگاری بیدی کے افسانوں کی نہایت نمایاں خصوصیت ہے۔ چیخوف کا فن انھیں اس لیے عزیز ہے کہ " اس کے یہاں افسانہ کہنے کی کوشش کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ وہ زندگی کی باتیں کرتا ہے اور زندگی کا ایک ٹکڑا یوں آپ کے سامنے رکھتا ہے کہ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

(اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔ سنبل نگار۔ 2001۔ مطبع: ایم کے آفیسٹ پرنٹرس، دہلی، صفحہ نمبر 171)

راجندر سنگھ بیدی کو اردو افسانے کا چیخوف تسلیم کیا گیا ہے۔ عام انسانوں کی زندگی کا قریب سے راجندر سنگھ بیدی نے نہایت باریکی سے مشاہدہ کیا ہے اس کا اندازہ ہمیں ان کے افسانے پڑھ کر ہو جاتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ' بھولا' بچوں کی نفسیات، جذبات اور معصومیت کی پیش کش کی عمدہ مثال ہے۔ افسانہ ' بھولا' راجندر سنگھ بیدی کے شاہکار افسانوں میں شامل ہے۔ اس افسانے میں ایک چھوٹے بچے کی محبت اور دردمندی کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں 'بھولا' ایک معصوم بچے کا کردار ہے جسے مرکزیت دی گئی ہے، ایک بوڑھے کا کردار ہے جو بھولا کا دادا ہے، ایک اور کردار ہے بوڑھے کی بہو کا جس کا شوہر یعنی بھولا کا باپ اور بوڑھے کا بیٹا انتقال کر چکا ہے۔ بوڑھا روشن خیال ہے وہ اپنی بہو کو منحوس نہیں سمجھتا اور اپنی بیٹی کی طرح اسے گھر میں ساتھ ہی رکھتا ہے۔ ایک اور کردار بھولا کے ماما کا ہے۔ بھولا اپنی ماں کا چہیتا ہے۔ بھولا کو کہانیاں سننے کا شوق ہے۔ راکھی کا تہوار نزدیک ہوتا ہے بھولا کی ماں مایا اپنے بھائی کے لئے مکھن جمع کرتی ہے۔ بھولا اپنے دادا کو کہانی سنانے کے لئے ضد کرتا ہے۔ دادا اپنے پوتے کی بات ٹالنے کے لئے کہتے ہیں کہ دن میں کہانی سنانے پر مسافر اپنا راستہ بھول جاتے ہیں۔ یہ بات بھولا کے دل میں گھر کر جاتی ہے، جب اس کے ماما کافی دیر کے بعد بھی گھر نہیں آتے تو وہ ماما کی تلاش میں نکل جاتا ہے اس کے غائب ہو جانے سے گھر کے تمام لوگ فکر مند ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بھولا ماما کو لیے گھر پہنچ جاتا ہے اور افسانہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ افسانے میں کوئی خاص تجسس اور نقطہ عروج نہیں ہے لیکن اپنی سادگی، جذبات نگاری اور زبان و بیان سے افسانہ شاہکار بن گیا ہے اور یہی راجندر سنگھ بیدی کا کمال ہے۔

کتابیات

1) مکتی بودھ۔ رابندر سنگھ بیدی۔ 2011
2) اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔ سنبل نگار۔ 2001
3) عکس ادب (اردو) سہ ماہی، اورنگ آباد۔ جولائی تا ستمبر 2016
4) جدید اردو افسانہ (تنقید) ۔ شہزاد منظر۔ 1982

Scanned with OKEN Scanner

5) اردوافسانہ۔پروفیسر ابن کنول۔2011
6) دانہ ودام(افسانوی مجموعہ) - راجندر سنگھ بیدی۔1936ء
7) گرہن(افسانوی مجموعہ) راجندر سنگھ بیدی۔1912ء
8) کوکھ جلی(افسانوی مجموعہ) راجندر سنگھ بیدی۔1949
9) اپنے دکھ مجھے دے دو(افسانوی مجموعہ) راجندر سنگھ بیدی راجندر سنگھ بیدی۔ 1965
10) ہاتھ ہمارے قلم ہوئے(افسانوی مجموعہ) راجندر سنگھ بیدی۔1974
11) پرواز ادب،فروری تا جولائی 1981
12) راجندر سنگھ بیدی شخصیت و فن۔جگدیش چندر 1992ء
13) راجندر سنگھ بیدی ایک سماجی و تہذیبی مطالعہ ۔ڈاکٹر سید محمود کاظمی۔راجندر سنگھ بیدی۔وارث علوی۔1989

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

پروفیسر عبدالقادر فاروقی کی ادبی واصلاحی تحریریں

ڈاکٹر سید علیم اللہ حسینی
صدر شعبۂ اُردو، انجمن ڈگری کالج بیجاپور

تلخیص: بہمنی سلطنت کے بعد دکن میں جو آزاد ریاستیں وجود میں آئی تھیں ان میں گولکنڈہ کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ اہمیت ان معنوں میں کہ ہر دور یاستوں میں بیک وقت دکنی زبان وادب کے فروح میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس زبان کے فروغ کے لیے بادشاہوں نے نہ صرف سرپرستی کی بلکہ خود بھی شعر وادب کے خالق رہے ہیں۔ گولکنڈہ میں قلی قطب شاہ اور بیجاپور میں علی عادل شاہ ثانی کو صاحب دیوان ہونے کا مرتبہ حاصل ہے۔ چونکہ ہم یہاں بیجاپور سے متعلق علمی، ادبی اور مذہبی خدمات کا جائزہ ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کی تحریروں کے آئینے میں لے رہے ہیں اس لیے گولکنڈہ کی علمی وادبی خدمات کو زیر بحث لانا نہیں چاہتے۔ اہل بیجاپور یہاں کی علمی وادبی اور تاریخی اہمیت سے بہت زیادہ واقف ہیں۔ دکنی زبان وادب کا نہ صرف مرکز رہا ہے بلکہ بیجاپور دکن میں مسلمانوں کی مذہبی اور رواداری کے لحاظ سے بھی کافی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہاں کے علم وادب سے متعلق بے شمار مضامین لکھے جاچکے ہیں۔ دکنی زبان کے ساتھ یہاں کی شاعری کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کا ماحول ادبی ہوتے ہوئے بھی مذہبی اور اخلاقی روایات کا پاسدار اور امین رہا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی قلمرو میں شامل ہونے کے بعد بیجاپور کی علمی محفلیں یقیناً اجڑ چکی تھیں لیکن مذہب اور اخلاق بیجاپور کی عوام کے دلوں کی دھڑکن بن کر زندہ تابندہ رہا ہے۔ بیجاپور زمانے کے نشیب وفراز سے مسلسل دوچار رہا۔ علمی محفلیں ماند پڑ گئیں کسی حد تک لوگوں میں مایوسی اور نامرادی کے اثرات بھی مرتب ہوئے لیکن انگریزوں کے قلمرو میں شامل ہونے کے بعد اور پھر پڑوسی ریاست حیدرآباد دکن کی علمی وادبی اثرات سے یہاں دوبارہ زندگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ آزادی کے بعد بیجاپور نے جیسے ایک طویل انگڑائی لے کر اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بیجاپور میں اردو کے سرکاری مدارس کے ساتھ ساتھ کالجوں کا قیام بھی یہاں کی اردو عوام کے لیے نعمت سے کم نہیں تھا۔ بیجاپور میں سمی کیاب کالج اور انجمن سائنس، آرٹس اور کامرس کالج نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے متوالوں کے لیے نئی روشنی فراہم کی۔ خصوصاً انجمن سائنس، آرٹس، اور کامرس کالج نے طلباء کی علمی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے، علمی ذوق پیدا کرنے کے لیے قابل ترین اساتذہ کا تقرر بھی عمل میں لایا۔

کلیدی الفاظ: پروفیسر، عبدالقادر، فاروقی، کی، ادبی واصلاحی، تحریریں، صوفیانہ شاعری، ادبی واصلاحی تحریریں، علم ومذہبی روایتوں کا امین، مقیق، ذہنی و فکری سفر، بیجاپور کے سپوت کی فکر، ہمہ ذہت شخصیت

سرزمین بیجاپور کی مشہور ومعاروف شخصیت جنہوں نے ادبی میدان میں شہرت حاصل کی میری مراد پروفیسر عبدالقادر فاروقی سے ہے۔ جن کا تعلق انجمن آرٹس، سائنس اور کامرس کالج سے ہے یہاں کے تمام اساتذہ کا تذکرہ مقصود نہیں ہے۔ ہمارے پیش نظر عبدالقادر کی تصانیف کا مطالعہ ان کی فکر اور بہ حیثیت استاد طلباء کی رہنمائی کی نشاندہی کرتا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر دفاروقی کالج ہذا کے صدر شعبہ اردو وفارسی اور عربی کی صدارت پر فائز تھے۔ ۲۹۹۱ء میں وہ امریکہ منتقل ہوئے، یہاں وہ نامساعد حالات سے دوچار بھی ہوئے لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ گرم دم جستجو کے سہارے

Scanned with OKEN Scanner

اپنے وجود کو برقرار رکھنے کا حوصلہ بھی پایااور سلیقہ بھی،جو علمی پیاس بیجاپور کے دورانِ ملازمت تشنگی کا شدید احساس دلاتی رہی تھی وہ امریکہ پہنچ کر سیراب بھی ہوتی نظر آتی ہے۔ان کا تحقیقی مقالہ ''اردو شاعری اور تصوف،تاریخی و تنقیدی جائزہ'' کا مطالعہ ہمیں احساس دلاتا ہے کہ بیجاپور کی کھوئی ہو ئی علمی وادبی روایات کا امین بن کر عنوان پر دنیا کے مختلف مذاہب میں اس کی حیثیت اور حقیقت کو تسلیم کرنااور اردو زبان کے شعراء کی اور خاص طور پر غزلوں میں متصوفانہ شاعری کی کھوج کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے تصوف اور اس عہد کے مزاج اور مذاق کو سمجھنے کے لیے انھوں نے نہ صرف اسلامیات کا مطالعہ کیا بلکہ قرآن مجید کا بھی مختلف عنوانات کے تحت بغور مطالعہ کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں تصوف کو مختلف ناموں کے سہارے اہمیت حاصل ہے بلکہ ان تمام مذاہب میں زندگی اور روح کے لیے ایک اطمینان اور سکون کا ذریعہ بھی فراہم کرتا ہے۔سماج اور عبدالقادر فاروقی نے تفصیل سے کی ہے۔عبدالقادر فاروقی لکھتے ہیں:

''کبیر کی زبان میں صوفیانہ لذت گونگے کا ذائقہ ہے جس کو بیان کرنے کے بجائے وہ صرف اشاروں سے ظاہر کرتا ہے۔گونگے آدمی کو مانند صوفی صرف اشارہ کر دیتا ہے۔یہی اشارے شاعری ہے جو تصوف کی زبان کہلاتی ہے۔''

(ص:18)

عبدالقادر فاروقی مزید لکھتے ہیں کہ:

''اردو شاعری میں تصوف کی روایات بہت قدیم ہے اس میں شنکر آچاریہ کے ویدانتی تصوف اور اسلامی تصوف کے نظریات اور عقائد کی گہری چھاپ ملتی ہے۔''

(ص: 8)

عبدالقادر فاروقی نے ایک اہم بات اپنے مقالے میں بیان کی ہے:

''اردو کے بہت سے شعراء متصوفانہ شاعری کرتے رہے ہیں لیکن وہ تمام کے تمام صوفی نہیں تھے چونکہ برصغیر میں تصوف کا چلن تمام تھا اس لیے ان کی شاعری میں متصوفانہ اثرات داخل ہو گئے تھے۔''

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''تصوف کی فلسفیانہ بنیادوں کو سمجھے بغیر ہماری شاعری کے سماجی مفہوم تک رسائی ممکن نہیں،غرض تصوف نے اردو شاعری کا ذہنی پس منظر بنانے میں کافی حصہ لیا ہے اور تصوف کی اصطلاحیں اس کی قدریں اور تصورات تیزی سے اردو شاعری میں منتقل ہونے لگیں۔حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو صوفی نہیں تھے برائے شعر گفتن خوب است کہہ کر تصوف کو اختیار کرنے لگے۔اشعار میں فیشن کے طور پر داخل ہو گیا تھا۔''

(ص:9)

اس مقالے میں صوفیانہ شاعری کی دکنی زبان سے لیکر اقبال اور جگر مرادآبادی تک کے شعرا کا کلام انھوں نے نہ صرف جائزہ لیا بلکہ مناسب اشعار بھی بڑے سلیقے سے پیش کرتے رہے ہیں وہ تمام اشعار عنوانات کے تحت زیر بحث آئے ہیں۔خاص طور پر غالب کے اس شعر کو اہمیت دیتے ہیں۔ مثلاً:

جب کہ تجھ بن کچھ نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
نہ تھا کچھ تو خدا تھا

Scanned with OKEN Scanner

کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبو یا مجھ کو ہو نے نے
نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جاتا
درد کا حد سے گزرنا دوا ہوجانا

اسی طرح ڈاکٹر فاروقی نے بہت سے شعراء کے کلام کو یکجا کر دیا ہے۔ یقیناشاعری میں تصوف کی تلاش کرنے والے تحقیقی طلباء کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں۔

ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کی دیگر کتابوں میں مضامین فاروقی مینارادب، اعجاز اور خون جلتارہا کے اہم مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کی کتابوں کے تمام مضامین نیویارک امریکہ کے تمام اخبارات جن میں خاص طور پر ''آزاد عام''، ایشاء، ماہنامہ انکشاف قابل ذکر ہیں۔ ان کے تقریباً تمام مضامین کا تعلق قرآن فہمی اور عظمت مصطفی کی تعبیر و تشریح سے متعلق تفصیلات فراہم کرتے ہیں اس کے علاوہ اخلاقیات اور کردار سازی کے متعلق بھی ان کے مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ ان کے مضامین کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک علمی و مذہبی گھرانے کے چشم وچراغ ہیں۔ ان کے مضامین میں یوں توہر مضمون معلومات فراہم کرتا ہے لیکن خاص طور پر کچھ ایسے مضامین ہیں جو مسلمانوں کی زندگی کے لیے رہنمائی کا کام کرتی ہیں۔ مسلمانوں کی اخلاق سازی، گھریلو زندگی، آپسی رشتہ داری، احکام الٰہی سے وفاداری، والدین اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک جیسے موضوعات مسلمانوں کی زندگی کو سہارا دینے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر یہ مضامین ''عظمت والدین، قرآن عظیم''، ''اولاد نعمت'' اور ''امانت الٰہی'' آدمی انسان اور مذہب، عالم عابد اور عارف، علم اور اخلاق، عورت اور خوبصورتی، عورت اور تعلیم، عورت اور لباس، عورت کیا ہے، انسان کی مہلک بیماری کینہ اور حسد موجودہ مسلم معاشرے کے لیے توشنی فراہم کرتے ہیں۔ ہم جس معاشرے میں جی رہے ہیں اس معاشرے میں والدین کا جو مقام اور مرتبہ فراہم کیا ہے وہ انتہائی قابل افسوس ہے۔ پروفیسر فاروقی نے قرآن مجید کے مختلف حوالوں سے اپنے قاری کے لیے یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ والدین کے ساتھ کسی طرح کا سلوک روا رکھا جائے۔ آج کل اولاد اپنے ضعیف والدین کو اپنی زندگی کے لیے بوجھ سمجھتی ہے اس ضمن میں قرآن مجید سے بہت سی آیتیں ثبوت کے طور پر فراہم کی ہیں۔ مثلاً سورہئ بقر کی آیت نمبر 215 کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ والدین کے ساتھ کس طرح کا رویہ اختیار کرنا چاہیے اس ضمن میں ڈاکٹر فاروقی نے سورہئ احقاق کی آیت نمبر 15، 16، سورہئ بقر کی آیت نمبر 185، سورہئ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 23، 24، سورہئ انعام کی آیت نمبر 151، سورہئ نساء کی آیت نمبر 36، سورہئ بقر کی آیت نمبر 85، سورہئ نساء کی آیت نمبر 25 کے حوالوں کے ذریعہ سے والدین کی عظمت اور اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ اسی طرح عورت کی اہمیت اور اس کے مساویانہ حقوق کے تعلق سے بہت سی آیتوں کے حوالے بھی فراہم کیے ہیں۔ ان کے تمام مضامین کے مطالعے سے ان کی دینی اور مذہبی فکر کے ساتھ ساتھ مسلم معاشرے کے تئیں ان کی ذمہ داری کا احساس بھی معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ عہد میں بہت کم ایسے اساتذہ ہیں جو مسلم معاشرے کی بیماریوں کی نشاندہی کر کے اس کا علاج بھی فراہم کرتے ہیں۔ یقیناڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کا یہ علمی کام لائق تحسین ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

ان کے ادبی مضامین کا مجموعہ مینارادب خالص ادبی مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین بھی نیویارک کے اردو اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ان میں خاص طور پر اردو ٹائمز عبدالقادر فاروقی نہ صرف قرآن فہمی اور مسلم معاشرے کی صحیح تعمیر و تشکیل پر زور دیتے ہیں بلکہ اردو ادب کے جوہر شناسی کے ذریعہ ایسی شخصیتوں پر قلم اُٹھاتے ہیں جو ان کی فکر سے مماثلت رکھتے ہیں مثلاً سر سید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی وغیرہ جیسے علماء ادب کا بڑے ادب و احترام سے تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ اس طویل مضمون کے مطالعے سے اتنا تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کا ذہنی و فکری سفر صالح بنیادوں پر جاری رہا، یقیناڈاکٹر فاروقی نے اپنی کتابوں میں صالح جذبات کی نشاندہی کی ہے۔

فاروقی بیجاپور کی قدیم علمی اور مذہبی روایتوں کے امین بن کر اُبھرے ہیں۔ طلبا اور محققین کا یہ فرض ہے کہ بیجاپور کے سپوت کی فکر کو اپنی تحقیق کا مرکز بنائیں اور اپنے حلقہ احباب کے علاوہ کرناٹک میں ان کے اس کام کی پذیرائی کے لیے جامع کوشش کرتے رہیں۔

بہر حال فاروقی ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے، ان کے حالات زندگی اور بے شمار عوامی خدمات کو چند سطور یا چند صفحات میں مقید کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے، فاروقی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جن پر طویل ترین تصنیف تیار کی جاسکتی ہے۔ خداوندے قدوس اس قابلہ قدر متحرک رہنے والی شخصیت کو ہمیشہ صحت کامل عطا فرمائیں اور ہمارے درمیان رہ کر مسلسل خدمت خلق کرنے کی سعادت نصیب فرمائیں۔ بقول شاعر:

مدتوں کی پیکرِ خاموشیوں کو توڑ کر
ذہن کے زنداں سے نکلا ہے کوئی خیال
چھین لو اب وقت کے اندھے مورخ سے قلم
ایک نئی تاریخ لکھنے آگیا ہے فاروقی

کتابیات:

1) اعجاز — پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی
2) ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی حیات وجہات — سلطان اختر سولاپور
3) اُردو شاعری اور تصوف — پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی
4) عبدالقادر فاروقی منفرد و فنکار و دانشور — نثار احمد صدیقی
5) امریکہ میں گلزار اردو ادب — پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

غبار خاطر ایک مطالعہ

ڈاکٹر نازیہ چنے گاؤں
شعبۂ اُردو انجمن ڈگری کالج وجئے پور

تلخیص: مولانا آزاد کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں مکاتیب ابوالکلام آزاد، نقش آزاد، برکات آزاد، کاروان خیال اور غبار خاطر خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ شہرت غیار خاطر کے حصے میں آئی۔

غبار خاطر مولانا آزاد کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو 1942ء اور 1945ء کے درمیان زمانہ اسیری میں لکھے گئے مولانا آزاد کی زندگی کا بڑا حصّہ قید و بند میں گزرا مگر اس بار قلعہ احمد نگر کی یہ اسیری ہر بار سے زیادہ سخت تھی کیونکہ اس بار نہ کسی سے ملاقات کی اجازت تھی نہ کسی سے خط و کتابت کرنے کی اس لیے مولانا آزاد نے دل کا غبار نکالنے کا یک راستہ ڈھونڈ نکالا اپنے ایک قدیم دوست مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی کے نام خط لکھ کر رکھتے رہے جیل سے رہا ہوئے تو یہ خطوط غبارِ خاطر کے نام سے چھپوا کر انہیں بھیج دئے گئے۔ یہ خطوط ہیں یا انشائیے سوال بار بار دہرایا گیا ہے اور واقعی یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ان خطوط کو کس خانے میں رکھا جائے غبار خاطر میں بعض خطوط ایسے ہیں جو کسی سنجیدہ موضوع پر سنجیدہ انداز میں لکھے گئے۔ جیسے موسیقی اور باغبانی پر کیونکہ مولانا آزاد حسن پرست تھے پھولوں سے انہیں بے حد پیار تھا غبار خاطر کا ایک خط اس چمن کے بارے میں ہے جو انہوں نے قلعے میں راستہ کر لیا تھا موسیقی سے انہیں خاص شغف تھا۔ ایسے ماحول کے پروردہ تھے جہاں موسیقی کا گزر نہ تھا مگر انہوں نے ستار بجانے کی مشق کی ایک زمانے میں ان کا معمول رہا کہ رات کو ستار لے کر تاج محل چلے جاتے اور چھت پر جمنا کے رُخ بیٹھ جاتے پھر جوں ہی چاندنی پھیلنے لگتی ستار پر کوئی گیت چھیڑ دیتے مولانا کو موسیقی سے روحانی لگاؤ تھا۔

کلیدی الفاظ : غبار خاطر، ایک، مطالعہ، انشائیہ کا انداز، مکتوب الیہ، غبار خاطر کی اہمیت، فلسفیانہ افکار، فارسی آمیز علمی زبان

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے عہد کے ایک ممتاز نثر نگار تھے انہوں نے اُردو ادب کے مختلف موضوعات پر تبع آزمائی کی ہے وہ صاحب طرز ادیب ہیں اور اُردو نثر میں وہ طرز نو کے بانی ہیں۔

غبار خاطر کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

ایک عظیم دانشور، مفکر عالم، صاحب طرز ادیب، بے باک صحافی، مذہبی رہنما کی حیثیت سے مولانا آزاد کی شخصیت مستحکم ہے ان کی تحریروں سے ان کی شخصیت کے مختلف رنگ جلوہ گر ہیں۔ بقول اجمل خاں:

"مولانا آزاد کی زندگی مختلف حیثیتوں میں بٹی ہوئی ہے وہ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں مصنف بھی ہیں مقرر بھی ہیں مفکر بھی ہیں فلسفی بھی ہیں اور ادیب بھی ہیں مدبر بھی ہیں اور ساتھ ہی سیاسی جدوجہد کے میدان کے سپہ سالار بھی ہیں۔"

"میں زندگی میں ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا آواز خوش میرے لئے زندگی کا سہارا خواہشوں کا مدار اور غم دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔"

Scanned with OKEN Scanner

یہاں انشائیہ کا انداز غالب ہے اس لیے بعض اہل نظر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مولانا آزاد نے مضمون لکھے انشائیے تحریر کیے اور انہیں خط کی شکل دینے کے لیے ہر خط کے شروع میں صدیق مگر لقب ٹانک دیا آخر میں دستخط فرمادیتے ابوالکلام اور یہ خط بن گئے۔

اس دعوے کے ثبوت میں ایک دلیل یہ بھی دی جاسکتی ہے کہ خط وہ ہوتا ہے جس میں خط لکھنے والا بھی نظر آئے اور وہ بھی جسے خط لکھا جارہا ہے غالب کے خط پڑھیں تو مکتوب الیہ بھی صاف نظر آتا ہے کبھی اسے گدگدایا جارہا کبھی سوال وجواب ہورہے ہیں کہیں اس کے مسائل پر اظہار خیال ہورہا ہے مولانا آزاد کے خط ایک طرفہ ہیں۔ مطلب یہ کہ بس وہ اپنی بات کہے جارہے ہیں۔

ان خامیوں کے باوجود غبار خاطر کو خطوط کا مجموعہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کیونکہ بیشتر جگہ خط نگاری کی ہی فضا قائم رہی ہے۔ غالب کے خط پڑھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایک کرکے مکتوب نگار کے چہرے سے نقاب اترتے جارہے ہیں مگر مولانا آزاد اپنی شخصیت کو پردوں میں چھپاتے چلے جاتے ہیں البتہ ایک خط ایسا بھی ہے جس میں مولانا آزاد ہمیں اپنے غم میں شریک کرلیتے ہیں ان کی بیگم زلیخا سخت بیمار ہیں اخبار میں ان کی بیماری کی خبریں چھپ رہی ہیں مولانا آزاد کو بے چینی سے اخبار کا انتظار رہتا ہے۔ جیلر ہر روز اخبار لے کر سیدھا ان کے کمرے میں آتا ہے جیسے ہی اس کے دفتر سے نکلنے کی آہٹ سنائی دیتی ہے ان کا دل دھڑکنے لگتا ہے کہ خدا جانے آج اخبار میں زلیخا کے بارے میں کیا چھپا ہوگا لیکن وہ کسی طرح ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے کہ ان کا صبر و سکون برباد ہوچکا ہے لکھتے ہیں:

''میرے صوفے کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی اس لیے جب تک آدمی اندر آکر کھڑا نہ ہوجاتا میرا چہرا نہیں دیکھ سکتا جب جیلر آتا تھا میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا تھا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہوجاتا گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں میں اعتراف کرتا ہوں کہ ساری ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جس سے دماغ کا ایک مفروزانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کھیلتا رہتا تھا کہ کہیں اس کے دامن صبر و قرار پر بے حالی اور پریشاں خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔''

اور مولانا آزاد نے یہ دھبہ اس دن بھی نہ لگنے دیا جس دن زلیخا کی موت کی خبر اخبار میں شائع ہوئی انسانی کمزوری کا یہ اعتراف ہمیں مولانا آزاد کے کتنا نزدیک کردیتا ہے اور ہم ان سے کیسی اپنایت محسوس کرنے لگتے ہیں شخصیت کا اظہار مکاتیب میں بہر حال ہوتے رہتا ہے۔

مولانا آزاد کی زندگی کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں ہیں کہ ان خطوط میں نہ لکھی جاتیں تو شاید کسی طرح ہم تک نہ پہنچتیں ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا خاندان ایسا قدامت پرست تھا کہ باہر کی ہوا کا وہاں گزر بھی نہ تھا لکھتے ہیں:

''میری تعلیم ایسے ماحول میں ہوئی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا اور باہر کی مخالف ہواؤں کا وہاں تج گزر ہی نہ تھا۔ مگر وہ تقلید کی اس چار دیواری سے نکلے اور انھوں نے اپنا راستہ الگ بتایا۔''

انفرادیت مولانا آزاد کے مزاج میں داخل تھی روش عام سے ہٹ کر چلنا ساری زندگی ان کا معمول رہا ایک خط میں لکھتے ہیں:

''زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دنیا سے الٹی ہی چال میرے حصے میں آئی دنیا کے لئے سونے کا وقت سب سے بہتر ہوا وہی میرے لیے بیداری کی اصل پونجی ہوتی وہ یعنی دنیا جب جاگتی ہے تو میں سوتے رہتا ہوں جب سو جاتی ہے تو میں اُٹھ بیٹھتا ہوں ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا۔''

اور حقیقتاً اُن کا یہی مزاج تھا لوگ جیل خانے میں قید تنہائی کو ایک اذیت ناک سزا خیال کرتے ہیں مولانا آزاد اس تنہائی کو انعام سمجھتے تھے صبح سویرے اُٹھنا نازک اور ناگوار ہوتا ہے مولانا آزاد رات کے پچھلے پہر کو بیدار ہوجایا کرتے تھے۔

Scanned with OKEN Scanner

غبار خاطر کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ ابوالکلام آزاد کی زندگی کے بعض گوشوں پر روشنی ڈالتی ہے غبار خاطر کے مکالمے سے مولانا آزاد کے خیالات، افکار رجحانات اور دلچسپی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ غبار خاطر کا مطالعہ کیجئے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انہیں اُردو فارسی اور عربی کے کتنے شعر یاد تھے جس شخص نے ایسا ذہن پایا ہو وہ اپنی صلاحیت پر ناز کرے اور اس کے مزاج میں انانیت پیدا ہو جائے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں جیل میں طبعی معائنے کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''سرجن ہر شخص کا سینہ ٹھوک بجا کے دیکھتا رہا کہ کیا آواز نکلتی ہے معلوم نہیں پھیپھڑوں کی حالت معلوم کرنی چاہتا یا دلوں کی چھونے بھی معائنے کی درخواست کی میں نے کہا میرا سینہ دیکھنا بے سود ہے اگر دماغ کے دیکھنے کا کوئی آلہ ساتھ ہے تو کام میں لا دیتے۔''

فکر و فلسفہ ایک موج تہہ نشین کی طرح غبار خاطر کے ہر صفحے پر کار فرما ہے اور یہی مولانا کا مزاج ہے ہر وقت سوچنا اور مسلسل سوچنا۔ ساری زندگی مولانا آزاد کی عادت رہی غبار خاطر کے بعض خطوں پر تو فلسفہ پوری طرح حاوی ہے اور بعض خطوں میں اس کی ہلکی لہریں نظر آتی ہیں ایک خط میں خوشی کا فلسفہ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں:

''اصل خوشی کی نہیں دماغ کی خوشی ہے قید و بند میں بھی برقرار رہتی ہے کیونکہ قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔''

غبار خاطر مولانا ابوالکلام آزاد کے فلسفیانہ افکار سے لبریز ہے۔ غبار خاطر میں ہمیں کوئی ایک اسٹائل نہیں ملتا بلکہ مکتوبات کے موضوعات جدا جدا ہونے کی بنا پر طرز نگارش بھی جدا جدا اختیار کی ہے یہی وجہ ہے کہ ہماری ملاقات کہیں آسان اور عام فہم نثر سے ہوتی ہے تو کہیں شاعرانہ چاشنی کچھ اور ہی لطف دے جاتی ہے اور کہیں فارسی آمیز علمی زبان ہماری فہم و لیاقت کا امتحان لیتی نظر آتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے غبار خاطر کے کئی خطوط میں عام فہم زبان استعمال کی ہے مولانا اس زبان پر پوری قدرت رکھتے ہیں ایک اور خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوتی یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مر جایئے اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہے جس نے یہ مشکل حل کر لی اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا۔''

غبار خاطر کی دلکشی کا اصل راز اس کی طرز تحریر ہے تخلیق نثر کا یہ شاہکار صدیوں تک ناقدان ادب کو ہمیشہ اپنی جانب متوجہ کرتا رہے گا۔

کتابیات:

	کتاب کا نام	مصنف
۱)	غبارِ خاطر	مولانا ابوالکلام آزاد
۲)	غبار خاطر کی وضاحتی فرہنگ	محمد آدم
۳)	خطوط آزاد	مولانا ابوالکلام آزاد
۴)	ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش	عبدالمغنی

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

فنِ افسانہ نگاری اور ممتاز شیریں کی انفرادیت

ڈاکٹر محمد طالب

اے146 فلور کر سچن کالونی

پٹیل چیسٹ، دہلی یونیورسٹی دہلی۔

تلخیص: ممتاز شیریں اردو ادب کی ایک اہم شخصیت ہیں، جنہوں نے افسانہ نگاری میں اپنی انفرادیت اور فنی مہارت کی وجہ سے نمایاں مقام حاصل کیا۔ان کی افسانہ نگاری نہ صرف تخلیقی سطح پر بلند ہے بلکہ وہ اپنے افسانوں سماجی، نفسیاتی اور تہذیبی پہلوؤں کو بھی عمدگی سے اجاگر کرتے ہیں۔اُن کے افسانے عموماً زندگی کے گہرے مسائل، انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں اور عورت کے نفسیاتی و سماجی مسائل پر مبنی ہوتے ہیں۔ان کے افسانوں میں نسوانی جذبات کی عکاسی انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں کی گئی ہے۔اسلوب سادہ، دلکش اور روانی سے بھرپور ہے، جس کی وجہ سے قاری ان کے افسانوں میں کھو جاتا ہے۔زبان میں ادبی چاشنی اور جذبات کی شدت دونوں موجود ہیں۔

کلیدی الفاظ۔ معروف، تخلیقات، طبقات، پیچیدگی، نفسیات، ہمدردی، اہمیت، جذبات، شناخت، میلان، آئینہ، عمدہ، قابلیت، منفرد، ثقافت، مسائل،

ممتاز شیریں کو اردو ادب میں نمایاں مقام حاصل ہے وہ بہ ایک وقت افسانہ نگار، تنقید نوس، مترجم، اور مدیر تھیں انہوں نے اردو افسانہ نگاری اور تنقید نگاری میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ان کی پیدائش ۱۲ سے ستمبر ۱۹۲٤ کو میسور صوبہ کرناٹک میں ہوئی. ممتاز شیریں بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت کی مالک تھی جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ۱۳ برس کی عمر میں دسویں کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔اعلی تعلیم مہارانی کالج بنگلور سے حاصل کی ۱۹۶۱ میں ان کی شادی صمد شاہین سے ہوئی۔شادی کے بعد بھی اعلی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔یہ عبارت ان کی تعلیمی قابلیت ذہانت اور ادبی خدمات کو نمایاں کرتی ہے۔ممتاز شیریں ایک معروف افسانہ نگار تھی جنہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو ادب میں اہم مقام حاصل کیا، ان کا اسلوب بیان اپنے عہد کے افسانہ نگاروں سے منفرد ہے وہ اپنے افسانوں میں عموما انسانی جذبات سماجی کشمکش حقیقت نگاری اور ازدواجی زندگی کے مسائل جیسے موضوعات پر لکھتی ہیں۔ان کے افسانوں میں انسانی جذبات سماجی مسائل اور عورت کے کردار کو اہمیت دی جاتی ہے وہ نہ صرف فنی اعتبار سے عمدہ ہوتے ہیں بلکہ ان میں گہرے سماجی اور نفسیاتی پہلو بھی ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں معاشرتی حقیقتوں اور انسانی رویوں کا تجزیہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے جس سے قاری کی زندگی کی پیچیدگیوں پر غور کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور وہ اس کو نئے زاویوں سے سوچنے پر امادہ ہوتا ہے ممتاز شیری کی ادبی خدمات پر پروفیسر وہاب شرف نے لکھا ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

"ممتاز شیری اردو ادب کا ایک بہت ممتاز نام ہے اور آج بھی ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے ان کا پہلا افسانہ انگڑائی ہے جو ۱۹۴۴ میں شاقی دہلی میں چھپا۔"

ممتاز شیرین نے اپنے افسانوں میں خواتین کے مسائل کو کافی اہمیت دی ہے وہ عورتوں مختلف حالات اور تجربات کو بڑی گہری حساسیت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ جہاں عورت کے اندرونی کشمکش سماجی دباؤ اور ان کی آزادی کی جدوجہد کو دکھاتی ہیں تو وہیں ان کے جذباتی نفساتی حالات کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ افسانوں میں بہت سی سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی جہتوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ افسانوں کے مرکزی موضوعات انسان کی داخلی کشمکش، سماجی حقیقتیں، عورتوں کے مسائل اور ان کی مشکلات ہیں۔ ان کے افسانوں میں افکار و نظریات درج ذیل پہلوؤں کی صورت میں دیکھنے کو ملتے ہیں:

۱. عورت کا مقام اور مسائل: ممتاز شیریں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی زندگی کی مختلف جہتوں کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ وہ عورت کے حقوق، اس کی جدوجہد اور سماج میں اس کے مقام کو اجاگر کرتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں عورت کو اپنی شناخت اور آزادی کی تلاش میں دکھایا گیا ہے۔ اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ وہ سماجی روایات، ازدواجی تعلقات، اور عورت کی ذاتی آزادی کی بات کرتی ہیں۔

۲ . نفسیاتی کشمکش: ممتاز شیریں کے افسانوں میں کرداروں کی داخلی کشمکش کو خاص طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان کے کردار اکثر اپنی ذات یا اپنے سماجی ماحول کے ساتھ توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو کہ انسانی فطرت اور نفسیات کو عیاں کرتا ہے۔

۳ . سماجی حقیقتیں: ان کے افسانے سماج کی تلخ حقیقتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ طبقاتی تفریق، معاشرتی نابرابری، اور انسانی جذبات کے پیچیدہ پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔

٤ . خودشناسی اور آزادی: ممتاز شیریں کے افسانوں میں خودشناسی اور آزادی کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان کے کردار اپنے مسائل اور سماجی دباؤ کے باوجود اپنی آزادی کی تلاش میں رہتے ہیں۔

٥ . دوسروں کی مدد اور ہمدردی: ان کے افسانوں میں انسانیت کے لیے ہمدردی، دوسروں کے لیے قربانی اور اجتماعی ذمہ داری جیسے افکار بھی ملتے ہیں۔ وہ انسانوں کی مدد اور ہمدردی کی اہمیت پر زور دیتی ہیں۔

٦ سماجی حقیقت پسندی: ممتاز شیریں اپنے افسانوں میں سماجی حقیقت پسندی کو اہمیت دیتی ہیں، اور ان کے افسانوں میں معاشرتی ناانصافی، غربت، اور محروم طبقات کی حالت کی عکاسی ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر، ممتاز شیریں کے افسانے نہ صرف جمالیاتی اعتبار سے اہم ہیں بلکہ ان میں معاشرتی اور نفسیاتی گہرائی بھی موجود ہے جو قارئین کو مختلف سطحوں پر سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ ممتاز شیریں کے افسانے صرف تفریح فراہم نہیں کرتے ہیں بلکہ اس میں نئے خیالات اور نظریات کی جڑیں بھی گہری کرتے ہیں۔

Scanned with OKEN Scanner

غرض یہ کہ ممتاز شیری کے افسانوں میں عورتوں کے مسائل اہم اور مرکزی موضوع کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں ان کے افسانے نہ صرف خواتین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ سماج میں عورت کو درپیش آنے والے مسائل کو حل کرنے کی ضرورت ہے ان کے یہاں عورت کے جذبات حقوق آزادی اور جدوجہد کی حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک نہایت ذہین اور بے باک خاتون تھیں۔ ان کے افسانوں میں تانیثیت کی احتجاج کی کئی صورتیں ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ممتاز شیریں کے تمام افسانوں میں کہیں نہ کہیں خواتین کے مسائل دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن افسانہ،، انگڑائی،، آہستہ، اور دیپک راگ، ایسے بے باک افسانے ہیں جس میں تانیثی فکر کو محض نسانی لہجے میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں کے نفسیاتی کائنات اور جنسی مسائل کو بڑے موثر انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ عورتوں کی حالت زار کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ جہاں وہ نہ صرف سماجی اور ثقافتی دباؤ کا شکار ہوتی ہیں بلکہ اپنے ذاتی حقوق کے لیے بھی جدوجہد کرتی ہیں ان کے افسانوں میں عورتوں کے آزادی تعلیم اور معاشرتی حیثیت پر زور دیا گیا ہے وہ عورتوں کی نفسیات اور جذبات کی پیچیدگیوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرتی ہیں انہوں نے عورتوں کی تعلیم مسئلے پر وار کیا ہے جب مذہب کے ٹھیکے داروں نے عورتوں کی تعلیم پر پابندی عائد کر دی تھی اس ماحول میں ممتاز شیریں نے خود اعلی تعلیم حاصل کی اور، آئینہ، جیسا افسانہ لکھا جس کی اشاعت کے فورا بعد مسلم معاشرے میں ایک بھوچال آگیا تھا۔

> ”اناتم مصیبت زدہ تھی مگر دنیا کو تم سے ہمدردی نہ تھی امی ابا کو بھی نہیں۔ کہنے گوان کے گھر میں تم اتنا کام کرتی تھی آخر کیوں؟ اگر تمہارے چہرے پر تمہارے دلی دکھ کا ذرا بھی اظہار ہوتا تو شاید لوگوں کو تم سے ہمدردی ہوتی۔ مگر تم یوں دکھائی دیتی تھی گویا تم میں جذبات ہی نہیں ایک پتھر کی مورت سی۔۔۔۔۔،،
>
> اپنی نگریہ ممتاز شیری مکتب جدید لاہور صفحہ ۲۲

ویسے تو ان کا پہلا افسانہ، انگڑائی، ہے جس کو شائع ہونے کے بعد عوام میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی اس کہانی میں انہوں نے نفسیات کے ایسے پہلو اجاگر کیے ہیں جو ہم جنس سے متعلق ہیں۔ ہم جنسی موضوعات پر لکھا گیا افسانہ، انگڑائی، ان کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے ویسے تو اردو ادب میں میلان اور ہم جنسی موضوع پر بہت سے افسانے لکھے گئے لیکن ممتاز شیریں یہ افسانہ اس لیے منفرد ہے کہ ان کا بنیادی موضوع ہی میلان اور ہم جنس ہے جبکہ دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں میلان اور ہم جنس کی صورت میں جسمانی گناہ دیکھنے کو ملتا ہے لیکن شیری کے افسانے میں یہ میلان محض جذباتی لگاؤ تک ہی دیکھنے کو ملتا ہے اس بیماری میں مبتلا یا تو گھر کی چار دیواری میں قید شادی شدہ عورتیں ہوتی ہیں یا وہ عورتیں جن ہیں جن کے شوہر ان کے فرائض انجام نہیں دیتے ایک اور صورت ہوتی ہے وہ لڑکیاں جو پردے کے سخت ماحول میں پرورش پاتی ہیں یا پھر وہ لڑکیاں جو جوان ہونے کے بعد پہلی بار ان کے اندر جنسی خواہشات پیدا ہوتی ہے لیکن ان کی یہ خواہش سماج اور غیرت کے نام پر کچل دی جاتی ہے اس کہانی کا مرکزی کردار گلنار ہے جو چھوٹی عمر میں انتہائی ذہین شوخ اور چنچل ہے اس کی معصوم محبت کا باب اپنی ہی ہم جنس ٹیچر مس فنانس کے ساتھ کھل جاتا ہے لیکن اس کی تشنگی پوری نہیں ہوتی۔ بعد میں ایک متحرک کن محبت کا روپ سامنے آتا ہے گلنار کی شادی جلد ہی پرویز نامی نوجوان سے شادی ہونے کے بعد اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی

Scanned with OKEN Scanner

ہے یہی انقلابی اور نازک تبدیلی ہی افسانہ، انگڑائی، کا اہم موڑ ہوتی ہے گلنار اپنی ٹیچر فنانس سے کس حد تک محبت کرتی ہے شیری افسانہ، انگڑائی، میں لکھتی ہیں۔

"میں پہلے تو اس کے سامنے یوں ہی شرمایا کرتی تھی جب وہ کہیں نکلتی تو میں بھاگ کر کہیں جا چھپتی وہ میری طرف دیکھتی تو دونوں ہاتھوں سے منہ چھپاتی گو دل یہی چاہتا ہے وہ یوں ہی دیکھتی رہیں عجیب لڑکی تھی کچھ سال پہلے رفتہ رفتہ میں ان سے کھل کر باتیں کرنے لگی تھی پھر بھی جب کبھی ان سے اچانک مڈ بھیڑ ہو جاتی تو میری بدحواسی نہ پوچھیے وہ دن بھی کیا دن تھے ان کا گھنٹہ نہ ہوتا وہ دن کس قدر منحوص دکھائی دیتا تھا۔ ہاں میں ان پر مرتی تھی انہیں دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی اور لڑکیاں کیسے مجھے تنگ کرتی تھیں،، افسانہ انگڑائی ممتاز شیری مشمولہ بعد رفت کا ممتاشیری صفحہ ۵۹

ممتاز شیری کہ اکثر افسانوں خوشگوار ازدواجی زندگی کی کہانی دیکھنے کو ملتی ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ ازدواجی زندگی اور نفسیات اور جنسی معاملات ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بہت سی کہانیاں ہیں جو سیاسی سماجی اور طبقاتی فرق کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثلاً، شکست، اور، رانی، جیسے افسانوں میں یہ مسائل دیکھے جا سکتے ہیں۔ افسانہ، اندھرے میں چراغ، میں ہسپتالوں میں مریضوں کے ساتھ طبقاتی سلوک ہوتا ہے اس درد کو بہترین نہایت بہترین انداز میں بیان کیا ہے مثال کے طور پر وہ افسانے میں لکھتی ہیں۔

"یہ المیہ میں نے اپنی انکھوں سے دیکھا ہے جب میں خود ماں بنی تھی ہسپتال میں ایک مستقل وارڈ میں بھی ایک دوسری ماں نے زندگی کی تخلیق نہیں کی تھی بلکہ ایک مردہ بچے کو جنم دیا تھا اور خود موت سے ہم کنار ہو گئی تھی۔،،

اس طرح وہ ہسپتالوں میں کس طرح سے ڈاکٹروں کی لاپرواہی کی وجہ سے عورتیں دم توڑ دیتی ہیں اس پر سوالیہ نشان قائم کرتی ہیں جبکہ ایک خواتین درد زہ کی تخلیق کو کس طرح برداشت کرتی ہے ایک عورت ہی جان سکتی ہے۔

ممتاز شیریں کے افسانوں میں رومانیت ایک اہم عنصر ہے، جسے وہ سماجی حقیقتوں اور انسانی جذبات کی گہری پیچیدگیوں کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومانوی تعلقات صرف محض محبت یا جذباتی تعلقات تک محدود نہیں ہوتے، بلکہ وہ انسانی فطرت، ذاتی خواہشات، اور سماجی دباؤ کے درمیان موجود تضاد کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔

رومانیت کا عنصر ان کے افسانوں میں ایک نظریہ کے طور پر بھی موجود ہے، جہاں افراد کی داخلی جدوجہد اور محبت کی تلاش ایک اہم موضوع بن کر ابھرتی ہے۔ ممتاز شیریں نے عورت کی محبت، خواہشات، اور اس کی نفسیات کو بہت ہی حساس انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے کردار نہ صرف رومانیت

Scanned with OKEN Scanner

سے جڑے ہوتے ہیں، بلکہ ان کے رومانوی تعلقات سماجی قید، طبقاتی فرق، اور ثقافتی معیارات کے اندر بھی پروان چڑھتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ممتاز شیریں کے کچھ افسانوں میں محبت کا اظہار صرف دو افراد کے درمیان نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک وسیع تر سماجی پس منظر میں ہوتا ہے، جہاں محبت کو ایک معاشرتی تحریک کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ رومانیت کو معاشرتی دباؤ کے خلاف آزادی کی علامت کے طور پر پیش کرتی ہیں، جس میں فرد اپنی محبت اور ذاتی خواہشات کو سامنے رکھ کر سماجی روایات کے ساتھ ٹکراجاتا ہے۔ یوں ممتاز شیریں کے افسانوں میں رومانیت ایک نفسیاتی اور سماجی موضوع بن کر ابھرتی ہے جو انسان کے اندرونی اور بیرونی دنیا کے درمیان تعلقات پیدا کرتی ہیں۔ ممتاز شیریں کے افسانوں میں حقیقت نگاری ایک نمایاں پہلو ہے، جو ان کی تحریروں کی خصوصیت ہے۔ ان کے افسانے حقیقت کی گہرائیوں میں جاکر سماجی مسائل، فرد کی نفسیات اور انسانی جذبات کو بڑی حقیقت پسندی سے بیان کرتے ہیں۔ وہ عام زندگی کے معمولات اور معاشرتی حالات کو اپنی تحریروں میں پیش کرتی ہیں، اور ان میں کوئی مصنوعیت یا آرائشی انداز نہیں ہوتا۔ ان کی حقیقت نگاری میں معاشرتی حقیقتوں کو بغیر کسی آرائش کے پیش کیا جاتا ہے، جس میں معاشرتی و طبقاتی فرق، خواتین کی مشکلات، اور فرد کی داخلی کشمکش کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ ان کے افسانے عام لوگوں کی زندگیوں، ان کے دکھ درد، اور ان کی ذاتی جدوجہد کو اہمیت دیتے ہیں، جس سے ان کی تحریروں میں ایک سچی اور حقیقی دنیا کی جھلک ملتی ہے۔ اس حقیقت نگاری کے ساتھ ہی سماجی تنقید بھی پائی جاتی ہے جو معاشرتی دباؤ روایات اور جبر کی حقیقتوں کو سامنے لاتی ہیں وہ عورتوں کی حالت ان کے حقوق اور ان کے مسائل کو حیثیت کے ساتھ پیش کرتی ہیں ان کی تحریروں میں انسان کی زندگی کی سچائیاں کھل کر سامنے آتی ہیں ان کا مقصد صرف کہانی سنانا نہیں بلکہ انسانی حقیقت اور سماجی پیچیدگیوں کو کاری کے سامنے لانا ہوتا ہے وہ ان لوگوں کی کہانی بیان کرتی ہیں جو سماج میں نظر انداز کیے جاتے ہیں یا جن کی آواز دبادی جاتی ہے مثال کے طور پر عورتیں اور معاشرتی طور پر کمزور طبقہ ہوتا ہے۔ اس طرح ممتاز شیریں کے افسانوں میں حقیقت نگاری صرف کرداروں کی حیثیت نہیں بلکہ ان کے اس پاس کے سماجی ثقافتی اور نفسیاتی حقیقتوں کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے جو ان کی تحریروں کو خاص گہرائی اور سچائی عطا کرتی ہے ممتاز شیریں کے افسانوں کی حقیقت نگاری اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ وہ صرف تخیل کی دنیا میں نہیں بلکہ حقیقی دنیا کے مسائل اور معاشرتی حقیقتوں کو دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں، اور ان کی تحریروں میں انسان کی زندگی کی سچائیاں کھل کر سامنے آتی ہیں۔

ممتاز شیریں اردو ادب کی ایک اہم افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے انسانی اقدار و افکار کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں معاشرتی مسائل، انسانی جذبات، اور اخلاقی پہلوؤں کو گہرائی سے اجاگر کرتی ہیں۔ ممتاز شیریں کے افسانے نہ صرف فکری و جذباتی پہلوؤں پر مبنی ہوتے ہیں بلکہ وہ معاشرتی ناہمواریوں اور طبقاتی تقسیم کو بھی پیش کرتی ہیں۔

ان کے افسانوں میں انسانی قدریں جیسے محبت، قربانی، ہمدردی، اور انصاف نمایاں ہیں۔ وہ کرداروں کے ذریعے انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں جھانکتی ہیں اور ان کی تحریریں قارئین کو خود احتسابی کی دعوت دیتی ہیں۔ ان کے افسانے جدید دور کے مسائل، خاص طور پر عورت کے حقوق، سماجی آزادی، اور شناخت کی تلاش پر روشنی ڈالتے ہیں۔

Scanned with OKEN Scanner

ممتاز شیریں کا اسلوب سادہ مگر دلکش ہے، جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ان کی کہانیاں ایک منفرد فلسفیانہ رنگ رکھتی ہیں جو انسانی افکار کو مہمیز دیتی ہیں۔یوں،ان کے افسانے اردو ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں اور انسانی اقدار کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں فطرت کی عکاسی ویخاص اہمیت رکھتی ہے، جو ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور گہرے مشاہدے کا مظہر ہے۔ان کے افسانوں میں فطرت محض پس منظر کے طور پر استعمال نہیں ہوتی بلکہ وہ کہانی کے موضوع اور کرداروں کے جذبات کو اجاگر کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔۔ ممتاز شیریں نے فطرت کے مختلف عناصر جیسے موسم، درخت، پھول، چاندنی، اور سمندر کو اپنی کہانیوں میں نہایت مہارت سے استعمال کیا ہے۔یہ عناصر کرداروں کے احساسات، داخلی کشمکش، اور کہانی کے موڈ کو بیان کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر، کسی غمگیں منظر میں بادلوں کی گرج یا بارش کے ذریعے ماحول کو زیادہ اثر انگیز بنایا جاتا ہے، جبکہ خوشی یا سکون کے لمحات کو چاندنی رات یا کھلتے پھولوں سے جوڑا جاتا ہے۔

فطرت کی یہ عکاسی ان کے افسانوں میں علامتی انداز بھی اختیار کرتی ہے، جو کہانی کے موضوع کو مزید گہرائی فراہم کرتی ہے۔یوں ممتاز شیریں کی تحریروں میں فطرت نہ صرف جمالیاتی پہلو کو بڑھاتی ہے بلکہ انسانی جذبات اور زندگی کی حقیقتوں کو بھی منفرد انداز میں پیش کرتی ہے۔ان کے افسانوں میں عورت کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ اپنے افسانوں میں عورت کے حقوق ازادی اور خود مختاری کے حوالے سے گہرے سوال اٹھاتی ہیں وہ عورت کے سماجی اور گھریلو زندگی کی پیچیدیوں کو پیش کرتے ہوئے ان کے حقوق کی پامالی اور ان کی حق میں آواز بلند کرتی ہیں ان کے کردار اکثر معاصرتی روایتی اور مردانہ تسلط کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے نظر اتے ہیں ان کی نسوانی کرداروں کی بنیاد محض مشاہدے پر نہیں رکھی ہے بلکہ انہوں نے اپنے اوپر گزرے سچے واقعات کو کہانی میں بنا کر پیش کیا ہے۔ جس سے ایک عورت کی شدید احساسات اور جذبات سامنے آتے ہیں ہندوستان میں بہت سی ایسی عورتوں کا کردار سامنے اتا ہے جو گہوارے سے ڈولی اور ڈولی سے جنازے تک کا سفر بڑی تیزی سے طے کرتی ہیں تہذیب شرم ولحاظ اور پردے کے علاوہ شوہر پرستی کے عناصر اس طرح گرفت کرتے ہیں کہ وہ آگے نہیں نکل پاتے ان کے سامنے کچھ مسائل اور مصائب تو قدرتی ہوتے ہیں اور کچھ مردانہ سماج کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور کچھ اپنی معصومیت مظلومیت اور گہرے محبت میں سرشار ہو کر رنج کو خوشی میں بدلنے کی کوشش کرتی ہے۔ان کا ایک افسانہ دیپک راگ جس میں تانیثیت اور نسائی احتجاج کی ایک مدہم سی آواز سنائی دیتی ہے اس میں انہوں نے عورت اور مرد کے مختلف رشتوں کو افسانوی انداز میں پیش کیا ہے جہاں ایک طرف ممتاز، عزیز، زبیری اور جارج جیسے متضاد مرد کردار سامنے آتے ہیں تو دوسری جانب دور تھی کملا، چمپا، جمیلہ، کسم، برملا، جیسی لڑکیوں کے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔جو ایک دوسرے سے گہری مطابقت رکھتے ہیں۔یہ سبھی کردار جنسی رشتوں کی معلومات فراہم کرتے ہیں ممتاز شیری نے ان رشتوں میں محض جنسی لذت ہی نہیں بلکہ فکر وزدان تجربے زبان کہ ایسے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں جو افسانوں کو پر اثر بناتے ہیں مثلا۔

”تم سمجھتے ہو کہ ایسے ادمیوں کو سچی مسرت ملتی ہے ایک عارضی لذت وسعت مسرت اور سچی دلی بسرت
میں بہت فرق اور پھر وہ کبھی مطمئن نہیں ہوتے ایک گناہ سے دوسرے گناہ کی طرف بڑھتے چلے جاتے
ہیں لیکن ان کی پیاس ابھی نہیں بجتی تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے اور یہ تشنگی ان کی روح پر چھا جاتی ہے،،
ممتاز شیری اپنی نگریہ سے مخ ملیار تک ڈاکٹر علی احمد فاطمی صفحہ نمبر ۲۱۱

Scanned with OKEN Scanner

جنسی معاملات کے ساتھ سماجی ناانصافیوں پر بھی کافی زور دیا ہے ان کی کہانیوں میں معاشرتی غریبی طبقاتی فرق اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف ایک آواز بلند کی ہے ان کے کردار اکثر سماجی غیر مساوات کا سامنا کرتے ہیں۔ان کی تحریریں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ معاشرتی تبدیلی کی ضرورت ہے تاکہ ہر فرد کو برابری اور عزت مل سکے۔ان کے افسانوں میں رومانیت ایک اہم انصر ہے جسے وہ سماجی حقیقتوں اور انسانی جذبات کی گہری پیچیدگیوں کے ساتھ پیش کرتی ہیں ان کے افسانوں میں رومانی تعلقات صرف محبت یا جذباتی تعلقات تک محدود نہیں ہوتے بلکہ وہ انسانی فطرت ذاتی خواہشات اور سماجی دباؤ کے درمیان موجود تقاضوں کو بھی ظاہر کرتے ہیں رومانیت کا عنصر ان کے افسانوں میں ایک نظریہ کے طور پر موجود ہے جہاں افراد کی داخلی جدوجہد اور محبت کی تلاش ایک اہم موضوع ہے ممتاز شیری نے عورت کی محبت خواہشات اور اس کی نفسیات کو بہت ہی حساس انداز میں اجاگر کیا ہے ان کے کردار نہ صرف رومان سے جڑے ہوتے ہیں بلکہ ان کی رومانوی تعلقات سماجی طبقاتی فرق اور ثقافتی معیارات کے اندر بھی پروان چڑھتے ہیں افسانہ، دیپک راگ، میں ایک شادی شدہ عورت کے حسن وجمال کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے مثلا

> ''شادی شدہ کو فسانہ تو اور بھی اسان ہے اور شادی شدہ عورتیں تو سماجی طور پر اور بھی زیادہ کشش انگیز ہوتی ہیں صحت منداور نارمل جنسی زندگی ان کے چہروں میں میں بھی نکھار پیدا کر دیتی ہے وہ زیادہ کشش کی حامل بھی ہوتی ہیں اور انہیں فسانہ بھی اسان ہوتا ہے ایک تو یہ کہ جنسی زندگی کی ادھی ہوتی ہیں پھر انہیں ایسے شوہر ملے ہوں اور یہ تشنہ ہوں تو کیا کہنے۔اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہیں بچے کا ڈر نہیں ہوتا۔'' ۲۰ ویں صدی میں خواتین اردو ادب مرتبہ پروفیسر عتیق اللہ ۲۷۷

مندرجہ بالا اقتباس میں ممتاز شیری نے عورتوں کی نفسیات اور گہرے جنسی مسائل کو بغیر ہچکچاہٹ کے اپنے افسانوں میں لکھا ہے جو صداقت پر مبنی ہے ایک لڑکی کی شادی سے قبل جنسی تعلقات قائم کرنے پر بہت سوچتی ہے یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاندان کی بدنامی کا باعث نہ بنے۔ لیکن شادی شدہ عورتیں ان تمام مسائل سے بری ہوتی ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے کچی عمر کی لڑکیوں کے حسن واور جنسی مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں دکھایا ہے جو پہلی بار بالغ ہونے پر جنسی خواہشات محسوس کرتی ہیں۔

> ''اس عمر کی لڑکیوں کی اٹھان عجیب ہوتی ہے اس عمر کی لڑکیاں پکا نرم پھل نہیں ہوتی بلکہ چٹپٹی ترش کچی کیری سی اور اور زیادہ کچی کیری کو دیکھ کر رال ٹپک پڑتی ہے نا؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس عمر میں ان کی جنسی حس ابھی ابھی جاگی ہوتی ہے اور جنس سے متعلق ان کا جذبہ تجسس اس قدر بڑا ہوتا ہے۔۔۔

یہاں ان کا مقصد محض لذت پسندی پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ وہ ان سوالات پر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔وہ زندگی کے اکثر ان پہلوؤں پر کھل کر بات کرتی ہیں جو مندرجہ والا اقتباس میں پیش کیے گئے ہیں اس سے ممتاز سیری کی ذہانت کا پورا ثبوت دیکھنے کو ملتا ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

ان کے افسانوں میں محبت کا اظہار صرف دو افراد کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ ایک وسیع تر سماجی پس منظر میں ہوتا ہے وہ رومانیت کو معاشری معاشرتی دباؤ کے خلاف ازادی کے علامت کے طور پر پیش کرتی ہیں جس میں فرد اپنی محبت اور ذاتی خواہشات کو سامنے رکھ کر سماجی دباؤ کے ساتھ ٹکرا جاتا ہے اس طرح ان کے افسانوں میں رومانیت۔ نفسیاتی اور سماجی موضوع بن کر سامنے اتی ہیں جو انسان کے اندرونی اور بیرونی دنیا کے درمیان تعلق پیدا کرتی ہے ممتاز شیری کے یہاں مغربیت کا پہلو ایک پیچیدہ اور متوازن انداز میں موجود ہے جہاں وہ مغربی خیالات اور روایات کو نہ صرف تنقید اور اس سے متاثر ہو کر ان کی معاصرتی انداز میں پیش کرتی ہیں ان کے افسانوں میں مغربیت کا جو پہلو نظر اتا ہے وہ عموما فرد کی ازادی ہے خود مختاری اور جدیدیت کا تصور سے جڑا ہوتا ہے تاہم ممتاز شیری کے اس مغربیت کو ایک فریم ورک کے طور پر استعمال کرتے ہیں جس میں وہ مغربی روایات اور سماجی خیالات کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں انہوں نے مغربی معاشرتی رجحانات کو اپنے افسانوں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ان کے اثرات کا جائزہ لیتی ہیں خاص طور پر عورتوں کی آزادی اور ان کے حقوق کے حوالے سے مغربیت کے اثرات میں فرد کی ذاتی ازادی ازواجی زندگی میں تعلقات میں تبدیلیاں اور معاشرتی کردار کی تقسیم جیسے موضوعات شامل ہیں جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ مغربیت کو مکمل طور پر بغیر کسی تنقیدی ذات کے قبول نہیں کرتی بلکہ اس کے اثرات نتائج پر سوال اٹھاتی ہیں یہ مغربیت کا اثر ایک طرف کرداروں کی ازادی اور ترقی کے مواقف فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف مشرقی روایات اور مذہبی اقدار کے تحفظ کے لیے کشمکش پیدا کرتا ہے جس سے ان کے افسانوں میں ایک پیچیدہ سماجی ثقافتی منظر نامہ سامنے اتا ہے۔

ممتاز شیریں نے اپنے افسانوں، تنقید اور مضامین کے ذریعے اردو ادب کو نہ صرف نیا رنگ دیا بلکہ اسے ایک فکری اور تخلیقی وسعت بھی عطا کی۔ ان کا تعلق اس عہد سے ہے جب اردو ادب میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ ممتاز شیریں نے اس تحریک سے متاثر ہو کر نہ صرف سماجی مسائل پر قلم اٹھایا بلکہ انسانی نفسیات اور عورت کے داخلی جذبات کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے افسانے جدید اردو ادب کی ایک قیمتی میراث ہیں جو آج بھی قاری کو اپنی گہرائی اور اثر پذیری سے متاثر کرتے ہیں۔

ممتاز شیریں ۲۰ ویں صدی کے ابتدائی نصف میں منظر عام پر آئیں۔ ان کی شخصیت نہایت منفرد تھی، کیونکہ انہوں نے ادب کے مختلف پہلوؤں پر کام کیا، جن میں افسانہ نگاری، تنقید، ترجمہ اور صحافت شامل ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کا مرکز انسان اور اس کے معاشرتی و نفسیاتی مسائل تھے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جنہیں عام طور پر نظر انداز کیا جاتا تھا، خاص طور پر عورت کے مسائل اور اس کے داخلی احساسات۔ دیکھنے کو ملتا ہے۔

ممتاز شیریں کے افسانے موضوعاتی تنوع کے حامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسانی رشتوں کی پیچیدگی، عورت کے حقوق، سماجی ناانصافی، طبقاتی فرق، اور انسانی نفسیات کو انتہائی گہرائی سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کے افسانے صرف کہانیوں تک محدود نہیں بلکہ ان میں فکر اور فلسفہ بھی شامل ہوتا ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

ممتاز شیریں کے افسانوں میں عورت کے مسائل ایک نمایاں موضوع ہیں۔انہوں نے عورت کے جذبات،خواہشات اور خوابوں کو اس طرح بیان کیا کہ قاری عورت کے داخلی احساسات کو بہتر طریقے سے سمجھ سکے۔ان کے افسانے "تقدیر"،"شیشہ اور شعلہ"،اور "ایک رات" میں عورت کے جذباتی اور نفسیاتی پہلوؤں کو بہت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔

ممتاز شیریں نے اپنے افسانوں میں طبقاتی تقسیم اور سماجی ناانصافی کے موضوع کو بھی اجاگر کیا۔ان کے افسانے اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ کس طرح امیر اور غریب کے درمیان موجود خلیج انسانی زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ان کی کہانیوں میں غریب طبقے کے دکھ،ان کے خواب اور ان کی جدوجہد کو انتہائی ہمدردی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

انسانی نفسیات اور رشتوں کی پیچیدگی ممتاز شیریں کے افسانوں کا ایک اور اہم موضوع ہے۔ان کے افسانے انسانی جذبات اور تعلقات کے ان پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں جو عام طور پر پوشیدہ رہتے ہیں۔ان کی کہانیاں انسانی کرداروں کی نفسیاتی گہرائی کو سمجھنے کا ایک ذریعہ فراہم کرتی ہیں۔

ممتاز شیریں کا اسلوب ان کے افسانوں کو ایک منفرد پہچان دیتا ہے۔ان کے افسانوں کی زبان سادہ مگر پُراثر ہوتی ہے۔وہ غیر ضروری طوالت سے گریز کرتے ہوئے کہانی کے اصل نقطے پر زور دیتی ہیں۔ان کے جملے مختصر مگر بامعنی ہوتے ہیں جو قاری کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ان کے افسانوں میں منظر نگاری اور مکالمہ نگاری کا استعمال انتہائی مؤثر ہوتا ہے،جو کہانی کو زندہ کر دیتا ہے۔ممتاز شیریں کی منظر نگاری ان کے افسانوں کا ایک خاص پہلو ہے۔وہ نہایت مہارت سے ماحول کو بیان کرتی ہیں،جس سے قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود کہانی کا حصہ ہو۔

ان کے افسانوں میں کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ اس قدر گہرا اور مؤثر ہوتا ہے کہ قاری کرداروں کے ساتھ جذباتی طور پر جڑ جاتا ہے

ممتاز شیریں نے اپنے افسانوں میں علامتی انداز میں زندگی کے مسائل کو پیش کیا۔ان کی کہانیاں بظاہر سادہ لگتی ہیں لیکن ان کے اندر گہرے مفاہیم پوشیدہ ہوتے ہی ممتاز شیریں کے افسانے اردو ادب کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں نہ صرف سماجی مسائل کو اجاگر کیا بلکہ انسانی جذبات اور نفسیات کو بھی موضوع بنایا۔ان کے افسانے آج بھی قاری کو اپنی گہرائی اور معنویت سے متاثر کرتے ہیں۔ان کی کہانیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ادب صرف تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک فکری اور تخلیقی عمل بھی ہے جو انسان کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

ممتاز شیریں اردو افسانہ نگاری کی ایک منفرد اور معتبر آواز ہیں۔ان کے افسانے نہ صرف ادبی لحاظ سے اعلیٰ معیار کے حامل ہیں بلکہ ان میں زندگی کی حقیقتوں اور انسانی جذبات کی گہری عکاسی بھی ملتی ہے۔ان کی تخلیقات اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور آنے والی نسلوں کو زندگی اور ادب کے نئے پہلوؤں سے روشناس کراتی رہیں گی۔۔ممتاز شیریں اردو ادب کی ایک نمایاں افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں میں گہرے جمالیاتی اور فلسفیانہ پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ان کے افسانے انسانی زندگی،جذبات،اور نفسیات کے پیچیدہ پہلوؤں کو نہایت باریکی دیکھنے کو ملتی ہے۔ممتاز شیریں کے کام میں جمالیات اور فلسفہ کا امتزاج ان کی تخلیقی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے۔

جمالیات:

Scanned with OKEN Scanner

ممتاز شیریں کے افسانے خوبصورتی اور فن کی حساسیت سے بھرپور ہیں۔ان کے افسانوں میں فطرت،انسانی جذبات،اور زندگی کے تجربات کو انتہائی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ان کے اسلوب میں نزاکت،لطافت،اور منظر کشی کا عنصر نمایاں ہے۔وہ زندگی کے عام اور معمولی واقعات کو بھی اس انداز سے پیش کرتی ہیں کہ ان میں ایک گہری خوبصورتی اور معنویت نظر آتی ہے۔

ان کے افسانوں میں انسانی زندگی کے گہرے سوالات اور وجودی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔وہ انسان کے باطن،اس کی خواہشات، محرومیوں،اور داخلی کشمکش کو نہایت گہرائی سے بیان کرتی ہیں۔ان کے افسانوں میں عشق،موت،وقت،اور انسانی رشتوں کی نوعیت جیسے موضوعات کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ا. نسائی شعور: ممتاز شیریں کے افسانوں میں خواتین کے مسائل،ان کی داخلی دنیا،اور سماجی رکاوٹوں کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔

۲ .نفسیاتی تجزیہ: ان کے کرداروں کے جذبات اور رویوں کا تجزیہ گہرائی سے کیا گیا ہے،جو قارئین کو کرداروں کی اندرونی دنیا سے روشناس کراتا ہے۔

۳ .علامت نگاری: ان کے افسانے علامتی اور استعاراتی انداز میں لکھے گئے ہیں،جو کہ قاری کو مختلف سطحوں پر سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

٤ .سماجی حقیقت نگاری: وہ اپنے افسانوں میں معاشرتی حقائق اور تضادات کو خوبصورتی اور حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔

٥ .وجودیت: ان کے افسانوں میں انسانی وجود، مقصدیت اور خودی جیسے موضوعات کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔وہ اس بات کا جائزہ لیتی ہیں کہ انسان کس طرح اپنے حالات اور محدودات میں اپنی شناخت قائم کرتا ہے۔

٦ معاشرتی تضادات: ممتاز شیریں کے افسانے اکثر معاشرتی تضادات،طبقاتی فرق،اور سماجی ناہمواریوں کو اجاگر کرتے ہیں۔وہ فلسفیانہ انداز میں ان مسائل کا تجزیہ کرتی ہیں۔

۷ .محبت اور تنہائی: محبت کے پیچیدہ جذبات اور تنہائی کے فلسفیانہ پہلو ان کے کئی افسانوں کا مرکزی موضوع ہیں۔وہ انسانی تعلقات کی گہرائی اور پیچیدگی کو بیان کرتی ہیں۔

۸ .وقت اور تبدیلی: ان کے افسانوں میں وقت کی گزرتی ہوئی نوعیت اور انسان پر اس کے اثرات کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ممتاز شیریں کی تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ایک حساس اور گہری سوچ رکھنے والی ادیبہ تھیں،جو اپنے قارئین کو نہ صرف تفریح فراہم کرتی ہیں بلکہ انہیں زندگی کے پیچیدہ سوالات پر غور کرنے کی دعوت بھی دیتی ہیں۔

ممتاز شیریں کی زبان سادہ مگر دلکش ہے۔ان کے اسلوب میں روانی، تخلیقی توانائی،اور فطری اظہار نمایاں ہے۔وہ علامتی انداز اور استعاروں کا بھی خوبصورت استعمال کرتی ہیں۔ان کے افسانے سماج کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں،خاص طور پر ان مسائل پر جو خواتین اور پسماندہ طبقات سے

Scanned with OKEN Scanner

متعلق ہیں۔ان کے ہاں عورت کے حقوق اور اس کی خود مختاری کا پیغام واضح طور پر نظر آتا ہے۔ فطرت اور ماحول کی خوبصورت عکاسی ملتی ہے، جو ان کی تحریروں کو زیادہ مؤثر اور دلکش بناتی ہے ان کے کردار جاندار اور حقیقت پسندانہ ہیں۔ وہ کرداروں کے جذبات اور ان کی داخلی کشمکش کو اتنے موثر انداز میں پیش کرتی ہیں کہ قاری ان سے جذباتی طور پر جڑ جاتا ہے۔ علامتی انداز کو اپنایا، جو ان کے افسانوں کو گہرائی اور فکری وسعت بخشتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں چھپے ہوئے معنی اور گہرے پیغامات قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر ممتاز شیریں کے افسانے اردو ادب کا ایک اہم حصہ ہیں، جو نہ صرف ادبی جمالیات کے حوالے سے اہم ہیں بلکہ انسانی نفسیات اور سماجی شعور کو سمجھنے کے لیے بھی ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

اردو کی شعری اصناف کا تحلیل نفسی کے تناظر میں مطالعہ

Dr. Alisha Khanam

Assistant Professor

Delhi School of Journalism, University of Delhi -110007

تلخیص :اردو شاعری اپنی گہری معنویت اور جذباتی تاثرات کے ذریعے انسانی زندگی کے مختلف پلہوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔اس میں انسانی جذبات اور نفسیات کی عکاسی نہایت خوبصورتی سے کی جاتی ہے۔اردو شاعری کی مختلف اصناف، جیسے غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ،انسانی جذبات اور نفسیات کی عکاسی کا مؤثر ذریعہ ہیں۔یہ مضمون تحلیل نفسی کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ان اصناف کی نفسیاتی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔اس کے ذریعے انسانی شعور، لا شعور اور تحت الشعور، اجتماعی شعور کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ہر صنف میں موجود جذباتی شدت اور موضوعاتی تنوع انسانی ذہن کے مختلف پہلوؤں، مثلاً خواہشات، اخلاقی اصولوں اور ذہنی کشمکش، کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔

اردو شاعری انسانی جذبات اور نفسیات کی آمیزش کا فقدان ہے کہ کس طرح شاعری فرد کی داخلی کیفیتوں کو واضح کرتی ہے۔ مثلاً غزل میں ہجر و وصال کے جذبات، قصیدے میں انا اور فخر کا اظہار، مرثیے میں غم اور جذباتی تطہیر، نفسیاتی (Catharsis) ، مثنوی میں کرداروں کی نفسیاتی پیچیدگیاں، اور نظم میں جدید انسانی شعور کی ترجمانی وغیرہ۔ لہذا یہ کہنا غلط نہیں کہ شعری اصناف نفسیاتی پلہوؤں اور انسانی تجربات کی ترجمانی کا مظہر ہیں۔ نفسیات اور ادب کے باہمی تعلق کی بنیاد پر اس مطالعے میں بابائے نفسیات سگمنڈ فرائیڈ کے نظریات کی زمیں پر اردو کی شعری اصناف سخن کے خیلوں کو یکجا کرنے کی کوشش ہے۔ مثال کے طور پر غزل میں محبت، اداسی اور تنہائی کے موضوعات انسان کے اندرونی جذباتی تنازعات کو واضح کرتے ہیں۔اسی طرح مرثیہ اجتماعی غم اور سوگ کے ذریعے جذباتی تطہیر کا ذریعہ بنتا ہے، جبکہ نظم فرد و نئی نسل افکار و نظریات، فکری الجھنوں اور جذباتی دباؤ کو نمایاں کرتی ہے۔

اردو شاعری کے نفسیاتی تجزیے میں اجتماعی نفسیات کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے، جہاں شاعری قومی شعور، آزادی، انقلاب، اور سماجی تبدیلیوں کی عکاسی کرتی ہے۔ مختلف ادوار کی شاعری نے انسان کے خارجی حالات اور داخلی جذبات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ادب کے ذریعے انسانی تجربات کی تفہیم کا اہم ذریعہ بن گئی ہے۔اس مضمون میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح اردو شاعری انسانی احساسات کو محض بیان ہی نہیں کرتی بلکہ قارئین کو ان جذبات کو محسوس کرنے پر مجبور بھی کرتی ہے۔اردو شاعری کے اس مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شاعری محض ایک تخلیقی عمل نہیں بلکہ انسانی جذبات اور نفسیات کو سمجھنے کا ایک جامع ذریعہ ہے۔ یہ مضمون ان تمام اصناف کے تاریخی اور ادبی پس منظر کے ساتھ ان میں موجود تلاطم کے نمونوں کا تجزیہ پیش

Scanned with OKEN Scanner

کرتا ہے، تاکہ ان کے نفسیاتی پہلوؤں کو بہتر طور پر سمجھا جاسکے۔ یہ مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ اردو کی شعری اصناف نہ صرف ادبی حسن کا مظہر ہیں بلکہ انسانی ذہن کی گہرائیوں کو سمجھنے کا ایک منفرد ذریعہ بھی ہیں۔

کلیدی الفاظ: اردو شاعری، نظم، غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، اصناف سخن، انسانی شعور، لاشعور، اجتماعی، شعور، تحلیل نفسی، انسانی جذبات، نفسیات، سگمنڈ فرائیڈ، تحت الشعور، محبت، اداسی، تنہائی، داخلی کشمکش، الجھاو، امرد پرستی، جنسیت، محرومی، کرب، تلاطم، شدت،

دنیا میں موجود تمام زبانیں اور ادب خواہ مغربی ہو یا مشرقی سبھی کی تاریخ شاعری پر مبنی ہے، دنیا کے تمام ادبیات کا وجود شعری ہئیت پر عمل میں آیا جس کی شہادت ادب کے تاریخی گوشوں میں پنہاں ہے۔ اردو شاعری اپنی خوبصورتی، گہرائی اور متنوع موضوعات کی وجہ سے دنیا بھر میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نہ صرف زبان کے حسن کا مظہر ہے بلکہ انسانی جذبات، نفسیات اور شعور کو بھی عمیق طور پر واضح کرتی ہے۔ اردو شاعری کی مختلف اصناف، جیسے غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ، ہر ایک اپنی جگہ ایک منفرد دنیا کی عکاسی کرتیں ہیں۔ جو فرد کی داخلی اور اجتماعی نفسیات کو سمجھنے کے لیے ایک موثر ذریعہ فراہم کرتیں ہیں۔ یہ مضمون اردو شاعری کی مختلف اصناف کو نفسیاتی اصولوں کی روشنی میں سمجھنے اور ان کے ذریعے انسانی شعور اور لا شعور کی عکاسی کو واضح کرنے کی کوشش ہے علاوہ ازیں تخلیق کار کے ذہنی گوشوں تک رسائی کر اس کے جذبات احساسات و ناآسودہ خواہشات اور خیالات سے آشنا کرنے کی بھی کوشش ہے۔ کیونکہ شاعری ذہنی گوشوں کی اپج ہے جو شاعر کے اپنے جذبات واحساسات اور ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کا آئینہ ہے جس میں قاری اپنے وجود کو دیکھتا ہے۔ اردو شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ فرد کے اندرونی جذبات اور بیرونی حالات کے امتزاج کو اس طرح پیش کرتی ہے کہ قاری نہ صرف ان جذبات کو محسوس کرتا ہے بلکہ ان کا گہرائی سے تجربہ بھی کرتا ہے۔

ادب انسان کے ذہنی رجحانات کا سرچشمہ ہے خواہ وہ نثر ہو یا نظم، نفسیات اور ادب کے درمیان تعلق کو سمجھنے کے لیے اردو شاعری ایک بہترین ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ شاعری انسان کے شعور، لاشعور اور اجتماعی شعور کی عکاسی کرتی ہے۔ شاعری میں اپنے خیالات، احساسات و جذبات کا تانا بانا بننا بہت دلچسپ عمل ہے۔ چونکہ شاعری کا دامن جتنا وسیع ہے اتنا ہی رنگین بھی ہے۔

شاعری ایک تخلیقی عمل ے جو انسانی جذبات، خیالات اور تجربات کو زبان و بیان کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ شاعر کی داخلی دنیا اور نفسیاتی کیفیات شاعری کے متن میں منعکس ہوتی ہیں، بابائے نفسیات سگمنڈ فرائیڈ کے نظریات کے مطابق شاعر کی تخلیقی قوت کا تعلق شعور، لاشعور اور تحت الشعور سے ہوتا ہے۔ شاعر لاشعوری خیالات کو شعری شکل میں پیش کرتا ہے، جو بعض اوقات ان کے دبے ہوئے جذبات یا ناقابل اظہار خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ شاعر کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ اس کے متن کے ذریعے اس کی نفسیاتی کیفیت کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ انہی جذبات، خیالات اور نفسیاتی کیفیات کی گہرائی کو سمجھنے کا ایک سائنسی طریقہ تحلیل نفسی (Psychoanalysis) ہے۔

تحلیل نفسی سے مراد " ذہن انسانی کا تجزیہ " ۔ نفسیات کے اس نظریہ کا وجود ادب کے کسی صیغیہ کے مرہون منت عمل میں نہیں آیا بلکہ یہ اصطلاح طبعی مشقوں کے نتیجے کے طور پر ظاہر ہوئی۔

Scanned with OKEN Scanner

جس کے مطالعہ ومشاہدہ سے انسانی نفسیات کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور انسانی شخصیت کے پوشیدہ و پیچیدہ رازوں سے پردہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ تحلیل نفسی انسان کے داخلی و خارجی محرکات اور اعصبیاتی اختلال کی آئینہ دار ہے۔ جس میں انسانی ذہن کے پیچ و خم کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جس کا اظہار شارب ردولوی ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

" .... تحلیل نفسی انسانی شخصیت کو متحرک اور موثر انداز میں دیکھتی ہے جو اندرونی طور پر ایک میدان جنگ کا نقشہ رکھتی ہے جس میں بیجان اور ضبط و نظم خواہش اور روایات میں سخت کشمکش ہوا کرتی ہے۔ یہ نظریہ یقینی طور پر داخلی تحریکات کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ تحلیل نفسی انسان کی خارجی باتوں سے گزر کر اس کے باطن تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے اور معاشرتی پردوں کے پیچھے انسان کی شخصیت کی تہہ میں حقیقتوں کی جستجو کرتی ہے ...۱

چنانچہ تحلیل نفسی کا عمل انسانی احساس وجذبات اور تجربات کی عکاسی میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اور اس اعتبار سے تحلیل نفسی ادب، خصوصاً شاعری کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ تحلیل نفسی کے نقطہ نظر سے شاعری سے شاعر کی شخصیت اور اس کی ذاتی زندگی کو علیحدہ نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ غالباً شاعری کے وہ جوہر جو شاعر پیش کرتا ہے وہ سبھی اس کی شخصیت کی گہرائی میں ہی مضمر ہوتے ہیں دوسرے الفاظ میں اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ تمام ادبی کاوشیں شاعر کے قلبی محرکات کا آئینہ ہوتیں ہیں جو شعوری اور لاشعوری کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ تحلیل نفسی کے ذریعے جب ماہرین نے انسانی فطرت کے عمیق گوشوں کا مشاہدہ کیا جس سے مختلف حقائق سامنے آئے اور ان سبھی میں سب سے اہم جنسی نظریہ ہے جو اردو شاعری کے تمام تر اصناف سخن میں جابجا نظر آتا ہے اور دنیا کے تمام مشہور و معروف شعراء کی یہاں ملتا ہے۔

بمطابق ریاض احمد:

"... تحلیل نفسی میں جب کسی انسانی فعل کی تہہ میں جنسی اثرات کی تلاش کی جاتی ہے تو اس سے مقصد صرف ان جذبات کی عریانی ہی نہیں ہوتی بلکہ ارتفاع کے اس عمل کی توضیح مقصود ہوتی ہے جس کے ماتحت وہ بنیادی اور خالص جنسی تاثرات ایک اتنی بلند اور ارفع صورت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعری اپنی تمام تر نزاکتوں اور بلندی کے باوجود زیادہ تر ایک جنسی اظہار ہی کی صورت ہے۔ "..۲

فرائیڈ کا نظریہ تحلیل نفسی (Psycho- Analysis) جنسی خواہشات کی تکمیل، ناآسودہ خواہشات کے ذہنی خلل اور معالجہ پر مبنی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر دیویندر اسر اپنی تخلیق " ادب اور نفسیات" میں لکھتے ہیں کہ :

".....جنسی جذبہ فطری ہے اور خواہش وصل بھی فطری ہے.... جنسی جذبہ صرف انسانی نسل کی افزائش اور بقا کے لیے ہی لازمی نہیں بلکہ ادب اور فکر کی انسپریشن بھی جنسی جذبہ ہے، دنیا کے ادب اور فن کے بیشتر اور بہترین حصے کا موضوع جنس ہی ہے۔ "۳

اردو شاعری میں جنس کی تسکین کے علاوہ دیگر رجحانات بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ جیسے احساس برتری (Superiority Complex) , احساس کمتری (Inferiority Complex) , احساس جرم (Guilt Feeling) انا نیت (Egoism), بے حسی (Insensibility), الجھاؤ، (Complexes) شکستہ شخصیت، (Schizophrenia) انتقام، (vengeance) پیچیدگی

Scanned with OKEN Scanner

،(Complication)اور تجربہ (abstraction) وغیرہ ایسی دیگر نفسیاتی علامتیں ہیں جو شاعری میں دیگر رجحانات کی نشان دہی کرتیں ہیں۔

مثال کے طور پر اصطلاح احساس برتری پر غالب کا یہ شعر :

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ

خو تم سے شہر میں ہوں اک دو تو کیوں کر ہو

''..... تحلیل نفسی انسان کی انفرادی زندگی کے مدفون حالات اور complexes کی تلاش کا نام ہے...'' ۴

لفظ Complexesایک نفسیاتی اصطلاح کا نام ہے جس کے متبادل کے طور پر اردو میں **الجھاؤ** کی علامت استعمال کی جاتی ہے۔ نفسیات میں complexانسان کی اس کیفیت کا نام ہے جس میں فرد کے لاشعور میں پوشیدہ دبی ہوئی خواہشات و خیالات متحرک ہو کر انسانی شعور اور اس کی خصیت کو متاثر کرتے ہیں۔اس کا اثر انسانی افعال ورویوں پر بھی ہوتا ہے۔فرائیڈ نے دیگر الجھاؤ کے نئے نظریات بھی پیش کیے جن میں اوڈی پس، الیکٹرا، سادیت، مسوکیست اور نرگیسیت خصوصیت کے حامل ہیں۔ جب ان الجھاؤ میں شدت پیدا ہو جاتی ہے تو یہ عارضہ کی شکل اختیار کر کے ذہنی و عصبی امراض کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ جس کا طریقہ معالجہ تحلیل نفسی ہے۔انسان کے ذہنی عارضہ کے اجزا ذہن کے لاشعور میں ہوتے ہیں۔ سید اقبال امر وہوی لاشعور کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

''..... لاشعور ایسا حصہ ہے جہاں مواد داخل ہو جاتا ہے تو اس کا واپس شعور میں آنا مشکل ہے۔ یہ ایک ایسا کمرہ ہے جس میں جانے کا راستہ تو ہے لیکن باہر آنے کا راستہ پر تالا پڑا ہوا ہے۔ لیکن لاشعور کے مواد کو کرید کرید کر شعور میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس عمل کو تحلیل نفسی کہا جاتا ہے ....

سیگمنڈ فرائیڈ کے مطابق انسانی شعور تین حصوں پر انحصار کرتا ہے مثلاً۔ ذہن شعور Conscious Mind ذہن تحت الشعور Sub Conscious Mind , ذہن لاشعورUnConscious Mind۔یہ تینوں حصے شاعر کی تخلیقی عمل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اور شاعری کو انسانی جذبات اور نفسیات کا ایک منفرد آئینہ بناتے ہیں۔

ذہن شعور Conscious Mind:

ذہن انسانی Conscious Mind شعور کے اس طبقہ کا نام ہے جو انسانی ذہن کے فوری تجربات، مشاہدات، جذبات و خیالات، خواہشات اور تصاویر کا احاطہ کرتا ہے جس میں ادراک، حافظہ، حس، جذبہ فکر اعمال وافعال وغیرہ شامل ہیں۔ جس کی نسبت سے انسان کو تمام محرکات کا علم ہوتا ہے۔ انسانی ذہن کے شعوری خیالات کسی ایک کیفیت و حالت میں قائم و دائم نہیں رہتے ان میں تغیرات کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے نتیجتاً بہ یک وقت بہت سے خیالات شعور سے گزرتے ہیں۔ لہذا شعور چند خیالات کو ہی قبولیت دیتا ہے، چونکہ ایک وقت میں ان گنت خیالات شعور پر حاوی ہونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انسان کی شعوری کیفیت سبھی خیالات کا بوجھ بیک وقت اٹھانے پر قادر نہیں۔ غالبا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ذہن کا وہ حصہ جو خارجی دنیا سے موافقت رکھتا ہے شعور کہلاتا ہے جو ہمارے احساس وجذبات، خیالات وخواہشات اور افعال کو مربوط شکل میں پیش کرتا ہے۔ شعوری حالت و کیفیت کے دھارے جہاں ملتے ہیں۔ شعور کے متعلق ساجدہ زیدی رقمطراز ہیں کہ :

Scanned with OKEN Scanner

''.... فرائڈ کے نظریہ کے مطابق انسانی ذہن کی شعوری سطح وہ ہوتی ہے جس سے فرد و اقفف ہوتا ہے جو اس کے حافظے اور ادراک کے دائرہ میں رہتی ہے اور جس کی طرف وہ اپنے ہر شعوری عمل کے سلسلہ میں رجوع کرتا ہے۔ انسانی ذہن کی شعوری سطح منطقی فکر کی حامل ہوتی ہے .... شعوری ذہن اور ماحول میں عمل اور رد عمل کا ایک لامتناہی سلسلہ چلتا رہتا ہے ....''۶

Sub Conscious Mindذہن تحت الشعور

ذہن تحت الشعور کو قبل شعور سے بھی موسوم کیا جاتا ہے جس کے لئے انگریزی میں "Pre-conscious" کی اصطلاح کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ انسانی ذہن کا وہ طبقہ ہے جو شعور اور لاشعور کے درمیان حائل ہوتا ہے، جو دونوں طبقات کے درمیان ربط وضبط اور آہنگ برقرار رکھنے کی سعی مشکور میں مصروف رہتا ہے اور بہ حیثیت دربان اپنا فریضہ انجام دیتا ہے۔ تحت الشعور شعوری صفت کا حامل تو نہیں لیکن اس حصہ کو شعور کے قریب تر گردانا جاتا ہے۔ یہاں وہ خواہشات، تجربات اور واقعات کی یادیں ملتی ہیں جو کبھی گزشتہ وقت میں شعور کا حصہ تھیں لیکن اب شعوری سطح سے ان کے عکس دھندلے ہو گئے ہیں مگر پوری طرح شعور نے انہیں فراموش نہیں کیا ہے لہذا معمولی کوشش سے انہیں شعوری سطح پر دوبارہ لایا جاسکتا ہے۔ تحت الشعور کا مواد ایسی یادداشت کے اجزاء ہوتے ہیں جنہیں شعوری ذہن بھولا بھی نہ ہو اور وہ اس کو اچھی طرح یاد بھی نہ ہو۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کے گذشتہ تجربات اور ہیجان کے مسکن کو تحت الشعور کہتے ہیں۔ تحت الشعور کے حوالے سے سید اقبال امروہوی لکھتے ہیں:

'' یہ شعور کی وہ شکل ہے جس میں آنے والے تجربات جب شعور کی حدود سے باہر جاتے ہیں تو تحت الشعور میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ہر تجربہ شعور سے ہٹتا نہیں ہے بلکہ تحت الشعور میں چلا جاتا ہے۔ تحت الشعور کی حدود شعور کی حدود سے بالکل ملی ہوتی ہیں اس لئے تحت الشعور میں جو کچھ ہوتا ہے وہ شعور کے بہت قریب ہوتا ہے.... ... تحت الشعور جے کچھ مصنفین نے قبل شعور Pre-conscious بھی کہا ہے ہمارے تجربے اور نفس کا وہ حصہ ہے جس کے واقعات کا علم ہمیں ارادی یا اختیاری توجہ سے ہوسکتا ہے.....''۷

مثلاً: ہم کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہیں یکایک کسی جملے یاالفاظ کی موافقت سے ہمیں کسی دوسری کتاب کا خاکہ یاواقعہ یاد آجاتا ہے جس کا بھی گذشتہ وقت میں مطالعہ کیا تھا۔یعنی اس مطالعہ کی یاداشت پہلے ہی سے ہمارے ذہن میں موجود تھی جو غیر معمولی سی کوشش سے شعوری سطح پر آگئی۔ان سبھی سرگرمیوں کے ساتھ تحت الشعور یہ بھی فریضہ انجام دیتا ہے کہ وہ لاشعور میں موجود منہ زور دبی ہوئی ناآسودہ خواہشات کو شعور میں آنے سے روکتا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

'' قبل شعور کا ایک بہت ہی اہم کام یہ ہے کہ وہ شعور اور لاشعور کے درمیان واقع ہوا ہے۔ لاشعوری خیالات جب شعور میں آنے کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں قبل شعور کے خانے سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ ان لاشعوری خیالات کو روکتا ہے اور وہ خیالات جو شعور میں جانے کے لائق نہیں ہیں انہیں شعور میں واپس ڈھکیل دیتا ہے۔ دوسری قسم کے خیالات کو وہ قبل شعور میں خود اس وقت تک رکھتا ہے جب تک شعور ان کا متحمل نہ ہو جائے ۔ اس لئے نفسیات میں قبل شعور کو بھی کافی اہمیت ہے....''۸

Scanned with OKEN Scanner

تحت الشعور، شعور کی دھندلی کیفیت کا نام ہے جو شعور کے لیے بے حد اہم ہے اور اس کو مواد فراہم کرتا ہے۔

UnConscious Mind ذہن لاشعور

انسانی ذہن کے تینوں طبقات میں سب سے قوی حصہ لاشعوری ذہن ہے۔ یہ شعوری ذہن کا متضاد بھی ہے جس میں انسان کے جذبات، خواہشات، خیالات، خوف، تصورات اور تجربات کی بھولی بسری اور ناآسودہ دبی کچلی یادداشت کے نقوش پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جس کا علم انسانی شعور کو بالکل نہیں ہوتا چونکہ یہاں ایسی خواہشات کی یادیں پناہ ڈھنڈتی ہیں جو سماج، مذہب، تہذیب و اخلاقی اقدار کے خوف کے باعث پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتی ہیں پھر یہ لاشعور کا حصہ بن جاتی ہیں۔ ڈاکٹر شارب ردولوی لاشعور Unconscious mind کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ :

'' لاشعور کی عام طور پر یہ تعریف کی گئی ہے کہ ذہن کے پیچھے ایک پوری دنیا خیالات، جذبات ، خوف، ہجانات اور بہت سے احساسات کی آباد ہے جو ہماری خارجی دنیا سے جس کو شعور کہتے ہیں کہیں زیادہ بڑی اور طاقت ور ہے ..... لاشعور ہمارے تجربات کا وہ حصہ ہے جس کا علم لاکھ توجہ کے باوجود بھی ہمیں نہیں ہوتا اور یہ ماضی کے ان افعال سے متعلق ہے جن کو ہم کسی وجہ سے دبانا چاہتے ہیں. یعنی وہ تمام باتیں جنہیں وقتی طور پر عقل قبول نہیں کرتی یا کسی وجہ سے جن کا اظہار نہیں ہو سکتا وہ لاشعور کا حصہ بن جاتی ہیں..... لاشعور انسانی نفس کا وہ حصہ ہے جو ہمیشہ خوشگوار اور دبائے ہوئے خیالات سے پر رہتا ہے ....'' ۹

لاشعوری ذہن ایسی یادوں کا بھی مرکز ہوتا ہے جنھیں فرد خود اپنے حافظہ میں محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ روزمرہ کے طرز عمل میں انسان کا سابقہ ایسے تلخ تجربات، واقعات یا حقائق سے پڑتا ہے جس کے دقیق جز کو بھی وہ اپنے ذہن کے کسی گوشہ میں موجود نہیں رہنے دینا چاہتا بلکہ اس حادثے کو پوری طرح فراموش کر اپنے ذہن کو اس کی گرفت سے آزاد کرنے کی سعی کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ یہ حادثہ اس کے شعور سے محو تو ہو جاتا ہے لیکن اس کی یاداشت لاشعور کی اندھیری تہوں میں چھپ جاتی ہے اور کسی نہ کسی حالت میں انسان کی شخصیت، رویے اور کردار کو متاثر کر اپنے وجود کا اظہار کرتی ہے۔ لاشعور کی قوت عملی اتنی شدید ہوتی ہے کہ یہ انسانی کردار و شخصیت، اذہان، شعور کو بے حد متاثر کرتی ہے۔

جن خواہشات کو آسودگی خاطر میسر نہیں آتی وہ لاشعور کی زیست میں مضمر ہو جاتی ہیں۔ یہ ذہنی سطح ہمیشہ ناخوشگوار احساس و جذبات اور دبی ہوئی خواہشات اور تجربات سے آباد رہتی ہے لہذا لاشعور کی دیگر عملی سرگرمیوں کے حوالے سے حزب اللہ رقم طراز ہیں:

'' ..... لاشعور مکمل طور پر اخلاق سے بے تعلق ہوتا ہے اس میں ایسا مواد جمع ہوتا ہے جسے اخلاق کی ہوا نہیں لگی ....'' ۱۰

انسانی نفس صرف شعور (conscious) تحت الشعور (sub-conscious) لاشعور (unconscious) پر ہی مشتمل نہیں ہے بلکہ اس کے تعین میں دیگر اور قوتیں بھی اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ فرائیڈ ان قوتوں کے تعلق سے ان کی مزید تشریح کے طور پر (Id) , (Ego) (super Ego) کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ یہ تینوں قوتیں آپس میں بہت کی انفرادی جبلتوں کے ساتھ مل کر انسان کے بیشتر عمل اور رد عمل کے پس پردہ اپنے عملی فرائض انجام دیتی ہیں۔

Scanned with OKEN Scanner

فرائیڈ کے تحلیل نفسی کے نظریے کے تحت، لاشعور میں موجود دبے ہوئے خیالات اور جذبات خوابوں، لغزشِ زبان، یا تخلیقی عمل کے ذریعے ظاہر ہوتے ہیں۔ شاعری انسانی ذہن کے ان تینوں حصوں کی عکاسی کا ایک بہترین ذریعہ ہے، جہاں شعور کے ذریعے شاعر اپنے جذبات کو ظاہر کرتا ہے، تحت الشعور ماضی کی یادداشتوں اور داخلی کیفیتوں کو تخلیقی زبان فراہم کرتا ہے، اور لاشعور جذبات اور خیالات کی گہرائیوں کو علامتوں اور استعاروں کے ذریعے نمایاں کرتا ہے۔ اس طرح، تحلیل نفسی انسانی ذہن اور شاعری کے تخلیقی عمل کے درمیان ایک گہرا تعلق واضح کرتی ہے، جو ادب کو جذباتی اور نفسیاتی گہرائی فراہم کرتا ہے۔

غزل اور تحلیل نفسی:

غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں حسن و عشق کی باتیں کرنا۔ غزل کو شاعری میں اولیت اور برتری حاصل ہے۔ غالباً اس صنف نے اپنے اندر تمام ادوار کے سماجی و تہذیبی عوامل اور عناصر کو سمویا ہوا ہے۔ جہاں عشق غزل کا ایک بنیادی عنصر رہا وہیں حسن نے اہم محرک کا فریضہ انجام دیا۔ اردو غزل کا آغاز فارسی شاعری کے زیر اثر وجود میں آیا موضوع کے اعتبار سے غزل کا دامن اتنا وسیع رہا جس میں حسن عشق کے ساتھ ساتھ سیاسی سماجی، معاشی، مذہبی، اخلاقی سبھی کو اپنے بطن میں مضمر کر لیا۔ غزل کے حوالے سے **خواجہ الطاف حسین حالیؔ** "**مقدمہ شعر و شاعری**" میں رقم طراز ہیں کہ :

''..... غزل کی اصلی وضع جیسا کہ لفظ غزل سے پایا جاتا ہے محض عشقیہ مضامین کے لیے ہوئی تھی۔ مگر ایک مدت کے بعد وہ اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہی۔ ایران میں اکثر اور ہندوستان میں چند شاعر ایسے بھی ہوئے جنہوں نے غزل میں عشق مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاق و مواعظ کی بھی شامل کرلیا ہے..... غزل کی اصطلاح تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے قوم کے لکھے پڑھے اور ان پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں۔'' ۱۱

غزل اردو ادب کی وہ صنف سخن ہے جس میں شاعر اپنے احساس و جذبات اور خواہشات کی ترجمانی موثر انداز میں چند لفظوں میں اشعار کی مدد سے کرتا ہے۔ جیسا کے ہم جانتے ہیں کے غزل اور اس کا ہر شعر مختلف اور جداگانہ نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ اگرچہ غزل کا نفسیاتی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ غزل کا ہر شعر انسان کی مختلف کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ تخلیق کار کی تخلیق کما حقہ اس کی شخصیت، احساس و جذبات اور خواہشات کی عکاس ہوتی ہے اور قاری بھی اس تخلیق سے لطف اندوز ہوتا ہے لہذا اس صورت حال میں قاری خود کو تخلیق کا خالق محسوس کرتا ہے۔

علم نفسیات، انسانی نفسیات کو جانے سمجھنے کا ایک ایسا علم ہے جو انسان کی فطرت کے تمام داخلی و خارجی پہلوؤں کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ الغرض کسی بھی تخلیق سے اس کے خالق کی داخلی و خارجی زندگی، احساسات و جذبات نیز فکری انداز اور خواہشات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غزل سے قاری کے قلب و ذہن میں پیدا ہونے والے احساسات و جذبات کا اندازہ درج ذیل غزل کے نفسیاتی مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

میر تقی میرؔ

Scanned with OKEN Scanner

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا

امیدوار وعدہ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

کب تک ظلم آہ بھلا مرگ کے تئیں
کچھ پیش آیا واقعہ رحمت کو کیا ہوا

اس کے گئے پر ایسے گئے دل سے ہم نشیں
معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا

بخشش نے مجھ کو ابر کرم کی کیا خجل
اے چشم جوش اشک ندامت کو کیا ہوا

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتہ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

تھی صعب عاشقی کی ہدایت ہی میرؔ پر
کیا جانئے کہ حال نہایت کو کیا ہوا

ہر شخص اپنی زندگی کے دوران ذہنی ارتقاء کے مختلف نشیب و فراز سے گزرتا ہے۔ ذہنی تلاطم و مختلف طوفانوں سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ غزل میرؔ کے ذہن میں جاری داخلی کشمکش، جذباتی بحران اور محبت کے تجربے سے پیدا ہونے والے نفسیاتی اثرات کو ظاہر کرتی ہے۔ میرؔ کی غزل میں تحلیل نفسی کی جھلک ان کے شکوے اور احساسات میں نظر آتی ہے۔ وہ اپنی محرومیوں اور داخلی کرب کا جائزہ لیتے ہیں اور اپنی نفسیاتی کیفیت کو اشعار کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ غزل کے اشعار شاعر کی اندرونی کشاکش اور اضطرابی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ جس میں شاعر محبت و مروت کی شکایت و شکوہ کرتے نظر آتے ہیں۔ پہلی نظر میں یہ غزل شکوہ اور شکایت کا اظہار معلوم ہوتی ہے، لیکن اس میں انسانی شعور، لاشعور اور جذبات کی ناپائیداری کو علامتی طور پر استعمال کیا ہے۔ میر انسانی تعلقات کے ٹوٹنے، وفاداری کے فقدان اور محبت کی گمشدگی کو ایسے پیش کرتے ہیں جیسے یہ سب کسی عظیم فلسفیانہ المیہ کا حصہ ہو۔ یہاں محبت کی زبوں حالی، جذباتی تنہائی کا استعارہ بن جاتی ہے۔ شاعر سوال اٹھاتا ہے کہ انسانی رشتے اور جذبات کیوں اپنی اصلیت کھو رہے ہیں، اور اس محبت کی گہرائی کہاں چلی گئی ہے جو کبھی انسانی روح کی معراج ہوا کرتی تھی۔ میرؔ غزل میں انسانی نفسیات، محبت کی محرومیت، شکوے، ظلم و ستم، ندامت اور اضطراب کی گہرائیوں کا بیان کرتے ہیں۔ محبوب سے جدائی نے تنہائی و غم کی کیفیت طاری کی ہے ندامت کے آنسو، ستم اور غیرت کے الجھے ہوئے جذبات بھی اس غزل میں شامل ہیں۔ جہاں وہ غیرت اور محبت کی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں تو وہی عاشق کی مشکلات اور اس میں چھپی محرومیت ان کی غزل کا مرکزی خیال بنتی ہے۔ اس غزل میں میرؔ نے انسانی جذبات، نفسیاتی کیفیت، شکوہ، ظلم، ندامت اور غیرت کے فلسفیانہ پہلو کو بڑے سچے اور عمیق انداز میں پیش کیا ہے۔ جو ان کے نفسیاتی محرکات کی کشاکش ہے جو میر کی اندرونی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے۔

نفسیاتی علامتیں:

غزل میں شاعر اپنے محبوب سے وفا کی طلب رکھتا ہے لیکن فراق یار میں خدا سے شکوہ کرتا ہے اور روز محشر کا بے صبری سے انتظار کرتا ہے تاکہ وہ اپنے محبوب کا دیدار کر سکے۔ اس غزل میں میر کے ذہنی و قلبی انتشار کے سبب خواہش کا عمل وجود میں آتا ہے۔ خواہش (Desire) خواہش پر انسانی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔

اس غزل کے تمام اشعار محرومی (Deprivation) کے ارد گرد طواف کرتے نظر آتے ہیں۔ محرومی (Deprivation) نفسیات کی ایک ایسی اصطلاح ہے جو انسان پر اس کی پسندیدہ شے یا خواہش کے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچنے کے سبب طاری ہوتی ہے۔ محبوب کے وعدہ وصال کے پورا نہ

Scanned with OKEN Scanner

ہونے پر شاعر ذہنی الجھاؤ کا شکار نظر آتا ہے۔ جو کہ لفظ" قیامت" سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر کا ذہنی اضطراب اس قدر شدید ہو چکا ہے کہ اب اس کو اس کا قلب و ذہن اسے برداشت کرنے سے قاصر ہے۔ انسان کی اس کیفیت کے لئے نفسیات میں اضطرابی افسردگی (Agitated Depression) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اس کیفیت میں فرد کا ردعمل منفی جذبات سے لبریز ہوتا ہے۔ اس غزل میں داخلی کیفیت کا ذکر ملتا ہے جو داخلی ادراک اور کیفیت ادراک کے باعث وجود میں آتی ہے۔ میرؔ احساس محرومی، ظلم اور شدت غم کے سبب موت کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ جو کہ نفسیاتی اصطلاحیں، احساس محرومی، شکستہ خوردی اور احساس کمتری (Inferiority feeling) کی علامت ہے۔ ان اصطلاحوں کے علاوہ مایوسی، ناامیدی کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔

محبوب کے فراق میں شاعر جو اپنی کیفیت بیان کرتا ہے کہ اس کی جدائی کا حوصلہ اب نہیں ہے۔ اس کی جدائی سے جسم ہے حس اور بے جان معلوم ہوتا ہے جس کے پس پشت محبت کا جذبہ سر گرم عمل ہے۔ جذبہ محبت کے علاوہ میر کی اس غزل میں شدید احساسیت (Erethosim) کی اصطلاح بھی ملتی ہے۔ اس اصطلاح کے حوالے سے سید اقبال امروہوی لکھتے ہیں۔

" یہ اصطلاح اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب کے کسی حصہ کی احساسایت میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہوجائے ۔ ۔۔۔" ۱۲

الغرض اس صطلاح کی علامت میرؔ کے یہاں لفظ خجل اور ندامت اور غیرت سے واضح ہوتی ہے۔ اس صورت حال میں انسان کو داخلی ادراک اور ادراک کیفیت سے ندامت اور غیرت کا احساس ہوتا ہے۔ اسی ہیجانی کیفیت کے باعث انسان کے احساسات و جذبات میں تغیرات اور محرکات عمل میں آتے ہیں۔ جس کی مناسبت Erethosim کی اصطلاح سر گرم علمل ہوتی ہے۔ اس کے انا (Ego)، لفظ غیرت سے واضح ہوتی ہے۔ سبھی سر گرمیاں لاشعوری اور شعوری کیفیت کی علمبر دار ہیں۔

دراصل شاعر و مصنف کی تخلیق اس کے ایسے نفسیاتی محرکات کی علمبر دار ہوتی ہے جن کو وہ اخلاقی اقدار و سماج کے اصولوں کی تقلید کے باعث انجام نہیں دے پاتے ہیں اور انہیں نامکمل خواہشات کو تخلیق کی شکل میں قاری کے سامنے رکھتے ہیں اور شاعری کی صنف غزل میں موضوع کے اعتبار سے یہ آسمانی ہے کہ شاعری میں جب چاہے جن حالات میں ہو دوسطر میں اپنی کیفیت کا اظہار کر سکتا ہے۔ اس میں کسی بھی موضوع کو تسلسل سے بیان کرنے کے لئے مجبور نہیں ہونا پڑتا ہے۔

نظم اور تحلیل نفسی:

لغت کے اعتبار سے نظم کے معنی ہیں آراستہ یا موزوں کرنے کے۔ اس کے دیگر معنی کسی چیز کے مختلف اجزا کو ترتیب سے جوڑنے یا لڑی میں پرونے کے ہیں۔ اردو نظم کے حوالے سے ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں کہ :

" نظم کی آسان اور جامع تعریف یہ ہے کہ ہر وہ منظوم کلام جو غزل نہ ہو نظم ہے۔" ۱۳

تو وہیں شمیم احمد لکھتے ہیں کہ :

Scanned with OKEN Scanner

'' غزل کی ہئیت مخصوص ہوتی ہے نظم کے لئے کسی خاص ہئیت کی تخصیص نہیں. غزل کے اشعار میں باہمی تسلسل نہیں ہوتا، لیکن نظم کے اشعار موضوع اور خیال کے اعتبار سے ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں...''۱۴

اردو شاعری میں تمام تر ایسی شعری تخلیقات جن کے اجزاء مربوط و مستقل ہوں اور جن کی نوعیت موضوعاتی ہو، انہیں نظم قرار دیا جاتا ہے۔ ایسی نظموں سے اردو شاعری کی تاریخ مالا مال ہے۔ قلی قطب شاہ سے لے کر عصر حاضر تک ایسی بیشتر نظمیں موجود ہیں۔

'' مقدمہ شعر و شاعری'' میں شاعری کی دیگر اصناف کا ذکر اختصار کے ساتھ ملتا ہے۔ لیکن نظم کا بہ حیثیت صنف ذکر موجود نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک اردو شاعری میں روایت پرستی حد درجہ تھی۔ غالباً غزل کا سورج بام عروج پر تھا۔ اردو شاعری میں سب سے مضبوط روایت غزل کی تھی۔ نظم کا تصور محض کسی خاص موضوع پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کرنا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے ہندوستان کی سیاسی و سماجی زندگی کی طرح ادبی تاریخ پر بھی اثر انداز ہوئے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں مغرب کے اثرات نظر آنے لگے تھے۔ مغربی زبان و ادب کی آگہی کے باعث مشرقی ادب بھی متاثر ہوا۔ اردو شاعری صدیوں کی روایتی تصورات کے پیچ و خم سے نکل کر نئی فکر اور احساس سے ہمکنار ہوئی۔ اس عہد میں ترقی پسند تحریک، علی گڑھ تحریک جیسی تحریکات نے ادب میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔

نظم ایک ایسی تخلیقی ادبی صنف ہے جو اپنے فکری انداز اور شعری اظہار کے ذریعے انسانی جذبات، احساسات، اور تجربات کو بیان کرتی ہے۔ نظم میں فکری آزادی اور جذباتی پیچیدگی کو بیان کرنا آسان عمل ہے کیونکہ نظم میں موضوعات کی پابندی نہیں ہوتی۔ نظم میں شعور، لاشعور، اور تحت الشعور کے عناصر کا باہم ربط نہایت اہم ہے۔ ان تینوں کے درمیان باہم تعلق نظم کے تخلیقی عمل کو ممکن بناتا ہے۔ شاعر شعور کے ذریعے اپنے تجربات کو شعری قالب میں ڈالتا ہے، لاشعور سے جذباتی محرکات لیتا ہے، اور تحت الشعور کے ذریعے غیر شعوری محرکات کو نظم کی شکل میں پیش کرتا ہے۔

یہ ربط نظم میں ایک پیچیدہ نفسیاتی تجزیے کا باعث بنتا ہے۔ شاعر کے خیالات اور جذبات کی تشکیل شعور کی منطقی فہم کے ساتھ لاشعور کی غیر منطقی خواہشات اور خوف سے بھی متاثر ہوتی ہے۔ تحت الشعور ان دونوں کے درمیان ایک پل فراہم کرتا ہے، جو نظم کے تخلیقی عمل کو بہتر بناتا ہے۔ نظم کی تحلیل نفسی کے ذریعے ہم شاعر کے داخلی و خارجی محرکات کو سمجھ سکتے ہیں۔

نظم تنہائی

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں

راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار

لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار

اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ

Scanned with OKEN Scanner

گل کرو شمعیں، بڑھادو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا
)فیض احمد فیض(

یہ نظم انسانی ذہن کے مختلف پہلوؤں کی عکاس ہے جو انسانی تنہائی، خوف، اور مایوسی کو ظاہر کرتی ہے۔ فیض نظم میں احساس تنہائی اور انتظار کا بیان کرتے ہیں۔ جس کے انتظار میں دل ناتواں آنکھیں بچھائے ہوئے شدت سے منتظر ہے وہ نہیں آیا اور ممکن ہے کہ وہ نہ آئے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور راستے کا مسافر ہو اور اسی طرف چلا گیا ہو۔ اس کا انتظار اب ختم کر دینا چاہیے کہ اب تو رات بھی ختم ہونے کے قریب ہے اور تاروں کا غبار آسمان پہ بکھر کر روشنی پھیلا رہا ہے۔ محلوں میں رات بھر جلنے والے چراغ بھی اب دم توڑنے کو ہیں۔ ہر ایک راستے کا انتظار بھی اب مایوسی کے سبب ختم ہونے کو ہے۔ وہ جو رات کے کسی پہر آرہا تھا اب اس کے قدموں کے نشان بھی اجنبی لوگوں کے قدموں کے نشانوں نے دھندلے کر دیے ہیں۔ شاعر پر مایوسی کا یہ عالم ہے کہ وہ روشن چراغ کو گل کر مئے کے نشے میں غرق ہونا چاہتا ہے اور شراب کی مقدار کو بڑھانا چاہتا ہے کہ (محبوب کے نہ آنے کے غم کو دور کرے) تم اپنے بے خواب دروازوں کو بند کر لو کیونکہ اب یہاں کوئی نہیں آیا اور نہ اب کسی کے آنے کی امید باقی ہے۔ انتظار بے سود ہے۔

فیض احمد فیض کی اس نظم کی تحلیل نفسی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ نظم شدید انتظار کے جذبے کا اظہار کرتی ہے کہ شاعر اپنے محبوب کا انتظار کر دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن اس کے بر خلاف یہ نظم آزادی کی خواہش کا بھی مظہر ہے۔ چونکہ آزادی بھی کسی محبوبہ سے کم نہ تھی۔ اس کا حصول تصور ہی تسلیم کیا جارہا تھا اور جذبہ، خواہش، شدت سے پیدا ہونے والا جذبہ شاعر کو نظم کے آخر میں مایوس کر دیتا ہے۔ ناخوشگوار یادوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ نفسیات میں اس جذبہ کے لئے امتناع (Supersession) کی علامت کی ذکر ملتا ہے۔ فرد اس احساس کی بنا پر شعور میں موجود وہ ناخوشگوار یادوں کو باہر نکالتا ہے جو موجود ہوتی ہیں۔ غالباً شاعر کے ذہن میں آزادی کی خواہش کچھ ایسا ہی درجہ رکھتی ہے۔ یوں تو شعری صنف ایک پہلو میں بیشتر معنی و مفہوم رکھتی ہے مگر معنویت اس تخلیق کی یہ ہے کہ وہ کن حالات کے باعث وجود میں آئی اور تخلیق کار نے کیونکر اس کی تخلیق۔ تخلیق کے زیر اثر احساس و جذبات کے ساتھ ساتھ وقت و حالات کی بھی ترجمانی ہوتی ہے۔ شاعر کے ہیجان پر احساس کمتری کا شدید غلبہ طاری ہوتا ہے کہ اس احساس میں شدت کے باعث کمتری، کمی، حقارت کا احساس ایک الجھاؤ (Complex) کی شکل اختیار کر لیتا اس کیفیت کو احساس کمتری (Inferiority Complex) کہتے ہیں۔ یہ نفسیاتی الجھاؤ انسان کی شخصیت اور اذہان میں مثبت محرکات اور نامرادی کی آپسی جدوجہد کا اظہار ہے۔ اسی نفسیاتی الجھاؤ کی وجہ سے محرومی (Deprivation) کا جذبہ سرگرم عمل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں شاعر کی شخصیت میں جذباتی انتشار (Dementia) کا بھی دخل نظر آتا ہے۔ اس کیفیت میں انسان کے جذبات میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی ہے اور وہ بکھرے بکھرے نظر آتے ہیں۔ کبھی فرد کے ذہن میں کچھ خیالات جگہ بناتے ہیں تو کبھی ذہن دوسری گرہ میں بندھ جاتا ہے جس کا اظہار نظم کے آخری اشعار سے ہوتا ہے۔

لہذا نظم کے اس تجزیہ کی رو میں ہم دیکھ سکتے ہیں کے نظم اور تحلیل نفسی (Psychoanalysis) کے درمیان گہرا تعلق موجود ہے جیسا کہ نظم انسانی جذبات، لاشعوری خیالات، اور نفسیاتی حالتوں کے اظہار کا اہم ذریعہ ہے۔ نظم کی ساخت اور اس کے موضوعات اکثر انسانی نفسیات کے پیچیدہ

Scanned with OKEN Scanner

پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ نظم کے تخلیقی عمل میں شاعر اپنے لاشعوری کیفیت کا اظہار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نظم میں مختلف علامات، تشبیہات، اور استعارات، خیالات اور احساسات کو بیان کیا جاتا ہے جس کا اظہار شعوری طور کرنا ممکن نہیں اور انہی تمام محرکات کو ہم تحلیل نفسی کے ذریعے بہتر طور پر سمجھے جا سکتے ہیں۔

مثنوی اور تحلیل نفسی:

اردو کے کلاسیکی ادب میں مثنوی کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ صنفی و ہیتی اعتبار سے اس صنف کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس صنف سخن میں مختصر سے طویل قصے کہانی اور واقعات مسلسل تسلسل کے ساتھ بیان کئے جا سکتے ہیں۔ خواہ ان کا تعلق رزم سے ہو یا بزم سے۔ مقدمہ شعر و شاعری میں الطاف حسین حالیؔ نے ادب میں مثنوی کی کارفرمائی اور کار آمد ہونے کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

'' مثنوی، اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بہ کار آمد صنف ہے..... یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب شاعری پر ترجیح دی جاسکتی ہے..... عرب ، شاہ نامے کو قرآن العجم کہتے ہیں۔ اور اسی لئے مثنوی معنوی کی بہ نسبت " هست قرآن در زبان پہلوی کہا گیا ہے ..''۱۵

جیسا کہ تسلیم شدہ ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے لہذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صنف مثنوی اپنے خالق اور عہد و زماں کی ترجمان ہوتی ہے۔ مثنوی ہی سے سماجی رسومات، عقائد، مذہبی و اخلاقی اقدار کا علم ہوتا ہے۔ مثنوی شاعر کے ذہنی داخلی و خارجی تاثرات کا مرقع ہوتی ہے۔ ایک مثنوی نگار، ناول نگار کے مانند ہی واقعات و قصوں میں توازن اور تناسب کا پورا خیال رکھتا ہے۔ صنف ثنوی کی ابتداء کی تلاش میں جب ہم تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو مثنوی کا آغاز ہمیں فارسی ادب تک لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی مثنوی کے آغاز کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

'' صنف مثنوی شعرائے فارسی کی دین ہے۔ اہل فارس نے اس صنف کی ابتداء ہی نہیں کی بلکہ اس کو بام و عروج تک پہنچا دیا۔''۱۶

اردو کے قدیم دور میں صوفیائے کرام نے دین کی تبلیغ و تلقین علم و واعظ کے لئے جس زبان کا سہارا لیا وہ قدیم اردو ہی تھی۔ چونکہ یہ زبان عام بول چال کے اعتبار سے سہل سمجھی گئی جس کے ذریعے اپنی بات دوسروں تک پہنچانا اور ان کو سمجھانا آسان ہو سکا لہذا یہ دور شعری نشست پر منحصر نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس وقت کے اردو کے نقوش ہمیں شعری ہئیت میں شاعری کی شکل میں ملتے ہیں اور یہی شاعری صنف مثنوی کی شکل میں ملحوظ رہی۔ '' **اردو مثنوی کے ارتقاء**'' میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ مختصر مثنوی کے قدیم ترین نمونوں میں حضرت شیخ فرید شکر گنج کی چند صوفیانہ مثنویاں پائی جاتی ہیں تو وہیں حافظ محمد شیرانی '' **پنجاب میں اردو**'' اور مولوی عبدالحق اپنے متعدد مضامین میں ان کی غزل و مثنویوں کے نمونے پیش کرتے ہیں جو بابا شیخ فرید شکر گنج کے نام سے ۶۶۴ ھ سے منسوب ہیں۔

دکن میں اردو شاعری کا باضابطہ آغاز صنف مثنوی سے ہوتا ہے۔ اردو میں سب سے پہلے رکن میں مثنوی لکھی گئی لہذا مثنوی نگاری کی اولیت کا سہرا دکن کے سر اندھا جاتا ہے۔ عبدالقادر سروری اپنی معروف تصنیف **''اردو مثنوی کا ارتقاء''** میں رقمطراز ہیں ہیں کہ :

Scanned with OKEN Scanner

'' اردو میں موجودہ مثنوی کا حقیقی ڈول گجرات اور دکن میں ڈالا گیا۔ اوردکن کے مراکز بیجا پور اور گولکنڈہ کے شعراء نے خاص طور پر اس صنف شاعری کو ترقی دی۔''۱۷

اردو ادب کی پہلی مثنوی کے حوالے سے یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ اردو کی پہلی مثنوی **کدم راؤ پدم راؤ** ہے اور اس مثنوی کے خالق فخر الدین نظامی'' **تاریخ ادب اردو** میں ڈاکٹر جمیل جالبی صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ :

'' اردو زبان کی پہلی مثنوی '' کدم راؤ پدم راؤ '' ہے جس کے مصنف فخر الدین نظامی ہیں ۔''۱۸

کدم راؤ پدم راؤ کو اردو زبان کی پہلی مثنوی کا درجہ اس لئے بھی حاصل ہے چونکہ یہ اس وقت کی وہ پہلی تصنیف ہے جو مثنوی کی ہئیت میں لکھی گئی۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں مثنوی نگاری کا باضابطہ آغاز دکن میں ہوا۔

اردو مثنوی کے آغاز کے حوالے سے محققین کی رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً نصر الدین ہاشمی کے مطابق مثنوی کا آغاز دکن سے ہوا ہے تو وہیں پروفیسر عبدالقادر سروری اس کی ابتداء شمالی ہند میں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

'' ۔۔اردو کے ابتدائی ریختوں کے بعد سب سے پہلے جو نظمیں ہمارے سامنے آتی ہیں وہ مختصر مثنویاں ہیں جو کم و بیش نویں صدی ہجری سے لے کر گیارہویں صدی ہجری کے اوائل تک لکھی گئی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ابتدائی دور کی چھوٹی نظمیں علمائے دین اور صوفیائے کرام کے ارشادات اور ملفوظات پر مشتمل ہیں۔ اور مثنوی کی شکل میں ہیں۔۔۔''۱۹

خواہ اردو مثنوی کا آغاز شمالی ہند میں ہوا لیکن اس صنف سخن نے دکن کے دامن کو مالا مال کیا۔ جہاں تک شمالی ہند میں مثنوی کے آغاز و روایت کا سوال سامنے آتا ہے تو ہمیں یہاں محققین کی رائے میں اتفاق ملنا مشکل معلوم ہوتا ہے چونکہ بعض محققین بابا فرید گنج شکر کو پہلا مثنوی نگار شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ تو وہی دیگر محققین یہ نتائج اخذ کرتے ہیں کہ شمالی ہند کے پہلے مثنوی نگار شاعر بابا فرید نہیں بلکہ افضل ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں کہ :

'' شمالی ہند کی پہلی مکمل مثنوی افضل کی بکٹ کہانی ہے۔ اس میں بارہ ماسہ کی طرز میں ایک برہا کی ماری نازنین اپنے شوہر کو یاد کرتی ہے۔ یہ موضوع ہندی شاعری سے لیا گیا ہے۔ اردو میں مرد کے جذبات اور تجربات رقم کرنے کی روایت ہے۔ بکٹ کہانی میں موضوع کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان بھی ہندی شاعری سے متاثر ہے۔۔۔''۲۰

لہذا ابعد کی تحقیق کو تسلیم کر محققین افضل کو پہلا مثنوی نگار شاعر اور بکٹ کہانی کو شمالی ہند کی پہلی اردو مثنوی کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ مثنوی کے اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہیں اور میر تقی میر کی مثنوی '' مثنوی معاملات عشق'' کا تحلیل نفسی کی رو میں جایزہ لیتے ہیں کہ کس طرح انسانی احساس و جذبات اور داخلی محراکات انسان کی شخصیت کے پوشیدہ پہلوؤں کو علمبردار بنتے ہیں۔ یہاں اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

مثنوی معاملات عشق

کیا بیاں خوبی شکم کو کرے دیکھنے سے کبھو نہ پیٹ بھرے
صدر کے ناحیے سے لے تا ناف چپ کی جگہ ہے کیونکے کہیے صاف

Scanned with OKEN Scanner

اس سے پر آگے غنچہ گل ہے یاں سخن بابت تامل ہے

پردے میں بھی جو کچھ کہا جاوے آپ سے تو نہ تک رہا جاوے

کیو پڑی ران پر نظر تا ساق اس بن اب زندگی ہوئی ہے شاق

وہ قدم کاش فرق سر پر ہو ساق سیمیں مری کمر پر ہو

واسطے جس کے تھا میں آوارہ ہاتھ آئی مرے وہ مہ پارہ

گہ گئے دست دی ہم آغوشی ہم سری ہم کناری ھم دوشی

چند روز اس طرح رہی صحبت پیار اخلاص رابطہ الفت

مذکورہ اشعار میر کے جذبہ جنسیت کی نشاندہی کرتے ہیں جس میں ان کا محبوب ایک مخالف جنس "Hetro-sex" ہے۔ میرؔ کے عشق کے یہ دونوں پہلوان کے عشق مجازی کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور اس مثنوی کے گہرے مطالعے سے میرؔ کی زندگی کے جنسی اور رومانی پہلو سامنے آتے ہیں۔ جیسا کہہ ہم جانتے ہیں کہ ادب دبی ہوئی خواہشات کے اظہار کا ایک بہترین ذریعہ ہے جس کی مدد سے خالق ذہنی کشمکش اور داخلی محرکات کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ میر نے اس مثنوی کو اپنے تصورات عشق کو اپنے داخلی واضطرابی کشاکش و کشمکش سے نجات پانے اور اپنی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ بنایا ہے جس کے اظہار سے اضطرابی کشاکش سے نجات حاصل ہو۔ جو خالق کی تخلیق میں شعوری یا لاشعوری طور پر واضح ہوتے ہیں۔

لاشعور انسانی ذہن کا وہ حصہ ہے جہاں اس کے غیر اخلاقی و معیاری اور جنسی خیالات جمع ہوتے ہیں۔ جس کا اہم خطہ اڈ ہے جو انسان کی تمام جبلتوں کا مرکز ہے۔ قوت اڈ فرد کی نشاط و مسرت اور اس کی آسودگی کے لئے ہمیشہ سر گرم عمل رہتی ہے۔ لہذا یہ انسان کی تسکین کیلئے کسی بھی اقدار و قوائد کی پابند نہیں ہوتی اور کسی نہ کسی وسیلے سے فرد کی خواہش کو پائے تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیتی ہے۔

اس مثنوی کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر کی شخصیت میں " قوت اڈ کی سرگرمیاں عروج پر ہیں چونکہ جب شاعر کی خواہشات جو اس کے محبوب سے وابستہ تھی وہ پایائے تکمیل تک نہیں پہنچتی اور اس کی خواہشات تسکین نہیں پاتی اور کوئی ہیلہ ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کا مہیا نہیں ہوتا تو" قوت اڈ شاعر کو ہم جنسیت کی جانب مرغوب کرتی ہے تاکہ وہ ناآسودہ خواہش کسی صورت آسودگی حاصل کر سکے جبکہ یہ ایک غیر فطری عمل ہے۔ لیکن پھر بھی میر کے یہاں آمرد پرستی کے نمایاں نقوش ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ شاعر کے کلام و مزاج میں ایک جارہانہ رویہ 'ہر جائی' لفظ کی شکل میں نمایا ہوتا ہے۔ جس کے سبب انہیں ایذا طلبی میں سکون ملنے لگتا ہے۔ غالباً شاعر کے یہاں عشق مجازی کے مختلف عناصر نظر آتے ہیں۔ مثلاً میر Hetro-sex سے Homo-sexاور اس کے بعد انحراف نفسی " sexual pervesion اور "Sexual Perversion مسوکیت Masochism کی طرف دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان عناصر کی وضاحت کے لئے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

ہماری چاہ نہ یوست ہی پر ہے موقوف

نہیں ہے وہ تو کوئی اور اس کا بھائی ہو

(Sexual Perversion)

Scanned with OKEN Scanner

اتنا کہا تھا فرش تری رہ کے ہم ہوں کاش

سو تو نے مار مار کے آ کر بچھا دیا

(Masochism)

لہذا میرؔ کے تصورات عشق کے نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کے بعد یہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں کہ میر کا عشق سراسر جنسیت کا حامی تھا جو دیگر عناصر پر بنی رہا۔ بے شک میرؔ کی دردمندی اور ان کے تصورات عشق نے انہیں اردو ادب میں ایک اعلیٰ مقام عطا کیا لیکن ان کے دردمندانہ حالات اور جنونی کیفیت اور افسردگی نے انہیں ہمیشہ انتشار ذات کا شکار رکھا۔

تحلیلِ نفسی سے اردو مثنوی کا گہرا ربط، اس صنف میں بیان کردہ کہانیوں، کرداروں، اور جذباتی کیفیتوں کے نفسیاتی پہلوؤں کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ مثنوی، جو عام طور پر محبت، المیہ، یا صوفیانہ موضوعات پر مبنی ہوتی ہے، انسانی جذبات، خواہشات، اور ذہنی کشمکش کو شعری انداز میں پیش کرتی ہے۔ فرائڈ کے نظریات کے تناظر میں مثنوی میں کرداروں کی خواہشات (Id)، ان کے اعمال اور فیصلے (Ego)، اور اخلاقی یا روحانی اقدار (Superego) کے درمیان جدوجہد کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً، مثنوی میں عاشق اور معشوق کے درمیان محبت کی داستانیں داخلی جذبات اور سماجی اصولوں کے مابین تصادم کی عکاسی کرتی ہیں، جبکہ صوفیانہ مثنویاں انسانی انا کو مٹا کر روحانی تکمیل کی جانب سفر کو اجاگر کرتی ہیں۔ یوں مثنوی تحلیلِ نفسی کے اصولوں کو ادبی شکل میں پیش کرتی ہے، جہاں قاری اپنے اندرونی جذبات اور ذہنی پیچیدگیوں کی عکاسی محسوس کرتا ہے۔

قصیدہ اور تحلیل نفسی:

'' قصیدہ ''لفظ '' قصد سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں مقصود چونکہ اس نظم میں شاعر کا ایک خاص مقصد (مدح یا ہجو وغیرہ) ہوتا ہے، اس لئے یہ نام رکھا گیا۔ قصیدے کی دو قسمیں ہیں۔ اول تمہید یہ ، یہ وہ قصیدہ ہے جس میں اول چند اشعار بطور تمہید کہہ کر مدح یا ہجو وغیرہ شروع کر دیں دوسرے خطابیہ ، دو قصیدہ ہے جس میں بغیر تمہید، ابتدا ہی سے مدح یا ہجو وغیرہ کہی جائے .....''۲۱

اردو ادب کی تمام اصناف میں قصیدہ کو وہی حیثیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں دماغ کو حاصل ہے لہذا اس صنف کو مغز سخن تصور کر "قصیدہ" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس صنف کو دیگر اصناف میں بھی فوقیت حاصل ہے کیونکہ اس کے دامن میں اتنا تنوع ہے کہ کوئی بھی موضوع یا مضمون تسلسل کے ساتھ غزل کی ہئیت میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ہئیتی اعتبار سے قصیدہ کی اہمیت اس بات پر بھی مضمر ہے چونکہ اس کے بطن سے غزل جیسی شاندار صنف سخن پیدا ہوئی۔ لہذا اس صنف کی بہت حد تک وہی ہئیت ہے جو غزل کی ہوتی ہے۔ صنف قصیدے میں مضامین و خیالات کا اظہار مسلسل و مربوط شکل میں کیا جاتا ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے ہر قصیدے کا کوئی نہ کوئی ایک عنوان بھی ہوتا ہے۔ مثلاً در مدح عالمگری ثانیم (در مدح نواب آصف الدولہ) اور در منقبت حضرت علی وغیرہ۔ مشرقی شعر و ادب میں صنف قصیدہ دور جاہلیت کی دین ہے جہاں سے شاعری کی ابتداء ہوتی ہے۔ عربی شاعری میں قصیدے کو ایک اہم جگہ حاصل ہے۔ ظہور اسلام سے قبل ''عکاظ'' کے میلوں میں ہر سال بہت سے قصائد پڑھے جاتے تھے۔ اس عہد میں شہر عرب میں شعر و ادب کے بازار لگائے جاتے تھے۔ ان بازاروں کا نام عکاظ مجنہ اور زوالمجاز تھا۔ یہ بازار عربوں کے لئے ایسے مراکز میں شامل تھے

Scanned with OKEN Scanner

جہاں لوگ دور دراز سے آکر ان میلوں میں اپنا کلام سناتے تھے۔ شعری ہئیت سے ان میلوں میں جس صنف کا استعمال شعرا اپنا کلام سنانے کے لئے کیا کرتے تھے وہ اصناف سخن " قصیدہ" ہوا کرتی تھی۔

عربی شاعری میں قصیدے کا موضوعی دامن بہت وسیع تر تھا۔ لیکن جب اس صنف سخن نے فارسی شاعری کے اثرات قبول کیے تو موضوعات محض مدح و ہجو تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔ قصیدے کے دامن کو مدح و ہجو کے موضوع میں قید کرنے کا کارنامہ فارسی شعرا نے انجام دیا۔ چونکہ فارسی اور اردو شاعری میں قصیدے کا تصور صرف ایسے موضوعات پر بنی ہے جن میں پند و نصیحت، اخلاق و حکمت، گردش زمانہ اور کیفیت پیار وغیرہ ہیں۔ نوعیت کے اعتبار سے قصیدے کی مختلف اقسام ملتی ہیں۔ ظاہری شکل کے پیش نظر ' تمہیدیہ 'اور 'خطابیہ' اور موضوع کے لحاظ سے مدحیہ، وعظیہ، عشقیہ، حالیہ، اور فخریہ ہیں۔ اردو ادب میں جب ہم قصیدے کی ابتدا سے ارتقا کی جانب بڑھتے ہیں اور جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صنف قصیدہ فارسی کے ذریعہ عربی شاعری سے اردو شاعری میں داخل ہوا۔ اردو کے سامنے ابتدا ہی سے فارسی قصائد کے نمونے تھے۔ لہذا اردو میں ہمیں ابتدائی دور میں کوئی کامیاب شاعر نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ اردو ادب کا آغاز دکن سے ہوا۔ وہاں شعراء کے دو طبقے ملتے ہیں۔ ایک طبقہ بادشاہوں کا دوسرا طبقہ درویشوں کا۔ لہذا اس طرح ولی سے پہلے قصیدہ کا رواج نہیں ملتا۔ ولی دکنی نے جو قصیدہ حضرت شاہ وجیہ الدین کی مدح میں لکھا وہ بھی دکنی زبان میں تھا۔ ولی نے کئی قصائد لکھے۔ کچھ عرصہ کے بعد صنف قصیدہ کا زریں عہد شروع ہوا۔ یہ زمانہ سودا کا تھا۔ ذوق، غالب اور مومن جیسے عظیم شعراء نے بھی اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور پھر صنف قصیدہ کی روایت شروع ہوئی اور مختلف مدح و ہجو میں دیگر موضوعات پر قصائد لکھے گئے۔

ابتدا میں قصیدے کا تعلق حقیقت نگاری سے تھا لکن رفتہ رفتہ حقیقت نگاری کی جگہ تمثیل نے لے لی۔ صلہ، انعام واکرام کی چاہ نے اس رنگ کو اور دوبالا کر دیا۔ ذاتی اوصاف، طبقاتی اوصاف میں تبدیل ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ قصیدہ حقیقت نگاری سے بہت دور ہو گیا۔ مدح و ستائش کی روایت قائم ہو گئی۔ پھر اس صنف میں فقط صاحب اقتدار کی شجاعت، عدل، رعب اور دبدبے کی تعریفیں کی جانے لگیں۔ مدح و ستائش کی بنا پر قصیدہ صرف درباروں کی زینت بن کر رہ گیا اور درباروں سے وابستہ ہونے کے باعث جلد زوال کی جانب بڑھنے لگے چونکہ جیسے جیسے دربار ختم ہوئے قصیدہ بھی زوال پزیری کی راہ پر گامزن ہونے لگا۔ محسن کاکوروی نے صنف قصیدہ میں طبع آزمائی کی اور نعتیہ و قصائد لکھ کر اس صنف کو جلا بخشی۔

جس طرح ادب کے زیر اثر انسانی زیست کی ترجمانی کی جاتی ہے لہذا قصیدہ بھی ایک ایسی صنف ہے جو اپنے عہد کے ساتھ ساتھ شاعر کے مقاصد کا بھی اظہار کرتی ہے۔ چونکہ قصیدہ یا تو کسی کی فرمائش کی نظر ہے یا تو پھر ہجو کے پیرائے میں دل کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کا ایک بہتر ذریعہ، دونوں صورتوں میں قصیدے کی تخلیق کے پیچھے کوئی نہ کوئی سبب یا مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔ اردو ادب میں ایسے بیشتر قصائد موجود ہیں جو کسی نہ کسی سلاطین یا نوابین کی فرمائش پر تخلیق کئے گئے یا انعام و مرتبہ کی غرض سے بھی وجود میں آئے۔

تحلیل نفسی کی طرز پر نفسیاتی نقطہ نظر سے گرچہ قصیدے کا مطالعہ کیا جائے انسانی احساسات و جذبات کی بولتی ہوئی تصویر سامنے آجاتی ہے جس میں انسانی جبلت (Instinet) جارحانہ پن (aggressiveness)، آزردگی (Resentment)، آغازیت (Initiation)، احتیاجی تناو (Need Tension)، احترام (Reverence)، اکراہ (نفرت) (Aversion)، انانیت (Egoism)، انبساط (حظ) (Pleasure)، اندرونی احساسیت (Deep Sensibility)، اور ارادہ (Will) وغیرہ جیسی مختلف نفسیاتی علامتیں مضمر ہوتی ہیں۔ جس کا

Scanned with OKEN Scanner

مطالعہ ہمیں شاعر کی داخلی کیفیت کے ساتھ خارجی احساسیت اور اس کے ارادے و مقصد سے جوڑتا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ قصیدہ جو انہوں نے بہادر شاہ ظفر کے لئے تخلیق کیا تھا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب در مدح بہادر شاہ ظفر

مہر عالم تاب کا منظر کھلا
شب کو تھا گنجینہ گوہر کھلا
صبح کو راز مہ و اختر کھلا
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
کعبہ امن و اماں کا در کھلا
راز ہستی اس پر سر تا سر کھلا
مقصدِ نہ چرخ ہفت اختر کھلا
عقدہ احکام پیغمبر کھلا
اس کے سرینگوں کا جب دفتر کھلا
واں لکھا ہے چہرہ قیصر کھلا
تھاں سے وہ غیرت مر مر کھلا
تو کہے بت خانہ آذر کھلا
منصب مردمہ و محور کھلا
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
بادباں کے اٹھتے ہی لنگر کھلا
عرض سے یاں رتبہ جوہر کھلا
بادشاہ کا رایت لشکر کھلا
اب علّوِ پایہ منبر کھلا
اب عیار آبروئے زر کھلا
اب ماں سعی اسکندر کھلا
اب فریب طغرل و سنجر کھلا

صبح دم دروازہ خاور کھلا
خسرو انجم کے آیا صرف میں
وہ بھی تھی اک سیمابا کی کی نمود
ہیں کو اکب کچھ ، نظر آتے ہیں
کچھ
سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو
بزم سلطانی ہوئی آراستہ
شاہ روشن دل، بہادر شہ کہ ہے
وہ کہ جس کی صورت تکوین میں
وہ، کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے
نوسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب
نقش پا کی صورتیں وہ دلفریب
مجھ پہ فیض تربیت سے شاہ کے
پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
خامے نے پائی طبعیت سے مدد
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
سکہ شہ کا ہوا ہے روشناس
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے

جیسا کہ لفظ **"قصیدہ"** سے واضح ہے کہ ارادی طور پر کسی کی مدح و تعریف بیان کرنا۔ مرزا غالبؔ نے یہ قصیدہ بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں لکھا۔ جس کا کچھ حصہ ہم نے اپنے مضمون میں شامل کیا ہے۔ یوں تو قصیدے میں نفسیات کی بیشتر علامتیں ملتی ہیں لیکن یہاں قصیدے کے جو اشعار پیش کئے ہیں ان کا مقصد نفسیات کی روشنی میں موجود علامتوں و اصطلاحوں کو واضح کرنا ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

لفظ ارادہ (will) سے کسی کی تعریف کرنا انسان کے اس جذبے کے پس پشت اس کی کوئی خواہش (Desire) پوشیدہ ہوتی ہے۔ جس کا وہ حصول چاہتا ہے۔ جو فرد کی آسودگی (satisfaction) کا باعث بنتی ہے۔ لیکن یہاں خواہش کی ایک قسم وضعی خواہشات Conventional Desire کارفرما ہے۔

وضعی خواہشات کے حوالے سے سید اقبال امروہوی لکھتے ہیں کہ :

'' یہ خود ساختہ خواہشات ہیں جنہیں افراد اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اپنا لیتے ہیں۔ یہ ایسی خواہشات ہیں جن کے بغیر بھی انسان حیاتیاتی اعتبار سے زندگی گزار سکتا ہے .....'' ۲۲

الغرض یہ نفسیاتی اصطلاح اس قصیدے کا بنیادی جز ہے۔ اس کے علاوہ دوسری اہم علامت احترام (Reverence) کی ہے جو کہ ایک جذبے کی نوعیت رکھتی ہے۔ چونکہ غالب نے مغلیہ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے احترام اور مرتبہ میں خاور، گوہر، خسر وانجم، مہ واختر اور کواکب وغیرہ جیسے الفاظ سے کام لیا ہے۔ جس کا اظہار دیگر تشبیہات، استعارات و کناؤں سے کرتے ہیں۔

جب فرد کو کسی شے کا ادراک ہوتا ہے تبھی عمل سے رد عمل کا سلسلہ جاری ہوتا ہے۔ اس قصیدے میں ادراک توجہ (Perception & Attention) کا دخل ملتا ہے۔ ادراک میں توجہ خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی بنیاد پر ارادہ کرنے کا عمل انجام دیا جاتا ہے۔

اس قصیدے میں بادشاہ کی شان واحترام میں جن الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے اس کا لب لباب سلطان کی انفرادیت (Individuality) سے روشناس کرانا ہے۔ فطری عمل کے نقطہ نظر سے اگر چہ غالب کے اس قصیدہ کا مطالعہ کریں تو یہ صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ کسی مقصد (Purpose) کے حصول کے لئے تخلیق کیا گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس قصیدے کے تحریر کرنے کے پس پردہ غالب کی کوئی غرض شامل تھی۔ جس کے حصول کے لئے انہوں نے اس قصیدہ کو تحریر کیا۔ علم النفس میں انسان کے اس ارادی جذبے کو اس معنی کے خانے میں رکھا جاتا ہے کہ :

'' نفسیات میں البتہ اس کو ایک محرک کی حیثیت دی جاتی ہے۔ اس کے لئے جدو جہد کرنا پڑتی ہے چاہے اس کی شدت کچھ بھی ہو ۔ مقصد کا حصول خوشی اور مسرت کا باعث ہوتا ہے....'' ۲۳

بلا آخر خواہش کی تسکین اس قصیدے کا حاصل ہے۔ یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی عمل اور رد عمل کے لئے انسان کی خواہشات اسے کسی بھی عمل کو انجام دینے پر آمادہ کرتی ہے۔ اور یہ امر انسانی ذہنی قوت اڈ، انا اور فوق النا کے ذریعے عمل میں آتا ہے جس کے ذریعے مقصد (Purpose) کو مقصد (Aim) میں تبدیل کرنے کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔ لہذا اس طرح انسان کا مقصد اس کی خواہش کے ذریعے اس کی تسکین کا ذریعہ بنتا ہے جس پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔ قصیدے کی مخصوص ساخت، جو تمہید، مدح، اور نتیجے پر مشتمل ہوتی ہے، نفسیاتی تسلسل کی عکاسی کرتی ہے۔ قصیدے میں صرف ظاہری مدح وثنا یا ہجو شامل نہیں ہوتی، بلکہ یہ انسانی نفسیات کے پیچیدہ پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ قصیدہ شاعر کے لاشعور، جذبات، اور سماجی رویوں کی عکاسی کرتا ہے، جسے تحلیل نفسی کے ذریعے بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ اس طرح قصیدہ نہ صرف ادبی صنف ہے بلکہ انسانی ذہن کے نفسیاتی سفر کی ایک جھلک بھی ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

مرثیہ اور تحلیل نفسی:

مرثیہ اردو ادب کی ایک مشہور اور اہم صنف سخن ہے۔ لفظ مرثیہ عربی کے لفظ '' رثا'' سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں **میت پر رونا**۔ اس صنف سخن میں اپنے کسی عزیز کی موت پر اظہار غم کرنے کے مرحلے کو قید کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے مرثیہ عربی زبان میں لکھے گئے۔ عرب سے یہ صنف سخن فارسی میں منتقل ہوئی اور پھر اردو ادب میں اس نے جگہ پائی۔

'' 'مرثیہ' '' رثا ''سے متشق ہے جس کے معنی مردے پر رونے کے ہیں۔ واقعہ کربلا سے بیشتر عرب میں مرثیہ لکھنے والے اپنے کسی عزیز یا برگزیدہ شخصیت کے مرنے پر جو اشعار کہتے تھے مرثیہ کہلاتے تھے۔ لیکن اب مرثیے کا اطلاق ان اشعار پر ہوتا ہے جو واقعہ کربلا سے متعلق ہوں اور جن میں سید الشہدا، حضرت امام حسینؓ ، اہل بیتؓ اور ان کے انصارؓ و اعوانؓ کی شہادہؓ اور ان کے مصائب پر اظہار غم کیا جائے ۔ مرثیہ کہلاتے ہیں...'' ۲۴

اردو ادب میں مرثیہ کی ابتد دکن سے ہوئی۔ بہمنی سلاطین شیعت کی جانب مائل تھے اسی وجہ سے شعراء میں حضرت امام کو خراج عقیدت پیش کرنے کا رجحان روز بروز بڑھتا گیا۔ دکن میں شاعری کی ابتداء فاری شعراء کے کلام سے ہوئی۔ چونکہ یہاں دکنی زبان عام طور پر مروج تھی اس لحاظ سے مرثیہ دکنی زبان میں لکھے گئے۔ چنانچہ ایک خاص طبقہ مرثیہ گو کا ابھر کر سامنے آیا اور کثرت سے مرثیہ لکھے گئے۔ یہ وثوق کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ دکنی مرثیہ کہاں سے لکھے گئے کیونکہ عادل شاہی اور قطب شاہی دونوں سلطنتوں کے بانی امامہ مذہب کے پیرو تھے اور اپنی اپنی سلطنتوں کو مذہب شیعت سے منسوب کیا کرتے تھے۔ نظام شاہی، عادل شاہی اور گولکنڈہ حکومت بھی اسی مذہب کے پیرو تھے۔ اس عہد تک قدیم در قدیم جو کتابیں سامنے آئیں وہ نظام شاہی سلطنت کے شاعر اشرف کا 'نوسر بار' ہے۔ اس کے بعد جو مرثیہ منظر عام پر آیا وہ گولکنڈہ کے مشہور و معروف شاعر وجہی کا ہے۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر بھی خود مرثیہ گو تھا۔ اس عہد کے مرثیے غزل کی ہئیت میں لکھے جاتے تھے۔ دکن کے قابل ذکر مرثیہ نگاروں میں قلی قطب شاہ، برہان الدین جانمؔ، ملا وجہیؔ، غواصیؔ، عبداللہ قطب شاہ، سیوکؔ، فائزؔ، لطیف نوریؔ، افضلؔ کاظم اور شاہی وغیرہ ہیں۔

شمالی ہند میں دکن کے مقابل مرثیہ گوئی کا زمانہ بہت بعد میں ملتا ہے۔ تقریباً شمالی ہند میں صنف مرثیہ کا آغاز بارہویں صدی ہجری میں ہوتا ہے۔ اپنے ابتدائی عہد میں مرثیے قصیدے کی ہئیت میں لکھے گئے۔ پھر رفتہ رفتہ مرثیہ نے مسدس کی ہئیت اختیار کی۔ اس ضمن میں مقارش حسین رضوی لکھتے ہیں کہ:

'' شمالی ہندوستان میں اس صنف سخن کی طرف کب توجہ کی گئی اس کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا مگر قائم دہلوی کو پہلا مرثیہ کہنے والا کہا جا سکتا ہے۔ قائم دہلوی کا ذکر شیخ چاند نے اپنے مقالہ سودا میں کیا ہے اور اسے محمد شاہ دہلی سے بہت پہلے کا بتایا.... مگر قائم دہلوی سے بھی پہلے روشن علی سہارنپوری (سہارنگ پور) نے روضہ الشہداء کے انداز کی ایک طویل نظم "عاشور نامہ" کے نام سے لکھی....'' ۲۵

اردو ادب میں دلّی کے حوالے سے جس مرثیہ گو شاعر کو اولین مقام حاصل ہے وہ ہیں سوداؔ۔ سودا نے بیشتر مرثیے لکھے جہاں ہمیں دہلی میں سودا جیسا مرثیہ گو شاعر نظر آتا ہے وہیں دبستان لکھنو میں بھی دیگر شعراء منظر عام پر آئے جنہوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔

Scanned with OKEN Scanner

اردو ادب میں مرثیہ دو طرز پر منحصر ہیں اول (شہید) میدان کربلا کے واقعات پر مبنی عشق حقیقی میں امام حسینؓ اور ان کے گھرانے کی قربانی کی سرگشت سنائی دیتی ہے۔ صنف مرثیہ کا مکمل منظر نامہ درد والم، آہ وبکا کی سرزمین پر آباد ہے۔ اور دوسرے شخصی مرثیہ جو اپنے کسی عزیز کی موت سے جدا ہونے اور اس کی جدائی کے الم کو بیان کرتا ہے۔ دونوں ہی اعتبار سے اردو زبان میں بے حد مواد موجود ہے جیسا کہ جہاں مرثیہ کا ذکر ہوتا ہے انسانی ذہن فوری طور پر میدان کربل کے منظر نامے تک جا پہنچتا ہے۔ جہاں میدان کربلا میں ہونے والے دل انگیز واقعات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اس مرثیہ کا مطالعہ انسانی ذہن و قلب کو اس قدر متاثر کر دیتا ہے کہ قاری وہ تمام رنج والم اپنی ذات میں محسوس کرتا ہے۔ جیسا کہ وہ اپنے کسی عزیز کی مرگ ناگہانی میں کرتا ہے۔ اس کیفیت کو فراموش کرنا ممکن نہیں۔

اردو ادب میں بیشتر تخلیقات ایسی موجود ہیں جو واقعات کربلا اور شخصی مرثیہ پر منحصر ہیں۔ لہذا یہاں ''حضرت علی اصغر'' مرثیہ کا نفسیاتی نقطہ نظر سے تجزیہ پیش کرنا مقصود ہے۔ جو کہ مرزا سلامت علی دبیر کی از حد معروف تخلیق ہے جس میں شیر خوار بچہ پانی نہ ملنے کے باعث بے جان ہو جاتا ہے۔ اس مرثیہ میں بچہ کی اس حالت پر اس کی ماں کی کیفیت کا بیان ہے۔

مرثیہ حضرت علی اصغر

بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے بچے کی نبض دیکھ کے ماں بے حواس ہے
نے دودھ ہے نہ پانی کے ملنے کی آس ہے پھرتی ہے آس پاس، پہ جینے سے پاس ہے
کہتی ہے کیا کروں میں دہائی حسین کی
پتلی پھری ہے آج مرے نور عین کی

فریاد یا علی ! میں کدھر جاؤں یا ملی ان داغوں کو کہاں سے جگر لاؤں یا علی
کسی طرح ان کی سانس کو ٹھہراؤں یا علی پانی کا قحط ہے، میں کہاں پاؤں یا عل
پچھلے کو آنکھ کھولی تھی، اب کھولتے نہیں
روتے نہیں، ہمکتے نہیں بولتے نہیں

ہر دم سکینہ سامنے بھائی کے آتی ہے ہاتھوں میں لے کے ان کے کھیلونے دکھاتی ہے
سہلا کے ننھے تلوے، یہ رو کر سناتی ہے مان جاو بھائی جان، یہ بہنا مناتی ہے
کڑھتی ہیں اماں، آنکھ کو تم کھولتے نہیں
اللہ، ہم پکارتے ہیں، بولتے نہیں

آخر کیا یہ سب ہے بلاؤ امام کو لاؤ خدا کے واسطے لاؤ امام کو
اس بے زباں کا حال سناؤ امام کو نیلی رگیں گلے کی دکھاؤ امام کو
اکبر کا لاش لے گئے ہیں قتل گاہ میں

Scanned with OKEN Scanner

کوئی پکار لو، وہ ابھی ہوں گے راہ میں

)مرزا سلامت علی دبیر(

الغرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ صنف مرثیہ جدائی اور اس جدائی سے ملنے والے یا نہ برداشت ہونے والے لمحات کا بیان ہے۔ تحلیل نفسی کی رو سے علم نفسیات میں اس کیفیت کے لئے محرومی (Deprivation) اکیلے پن کے خوف (Autophobia) ۔ درد و تکلیف کا خوف (Algophobia) جیسی دیگر علامتیں پائی جاتی ہیں۔ جو فرد کی اس کیفیت کا اظہار کرتی ہیں جس سے وہ وقت جدائی گزرتا ہے۔ جس معاشرے میں فرد رشتہ دار، دوست، احباب، خاندان اور گھر والوں کے ساتھ رہ کر اپنی زندگی کے مراحل طے کرتا ہے اس آپسی وابستگی جس کے ذریعہ فرد دوسرے افراد سے جڑا ہوتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح کے جذبے کی بدولت ہوتا ہے۔ اسی جذبہ کی نوعیت سے رشتے ہمکنار ہوتے ہیں اور انہی رشتوں کی بنیاد محبت پر رکھی جاتی ہے۔ غالباً اس طرح رابطے، احساس و جذبات، محبت، پیار، فکر، خیال، ناراضگی، خوشی غم جیسے محرکات کارفرما ہوتے ہیں اور یہی فکری میلان و احساس اپنوں سے جدائی کی نہ برداشتہ کیفیت فرد کو بے چین کرتی ہے اور درد والم کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ زندگی میں ان سبھی رشتوں کی محبت اور ان کا وجود ہمارے لئے لازمی جز بن جاتا ہے جن کا نہ ہونا ہمیں بے قرار کر جاتا ہے اور ان کی موت ہمیں بے جان کر دیتی ہے۔

صنف مرثیہ انسانی ذہن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ جذبات، اخلاقیات، اور سماجی اقدار کے امتزاج نے مرثیے کو ایک منفرد ادبی صنف بنایا ہے، جو نہ صرف ادبی حسن کا مظہر ہے بلکہ انسانی نفسیات کے پیچیدہ گوشوں کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ مرثیہ نہ صرف فرد کے غم کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اسے اجتماعی سطح پر لے جاتا ہے۔ سامعین اس صنف کے ذریعے اپنے دبے ہوئے جذبات اور غم کو ظاہر کرتے ہیں، جو تحلیلِ نفسی کے "کیتھارسس " (Catharsis) کے اصول کے تحت ذہنی سکون کا باعث بنتا ہے۔ اس میں انسانی جذبات جیسے غم، صبر، خوف، اور امید کا اظہار شدت سے کیا جاتا ہے۔ تحلیلِ نفسی کے مطابق، یہ جذبات انسانی ذہن کے ان پوشیدہ گوشوں کو نمایاں کرتے ہیں جو شعوری سطح پر عموماً دبے رہتے ہیں۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ صنف مرثیہ فرد کے ان رشتوں کی شدید محبت کا ترجمان ہے جن کے بغیر فرد اپنی زندگی میں موجود نشاط و مسرت کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔ یوں تو ادب کے تمام اصناف سخن انسان کے کسی نہ کسی احساس و جذبات کی عکاسی کرتے ہیں لیکن مرثیہ فقط محرومی اور رنج والم کا علمبردار ہے۔

تحلیل نفسی کے تناظر میں اردو کی شعری اصناف کا مطالعہ ہمیں انسانی ذہن اور جذبات کی گہری تفہیم فراہم کرتا ہے۔ اردو شاعری کی مختلف اصناف نہ صرف ادب کا سنگھار ہیں بلکہ انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔ ہر صنف میں موجود موضوعات، اسلوب اور جذباتی شدت کو نفسیاتی ماہرین کے اصولوں کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔

غزل، جو عموماً عشق اور غم کے موضوعات پر مبنی ہوتی ہے، انسان کی داخلی کشمکش اور خواہشات (Id) کی عکاسی کرتی ہے۔ غزل میں محبت کی شدت اور غم کی گہرائی، انسان کے لاشعوری جذبات اور خواہشات کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔ نظم میں انسان کی فکری پیچیدگیاں، تخیل اور شعور کی عکاسی ہوتی ہے، جو Ego کی سطح پر سماجی اور ذاتی مسائل کی تفصیل پیش کرتی ہے۔ مثنوی میں کہانی کے ذریعے جذباتی اور اخلاقی کشمکش کو اجاگر کیا جاتا ہے، جہاں کرداروں کی داخلی جدوجہد (Ego اور Superego کے مابین (واضح ہوتی ہے۔ قصیدہ، جو مدح و ستائش کا ذریعہ ہوتا ہے، سماجی اقدار اور ثقافتی

Scanned with OKEN Scanner

اصولوں کی تفہیم میں مددگار ثابت ہوتا ہے، اور مرثیہ، جس میں غم اور الم کی وضاحت کی جاتی ہے، جو انسان کے اجتماعی شعور اور دکھ درد کی گہرائیوں کو پیش کرتا ہے۔

یہ تمام اصناف انسانی تجربات کی مختلف پرتوں کو چھوتی ہیں اور ہر صنف میں پایا جانے والا جذباتی تاثر، نفسیاتی اصولوں کے مطابق انسانی ذہن کی پیچیدگیوں کو واضح کرتا ہے۔ تحلیل نفسی کے اصولوں کے تحت ان اصناف کا تجزیہ ہمیں انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں غوطہ لگانے کا موقع فراہم کرتا ہے، جہاں فرد کی داخلی دنیا، اس کی خواہشات، خوف اور اخلاقی اقدار کی عکاسی کی جاتی ہے۔ اس طرح اردو کی شعری اصناف نہ صرف ادبی جمالیات کو اجاگر کرتی ہیں، بلکہ انسانی ذہن کی گہری تفہیم بھی فراہم کرتی ہیں، جو ایک منفرد نفسیاتی تجربہ پیش کرتی ہیں۔ یہ مضمون ان اصناف کی تاریخی اہمیت اور نمونہ کلام کے ذریعے ان کے نفسیاتی پہلوؤں کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ تحقیق واضح کرتی ہے کہ اردو شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسانی ذہن کی گہرائیوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اردو کی یہ اصناف انسانی جذبات اور نفسیات کو منفرد انداز میں پیش کر کے ادب کو ذہنی اور جذباتی تسکین کا ایک ذریعہ بناتی ہیں۔ یوں یہ مطالعہ ان اصناف کی ادبی و نفسیاتی اہمیت کو اجاگر کرنے میں کامیاب ثابت ہوتا ہے۔

کتابیات

۱۔ جدید اصول و نظریات۔ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ ص ۲۰۸

۲۔ اردو شاعری میں جنسیات۔ ریاض احمد۔ ص ۶۷

۳۔ ادب اور جنسیات مشمولہ ادب اور نفسیات۔ دیویندر اسر۔ ص ۱۱۷

۴۔ جدید اصول و نظریات۔ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ ص ۲۰۸

۵۔ جدید نفسیات۔ سید اقبال امروہوی۔ ص ۳۹

۶۔ شخصیت کے نظریات۔ مترجم ساجدہ زیدی ص ۳۸

۷۔ اصطلاحات نفسیات تشریح و تفہیم۔ سید اقبال امروہوی۔ ۱۶۷۔۱۶۸

۸۔ جدید اصول و نظریات۔ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ ص ۱۹۱

۹۔ جدید اصول و نظریات۔ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ ص ۱۹۱

۱۰۔ تحلیل نفسی۔ حزب اللہ۔ ۹۲

۱۱۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ الطاف حسین حالیؔ۔ ص ۱۲۶

۱۲۔ اصطلاحات نفسیات تشریح و تفہیم۔ سید اقبال امروہوی۔ ص ۲۷

۱۳۔ نظم کا اسلوب (مضمون مشمولہ اردو نظم) شمس الرحمن فاروقی۔ ص ۴۶

۱۴۔ اصناف سخن اور شعری ہیئتیں۔ شمیم احمد۔ ص ۷۸

۱۵۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ الطاف حسین حالیؔ ص ۲۰۲

Scanned with OKEN Scanner

۱۶۔ مثنویات میرؔ کا تنقیدی جائزہ۔ وہاب اشرفی۔ ص ۵۰

۱۷۔ اردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں) ۔ عبدالقادر سروری۔ ص ۳۱

۱۸۔ تاریخ ادب اردو۔ جمیل جالبی۔ ص ۶۰۵

۱۹۔ اردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں) ۔ عبدالقادر سروری۔ ص ۲۴

۲۰۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں۔ ڈاکٹر گیان چند جین۔ ص ۱۲۲

۲۱۔ نظم اردو۔ نسیم امروہوی۔ ص ۱

۲۲۔۔ اصطلاحات نفسیات تشریح و تفہیم۔ سید اقبال امروہوی۔ ص ۱۲۸

۲۳۔۔ اصطلاحات نفسیات تشریح و تفہیم۔ سید اقبال امروہوی۔ ص ۲۴۶

۲۵۔ شمالی ہند کی مرثیہ گوئی۔ سفارش حسین رضوی۔ ص ۵۷

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

سر سید احمد خان اور عصری تعلیم

ڈاکٹر نازیہ چنے گاؤں
شعبۂ اُردو انجمن ڈگری کالج وجئے پور

تلخیص: انسان کو اشرف المخلوقات بنانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ نے انسان کو علم عطا فرمایا، جب تک جو قوم علم سے وابستہ رہے گی وہ سربلند رہے گی، علم سے ہی انسانیت کی پہچان ہے۔ علم رکھنے والے اور علم سے محروم کی مثال تاریکی اور روشنی کی طرح ہے علم رکھنے والا خود بھی روشن ہے اور دوسروں کو بھی روشنی دے سکتا ہے۔ تاریخ میں انہی کے نام ہیں جنہوں نے علم کی تہہ تک رسائی حاصل کی، دنیا میں بہت سارے ماہرین علوم گذرے ہیں جن کا نام تاریخ میں آج بھی نمایاں ہے۔ انہیں ناموں میں ایک نام سر سید احمد خان کا بھی ہے جنہوں نے اپنے علم کا لوہا منوایا اور تاریخ میں اپنا نام باقی رکھا۔

سر سید احمد خان کے بہت سے مذہبی و فکری رجحانات اور افکار سے اختلاف کے باوجود اس اعتقادی نظریہ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف ان کے مداح و ناقدین ہر کسی کو ہے کہ انہوں نے حالات کے پیش نظر مسلمانوں کی تعلیم کا جو خاکہ بنایا تھا وہ ضروری تھا ہم ان کے اسی نظریہ کے متعلق کچھ باتیں ضبط تحریر کر رہے ہیں۔ دنیا میں بہت سے انسان ایسے ملتے ہیں جو صرف اپنی ذات تک یا اپنے گھر یا خاندان کی اصلاح کی فکر رکھتے ہیں مگر بہت کم ہی ایسے لوگ ہیں جو پوری ملت کا درد اپنے اندر رکھتے ہیں انہی میں ایک سر سید احمد خاں بھی ہیں جنہوں نے پوری ملت کا درد اپنے دل میں بسایا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ آنے والی نسل علم و تہذیب، فکر و تدقیق اور کمالات و فضائل کے میدان میں دنیا کی دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہے، ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے حوالے سے سر سید کا نظریہ بالکل واضح تھا کہ وہ تعلیمی ترقی چاہتے تھے۔ سر سید نے مسلم قوم میں تعلیمی زوال کو جس طرح محسوس کیا شاعر اس کی ترجمانی کرتا ہے:

حیرت ہے کہ وہ قوم تعلیم سے ہے پیچھے
جس قوم کا آغاز ہی اقراء سے ہوا ہے

یقیناً قوم مسلم کا آغاز لفظ اقرأ سے ہی ہوا ہے جس میں پڑھنے کا حکم دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کی عظمت و فضیلت کا اظہار کرانا چاہا تو علم کے ذریعہ سے ہی کرادیا حضرت آدم علیہ السلام کے علم کو دیکھ کر فرشتے حیرت میں پڑھ گئے۔ یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ قوم مسلم کے لئے تعلیم، غذا سے بھی زیادہ عزیز ہونی چاہیئے۔ کیوں کہ تعلیم روح کی غذا ہے۔ لیکن جب یہ قوم تعلیم، تہذیب، اخلاقی قدروں سے دور ہوتی گئی تو زوال پذیر ہوتی گئی۔ جب قوم میں علم، خصوصاً جدید علم سے دوری کو سر سید نے محسوس کیا تو انہوں نے ایک انقلاب لانا چاہا وہ اپنی فکر میں کافی حد تک کامیاب رہے یہ اور بات ہے کہ جس وقت انہوں نے جدید تعلیم کی اہمیت کے تعلق سے اپنا نظریہ پیش کیا تھا اس وقت بہت سے اہل علم کو وہ بات سمجھ میں نہ آئی۔ جب سر سید نے دیکھا کہ میری بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے تو انہوں نے خاموشی اختیار کئے بغیر خود اُٹھے اور ایک تحریکی کام انجام دیا۔ بقول شاعر:

Scanned with OKEN Scanner

جلالِ آتشِ برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اُٹھے وہ شباب پیداکر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہوسکے تو تو ہی انقلاب پیدا کر

کلیدی الفاظ

سر سید احمد خان،اور، عصری، تعلیم،اسلاحی تحریکات، سر سید تحریک، تعلیمی نظام

سر سید احمد خاں کا شمار اُردو ادب کی عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے۔آپ کا دل ہمیشہ قوم وملت کے لئے دھڑکتا رہا۔ہندوستان کی اصلاحی تحریکات میں سر سید تحریک نے پہلی مرتبہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم اوران کی اصلاح کے لئے مخلصانہ کوششیں کی۔ سر سید احمد خان کی توجہ ہمیشہ اس بات پر تھی کہ ایک ایسا تعلیمی نظام وضع کیا جائے جو وقت کی ضروریات سے ہم آہنگ ہو۔ سر سید نے قوم کے زوال کو محسوس کرتے ہوئے اس کی تعمیر کے لئے اُٹھے انہوں نے قوم میں بہت سارے ایسے پہلوؤں کو پایا جس کی اصلاح انہوں نے ضروری سمجھی۔ان کی رائے سے ابتداء میں بہت سے اہل علم نے اعتراض کیا مگران کے ترقی پسند فکر کو بعد میں پسند بھی کیا گیا۔ جیساکہ اکبر الہ آبادنے جب سر سید کی فکر کو سمجھااوران کے تحریکی کارناموں کو دیکھاتوانہوں نے کہا:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی، میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبرؔ!
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اکبر الہ آبادی کا بھی یہ خیال تھا کہ سر سید احمد خان میں مسلمانوں کی خیر خواہی پوشیدہ تھی۔ سر سید نے تعلیم ہی کو کامیابی کی کنجی تصور کیااور وہ تعلیم ہی کو برائی بھلائی میں تمیز کرنے، قدرت الٰہی کے ایجادات واختراعات کو سمجھنے اور اخلاق و کردار کی درستگی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ سر سید نے قوم کے لئے تعلیم کی فکر بڑے ہی اعلیٰ سطح پر کی اورانہوں نے اپنے ذہن میں کسی چھوٹے اسکول یامدرسہ کا خانہ تیار نہیں کیابلکہ اس وقت کی سب سے بڑی یوروپی درسگاہوں آکسفورڈ اور کیمبرج کے طرز پر ایک ادارہ کا قیام کاارادہ کیااوراسی غرض سے یوروپ کا سفر کیااس سفر کے کچھ اور بھی مقاصد تھے۔انہوں نے وہاں کی تہذیب، تمدن، رہن سہن،اور تعلیم وتربیت کا بغور مشاہدہ کیااس سے ان کے اندر یہ جذبہ اور تڑپ اور بھی شدت اختیار کر گیا کہ ہماری قوم بھی اسی طرح ترقی یافتہ، مہذب،اور آپس میں محبت ومودت کے ساتھ زندگی گزارنے والی قوم بن جائے اور ان کے اخلاق و کردار کا معیار نہایت ہی اعلیٰ ہو جائےاور تعلیم وتربیت حاصل کر کے وہ بلند مقام پر فائز ہو جائیں۔

سر سید کا نقطہ نظر تھا کہ مسلم قوم کی ترقی کی راہ تعلیم کی مدد سے ہی ہموار کی جاسکتی ہے انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اور دوسری اقوام کے شانہ بشانہ بڑھیں،انہوں نے محض مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ مسلمانوں کے لئے جدید علوم کے حصول کی سہولتیں بھی فراہم

Scanned with OKEN Scanner

کرنے کی پوری کوشش کی، سائنس، ادب اور معاشرتی علوم کی طرف مسلمانوں کو راغب کیا، انگریزی کی تعلیم کو مسلمانوں کی کامیابی کے لئے زینہ قرار دیا تاکہ وہ دوسری قوم کے مساوی معاشرتی درجہ حاصل کر سکیں۔

سرسید احمد خان کی زندگی کا مطالعہ ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ وہ فروغ تعلیم کے تئیں وہکس قدر حساس تھے، اور علوم کے فروغ کے ذریعے ہندوستانی عوام کو اعلیٰ تہذیب و تمدن سے مزین کرنا چاہتے تھے ان کا تصور تعلیم یہ تھا کہ مسلمان تمام علوم میں مہارت حاصل کریں، اور اسی نظریہ اور تصور کے تحت بہت سی قابل قدر اور نمایاں کوششیں سرسید نے کیں۔ ان کے جو مقاصد تھے مورخین نے ان کو مفصل انداز میں پیش کیا ہے ان میں سے کچھ ایک یہ بھی تھے۔

مسلمانوں کی تعلیم کے لئے جو انگریزی ادارے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں ان میں مذہب کے حالات کو دریافت کرنا اور بقدر امکان عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔

مسلمانوں کو نہایت اعلیٰ تعلیم سے ہمکنار کرنا، ان کے فلاح و بہبود کی ہر ممکن کوشش کرنا، اس کی تدبیروں کو سوچنا اور ان پر بحث کرنا وغیرہ۔ مذکورہ بالا مقاصد پر غور کرنے سے ہمیں سرسید کے اعلیٰ نظریہ فروغ تعلیم کا پتہ چلتا ہے اور اس معاملے میں ان کے حد درجہ حساس ہونے کا نمایاں ثبوت ملتا ہے، بقول سرسید ''تعلیم ہی تمام ترقیوں کی اور بلندیوں کی معراج ہے، پہلے علم کے خزانوں کو قابو میں کر لو پھر دنیا کی کوئی بھی دولت حاصل کی جاسکتی ہے۔ علم ہی ہے جو انسان کی ذہنی و فکری سطح کو بلند کرتا ہے، سوچنے، سمجھنے اور میدان عمل میں کچھ کر گزرنے کا یقین اور عزم و حوصلہ عطا کرتا ہے۔ مسائل کی پیچیدگیاں خود بخود سلجھنے لگتی ہیں اور نشان منزل صاف صاف نظر آنے لگتا ہے، یہ تعلیم ہی ہے جو ذہن انسانی کو اس کی جہت عطاء کرتی ہے، مسائل کا ہر رخ سے تجزیہ کرنے کی مہارت پیدا کرتی ہے، مسائل کے حل کرنے کے مختلف طریقوں سے روشناس کر کے بہترین حل کو بروئے کار لانے کی قوت عطا کرتی ہے۔'' سرسید کے اس قول میں قوم کے لئے قیمتی موتیاں موجود ہیں انہوں نے تعلیم کو بلندیوں کی معراج کہا جس میں کسی بھی طرح کا شک نہیں کیا جاسکتا۔

سرسید نے تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی ذہنی تربیت بھی کی، چنانچہ مورخین کے مطابق جہاں پر وہ ایک جدید تعلیم، فکری بلندی و ترقی کے حامل تھے وہیں پر وہ بنیادی طور پر ایک بے مثال مربی و معلم بھی تھے۔ تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدروں کی حفاظت بھی ان کے پیش نظر تھی، عموماً جو لوگ جدید تعلیم اور عصری ترقی کی فکر رکھتے ہیں وہ ادب اخلاق سے محروم رہتے ہیں اور ان کے پاس اخلاق و آداب کی اہمیت نہیں رہتی مگر سرسید اس سے مبراء تھے وہ اپنی قوم میں اخلاقی ترقی بھی چاہتے تھے جو علم کی بنیاد ہے۔ اخلاق کو پروان چڑھانے کے لئے انہوں نے 1870ء میں ''تہذیب الاخلاق'' نامی رسالہ نکالا، اس رسالے کا مقصد بھی مسلمانوں کے اندر سیاسی، سماجی، تعلیمی، تہذیبی، اخلاقی وغیرہ اصلاح تھا۔ اسی وجہ سے اصلاح کے باب میں سرسید کے اقدامات کی تحسین کی جاتی ہے۔

سرسید بہت دور اندیش تھے انہوں نے صدیوں پہلے مسلمانوں کو جدید فکر سے ہم آہنگ ہونے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے جو اقدامات کئے وہ بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں انہوں نے آج سے تقریباً دو صدی قبل یہ اندازہ لگایا تھا کہ تعلیم کے بغیر مسلمانوں کی ترقی ایک ناممکن شئے ہے۔ آج اتنے زمانے کے گزر جانے کے بعد دنیا کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ سرسید اپنے فیصلوں اور ارادوں میں کس قدر مضبوط، مستحکم اور درست تھے اور ان دشوار کن حالات کے باوجود

Scanned with OKEN Scanner

انہوں نے اپنی زندگی تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے اور اسے فروغ دے کر اوج کمال تک پہنچانے میں صرف کر دی، ان میں تعلیم و تربیت کے تمام مسائل حل کرنے کی خداداد صلاحیت بھی موجود تھی۔

جدید تعلیم کے حصول کے لئے جس وقت سر سید نے قوم کو بیدار کیا تھا اگر قوم اس وقت بیدار ہو جاتی تو آج مسلم قوم بڑی ترقی اور بلندی پر ہوتی، مذہبی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو کوئی مذہب بھی تعلیم کے خلاف نہیں، اور خصوصاً مذہب اسلام نے تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان تعلیم و تہذیب کی طرف توجہ دیں۔ جہاں پر سر سید تعلیم بیداری و ترقی چاہتے تھے، ساتھ ہی وہ ہندو مسلم اتحاد بھی چاہتے تھے ان کا ماننا تھا کہ ہندوستان کی ترقی ہندو مسلم اتحاد سے ہی ممکن ہے۔ ایسی ترقی و اتحاد چاہنے والی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے حالات زمانہ کے مخالف کے باوجود اپنے عزائم کو سرد ہونے نہیں دیا بلکہ تن تنہا علی گڈھ تحریک کی بنیاد ڈالی اور قوم کی اصلاح سے لے کر فلاح و بہبود تک بہت سے کام انجام دئے۔ سر سید احمد خان ایک انقلابی و اصلاحی شخصیت تھے جنہوں نے قوم کو زندگی میں ترقی کے نئے اصول بتائے نہ صرف بتایا بلکہ خود اس پر عمل پیرا رہے آج ان کے گذر جانے کے بعد بھی جب کبھی کسی مجلس یا محفل یا حلقہ میں تعلیم و قوم مسلم کی ترقی کی بات ہوتی ہے تو سر سید احمد خان کو کسی نہ کسی طرح ضرور یاد کیا جاتا ہے۔ اور ان کو بڑے بڑے دانشورن خراج عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

سر سید کا نقطہ نظر تھا کہ مسلم قوم کی ترقی کی راہ تعلیم کی مدد سے ہموار کی جاسکتی ہے انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اور دوسری اقوام کے شانہ بشانہ آگے بڑیں انہوں نے محض مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ مسلمانوں کے لئے جدید علوم کے حصول کی سہولتیں بھی فراہم کرنے کی پوری کوشش کی انہوں نے سائنس جدید ادب اور معاشرتی علوم کو مسلمانوں کی کامیابی کا زینہ قرار دیا۔

یہ دنیا چاہے جو کچھ بھی کہے اکبرؔ یہ کہتا ہے
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں
ترے احسان رہ رہ کر سدا یاد آئیں گے اِن کو
کریں گے تذکرہ مجلس میں اور دہرائیں گے ان کو

سر سید احمد خان کی زندگی کا حصہ بر صغیر کے مسلمانوں کو حسن و عشق کی فضاؤں سے نکال کر میدان عمل میں لے جانا تھا اس وقت کے ادیب طرز بیان پر روز دیتے تھے اور ان کی تحریریں بے مقصد ہوتی تھی انہوں نے زمانے کی اس روایت سے بغاوت کرتے ہوئے تحریروں میں طرز بیان سے زیادہ مقصدیت پر زور دیا ایسی تحریریں قلم بند کی جن سے قوم میں شعور پیدا ہو۔

سر سید کا ایک بڑا کارنامہ اپنے حلقہ احباب میں علم و ادب کا ذوق اور تلاش و تحقیق کا جذبہ بیدار کرنا تھا۔ ان کا کامل یقین تھا کہ مسلمانوں کی ذہنی اور سماجی بیماریوں کا واحد علاج انگریزی زبان اور مغربی علوم کا حصول ہے اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر وہ تمام عمر جد و جہد کرتے رہے۔ سر سید احمد خان کا شمار ایسی انقلاب آفریں شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے فکر و عمل کے ذریعہ اپنی قوم کے فرسودہ خیالات اور جمود میں طغیانی پیدا کی اور ان کا یہ کارنامہ صدیوں یاد کیا جائے گا۔

Scanned with OKEN Scanner

سر سید اپنے اخلاق اپنی سیرت اپنے علم اور دور اندیشی کی بدولت سب کے ذہنوں پر چھا گئے یہی وجہ ہے کہ باد سموم نے نیم سے شکست قبول کرلی اور سر سید کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے:

بہ قول حالی:

بہت جھکڑ چلے اور آئیں اکثر آندھیاں لیکن
رہا گلزار ہوکر باغ جو تونے لگایا ہے

بقول پروفیسر اختر الواسع:

"سر سید احمد خان جدید ہندوستان کے معماروں میں سے ایک تھے علم و حکمت کی جو شمعِ ہدایت
انہوں نے روشن کی اس کا فیض آج تک جاری ہے سر سید اپنی ذات میں ایک ایسا منار نور تھے جس کا سایہ
جس پر بھی پڑ گیا وہ علم و عمل کا چراغ بن گیا۔"

سر سید احمد خان نے ہندوستانی مسلمانوں کو جمود سے نکالنے اور پھر انہیں باعزت قوم بنانے کے لئے سخت جدوجہد کی آپ ایک زبردست بلند خیال مفکر اور جلیل القدر مصلح تھے سر سید احمد خان نے مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب زمین مسلمانوں پر تنگ تھی۔

سر سید احمد خاں کی شخصیت انتہائی فیاضی اور ان کے نگاہ بے پناہ دور بین واقع ہوئی تھی انہوں نے اپنے دور کے حالات کے آئینیٔ میں آنے والے سائنسی ترقی کے زمانے کا نہ صرف عکس دیکھ لیا تھا اور اس کے لحاظ سے وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بے قرار تھے۔

سر سید احمد خاں کے تعلیمی تصورات میں مفید اور کار آمد تعلیم کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد، فروغ وطنیت، اتحاد و اتفاق، قومی یکجہتی، تجارتی اور معاشی ترقی اردو زبان و ادب کی توسیع و اشاعت عدم لسانی لقب دین و دنیا کی بھلائی اور آنے والے ترقی یافتہ اور تیز رفتاری سے ہم آہنگ ہونے کی سرگرمی بھی کچھ شامل تھے۔

دراصل سر سید حقیقی معنی میں مسلم معاشرے کو تہذیب نو کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے ان کے ذہن میں نئی تہذیب کا جو تصور تھا وہ مغرب میں رونما ہونے والی عہد ساز تبدیلیوں کے پیش نظر تھا لیکن وہ مشرقی تہذیب کے خلاف نہیں تھے نہ ہی اپنی روایات و اقدار کو مسترد کرنے کے حق میں تھے وہ تو ایک ایسی مشترک تہذیب کے وکیل تھے جس میں نئے تمدن کی پرکشش بھی ہوں اور مسلمانوں کی اپنی صدیوں کی پروردہ حقائق وراثت بھی وہ دراصل قدیم و جدید کے امتزاج احسن کے حق میں تھے۔ جس کا جیتا جاگتا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے ایک طرف علی گڑھ کی درس گاہ کے ذریعیٔ تعلیم انگریزی زبان کو تجویز کیا اور سائنسی علوم کی تعلیم رائج کی دوسری طرف انہوں نے عربی فارسی اور اُردو میں ہی نہیں اسلامیات اور دینیات کے شعبے بھی قائم کئے سر سید نے اپنی قوم کے لئے جو خواب دیکھا تھا وہ کوئی معمولی خواب نہیں تھا وہ علی گڑھ میں صرف ایک دانش گاہ کے قیام کے خواہش مند نہیں تھے بلکہ آکسفورڈ یا مسلم کیمبرج کا قیام ان کے پیش نظر تھا لہٰذا ایک موقع پر انہوں نے فرمایا:

Scanned with OKEN Scanner

"جو علوم سات سو برس پہلے ہماری قوم کی تعلیم میں داخل ہوتے تھے اگر آج ہم انہیں پر قناعت کریں گے تو گویا ہم اپنی قوم کو حال کی ترقی سے سات سو برس پیچھے لے جائیں گے پس ہم کو مضبوطی کے ساتھ ارادہ کرنا چاہئے کہ جس قدر علوم دنیاوی تعلیم سے متعلق ہیں مثلاً الجبراء، زوالوجی، جیالوجی، فزکس، لوجک، مارل، فلوسفی، کیمسٹری اور تمام علوم جو ترقی یافتہ قوموں میں رائج ہیں ان کی تعلیم بڑے اہتمام اور کامل طور سے دیں۔"

سائنٹفک سوسائٹی کا قیام سرسید کے انہیں خوابوں کی تعبیر کا وسیلہ تھی۔بقول پروفیسر سید لطیف حسین کاظمی:

"سرسید کا فلسفہ تعلیم جداگانہ تھا وہ تعلیم سے مراد صرف لکھنا پڑھنا اور سیکھنا مراد نہیں لیتے تھے بلکہ وہ تعلیم کو انسان کی ہمہ جہت ترقیاتی منصوبوں کا ضامن قرار دیتے تھے وہ تعلیم کو اخلاقی بلندی مہذب رویہ اور ذہن کشادگی کا بہترین وسیلہ سمجھتے تھے۔"

سرسید احمد خاں فرماتے ہیں، میں اپنی قوم میں ہزاروں خوبیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ، جرات مندی اور بینائی پاتا ہوں، خوفناک، ان میں قوی استقلال دیکھتا ہوں پر بے ڈھنگا ان میں صبر و قناعت بھی ہے پر بے موقع پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جائیں تو دین و دنیا دونوں کے لئے کیسی کچھ مفید ہوں (مقالات سرسید)

سرسید احمد خاں مسلمانوں کو دینی اور دنیاوی علوم دونوں کے حق میں تھے۔ سرسید احمد خاں قومی تعلیم کے حصول پر زور دیتے تھے اور قوم سے اس طرح کہتے تھے کہ ان کے ایک ایک لفظ سے دردمندی اور عبرت جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے جسے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

"اے میری قوم کے لوگو! اپنے عزیز اور پیارے بچوں کو غارت نہ کرو ان کی پرورش کرو ان کی آئندہ زندگی اچھی طرح بسر ہونے کا سامان کرو مجھ کو تم کچھ ہی کہو میری بات سنو یا نہ سنو مگر یاد رکھو کہ اگر تم ایک قومی تعلیم کے طور پر ان کو تعلیم نہ دوگے تو وہ آوارہ اور خراب ہوں گے تم ان کی ابتر حالت کو دیکھوگے اور بے چین ہوگے روؤگے اور کچھ نہ کر سکو تم اگر مر جاؤگے تو اپنی اولاد کی خراب زندگی دیکھ کر تمہاری روحیں قبروں میں تڑپیں گی اور تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔"

سرسید نے قوم کی اصلاح و ترقی کا ایک ہمہ گیر منصوبہ بنایا تھا جس میں تعلیم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ سرسید احمد خاں نہ صرف ایک بلند کردار انسان تھے بلکہ روشن خیالی اور روشن دماغی کے ساتھ انہوں نے ہندوسانیوں میں جدید تعلیم کے حصول کے لئے پورے تن من دھن سے اپنے آپ کو واقف کر دیا تھا۔

سرسید کا خیال تھا کہ ہندوستان کے ہندو ہم وطن بھائی انگریزی تعلیم اپنا کر جدید ترقی کی دوڑ میں آگے نکل رہے ہیں اس طرح مسلمانوں کو بھی جدید مغربی تعلیم کو اپنا کر اپنے ہندو ہم وطن بھائیوں کے شانہ بشانہ ترقی کی دوڑ میں شامل ہو جانا چاہئے اور اسی مقصد کے تحت انہوں نے ایک تنظیم کمیٹی

Scanned with OKEN Scanner

درخواستگاران ترقی تعلیم قائم کی اور مغربی تعلیمی ترقی سے تحریک پاکر ایک اعلیٰ معیاری درسگاہ کا منصوبہ بنایا جو ایم اے او کالج کے صورت میں علی گڈھ میں عمل پذیر ہوا۔

1857ء کے بعد کے حالات اور سرسید کی علی گڈھ تحریک نے غیر منقسم ہندوستان کے گوشے گوشے کو متاثر کیا جس سے پورے بر صغیر میں ایک علمی وادبی ماحول پیدا ہوا۔ سرسید احمد خاں کے ذہن میں ہندوستانیوں کے لئے جس جدید انگریزی تعلیم اور مغربی سائنس کے حصول کا تصور تھا وہ نہایت وسیع اور ہمہ گیر تھا اور وہ مسلمانوں کے لئے جس قسم کی جدید تعلیم کے لئے سرگرم عمل تھے اس میں کسی بھی حال میں مذہب عقیدہ اور تہذیب و معاشرت کو داؤ پر لگائے بغیر بلکہ ان کے تحفظ وبقا کے ساتھ دلانے کے ہمنوا تھے مغربی تعلیم وسائنس سے ہندوستانیوں کو فائدہ پہنچنے والا تھا لیکن لارڈ میکالے کی وہ ہندوستانیوں کو محض سند یافتہ بنانے کے قائل نہیں تھے بلکہ لارڈ میکالے کی فکر کے برخلاف ہندوستانیوں کا ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا کرنا چاہتے تھے جس میں ذہنی وفکری بیداری ہو اپنے حقوق کے جرات ہو قناعت پسندی اور توہم پرستی کے بجائے حقائق پسندی ہو اور وقت وحالات کے قدموں کی آہٹ پہچانے کی صلاحیت کا حامل ہو۔

سائنٹفک سوسائٹی قائم کی شہر کے ہندو مسلمان دونوں نے اس کام میں تعاون کیا دو لیفٹیننٹ گورنروں نے اس کی سرپرستی قبول کی سوسائٹی کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مفید علوم کی کتابیں اپنی زبان میں منتقل کی جائیں تاکہ جدید تعلیم کو عوام وخواص میں فروغ حاصل ہو۔ بقول آفتاب احمد آفاقی:

> "سرسید جیسی نابغہ روزگار شخصیت کی معنویت کسی ایک عہد قوم یا علاقے تک محدود نہیں جدید ہندوستان کی تہذیب و تعمیر میں سرسید کی خدمات تاریخ میں ایک نئے باب کی حیثیت رکھتی ہے سرسید تحریک ان کے تعلیمی افکار و نظریات نیز ان کی عملی زندگی میں بہ آسانی دیکھی جاسکتی ہے حقیقت یہ کہ ان کی نظری علمی ادبی اور تعلیمی خدمات قیمتی اثاثے کی حکم رکھتی ہیں۔"

سرسید کی دوراندیشی اور دانشوری عصر حاضر یعنی جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے عہد میں بھی بے حد اہمیت کی حامل ہے جہاں تک سرسید کے افکار وخیالات اور جدید تعلیمی معیار کے اثاثے کی معنویت اور استفادے کا سوال ہے تو ان کے نظریات وتصورات کو کسی ایک عہد سے منسوب نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کے علمی وادبی اصلاحی واخلاقی تصورات اور کارنامے اپنے عہد میں بھی مفید وکارآمد تھے اور آج بھی۔

سرسید کے نزدیک معاشرتی اصلاح کے لئے تعلیم سب سے زیادہ ضروری چیز تھی سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان اس ضرورت کو محسوس کریں۔ سرسید جانتے تھے کہ اچھی تعلیم صرف چند کتابوں کے پڑھ لینے اور طوطے کی طرح یاد کرنے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے سب سے عمدہ تعلیم دینے والی ایک عمدہ سوسائٹی ہے۔ سرسید تعلیم کو خاص وعام سب کے لئے ضروری بتاتے ہیں۔

یہ راز تو سرسید نے بہت پہلے پالیا تھا کہ ہندوستانیوں کی ترقی سربلندی کے لئے تعلیم بہت ضروری ہے 1859ء میں انہوں نے مرادآباد میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا 1863ء میں جب وہ غازی پور میں تھے تو انہوں نے تعلیم کے میدان میں ایک نہایت اہم قدم اٹھایا انہوں نے مسلمانوں کی زبوں حالی کا واحد سبب جو سرسید نے محسوس کیا وہ تھا جدید تعلیم سے بے بہرہ ہونا تھا۔ سرسید نے تعلیم خصوصاً جدید تعلیم کو اولیت دی ان کے نزدیک جدید تعلیم ہی وہ واحد راستہ ہے جس کے ذریعہ مسلمان قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم:

Scanned with OKEN Scanner

"سرسید کی بیشتر کتابیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے ماضی سے زبردست عشق تھا لیکن چونکہ وہ برطانوی حکومت کے ملازم رہے تھے اور انہیں انگریزوں سے قریب رہنے کا اتفاق تھا یہی نہیں بلکہ انہوں نے لندن کا سفر بھی کیا تھا اس لئے ان کی دور رس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر مسلمان جدید تعلیم حاصل نہیں کریں گے تو وہ تعلیمی اور سماجی اعتبار سے ہندوستان کے دوسرے مذہبی گروہوں کے مقابلے میں پسماندہ رہ جائیں اس لئے سرسید نے ایک طرف مصلح قوم کا اول ادا کرنا شروع کیا اور دوسری طرف مسلمانوں کو جدید تعلیم کی برکتوں سے واقف کرایا۔"

سرسید کے نزدیک معاشرتی اصلاح کے لئے تعلیم یافتہ ہونا انتہائی اہم ہے یہی وجہ تھی کہ سرسید فکر مند رہتے تھے کہ مسلمان تعلیم کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے بچوں کو تعلیم دیں۔ان کی فکر آفاقی تھی۔ قوم کی تعلیم و ترقی کے لیے بے مثال خدمات انجام دیں۔ان کی کاوشیں آج بھی علم و عمل کی دعوت دیتی ہیں۔ڈاکٹر خلیق انجم کے اس اقتباس سے ان کی فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتابیات:

	کتاب کا نام	مصنف
۱)	سرسید احمد خاں	میر نجابت علی
۲)	اُردو صحافت اور سرسید احمد خاں	عبدالحئ
۳)	سرسید احمد خاں کی نثری خدمات	ڈاکٹر مشتاق احمد
۴)	فکر و نظر	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۵)	سرسید اور علی گڑھ تحریک	پروفیسر خلیق احمد نظامی

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

ناول "عنبرین"۔ایک تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر کے۔ایچ۔ کلیم اللہ

نائب پرنسپل (اکاڈمک) صدر، شعبۂ اردو،

مظہر العلوم کالج (خود مختار) آمبور، تمل ناڈو

تلخیص :امیر النساء کا یہ ناول "عنبرین" ایک اصلاحی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے۔اس ناول میں سماجی برائیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس میں عنبرین کا کردار ایک آدرش کردار ہے۔ناول کا کینوس مختصر ہے۔نوشین بیگم کا کردار اور عنبرین کا کردار دونوں ہی کو متحرک دکھایا گیا ہے اور دونوں ہی کردار مؤثر ہیں۔امیر النساء کے دیگر افسانوں کی طرح اس ناول میں بھی خیر و شر کی کشمکش نظر آتی ہے اور بالآخر ناول نگار نے عنبرین کے اصلاحی خیالات کو اجاگر کرنے کو شش کی ہے۔امیر النساء نے عنبرین کے کردار میں اسلامی اقدار کو نمایاں کیا ہے۔پردہ عورت کی حیا اور عفت کا ضامن ہے۔گھر کی چار دیواری میں رہ کر عورتیں روزگار کے مواقع حاصل کر سکتی ہیں۔امیر النساء نے عورتوں کی تعلیم کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔اصلاحی نقطۂ نظر سے یہ ان کا شاہکار ناول ہے۔

کلیدی الفاظ: سماجی اصلاح# خیر و شر #امارات کا غرور #غربت کی مجبوری# نظریۂ حیات# گھر کی چار دیواری# لڑکیوں کی تعلیم# فضول خرچی#۔

امیر النساء کا یہ ناول "عنبرین" سماجی اصلاح کے نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے۔ناول میں چوں کہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویروں کو پیش کیا جاتا ہے یہاں بھی امیر النساء نے امارات کا غرور اور غربت کی مجبوری کا نقشہ خوبصورت انداز میں پیش کر کے اصلاحِ سماج کی کوشش کی ہے۔ان کے تصنیف کردہ افسانوں کی طرح اس ناول میں بھی گھریلو زندگی میں پیش آنے والے معاملات، روز مرّہ میں پیش آنے والے واقعات کا بخوبی جائزہ لیا ہے اور یہ درس دیا ہے کہ ہر ایک سے ہمدردی، غم خواری، اخوت و بھائی چارگی بلکہ انسانی اقدار کی پاسداری ضروری ہے۔ہر ناول کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوا کرتا ہے، اس ناول میں امیر النساء نے نظریۂ حیات پر زور دیا ہے۔اگرچہ کہ بعض جگہ طویل مکالموں سے ناول کا فن مجروح ہوتا نظر آتا ہے لیکن ناول نگار اپنے مقصد کو پیش کرنے میں حتّٰی امکان کامیاب نظر آتی ہیں۔پروفیسر نجم الھدیٰ کے الفاظ میں:

"ان کا پہلا ناول ہے۔ناول کی تکنیک، پلاٹ سازی اور کردار نگاری کے اعتبار سے دیکھنے کی بجائے اس میں پائے جانے والے نظریۂ حیات پر میں زور دینا چاہتا ہوں۔مصنفہ کا مطمحِ نظر اتنا واضح ہے کہ اس سے ناول کا کوئی قاری اختلاف نہیں کرے گا۔انھوں نے اپنے ناول کو ایک خاص بامعنی اور تعمیری رخ دینے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش بہت حد تک کامیاب ہے۔(پروفیسر نجم الھدیٰ پیش لفظ "عنبرین" صفحہ 6(ب((

امیر النساء کا یہ ناول عین اسلامی تعلیمات کا درس دیتا ہے۔اس میں انھوں نے قرآن اور حدیث کے حوالے سے بہت سی باتیں بتائی ہے۔امیر النساء کا یہ ناول "عنبرین" کی اشاعت 1981ء میں ہوئی ہے۔شاید اس زمانے میں خواتین کا ناول لکھنا تو دور کی بات، انھیں ناول پڑھنے سے

Scanned with OKEN Scanner

بھی منع کیا جاتا تھا۔اس لیے کہ ناول پڑھنا اخلاقی بُرائی سمجھی جاتی تھی چوں کہ ناول میں عام طور سے ہر بات کھلم کھلا پیش کر دی جاتی تھی جس میں فحش گوئی، عریانیت اور خفیہ حقیقت شامل ہیں، ہمارے سامنے ایسے بہت سے خواتین ناول نگار ہیں جنھوں نے ناول کو اپنے مقاصد کا حربہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہاں پر میں ان ناول نگاروں کا نام لینا نہیں چاہتا یہ تو ہر ایک کے علم میں ہے۔ جہاں تک "عنبرین" کا تعلق ہے یہ ناول ہر خاتون کو پڑھنا چاہئے تاکہ سماج میں جینے کے طور طریقے اور آداب واطوار سے واقف ہوں اور سماج میں اونچ نیچ کا فرق کو ختم کر کے ایک صالح معاشرہ کی بنیاد رکھیں، جو محبت و یگانگت اور دوستانہ فضا کا ضامن ہو۔ امیر طبقہ اپنی دولت و جاہت سے غریب طبقہ کو مجبور کر رہا ہے۔ اپنی شان و شوکت کے مظاہرے کے لیے فضول خرچی میں مبتلا ہے۔ بے جا رسومات اور تکلفات سے سماج میں بُرا اثر چھوڑ رہا ہے۔ یہاں پر ناول نگار نے اس بُرائی کو نہ صرف سماجی بُرائی ظاہر کی ہے بلکہ اسلامی طریقۂ کار کے خلاف بتا کر گویا احکامِ خداوندی کی مہر بھی ثبت کی ہے۔ ولیمہ کو سنت قرار دے کر غریب لوگوں کو زیادہ سے زیادہ شامل کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے غریب پروری کا ثبوت دیا ہے۔ عام طور سے امیروں کی مہمان نوازی بہت خوب ہوتی ہے اور غریبوں کی طرف کچھ التفات نہیں ہوتا ہے اور غریبوں کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا ہے گویا وہ بن بلائے مہمان ہیں۔ سماج کی اس بُرائی کا ناول نگار نے پردہ فاش کیا ہے۔ عنبریں نے اپنے چچازاد بہن غزالہ کو اس سماجی بُرائی سے متنبہ کرنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ "ویسے تو تم نئے دور سے تعلق رکھتی ہو، مگر تمھیں سو سال پہلے پیدا ہونا چاہئے" گویا وہ یہ کہنا چاہتی ہے کہ یہ اونٹوں کا زمانہ نہیں رہا یہ تو راکٹوں بلکہ سیٹالائٹ کا زمانہ ہے۔

نوشین بیگم اور عنبرین کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لیے ہمیشہ ماں اور بیٹی میں بحث ہوتی رہتی ہے لیکن ناول نگار نے ماں کے رتبہ کو کم ہونے نہیں دیا ہمیشہ عنبرین کی گفتگو اور لب ولہجہ میں ماں کی عظمت اور محبت کا توازن باقی رکھا۔ جہاں کہیں ایسے مواقع آئے کہ ماں کی دل شکنی ہو، عنبرین نے وہاں یہ تو احتیاط کا پہلو اختیار کیا یا پھر خاموشی۔ یہ تعلیم سماج کی بھی ہے بلکہ اسلامی احکامات کے عین مطابق بھی۔ بقول امیر النساء

"نوشین بیگم اور عنبرین کہنے کو تو دونوں ماں بیٹی تھیں، مگر دونوں کے مزاج اتنے مختلف تھے جیسے ندی کے دو کنارے، مزاجوں کا یہ اختلاف اگرچہ ان کی محبت میں کمی کا سبب نہیں بنتا تھا، مگر خیالات دونوں کے آپس میں کبھی کبھی ٹکرا بھی جاتے تھے۔۔۔۔۔اس کی باتوں سے نہ مخالف کی دل شکنی ہوتی تھی، نہ دل آزاری۔" ("عنبرین" امیر النساء صفحہ 27(

شمیم بیگم جو نوشین بیگم کی خالہ تھیں، ناول نگار نے اس کردار کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ اس کی غربت و مجبوری اور اپنی بھانجی کی دل آزاری پر صبر کرنا اور تحمل سے کام لینا، جو اس کردار کی اخلاقی خوبیاں کا مظہر ہے۔ نوشین بیگم اپنی حقیقی خالہ کو عنبرین کی کھلائی کہتی ہے اور اپنے زمینوں کی دیکھ بھال کرنے والی نوکرانی بتانے کے باوجود صبر و تحمل سے کام لیتی ہے، اُف تک نہیں کرتی اور اس نے اپنے بھانجی کی امیرانہ شان و شوکت پر دھبّا آنے نہیں دیا۔

عنبرین کے کردار میں اسلامی مزاج سمادیا گیا ہے، بازار سے زیادہ اسے گھر کی چار دیواری میں عافیت محسوس ہوتی ہے، اس کو ہوٹلوں کی پارٹی سے زیادہ کچن سنبھال میں مزہ ملتا ہے۔ یہاں تک کہ سیر و تفریح سے گریز کرتی ہے۔ ایسی کتابیں پڑھنا جو اخلاقی درس دیتی ہوں، ایسے رسالوں سے گریز کرنا جو اسے زندگی سے بیزاری سکھاتی ہوں اور عام لڑکیوں کی طرح اسے فلمی رسالے پڑھنا تک منظور نہیں۔ وہ ایسی کتابیں پڑھنے کی خواہاں تھی جو

Scanned with OKEN Scanner

اسے اسلامی معاشرہ کی رہنمائی کرے اور وہ خود کہتی ہے کہ میرے زیرِ مطالعہ کتاب اس وقت "پردہ" ہے۔اس کی اس خصلت سے نوشین بیگم نالاں تھیں۔

"عنبرین کے قالب میں بوڑھی روح سماگئی ہے،اس سے کسی قسم کی توقع رکھنا ہی فضول ہے۔۔۔۔۔الٹا مجھ سے کہتی ہے کہ میں باہر نہ جاؤں۔گھر کے اندر جو سکون ہے وہ باہر کے شور شرابے میں نہیں۔" (عنبرین صفحہ 40(

نوشین بیگم کی " یہ ہاتھ لے اور یہ ہاتھ دے (Give and Take Policy) "عنبرین کو پسند نہ تھی۔امیر لوگوں کے لیے قیمتی تحفہ دیں،اس لیے کہ وہ بھی قیمتی دیتے ہیں۔غریبوں کے لیے سستا تحفہ اس لیے کہ ان سے واپسی کی امید نہیں۔عنبرین کم اور زیادہ کا فرق مٹانا دینا چاہتی ہے۔ناول نگار نے عنبرین کی وطن پرستی اور محبّ الوطنی کو پیش کیا ہے۔اس نے ملک میں بنی ہوئی چیزوں کو غیر ملکی اشیاء پر ترجیح دی ہے اور سالگرہ منانا جو مغربی تہذیب کی تقلید،یہ بھی وہ پسند نہیں کرتی جس میں بے جا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔وہ یہ چاہتی ہے کہ کاش یہ روپے کسی غریب کے کام آتے۔

نوشین بیگم کا کردار غریب پروری کے منافع ہے وہ یہ کہتی ہے کہ ہر ایک کا ٹھیکہ کیا ہمیں نے لے رکھا ہے۔ایسے تو دنیا میں کئی غریب لوگ رہتے ہیں،بقول غالبؔ ع

کس کی حاجت روا کرے کوئی

بقول نوشین بیگم:

"اگر غریب اپنی غریبی کی وجہ سے پریشان ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور،نہ تو ہم ان کی غریبی کے ذمہ دار ہیں نہ ان کی پریشانیوں کے۔وہ اگر دولت مند بننا چاہتے ہیں تو بن جائیں خوشی سے ، ہم نے روکا تھوڑی۔۔۔۔ ہر ایک اپنے مقدر کا کھاتا ہے۔ ہم نے کسی کی جاگیر نہیں چھینی۔("عنبرین" صفحہ 49(

عنبرین کو شہر کی زندگی سے زیادہ دیہاتی ماحول زیادہ پسند ہے۔اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عنبرین کے مزاج میں سادگی اور بے تکلّفی پائی جاتی ہے۔شہر کی زندگی میں بے جا فضول خرچی،رسم ورواج تکلّفات ہوتے ہیں۔دیہات میں کفایت شعار،فضول خرچی سے احتراز،بے جا تکلّفات اور نام ونمود سے پرہیز کیا جاتا ہے۔اسی لیے شعیب نوشین بیگم کے سامنے معتوب نظر آتا ہے۔شعیب دیہات کا پروردہ ہے،جی حضوری اس کی طبیعت میں نہیں تھی،خودداری اس کے مزاج میں رچ بس گئی تھی۔اس کی نظر میں اپنے اور غیر سب برابر تھے۔اس کردار کے ذریعے ناول نگار نے امارات کے سامنے سر جھکانے کے بجائے خودداری اور غیرت کی تعلیم دی ہے۔یہی سادگی اور بے تکلّفی عنبرین کے لیے شعیب جیسے لڑکے کو اپنا شریکِ حیات بنانے پر آمادہ کیا۔عنبرین نے دولت مند بیگم عتیق الرحمٰن کے لڑکے سے بیاہی جانے کے ایک ایسے لڑکے شعیب سے اپنی شادی کے لیے منظوری دی ہے جو خود اپنے ماتحت پرورش پایا ہے،عنبرین کا فیصلہ ناول نگار کے نظریۂ حیات کو تقویت دیتا ہے۔

"بیٹی بچاؤ ، بیٹی پڑھاؤ" کا نعرہ آج سے تقریباً تیس سال پہلے امیر النساء نے لگادیا تھا،انھوں نے اس ناول میں لڑکیوں کی تعلیم پر بہت زور دیا ہے۔اگر لڑکیاں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوگئیں تو وہ ماں باپ اور شوہر پر بوجھ نہیں بنے گی۔انھوں نے لڑکیوں کو اپنے پیر پر کھڑے ہونے کی

Scanned with OKEN Scanner

ترغیب دی ہے، انھوں نے جو ذریعۂ معاش تلاش کرنے کی ترکیب بتائی ہے وہ خالصاتاًایک پردہ نشین خاتون کے لیے بالکل مناسب ہے یعنی ٹیلر نگ، کوکنگ اور کچن گارڈننگ کی ٹریننگ وغیرہ۔امیر النساء کے الفاظ میں:

"ٹیلر نگ سیکھنے کے بعد کوئی لڑکی بے کار نہیں رہ سکتی۔ گھر بیٹھے اسے کام مل جائے گا۔اس طرح پکوان میں بھی ماہر ہو جائے گی۔ کہیں بھی شادی بیاہ میں جاکر گھروں میں کھانا بنا سکتی ہے یا خود کوئی چھوٹا موٹا ہوٹل چلا سکتی ہے۔اس طرح کچن گارڈننگ بھی مفید کورس ہے۔ سبزیاں وغیرہ اگا کر فروخت کر کے وہ اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکتی ہے۔"(عنبرین صفحہ 67)

الغرض ناول نگار نے عنبرین کو ایک مثالی کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔امیر النساء نے اس ناول میں نہ صرف سماجی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس ناول میں ایک مسئلہ کو اٹھایا، سلجھایا اور اس کا حل بھی بتایا ہے، خواتین کی پریشانیاں، پریشانیاں کا نتیجہ اور اس کو کس طرح دور کیا جائے، ایک عملی نمونہ پیش کر کے اس ناول کو امیر النساء نے مشعلِ راہ بنا دیا ہے۔ میں تو سمجھوں گا اگر کسی خاتون کو زندگی کے طور طریقے جاننا، اچھی سماجی زندگی پانا اور اپنے مستقبل کو سنوارنا ہے تو اس ناول کا مطالعہ بے حد کار آمد اور مفید ثابت ہو گا۔

کتابیات(Bibliography) :

☆کلیاتِ امیر النساء۔ مرتب ڈاکٹر ایس۔ محمد یاسر۔ پبلشر شعبۂ اردو سی۔ عبدالحکیم کالج (خود مختار)، میل وشارم

☆"عنبرین"(ناول)۔ مصنفہ امیر النساء

☆"بند کتاب" (افسانوں کا مجموعہ) مصنفہ امیر النساء

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

ہندوستانی مشترکہ تہذیب اوراودھ کی اردو شاعری پراس کے اثرات

Muqeem Ullah Khan
DA. Staff Quarter
Shalimar Bagh -Delhi

تلخیص:۔ اودھ جو قدیم دور سے ہی ہندوستانی تہذیب کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ رام کی جائے پیدائش اجودھیا کا تعلق بھی اودھ سے ہی ہے جو کہ ہندوؤں کے اہم مقدس مقامات میں سب سے اہم ہے۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے کچھ عرصے بعد مسلمان صوبہ اودھ میں آباد ہونے لگے، یہ علاقہ بھی مسلم سلطنت کا ایک اہم حصہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ دونوں قوموں کی تہذیب میں آمیزش ہوئی، جس سے دونوں قوموں کی تہذیب میں مماثلت بھی پیدا ہوگئی ساتھ ہی وہ ایک دوسرے کے زیادہ قریب آتے گئے۔ یہی تہذیب آگے چل کر 'گنگا جمنی' تہذیب کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس مشترکہ تہذیب کے سبب ہندو مسلمان باہم ایک دوسرے کے رسم ورواج اور تہواروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ ہندوؤں کے تہواروں میں مسلم اور مسلمانوں کے تہواروں میں ہندو کثرت کے ساتھ شامل ہوا کرتے تھے۔ دونوں مذاہب کے درمیان یگانیت بڑھانے میں نوابین اودھ کا غیر معمولی تعاون رہا ہے۔

کلیدی الفاظ: تہذیب#مشترکہ تہذیب# ہندوستانی تہوار# شاہانِ اودھ#رسم ورواج#لکھنؤ#اودھی شاعری

لفظ 'تہذیب' ہماری زندگی میں کثرت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ دراصل تہذیب ہماری عادات واطوار کے مجموعے کا نام ہے، جس میں زبان، سوچ، فکر، مکان، لباس، اخلاق، احساس، موسیقی، تعمیر، تحریک، طرز عمل، قانون، عقیدہ، رسم، یقین سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سبھی سماج کے تہذیب واقدار ایک جیسے ہوں۔ جس طرح سے ہر ایک فرد اپنی قدر کے اعتبار سے ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سے کوئی بھی جماعت یا سماج اپنی منفرد تہذیب شناخت رکھتا ہے۔ اگر ایک قوم یا جماعت کی تہذیبی قدریں دوسری قوم یا جماعت کی تہذیبی قدروں سے یکسانیت رکھتی ہیں تو اسے ہم محض ایک اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں۔ تہذیب کا ایک مخصوص دائرہ ہے جو کہ ایک مخصوص علاقے، آب وہوا، تاریخ، سیاست، معاشرہ اور اس کے رسم ورواج ومذہب تک پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان تہذیبی اعتبار سے ایک بے حد ثروت مند ملک ہے۔ یہاں پر شمالی ہند سے جنوبی ہند تک اور مشرقی ہند سے مغربی ہند تک تہذیب وثقافت مختلف ہے۔ ملک کے ہر حصے میں مختلف تہذیب وثقافت دیکھنے کو ملتی ہے۔ دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، میسور، عظیم آباد وغیرہ بھی انفرادی تہذیبی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ مخصوص علاقے قدیم زمانے سے تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہے ہیں۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد جب دہلی تباہ وبرباد ہوگئی اور ہندوستان کی قدیم تہذیبی وراثت خطرے میں تھی، اس وقت نوابین اودھ نے تہذیب وثقافت اور علم وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی دور میں ہی لکھنوی تہذیب اعلیٰ مقام پر پہنچ گئی تھی اور اس دور میں جو شعر وادب کی تخلیق ہوئی، اس کی بخوبی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

اودھ کی مشترکہ تہذیب کو ہم 'گنگا جمنی' تہذیب بھی کہہ سکتے ہیں جس کا سب سے نمایاں پہلو یہاں کی مشترکہ روایات ہیں۔ یہاں پر ہندو اور مسلمان کسی بھی تہوار کو بڑے ہی دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ یہاں پر تہوار منانے کا طریقہ ملک کی اور جگہوں سے بالکل ہی الگ نظر آتا تھا۔ نواب اودھ کے زمانے میں تہوار صرف عوام کے درمیان ہی نہیں منائے جاتے تھے بلکہ حکومت کی طرف سے بھی معقول انتظام کیے جاتے تھے۔ تہوار کے موقع پر دربار کی جانب سے تقریبات منعقد کی جاتی تھیں، جس پر اچھی خاصی رقم خرچ کی جاتی اور شاہانِ اودھ بھی خود اس میں شرکت کیا کرتے تھے۔ جس طرح سے مسلمانوں کے تہوار منعقد ہوتے تھے، ٹھیک اسی طرح ہی ہندوؤں کے تہوار بھی منائے جاتے۔ اس سلسلے میں دونوں مذاہب کے درمیان کوئی بھید بھاؤ نہیں کیا جاتا تھا۔ جس سے تہوار منانے کے رسوم مذہبی سے زیادہ ثقافتی نظر آنے لگتے تھے۔ دونوں کے تہواروں کے ثقافتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان کے مذہبی پہلوؤں میں اشتراکی صورتیں فروغ پائیں۔ ہندوؤں کے بعض تہوار ایسے تھے جن کی کچھ مذہبی رسوم کو مسلمان اپنے طور پر ادا کرتے تھے اور مسلمانوں کے کچھ تہواروں کی مذہبی رسوم کو ادا کرنے کا چلن ہندوؤں میں بھی تھا۔ اودھ کے تہواروں کے مشترکہ روایت سے متاثر ہو کر اختر بستوی لکھتے ہیں کہ :

> ''اس سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں پر حکومت کی طرف سے تقریبات کا انعقاد ہوتا تھا اسی طرح ہندوؤں کے تہواروں پر بھی ہوا کرتا تھا۔ چونکہ حکمران اودھ مسلمان تھے اس لیے مسلمانوں کے تہواروں کا حکومتی سطح پر منایا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن مسلم حکمرانوں کا ہندوؤں کے تہواروں کو دربار میں منانا اور سرکاری خزانے سے ان کے لیے بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنا ایک بہت ہی اہم بات تھی۔ یہ مذہبی وسیع النظری اور رواداری کی شاندار مثال تھی۔''

(تہواروں کی مشترکہ تہذیبی نوعیت۔ اختر بستوی مشمولہ اودھ نمبر نیا دور ص۔ ۹۲)

اودھ کے تہواروں میں ہولی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ دونوں ہی مذاہب کے لوگ اسے ساتھ میں مل کر منایا کرتے اور منانے کے طریقوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اور ساتھ ہی دربار اودھ میں سبھی لوگ اسے بڑے ہی اہتمام کے ساتھ منایا کرتے تھے۔ نواب آصف الدولہ اور سعادت علی خاں دونوں ہی دھوم دھام سے ہولی کھیلا کرتے اور درباریوں کے ساتھ خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ عام و خاص کے ساتھ میں مل کر 'ہولی کا دہن' کیا کرتے اور پھر اگلی صبح گلال، عبیر، زعفران سے اور پچکاریوں میں رنگ بھر کر دھوم دھام سے ہولی کھیلا کرتے اور ساتھ ہی کھیل تماشے اور مذاقیہ پروگراموں میں لوگ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور شام ہونے تک یہ دور جاری رہتا تھا۔ شام ہوتے ہی اودھ آتش بازی کے ماحول میں رنگا ہوا نظر آتا اور اودھ میں ہولی منانے کا یہ طریقہ ہندوستان کے کسی بھی علاقے میں دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔

اودھ کی مشترکہ تہذیب جو کہ تہواروں کے مواقع پر نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اسے شعراء اردو نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ اپنے شعر و سخن کا حصہ بنایا اور عوام ان کو موقع محل کے مطابق اپنی محفلوں میں پڑھتے اور گاتے اور لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہولی کھیلنے کی ایک بہتر مثال دیکھئے

دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں جیسے گلدستہ تھے جوؤن پر رواں

Scanned with OKEN Scanner

زعفرانی رنگ میں رنگیں لباس عطر پاشی سے سبھوں میں گل کی باس
رنگ افشانی سے پڑتی تھی پھوار رنگ باراں تھا مگر ابر بہار

اردو ادب میں اودھ، احمد خاں، ص۔۱۰۸

شیخ محمد بخش مہجور لکھنوی نے نواب سعادت علی خاں کی مجلس میں ہولی کا بڑے ہی لطیف انداز میں بیان کیا ہے، ملاحظہ ہو

موسم ہولی کا تیری بزم میں دیکھا جو رنگ
ٹمٹکی نمٹ باندھی ہوں دامن کو اپنے مہوشاں
پھرتے ہیں رنگ شفق میں سب ڈوبے ہوئے
ہاتھ میں مثل ثریا سب لے کے پچکاریاں

اردو ادب میں اودھ، احمد خاں، ص۔۱۰۸

اس موقع پر مشاعرے بھی منعقد ہوا کرتے تھے۔ جس میں ہولی سے متعلق کلام پڑھے جاتے تھے۔ اس موقع پر انشاءاللہ خاں انشاؔ کا کلام ملاحظہ ہو

سانگ ہولی میں حضور اپنے لاویں ہر رات
کہ کنہیا بنیں اور سر پر وہ دھر لیویں مکٹ
گوپنیں ہو کے پڑی ڈھونڈیں قدم کی چھائیں
بانسری دہن میں دکھا دیویں وہ ہی جمنا ہٹ

(اردو ادب میں اودھ، احمد خاں، ص۔۱۰۹)

ہولی کی طرح بسنت کا تہوار بھی ہندو اور مسلمان دونوں مل کر منایا کرتے تھے، دربار اودھ میں بھی بڑی شان و شوکت کے ساتھ منایا جاتا اور اس پر اچھی خاصی رقم خرچ کی جاتی تھی۔ بسنت میں لوگ زرد کپڑے پہن کر زرد کاغذ کی پتنگ زرد ڈور سے اڑاتے تھے اور اس کے بعد ہندو مسلمان دونوں ہی شامل ہو کر بسنت کی تعریف میں کلام پڑھتے اور امن و آمان کی دعا مانگتے تھے۔ ڈاکٹر اختر بستوی بسنت کے تہوار کے متعلق خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہولی ہی کی طرح بسنت کا تہوار بھی اس عہد میں ہندو مسلمان یکساں جوش وجذبے سے مناتے تھے۔ فرماں روایانِ اودھ بسنت کے جشن کے سلسلے میں بھی بڑا اہتمام کرتے تھے۔ آصف الدولہ کے دربار میں اس تہوار کا جشن بڑے تزک واحتشام کے ساتھ ہوا کرتا تھا اور اس پر بھی وہ ہولی کے جشن کی طرح لاکھوں روپیہ خرچ کیا کرتے تھے۔ دیگر حکمران اودھ بھی بسنت کے جشن کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس روز لوگ زرد لباس پہنتے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں شہر کے باہر جمع ہو کر زرد کاغذ کی پتنگ زرد رنگ کی ڈور سے اڑاتے تھے۔ اس تہوار کے دن مسلمان گانے والے، دیگر لوگوں کے ساتھ جن میں

Scanned with OKEN Scanner

ہندو مسلمان دونوں شامل ہوتے تھے۔ مٹی کے برتن میں سبز خوشے اور 'گل شریف' ڈال کر کسی بزرگ کے مزار پر جاکر بسنت کی تہذیب اور اس بزرگ کی مدح میں اشعار گاتے تھے۔''

(تہواروں کی مشترکہ تہذیبی نوعیت، اختر بستوی، مشمولہ اودھ نمبر نیا دور ص۔ ۱۹۲)

اودھ کے اہم تہواروں میں دسہرہ بھی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ دسہرے کا تعلق شری رام سے ہے جو کہ رامائن کے ایک اہم کردار ہیں۔ ہندو عقیدہ کے مطابق یہ تہوار جھوٹ پر سچ کی جیت کی خوشی میں منایا جاتا ہے۔ اودھ میں ہندو مسلم دونوں ہی اسے بڑے جوش و خروش کے ساتھ مناتے اور اس میں گاؤں اور شہر کے لوگ شامل ہوا کرتے تھے۔ یہ تہوار مشترکہ تہذیب کا ایک اہم عمدہ تہوار تھا، جس میں دونوں ہی فریق دل کھول کر ایک دوسرے کو اچھائی پر برائی کی جیت کی مبارکباد دیا کرتے تھے۔ اختر بستوی دسہرے کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دسہرے کی بھی، اودھ کے فرمانرواؤں کے دور میں بڑی دھوم ہوتی تھی۔ اس تہوار میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی 'نیل کنٹھ' کے درشن کے لیے مختلف مندروں میں اور دیگر مقامات پر جاتے تھے۔ خصوصیات کے ساتھ شہر کے حاکم اپنے گھوڑے اور ہاتھیوں کو مہندی اور دوسرے رنگوں سے رنگوا کر، نقرئی اور طلائی ساز و سامان اور زر نگار جھول اور عماریاں لگا کر، اپنے فوجی دستے اور ذی مرتبہ مصاحبوں کے ساتھ 'نیل کنٹھ' کے درشن کرتے تھے اور شام کے وقت رقص و سرور کی محفل منعقد ہوتی تھی۔ دسہرے کے ایام میں مسلم بچے بھی ہندو بچوں کی طرح ٹیسورائے کی مورت بنا کر اور اسے لکڑی پر لٹکا کر شام کے وقت روزانہ ہندی کے اشعار پڑھتے ہوئے دروازے دروازے جاکر پیسہ مانگتے تھے اور جو رقم جمع ہوتی تھی اس سے خاص دسہرے کے دن مٹھائی خرید کر آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔''

(تہواروں کی مشترکہ تہذیبی نوعیت، اختر بستوی، مشمولہ اودھ نمبر نیا دور ص۔ ۱۹۲)

مسلم تہواروں میں عیدالفطر اور عیدالاضحی اہم تہوار ہیں، جنہیں ہم عام بول چال میں عید اور بقرا عید بھی کہتے ہیں۔ یہ دونوں ہی تہوار اودھ میں بڑے ہی خوشی کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ عید کا چاند ہونے کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ خوشی کا اظہار کرتے اور ساتھ ہی کچھ لوگ اظہار خوشی میں بِگُل اور نقارے بھی بجایا کرتے تھے۔ نوابین اودھ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ عیدگاہ جاتے۔ قیمتی لباس پہن کر امراء و رؤسا، گھوڑ سوار، پیدل، فوجی، اونٹوں پر سوار فوجی ساتھ ہی توپ خانے اور نجیوں کے دستے بھی ہوا کرتے تھے۔ بعد نماز عوام و خواص سبھی لوگ ایک دوسرے کو گلے مل کر عید کی مبارکباد دیا کرتے اور جس میں ہندو حضرات بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور مسلمانوں کے گھر جاکر ان کو عید کی مبارک باد پیش کیا کرتے اور سوئیں کھا کر اپنا منہ بھی میٹھا کرتے۔ نماز کے بعد حکمرانوں کے یہاں بھی ہندو مسلمان دونون ہی عید کی مبارکباد دینے جایا کرتے اور وہاں پر سبھی کو شیرینی بھی تقسیم کی جاتی۔

شاہان اودھ میں محرم کو سب سے زیادہ اہتمام و عقیدت کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ محرم میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کی یاد میں اظہار غم کیا جاتا ہے۔ شاہان اودھ سے قبل محرم منائے جاتے تھے مگر اتنی اہمیت کے ساتھ نہیں۔ اس دور میں محرم کو عروج و اعزاز حاصل ہونے کی سب سے خاص

Scanned with OKEN Scanner

وجہ یہ تھی کہ دربار اودھ کے حکمران شیعہ تھے۔ لیکن اس دور میں صرف شیعہ ہی نہیں بلکہ سنی وہندو بھی بڑی عقیدت اور سادگی کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ جس سے متعلق مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں کہ :

''اودھ کے حکمران فراخ دل اور وسیع النظر تھے۔ انہوں نے اگر ایک طرف تعزیہ داری کو فروغ دیا تھا تو اسی کے ساتھ مقامی تہواروں کو بھی اپنا لیا تھا۔ درباروں میں بڑے بڑے تزک واحتشام سے ہولی کھیلی جاتی تھی اور جوش وخروش سے بسنت منایا جاتا تھا۔ ان کی سرکار میں ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یکساں طور پر سرپرستی ہوتی تھی۔ اس روادارانہ اور منصفانہ حسن سلوک کی وجہ سے بھی لکھنؤ کی عزاداری کو جو پہلے ہی رائج تھی اور زیادہ مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔''

(قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، مرزا جعفر حسین، ص۔ ۳۲۴)

محرم کا چاند نظر آنے کے ساتھ ہی لوگ سبز اور سیاہ رنگ کے لباس پہننا شروع کر دیتے تھے۔ ہر جگہ مجالس منعقد ہوتیں اور ساتھ ہی مختلف قسم کے جلوس بھی نکلنے شروع ہو جاتے۔ ہندو اور مسلمان عورتیں اہتمام کے ساتھ نوحے گاتی تھیں اور ساتھ ہی ماتم وعزاداری کرنے والوں میں ہر فرقے کے لوگ شامل ہوا کرتے تھے۔ اصف الدولہ اور شجاع الدولہ محرم کے دوران عقیدت اور سادگی کے ساتھ عزاداری کیا کرتے اور ساتھ ہی ساتھ تمام تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ آصف الدولہ تو اکثر وبیشتر ماتم کے دوران لہولہان ہو جایا کرتے تھے۔ واجد علی شاہ بھی محرم کا چاند دیکھنے کے ساتھ ہی سبز لباس پہن لیا کرتے اور ساتھ ہی دسویں تاریخ کی شب کو لوگوں کے گھر جا کر تعزیہ کی زیارت بھی کیا کرتے تھے۔ وہ تعزیوں پر چڑھاوا چڑھاتے اور جلوس میں وہ خود ہی تاشہ بجایا کرتے تھے۔ تعزیہ داری ایک خالص ہندوستانی رسم ہے، جس کی بنیاد ہندوستان میں ہی پڑی تھی اور اسے ابتدا سے ہی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی بڑی عقیدت پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہندو حضرات بھی عقیدت واحترام کے ساتھ تاریخ اول سے لے کر یوم عاشورہ تک مجالس میں شامل ہوتے اور نوحہ خوانی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔

مسلمانوں کے تہواروں میں شب برأت کو ایک اہم تہوار کی شکل میں منایا جاتا ہے۔ مسلمان اس دن طرح طرح کے پکوان اور حلوے بنا کر انہیں غریبوں مسکینوں میں تقسیم کیا کرتے اور ساتھ ہی قبرستانوں میں جا کر اپنے بزرگوں وعزیزوں کے لیے دعائے مغفرت بھی کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو یہاں تک مان لیا ہے کہ شب برأت بھی محرم کی طرح ایک خالص ہندوستانی رسم ہے، جس کا تعلق اسلام سے مختلف واقعات وعقائد بتایا جاتا ہے۔ شب برأت کو منانے کے سلسلے کے متعلق مختلف روایات جڑی ہوئی ہیں، جس کو اختر بستوی تفصیل سے بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''کچھ لوگ اس سلسلہ جنگ احد میں پیغمبر اسلامؐ کے دندان مبارک کو شہید ہونے سے اور کچھ اشخاص، حضرت امیر حمزہ کی شہادت سے جوڑتے ہیں، اور بعض حضرات اس کو ان عقائد سے منسلک کرتے ہیں کہ رات کو حکم الٰہی سے ملا کر رزق کی تقسیم اور عمر کا حساب لگاتے ہیں اور ہر شخص کا اعمال نامہ کھولا جاتا ہے اور اس کی قسمت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس تہوار کے ہندوستان میں رائج ہونے کے سلسلے میں بعض لوگوں نے ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کے اثرات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے

Scanned with OKEN Scanner

کہ اکبر اعظم نے جب اپنی ملکہ جودھا بائی کے اپنے مرے ہوئے بزرگوں کو کھانا دیتے ہوئے دیکھا تو وہ اس رسم سے بہت متاثر ہوا اور اس نے حکم دیا کہ اسلام میں بھی اس طرح کی کوئی رسم ڈھونڈھی جائے اور اس کے نتیجے میں ایک مشیر نے شب برأت کی بنیاد قائم کی جو مسلمانوں میں سارے ہندوستان میں رواج پاگئی۔'' (تہواروں کی مشترکہ تہذیبی نوعیت، اختر بستوی، مشمولہ اودھ نمبر ص۔ ۹۳۔۲۹۲)

اودھ میں بھی اس تہوار کو بڑی ہی عقیدت مندی کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ یہاں پر مختلف قسم کے حلوے تیار کیے جاتے اور اس کے علاوہ میٹھے پکوان بھی بنائے جاتے تھے۔ جس پر لوگ اپنے بزرگوں کی فاتحہ کرواتے اور غریبوں میں تقسیم کرتے اور پھر شام کے وقت لوگ اپنے بزرگوں کے قبرستان پر جاکر فاتحہ پڑھتے و قبروں پر روشنی کیا کرتے تھے۔ اس دن شیعہ فرقے کے لوگ امام مہدی کی ولادت کو مناتے اور ساتھ ہی ساتھ اس تہوار کو جشن کے طور پر منانے کا ایک طریقہ اور مل گیا تھا۔ اس لیے یہاں پر گھر گھر میں چراغاں ہوتا اور کئی طرح کی آتش بازیاں چھوڑی جاتی تھیں۔

تہذیبِ اودھ ہندوستان کی ایک اعلیٰ تہذیب تھی۔ جس میں بظاہر تصنع، تکلف، نزاکت اور آداب واخلاق کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں اور ساتھ ہی اس عہد میں اودھ تہذیبی اعتبار سے حیدر آباد، میسور، عظیم آباد یا پھر دہلی کے مقابلے میں منفرد و ممتاز مقام رکھتا تھا۔ جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ نوابین اودھ نے سماج میں ادب و ثقافت کا ایک نیا ہی رنگ بھر دیا تھا اور اودھ کی دنیا ایک الگ دنیا ہو گئی تھی، جو اس وقت کی دہلی سے کئی معنوں میں اعلیٰ معیار رکھتی تھی۔ تہذیب اودھ میں ہندو مسلم، امیر و غریب اور اونچ نیچ میں کوئی بھی فرق موجود نہیں رہا تھا اور ہندو مسلمان تہذیبی اعتبار سے ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے تھے۔ اسی بناپر ہی دربار اودھ میں ہولی، دیوالی، دسہرہ، بسنت، عید اور محرم میں سبھی لوگ برابر شرکت کیا کرتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہ کوئی بھید بھاؤ تھا اور نہ ہی کوئی تضاد دیکھنے کو ملتا تھا۔ اسی بناپر ہی اودھ کی تہذیب ہندوستانی تہذیبوں میں ایک اعلیٰ اور منفرد مقام رکھتی ہے۔

کتابیات

۱۔	ادب اور تہذیب	فرمان فتح پوری	1967	تنویر پریس، لکھنؤ
۲۔	اردو ادب میں اودھ	احمد خان	2010	کتابی دنیا، دہلی
۳۔	اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب	کامل قریشی	2000	اردو اکادمی، دہلی
۴۔	تاریخ ادب اودھ	جمیل جالبی	1985	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۵۔	لکھنؤ کی تہذیبی میراث	سید صفدر حسین	1978	اردو پبلشرز، لکھنؤ
۶۔	ہندو تہواروں کی دلچسپ اصلیت	رام پرساد ماتھور	1991	خدا بخش لائبریری، پٹنہ
۷۔	قدیم لکھنؤ کی آخری بہار	سید جعفر حسین	1981	ترقی اردو بیورو، دہلی

- نیا دور قومی یکجہتی نمبر لکھنؤ، شمارہ مارچ اپریل 1993

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

اقبال کی قافیہ پیمائی

عمران اعظم

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو

دہلی یونیورسٹی، دہلی

Abstract: As Poetry needs meter and rhythm to maintain its melody and music, similarly the beauty of poetry is enhanced by rhyme (cadence). Like as beauty is related to decoration, similarly poetry also represent the essence of decoration. There is no disagreement about this. Some Prosodist have argued whether it is necessary for poetry or not. Those who used to say that it is not necessary for poetry, and only rhythm is necessary for poetry, actually that is not poetry. But the majority of literary scholars agree that couplets, writing which is deliberately rhythmic and harmonious should be called poetry.

In this article we examined Iqbal's poetry deeply, which clearly shows that Iqbal has put all possible effort and full attention in the selection of rhyme (cadence). He has used rhyme (cadence) in a beautiful way, which has doubled the beauty of the poem and at the same time reveals his depth of thought, knowledge of rhyme (cadence) and universality. Iqbal has used rhyme (cadence) in his poetry keeping in mind the rules and regulations of poetry. Iqbal has taken everything into account, be it the rhyming sounds or the letters of poetry.

کلیدی الفاظ: عروس سخن، چسپیدگی، اشباع، دخیل، ڈھال، مطابقت، متحرک

Scanned with OKEN Scanner

ادب کی دو قسمیں ہیں۔ایک نظم دوسری نثر،یعنی ہم اپنامافی الضمیر یاتو شعری پیکر میں ڈھال کر سامعین کو پروستے ہیں یا منثور انداز میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ موزونی پیکر میں ڈھال کر اپنی بات کی ترسیل کرنا شاعری کہلاتا ہے۔ جبکہ عام بول چال میں ہم دوسرا طریقہ کار یعنی نثری لہجہ اپناتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مابہ الا متیاز کیا ہے یعنی وہ شے جو نثر کو نظم سے اور نظم کو نثر سے ممتاز کرتی ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نظم کی موزونیت و موسیقیت نثر کو نظم سے الگ کر دیتی ہے۔ لیکن کچھ لوگ یہاں پر یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ بعض ناقدین نے شعر کے لیئے وزن کو ضروری نہیں گردانا۔ مگر یہ دھیان رہے کہ جب تک شعر میں موزونیت اور موسیقیت نہ ہو تو نثر سے الگ نہیں ہو سکتا،اور نہ ہی موثر و کار آمد ہو گا۔ نیز جمہوریت ادب بھی اسی بات کی قائل ہے کہ وزن شعر کے لئے ضروری ہے۔ کیوں کہ وزن کے ساتھ شعر کی نغمگی اور موسیقیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بہر کیف اشعار کو وزن کے ترازو پر پرکھنے کے علم کا نام عروض ہے۔

جس طرح شعر کی نغمگی اور موسیقیت بچانے کے لیے وزن اور بحر کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح شعر کے حسن میں مزید اضافہ، قافیہ پیمائی سے ہوتا ہے۔ جس طرح حسن کو آرائش سے تعلق ہوتا ہے۔ ٹھیک قافیہ کو بھی شعر کے ساتھ وہی علاقہ ہے۔اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اختلاف کچھ عروضیوں کا اس پر ہوا کہ آیا وہ شعر کے لئے لازم ہے یا نہیں۔ جن لوگوں نے یہ کہا کہ وہ شعر کے لئے لازم نہیں ان کا کہنا ہے کہ شعر کے لئے صرف موزونی ہونا ضروری ہے قافیہ پیمائی ضروری نہیں۔ مگر اہل ادب کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ شعر وہی ہے بلکہ اسی کو کہا جانا چاہیے جس کو قصداً موزون و مقفیٰ کیا گیا ہو۔ جو لوگ بلا قافیہ شعر کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ عربی زبان میں بھی اس کی مثال دیکھنے کو ملتی ہے اور مثال میں ابونواس کے ان اشعار کو پیش کرتے ہیں جو اس نے امین ابن ہارون الرشید کے دربار میں پڑھے تھے۔ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک دن ابونواس، امین ابن ہارون ارشید کے دربار میں تھا اور شعر و سخن کا دور چل نکلا۔ دورانِ گفتگو جب عروض و قوافی پر بحث ہوئی تو امین الرشید نے کہا کہ اے ابونواس کیا تم بلا قافیہ بھی شعر کہتے ہو؟ تو ابونواس نے جواب دیا بلیٰ (کیوں نہیں) اور فی البدیہ تین اشعار بلا قافیہ کہہ ڈالے جن میں صنعت اشارہ کو برتا گیا تھا:

ولقد قلت للملیحۃ قولی	من بعید لمن یحبک حبک۔	اشارہ قُبلہ
و اشارت بمعصم ثم قالت	من بعید خلاف قولی	اشارہ لالا
فتنفست ساعۃ ثم انی	قلت للبغل عند ذلک	اشارۃ امش

اس واقعہ کی روشنی میں اتنا تو پتہ ضرور چلتا ہے کہ ابونواس نے اس وقت بلا قافیہ اشعار کہے تھے۔ مگر اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ اگر وہ بلا قافیہ اشعار کہتا تھا تو اسے فی البدیہ اشعار کہنے کی حاجت محسوس نہیں ہوتی۔ اسی واقعے کے حوالے سے ''مراۃ الشعر'' میں عبد الرحمن نے لکھا ہے کہ:

> ''جس زبان والوں کو یہ قدرت ہو کہ اشارہ جیسی دشوار صنعت میں فی البدیہہ شعر کہہ جائیں ان کے لیے قافیہ کی پابندی کیا مشکل ہو سکتی ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ جانتے اور دیکھتے ہوں کہ قافیہ شعر کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے یہی وجہ تھی کہ انہیں شعر غیر مقفیٰ کا کبھی خیال نہیں آیا۔ موشح اور مسمط کی ایجاد کے

Scanned with OKEN Scanner

ساتھ قافیہ کی ترتیب میں تنوع پیدا ہوا۔ لیکن قافیہ کا التزام متروک نہیں ہوا، پھر بھی عربی زبان نے اتنے شاعر پیدا کیے کہ کوئی زبان مشکل ہے کہ پیدا کر سکی ہو۔'' ص۸۶

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ عربی زبان کی شاعری قافیہ سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکی اور نہ ہی اس کے شعرا کو کبھی قافیہ ترک کرنے کا خیال آیا۔ کیوں کہ قافیہ شعر کی دلکشی کو دو بالا کر دیتا ہے۔ تو وہ شعرا اپنے کلام میں ترکِ قافیہ کیسے تصور کر سکتے تھے تو اب یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ عروضیوں کی نظر میں قافیہ کیا ہے؟

اگر لباسِ حسیں ہیں مطالبِ دلکش

تو قافیہ بھی عروسِ سخن کا زیور ہے

قافیہ کے لغوی معنی فارسی میں پَے روندہ اور اردو میں پیچھے آنے والے کے ہیں۔ اسی لیے قافیہ کا التزام شعر کے آخر میں کیا جاتا ہے۔ اخفش نے لغوی معنی کو مد نظر رکھتے ہوئے شعر کا آخری کلمہ کہہ کر قافیہ کی تعریف کی ہے۔ خلیل نے قافیہ کی تعریف کو یوں جامہ الفاظ پہنایا ہے کہ شعر میں سب سے آخری ساکن سے پہلے جو ساکن آئے اس کے ماقبل متحرک سے لے کر آخر تک سب کچھ قافیہ ہے۔ جبکہ سکاکی کے نزدیک ساکن مقدم سے پہلا حرف مع حرکت، قافیہ کہلاتا ہے۔ یہ تعریفات عربی زبان تک تو ٹھیک ہیں مگر اردو کے مزاج سے روا نہیں۔ اردو زبان میں قافیہ کی تعریف یوں کی گئی ہے:

قافیہ: ان حروف و حرکات کا مجموعہ ہے جو مختلف الفاظ میں شعر یا مصرعہ کے آخر میں، مطلع اور بیت کے ہر مصرعہ میں غیر مستقل طور پر بار بار آئے۔

سید کاظم علی عروض نے اپنی کتاب '' علم عروض و قافیہ و تاریخ گوئی''، میں لکھا ہے کہ :

''اصطلاح شعر میں قافیہ ان کلمات کو کہتے ہیں جو مصرعوں اور بیتوں کے اواخر میں آتے ہیں اور انہیں پر بناء شعر مستحکم ہوتی ہے یہ صورت میں تو ایک دوسرے سے مشابہ ۃ الاواخر اور معنی میں مختلف ہوتے ہیں۔'' ص۶۵

ذیل میں کلامِ اقبال سے قافیہ کی مثال

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں

نفَسِ سوختہ شام و سحر تازہ کریں

Scanned with OKEN Scanner

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں سفر اور دوسرے میں سحر قافیہ ہے۔ جبکہ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں جگر اور دوسرے مصرعے میں اثر قافیہ ہے۔

محققین نے قافیہ کے لئے نو حروف بتائیں ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱)تاسیس، (۲)دخیل، (۳)ردف، (۴)قید، (۵) روی،

(۶) وصل، (۷) مزید، (۸)خروج، (۹) نائرہ،

ان تمام حروف میں سے جس کا ہر قافیہ میں پایا جانا ضروری ہے وہ حرف روی ہے۔ علم قافیہ کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے کلام اقبال کو قافیہ پر جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حروف قافیہ میں قافیہ کی دیوار جس پر مستحکم ہوتی ہے وہ حرف روی ہے۔ روی قافیہ کی بنیاد ہے۔ اس کے بغیر قافیہ نہیں ہو سکتا۔ روی کے لفظی معنٰی سامان باندھنے کی رسی کے ہیں۔ حرف روی سے چار حرف پہلے لائے جا سکتے ہیں اور چار بعد میں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ قافیہ میں حرف روی لازمی ہے باقی نہیں، کبھی ایک اور دو بھی ہو سکتے ہیں اور زیادہ بھی۔

روی: قافیہ کا اصلی اور آخری حرف جس کے ہٹانے سے لفظ بے معنٰی ہو جائے

حکیم نجم الغنی نے روی کی تعریف بحر الفصاحت میں یوں کی ہے:

روی رائے مہملہ کے فتح اور واو کے کسر اور یائے معروف سے لفظ کے اس حرف آخر کو کہتے ہیں جو مصرع اور بیت کے آخر میں واقع ہوا ہو اور یہ حرف مکرر آتا ہے اور قافیہ کی بنیاد اسی پر ہوتی ہے۔ ص ۴۰۴

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں

ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال نے اس شعر میں خبر اور نظر کو بطور قافیہ استعمال کیا ہے۔ جس میں خبر اور نظر کی را حرف روی ہے۔ روی کے بعد حروف قافیہ میں سے جس حرف قافیہ کو سب سے پہلے بیان کیا جاتا ہے وہ الف تاسیس ہے۔ بعض لوگوں نے دخیل بھی بیان کیا ہے مگر اکثریت الف تاسیس والوں کی ہے۔

الف تاسیس: وہ الف ساکن جو حرف روی سے پہلے ہو اور حرف روی اور الف تاسیس کے درمیان کوئی ایک متحرک حرف ہو۔

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں

Scanned with OKEN Scanner

یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

علامہ کے اس شعر میں نرالے اور والے قافیے ہیں جس میں یائے مجہول حرف روی ہے اس سے پہلے جو الف ہے وہ الف تاسیس ہے اور الف تاسیس اور حرف روی کے درمیان ایک متحرک حرف بھی ہے

دخیل: قافیہ کے اس حرف کو کہتے ہیں جو حرف روی سے پہلے ہو اور الف تاسیس کے بعد ہو جس طرح دخیل کا معنی ہی ہے بیچ میں آنے والا لہذا حرف دخیل ہمیشہ الف تاسیس اور حرف روی کے درمیان میں واقع ہوتا ہے۔اس کی مثال اقبال کے اسی کلام میں دیکھئے بلکہ یہ پورا کلام الف تاسیس اور دخیل کی مثال ہے۔

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا

جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے ہم نے پالے ہیں

رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی

نرالا عشق ہے میرا، نرالے میرے نالے ہیں

ان اشعار میں اقبال نے نرالے، والے اور پالے بطور قافیہ استعمال کئے ہیں جن میں یائے مجہول حرف روی اور اس سے پہلے لام حرف دخیل جس کے ما قبل الف تاسیس ہے۔اقبال کے اسی کلام کے دوسرے اشعار میں اس کی مثال ملاحظہ کریں:

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی

نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو

میرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

حروف قافیہ میں دخیل کے بعد ردف آتا ہے۔

ردف: وہ حرف مدہ ہے جو حرف روی سے پہلے کسی لفظ کے حائل ہوئے بغیر آئے۔ حروف مدہ تین ہیں۔

الف ماقبل مفتوح

یائے ماقبل مکسور

Scanned with OKEN Scanner

واؤ ما قبل مضموم

ردف کے بارے میں اہل عرب کا کہنا ہے کہ ردف کی تقلیب جائز ہے یعنی ان کے نزدیک وجود اور وعید قافیے بنائے جا سکتے ہیں لیکن اردو شاعری میں ردف کا اختلاف جائز نہیں۔

اقبال کے کلام میں ردف یعنی الف ما قبل مفتوح کی مثال دیکھئے۔

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

آیا ہے تو جہاں میں مثال شرار دیکھ

دم دے نہ جائے ہستیئ ناپائدار دیکھ

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں

تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ

علامہ کی اس غزل میں وار، بار، شرار، پائیدار، انتظار وغیر قوافی ہیں ان الفاظ میں را حرف روی ہے اور اس سے پہلے آنے والا الف ساکن ردف ہے اور ردف کے لئے اردو والوں کا جو اصول ہے کہ اختلاف ردف جائز نہیں اقبال کا یہ پورا کلام اس پر کھرا اترتا ہے۔

اقبال کے کلام میں ردف یائے ما قبل مکسور کی مثال

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں

وہ نکلے میرے ظلمت خانہ دل کے مکینوں میں

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق

بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں

اقبال نے اس میں زمینوں، مکینوں، حسینوں قوافی استعمال کئے ہیں۔ جس میں حرف روی نون مضموم ہے اور اس سے قبل یائے ما قبل مکسور ردف ہے۔

کلام اقبال میں ردف واؤ ما قبل مضموم کی مثال:

Scanned with OKEN Scanner

گرچہ میں ظلمت سراپاہوں سراپانور تو

سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو

اس میں نوراور دور قوافی ہیں رائے ساکن حرف روی ہے اوراس سے پہلے واؤ ما قبل مضموم ردف ہے۔

چوتھا حرف جو حرف روی سے پہلے آتا ہے وہ قید ہے۔

قید: لغوی معنی بیڑی یا شکنجے کے ہیں اصطلاح میں حرف روی سے پہلے آنے والا وہ ساکن حرف جو حروف مدہ میں سے نہ ہو اور اس کے اور حرف روی کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہو تو اسے قید کہتے ہیں۔اسی طرح حرف روی سے پہلے الف ہو مگر اس کے ما قبل زبر نہ ہو، واؤ ہو تو اس سے پہلے پیش نہ ہو اور یا ہو تو اس سے پہلے زیر نہ ہو تو یہ بھی قید مانا جائے گا۔

بزم جہاں میں میں بھی ہوں اے شمع دردمند

فریاد در گرہ صفتِ دانہ سپند

اس میں سپند، دردمند، اقبال نے قافیے استعمال کئے ہیں جس میں دال موقوف حرف روی ہے اور نون ساکن حرف قید ہے

یہ چاروں وہ حروف تھے جو حرف روی سے پہلے آتے ہیں جس طرح حرف روی سے پہلے چار حروف آتے ہیں ٹھیک اسی طرح حرف روی کے بعد بھی چار حروف آسکتے ہیں وہ ہیں وصل، مزید، خروج اور نائرہ اگر حرف روی کے بعد ایک حرف ہے تو وہ وصل کہلائے گا اگر دو ہیں تو پہلا وصل دوسرا مزید، اگر تین ہیں تو پہلا وصل دوسرا مزید، تیسرا خروج، اسی طرح اگر چوتھا حرف بھی ہے تو وہ نائرہ کہلاتا ہے۔

پردہ چہرہ سے اٹھا انجمن آرائی کر

چشمِ مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر

تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کب تک

بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر

اقبال کے اس اشعار میں آرائی، تماشائی اور شناسائی قوافی ہیں جس میں الف حرف روی، ہمزہ وصل، یاء مزید ہے۔ حرف وصل کے متعلق یہ بات جاننا ضروری ہے کہ وہ تنہا آئے تو خود ساکن ہوتا ہے مگر حرف روی کو متحرک کر دیتا ہے۔ بعض شعرائے اردو اس بات کے قائل ہیں کہ حرف روی کے بعد جو حروف آتے ہیں وہ ردیف میں شامل ہوتے ہیں، چاہیں وہ حروف کوئی کلمہ ہوں یا نہ ہوں۔ان کے اس قول کی روشنی میں اردو میں حروف قافیہ

Scanned with OKEN Scanner

پانچ رہ جائیں گے ایک روی اور چار وہ جو حرف روی سے پہلے آتے ہیں۔اب تک جو کلامِ اقبال پر نظر ڈالی گئی وہ حروفِ قافیہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جانچنے اور پرکھنے کی حوالہ سے تھی۔اب حرکاتِ قافیہ کے ضمن میں کلامِ اقبال کو دیکھتے ہیں۔

قافیہ کے اعراب (زبر زیر پیش) ان کی چھ شکلیں ہیں ہر شکل کا ایک نام ہے۔ان اشکال کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔رس ۲۔اشباع ۳۔حذو ۴۔توجیہ ۵۔مجریٰ ۶۔نفاذ

رَس: (بفتح الراء وسکونِ السین) اس زبر کو کہتے ہیں جو الفِ تاسیس سے پہلے آتا ہے جیسے نرالے اور والے اس میں رااور واو کا زبر اس حرکت کا اختلاف ممکن ہی نہیں اسی لئے کلامِ اقبال میں اس کی کوئی بھی مثال نہیں ملتی جس کی وجہ سے کہا جائے کہ اقبال نے اس حرکتِ قافیہ کی مخالفت کی ہے۔

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے

بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے

باقی اور ساقی قوافی ہیں ان میں باءاور سین کی حرکت کا نام رس ہے۔

حرکت قافیہ میں سے دوسری حرکت کا نام اشباع ہے۔

اِشباع: (بکسر الالف وسکونِ الشین وفتح الباء وسکونِ الالف وسکونِ العین) یہ حرف دخیل کی حرکت کا نام ہے۔

سمندر سے پیاسے کو ملے شبنم

بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

مندرجہ والا شعر اور اس سے قبل والے شعر کے ساقی، باقی اور رزاقی میں قاف کے کسرے کا نام اشباع ہے۔اختلافِ اشباع جائز نہیں ہے جیسے عالم اور عالم ہم قافیہ نہیں ہو سکتے مگر اس صورت میں جب حرفِ روی وصل سے مل کر متحرک ہو جائے۔کلام اقبال میں حرف وصل سے مل کر روی کے متحرک ہونے کی مثال:

نہ سلیقہ ہے مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ ہے تجھ میں خلیل کا

میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوہ آذری

مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفسِ عدم

Scanned with OKEN Scanner

ترادل حرم گرَوِ عجم، ترادیں خریدہ کافری

اس مثال میں اختلاف اشباع ہے جو حرف وصل سے مل کر متحرک ہونے کی شکل میں ہے۔یعنی حرف دخیل جو ذال اور کاف ہے اس ذال پر زبر اور فاء پر پیش ہے۔اور یہ اختلاف جائز ہے۔

حذو: (بفتح حاء وسکون ذال وواؤ موقوف) یہ قید اور ردف سے پہلے کی حرکت کا نام ہے۔ردف اور قید سے پہلے کی حرکت کا اختلاف جائز نہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ پِیر اور پَیر ہم قافیہ نہیں ہو سکتے۔رِیل اور بَیل بھی ہم قافیہ نہیں ہو سکتے۔ہاں اگر روی اپنے وصلی حرف سے مل کر متحرک ہو جائے تو بعض نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔کلام اقبال میں حذو کی مثال:

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر

نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو

سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر

اس میں مقام، شام، کلام قافیے استعمال ہوئے ہیں۔جس میں میم حرف روی ہے اس سے قبل الف ردف ہے، ماقبل میں قاف، شین۔اور کاف پر جو زبر آیا ہے اسی کا نام حذو ہے۔

توجیہ: (بفتح تاء وسکون واؤ وسکون یاء وہائے ہوز) جب حرف روی ساکن ہو اور کوئی حرف قافیہ نہ ہو تو اس حرف روی سے ماقبل جو حرکت ہو گی اس کو توجیہ کہیں گے جیسے علمِ اور قلَم کے لام کا زبر۔توجیہ کا اختلاف جائز نہیں یعنی ہم اور تم قافیہ نہیں ہو سکتے۔کلام اقبال میں اس کی مثال:

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو

پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا ہو

نہ مئے، نہ شعر، نہ ساقی، نہ شورِ چنگ و رباب

سکوتِ کوہ و لبِ جوئے و لالۂ خودرو

یہاں تو، ہو، رو قوافی ہیں جس میں واو حرف روی ہے جو کہ ساکن ہے واو کے ماقبل جو پیش ہے وہ توجیہ ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

مجریٰ: (بفتح میم وسکون جیم وفتح راءاور آخر میں الف مقصورہ) جب حرف روی متحرک ہوتا ہے تو اس حرف روی پر جو حرکت ہوتی ہے اسے مجریٰ کہتے ہیں۔اس کا اختلاف بھی روا نہیں۔

آبتاوں تجھ کو رمز آیہ انَّ الملوک

سلطنت اقوام عالم کی ہے اک جادو گری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر

پھر سلادیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

ان اشعار میں جادو گری اور ساحری کو بطور قافیہ استعمال کیا گیا ہے جس میں راء مکسور حرف روی ہے جو وصل کی بناء پر متحرک ہے۔اسی کا نام مجریٰ ہے۔ پورے کلام میں راء حرف روی مکسور ہی مستعمل ہے کہیں اس کی مخالفت نہیں ملتی۔

نفاذ: (بفتح نان وفتح فاوسکون الف وذال موقوف) حرف وصل کی حرکت کا نام ہے۔ خروج مزید اور نائرہ کی حرکت کا نام بھی نفاذ ہی ہے۔اس میں بھی کسی قسم کا اختلاف جائز نہیں۔کلام اقبال میں نفاذ کا استعمال:

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگادو

کاخِ امراء کے در و دیوار ہلادو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی

اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلادو

مندرجہ بالا اشعار میں جگادو، ہلادو، جلادو وغیرہ قوافی مستعمل ہیں اس میں الف ساکن حرف روی ہے اور دال مضموم حرف وصل ہے اسی حرکت کا نام نفاذ ہے۔

یہاں تک جو بحث تھی وہ اقبال کے کلام میں حروف قافیہ اور حرکت قافیہ کو لے کر تھی۔ جس سے اقبال کی علم قافیہ کی سوجھ بوجھ اور فہم کا پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو علم قافیہ پر بھی زبردست عبور حاصل تھا۔انہوں نے نہ صرف اپنے کلام کو وزن وبحر کے سانچے میں ڈھالا ہے بلکہ اس میں ترنم اور نغمگی کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ قافیہ نغمگی میں مزید اضافہ کرتا ہے تو بھلا اقبال اس کے ذریعے اپنے کلام کو کیوں نہ سنوارتے۔ قافیہ کو عروسِ سخن کا زیور کہا گیا ہے۔ کسی نے لاریب خال روئے سخن کہا ہے، تو کسی نے کہا ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

"۔۔۔وزن کا قالب ان میں اعتدال لاتا ہے اور اس کے حسن و جمال کو بڑھاتا ہے۔ قوافی اس کے خط و خال
بن کر سونے پر سہاگے کا کام کرتے ہیں عرب اسی حسن مجسم کو شعر کہتے ہیں"

مراۃ الشعر ص ۳۶

اب جب اصولی اعتبار سے اقبال کے علم قافیہ پر بحث ہو چکی ہے تو اب لازم آتا ہے کہ باعتبار الفاظ بھی اس کی پیمائش اور جانچ کی جائے۔ اقبال کے الفاظ قوافی کو اصول قافیہ کی روشنی میں پرکھنے کے علاوہ مزید دو جہات سے دیکھا جا سکتا ہے۔ (۱) تلفظی (۲) معنوی۔ اقبال نے شعریت میں نغمگی اور موسیقیت کے حسن کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے الفاظ کے تلفظ کا بھی بھرپور خیال رکھا ہے بلکہ اقبال نے اپنے شاعرانہ اسلوب سے اس کو دل نشیں بنا دیا ہے۔ کلام اقبال میں الفاظ کا انتخاب الہامی معلوم ہوتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ اقبال کی ملکیت ہیں اور انھیں معلوم ہے کہ کون سا لفظ بطور قافیہ کہاں رکھنا ہے۔ اسی لئے وہ قوافی کو مناسب اور بر محل استعمال کر جاتے ہیں۔ تاہم انھوں نے اپنے کلام میں چسپ پیدگی والے قوافی برتے ہیں۔ کیوں کہ چست اور بر محل قوافی کلام کی جان ہوتے ہیں۔ اگر کلام میں ایسا محسوس ہو کہ اس میں قافیے کو زبردستی یہاں باندھنے کی کوشش کی گئی ہے تو وہ قافیے مناسب اور عمدہ تصور نہیں کئے جاتے۔ آمد والے قافیے اچھے اور بہتر خیال کئے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھ لیجیے:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا

آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

اب انداز گلستاں کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھ کر دیکھ لیجئے جتنی سلاست اور روانگی اس میں پائی جاتی ہے دوسرے میں مشکل ہی سے ملے گی

یا یہ مثال دیکھ لیجئے

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

اس میں جگر اور اثر جو قوافی استعمال کیے ہیں وہ بالکل بر محل معلوم ہوتے ہیں اور کسی طرح سے بھی نغمگی اور ترنم میں آورد کا احساس نہیں ہوتا۔

اب قافیہ معنوی جہت سے بھی دیکھ لیتے ہیں یعنی ایسا تو نہیں ہے کہ اقبال نے قافیہ تو باندھا ہے مگر معنی کے اعتبار سے مطابقت و مفاہمت نہیں ہے۔ یا یہ احساس ہو کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ ہوتا تو معانی اور بہتر انداز میں ادا ہو سکتے تھے۔ یا صرف قافیہ پیمائی کی وجہ سے اس لفظ کو لانا پڑا ہے مگر کلام اقبال پڑھتے چلے جائیں کہیں بھی آپ کو ایسا نہیں ملے گا۔ قافیہ تو قافیہ بلکہ پورے شعر میں جو لفظ جہاں ہے وہیں بر محل معلوم ہوتا ہے۔ موضوع کی نوعیت سے قافیے کا ایسا استعمال جس سے موضوع کی تفہیم میں آسانی ہو اقبال ہی کا خاصہ ہے۔ کلام اقبال میں بیشتر جگہ ان کے افکار کی گہرائی ان کے معنی قوافی میں مضمر ہوتی ہے۔ جس سے ان کے معنی قوافی کی عمارت پر شکوہ نظر آتی ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں

غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں

میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقش بند

میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

پورا کلام پڑھتے چلے جائیں کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ قافیہ پیمائی کی وجہ سے اقبال سے مفاہیم کو ادا کرنے میں کوئی کوتاہی ہوئی ہے بلکہ ہر لفظ اپنی جگہ ہار میں موتی کے مانند پرویا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اگر کلام اقبال کا مطالعہ بنظر دقیق کیا جائے تو یہ بات صاف طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ اقبال نے قوافی کا انتخاب کرتے وقت ہر ممکنہ کوشش اور بھرپور توجہ سے کام لیا ہے۔ انھوں نے قوافی کا استعمال عمدہ پیرایہ ئ میں بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے جس سے کلام کا حسن دوبالا ہو گیا ہے ساتھ ہی انکی فکر کی گہرائی، قافیہ دانی، اور ہمہ جہتی کا پتہ چلتا ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں اصول و قواعد کو مد نظر رکھتے ہوئے قافیہ پیمائی کی ہے پورے کلام میں کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ آورد ہے بلکہ آمد کا احساس برقرار رہتا ہے اقبال نے چاہے حرف قافیہ ہو یا حرکت قافیہ سبھی کو مد نظر رکھا ہے۔ کلام اقبال پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جس لفظ کو جہاں لایا گیا ہے گویا وہی اس کا محل ہے اور پورا کلام اقبال بزبان حال کہہ رہا ہے کہ:

جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

مذہبی و قومی ہم آہنگی میں سر سید کا کردار

محمد محدث

ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

تلخیص: سر سید احمد خاں کا شمار انیسویں صدی کے ان نفوس میں ہوتا ہے، جنہوں نے مذہبی ہم آہنگی کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ وہ ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے۔ انہوں نے مذہبی رواداری کے فروغ کے لیے طرح طرح کی عملی کوششیں کی ہیں۔ خاص طور پر ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے نام کوشش کے بعد ملک میں فرقہ ورانہ ماحول کو ہوا دیا گیا۔ بغاوت کا اصل ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھرایا گیا اور عوام کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کی گئی ایسی نازک صورتِ حال میں سر سید احمد خاں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ سے اس نفرت کا سدِ باب کیا۔ انہوں نے عملی خدمات کے ذریعہ بھی مذہبی یکجہتی کا نمونہ پیش کیا۔ زیرِ نظر مضمون میں سر سید کی انہیں کوششوں کا بقدرِ تفصیل جائزہ لیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ : قوم مذہب سر سید علی گڑھ ہم آہنگی یکجہتی رواداری تعلیم تعمیر ترقی ہندوستان وطن ملک اتحاد اتفاق۔

سر سید احمد کا شمار انیسویں صدی کے ان مفکرین میں ہوتا ہے جن کی بے لوث خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سر سید ایک عظیم دانشور، روشن خیال اور دور اندیش ماہرِ تعلیم، شاندار ادیب، علمی و سماجی مصلح، ہمہ گیر و بلند خیال مصنف، ماہر قانون، بیدار مغز سیاست داں، سیرت نگار، مفسرِ قرآن، جدید علم الکلام کے بانی، قومی رہنما، بے باک صحافی، سیکولرزم و ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی، جدید ہندوستان کے عظیم معمار اور مذہبی و قومی ہم آہنگی کے علمبردار تھے۔ آج سر سید امن و آشتی کے پیمبر کی حیثیت سے کائناتِ علم و ادب میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کے بے شمار روشن پہلو ہیں اور ہر پہلو پر متعدد پر مغز مقالے سپردِ قرطاس کیے جا سکتے ہیں۔

سر سید احمد خان ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانہ علمی ہونے کے باوجود پرانی قدروں کا دلدادہ تھا۔ سر سید نے اپنی زندگی میں تعلیم کے فروغ کے لیے بہت محنت کی۔ مجتہدانہ بصیرت، روشن خیالی اور فکر و آگہی سے ملک و قوم کی ایسی آبیاری کی کہ رہتی دنیا تک تشنگانِ علم و فن سیراب ہوتے رہیں گے۔ انیسویں صدی میں برطانوی حکمرانوں نے باہمی اختلافات، خانہ جنگی اور تقسیم کو بڑھاوا دیا۔ اس مشکل وقت میں سر سید احمد خاں اصلاح و اتحاد کے روشن مینار بن کر ابھرے۔

سر سید کی زندگی اور ان کی تعلیمات کا نصب العین یہ تھا کہ اہلِ وطن باہمی تعلقات کو استوار کریں، ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنے تن من دھن سے تعاون پیش کریں اور مذہبی بنیادوں پر کسی قسم کی کوئی تفریق کو فروغ نہ دیں۔ سر سید بلا تفریق مذہب و ملت انسانی فلاح کے سچے حامی تھے۔ سر سید

Scanned with OKEN Scanner

مذہبی ہم آہنگی کے ذریعے ملک کی تعلیمی، معاشی اور تہذیبی ترقی کے متمنی تھے۔ ۱۸۶۴ء میں جب غازی پور میں سر سید نے ایک کالج قائم کرنے کی دلی خواہش کا اظہار عوام کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس دوران انہوں نے ہندوستانی عوام کو ایک قوم کہہ کر خطاب کیا تھا ''اے ہندوستانی صاحبو'' جملے کا بار بار استعمال کرنا ان کی نیک نیتی اور خلوص کو ثابت کرتا ہے۔ پھر سر سید نے سماج کے مختلف باشندگان کے درمیان اظہارِ یکجہتی کے فروغ کے لیے غازی پور میں ایک ادارہ قائم کیا تھا جو بعد میں وکٹوریہ اسکول کے نام سے معروف ہوا۔ سر سید نے عوامی مشورے سے اس ادارے کا پیٹرن اور وزیٹر راجہ دیو نرائن سنگھ بہادر کو نامزد کیا۔ سر سید نے اس موقع پر عوام سے پر مغز خطاب کیا، اس کے چند جملے ملاحظہ کریں :

''اے صاحبان! تم خوب جانتے ہو کہ انسان کو لازم ہے کہ تمام جہان کے انسان کی بھلائی چاہے۔ اگر ہم ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھیں تو جان لیں گے کہ ہم سب آپس میں بھائی اور ایک باپ کی اولاد ہیں، گو آفتاب کی تیزی نے کسی ملک میں ہم میں سے کسی کا رنگ کالا اور کسی ملک میں دھوپ کی نرمی نے کسی کا رنگ گورا کر دیا ہو۔ مگر ہم سب ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ پس ہم سب کو بلا تعصب تمام انسان کی بھلائی چاہنی چاہیے۔.... یہ مدرسہ بلا کسی تعصب کے تمام لوگوں اور ہر ایک قوم کے فائدہ کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ اس سے اس مدرسہ میں کسی قوم کی مذہبی کتابیں پڑھنے کا بھی امتناع نہ ہوگا۔ ہر ایک مذہب کی کتابیں اس مدرسہ میں جو شخص ان کا پڑھنا چاہے پڑھائی جائیں گی۔'' ۱

سر سید احمد خاں مراد آباد میں ۱۸۶۰ء میں صدر الصدور تھے اس دوران اس خطے میں ایک قدرتی وبا پھیل گئی تھی جس سے عوام میں بے چینی اور خوف کا ماحول تھا۔ اس وقت کے حاکم اعلیٰ نے قحط کی انتظام و انصرام کی ذمے داری سر سید کے سپرد کی تھی۔ اس دوران سر سید نے انسانی، قومی اور مذہبی خدمات کے ذریعہ ملک گیر اتحاد و بھائی چارے کا اعلیٰ نمونہ پیش کر کے ایک مثال قائم کی تھی۔ اس حوالے سے حالی ''حیاتِ جاوید'' میں رقم طراز ہیں :

''اس موقع پر قطعِ نظر لیاقت اور سلیقۂ انتظام کے جو انسانی ہمدردی سر سید سے ظہور میں آئی وہ ہندوستان کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔..... محتاج خانے میں حسنِ انتظام کا یہ حال تھا کہ چودہ ہزار محتاجوں کو گھنٹہ بھر میں کھانا تقسیم ہو جاتا تھا بیماروں کے لیے شفاخانہ اور ڈاکٹر موجود تھے۔ بیماروں کو پرہیزی کھانا ملتا تھا۔ زچّاؤں اور شیر خوار بچوں کو دودھ یا کھیر ملتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے مسلمان اور ہندوؤں کے لیے ہندو کھانا پکاتے تھے۔... سر سید صبح و شام دونوں وقت بلا ناغہ محتاج خانے خود جاتے تھے، ایک ایک بیمار کو دیکھتے تھے۔ جن کنگلوں کی صورت اور حالت آنکھ سے دیکھی نہ جاتی تھی، جن کے دست جاری ہوتے تھے اور کپڑے بول و براز میں لتھڑے ہوتے تھے ان کو سر سید خود اپنی گود میں اُٹھا کر دوسری صاف جگہ احتیاط سے لٹا دیتے تھے ان کے کپڑے بدلواتے تھے، سر منڈواتے تھے، ہاتھ منہ دھلواتے تھے اور نہایت شفقت سے ان کے ساتھ پیش آتے تھے۔'' ۲

سر سید احمد خاں پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے مذہبی ہم آہنگی کے فروغ کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو دلہن کی آنکھ سے تعبیر کیا۔ تمام ہندوستانیوں کو پستی اور حالتِ زار سے نکالنے کے لیے مسیحائی کا فریضہ انجام دیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد حکومتِ برطانیہ نے پورے ملک کو انتقامی آگ کے حوالے کر دیا تھا۔ جس سے پورے ملک میں افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ ہزاروں بے گناہ اور معصوم ظلم و بربریت کا شکار ہو رہے تھے۔ برطانوی حکومت کی پالیسی تو تھی ہی کہ پھوٹ ڈالو راج کرو، اس لیے وہ قوموں کے درمیان اختلافات کو ہوا دیا کرتے تھے جس سے نفرت کو فروغ

Scanned with OKEN Scanner

ملتا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ انگریزوں نے اس بغاوت کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھیرایا کیوں کہ حکومت مسلمانوں سے چھینی گئی تھی۔اس کس مپرسی کے دوران قوموں،ذاتوں اور برادریوں کے درمیان باہمی تعلقات کی ضرورت تیزی سے محسوس ہونے لگی۔اس وقت سر سید نے اپنی حکمت عملی اور دوراندیشی سے ملک پر ہو رہے ظلم و بربریت کا ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' لکھ کر سدِ باب کیا۔ سر سید نے دانش مندی اور مضبوط طرزِ استدلال کے ساتھ برطانوی قوتوں کو اصل حقائق سے واقف کراتے ہوئے یہ باور کرایا کہ بغاوت کے ذمہ دار ہندو یا مسلم نہیں بلکہ خود انگریز حکومت کی قانون ساز کونسل اور ناکارہ انتظامیہ کی حکمتِ عملی ہے۔

سر سید احمد خان نہ صرف ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی اصلاحات کے حوالے سے معروف ہیں بلکہ ان کی حکمتِ علمی بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لیے بھی بے مثال ہے۔ وہ اپنے مضامین اور خطبات کے ذریعے بھی مذہبی رواداری پر زور دیا کرتے تھے ان کا ماننا تھا کہ ہر مذہب انسانیت کا درس دیتا ہے اور مذہبی اختلافات کو ہوا دینا، نفرت پیدا کرنا، معاشرتی ترقی کے لیے بڑی رکاوٹ ہے۔ سر سید نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے اور اسے سیاست یا معاشرتی معاملات میں الجھانے سے گریز کیا جانا چاہیئے۔ سر سید نے قرآن کی جدید تفسیر کی تھی جس میں انہوں نے دوسرے مذاہب کے عقائد کے بارے میں مثبت رویہ اپنایا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ تمام مذاہب کی بنیادی تعلیمات انسانیت کی قدر کرنا ہے۔ تمام مذاہب ایک ہی منزل کی طرف رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ سر سید نے اپنے دور میں مذہبی مکالمے کی حوصلہ افزائی کی تھی تاکہ مختلف مذاہب کے درمیان غلط فہمیاں دور ہو سکیں۔ انہوں نے صحافت کے ذریعے بھی مختلف مذہبی کمیونیٹیز کے درمیان محبت اور بھائی چارے کا پیغام دیا تھا۔ان کا مقصد برطانوی دورِ حکومت میں ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان ایک سازگار ماحول پیدا کرنا تھا۔اس حوالے سے سر سید احمد خاں نے ایک مضمون 'غیر مذہب کے پیشواؤں کا ہم کو ادب کرنا چاہئے' تحریر کیا تھا،اس مضمون سے ان کی مذہبی پیشواؤں سے ہم آہنگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سر سید نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باہمی ارتباط پر اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ خوب زور دیا ہے۔ باہمی اتحاد و اتفاق پر خوشی کا اظہار بھی کیا ہے۔ان کا خیال تھا کہ جس طرح آریا ہندو کہلاتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلا سکتے ہیں۔ مذہبی ہم آہنگی اور ہندو مسلم کے درمیان اظہارِ یکجہتی کے فروغ کے لیے اپنے مضمون 'ہندو اور مسلمانوں میں ارتباط' میں اپنے خیالات کا اظہار اس انداز سے کرتے ہیں:

''ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں۔ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں۔ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں۔ایک ہی ملک کی ہوا کھاتے ہیں۔پس مسلمانوں اور ہندؤں میں کچھ مغائرت نہیں ہے۔... ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے، ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں۔اس کی خوبصورتی اس میں ہے۔ کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔ اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہو جاوے گی۔اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی۔ تو کانی ہو جاوے گی۔ ہم دونوں کی سوشل حالت قریب قریب ایک ہی سی ہے'' ۳

سر سید ہندو مسلم دوستی کے سچے دل سے خواہش مند تھے اور انہیں بردرانِ وطن کے جذبات کا بے حد خیال تھا۔ گائے کی قربانی کو لے کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اکثر بحث و تکرار ہوتی تھی اس سے متعلق سر سید کے خیالات ملاحظہ کریں۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:

Scanned with OKEN Scanner

''اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لیے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت ہے۔'' ۴

سرسید نے گؤکشی کے خلاف ملک گیر تحریک بھی چلائی تھی اور ہمیشہ کے لیے کالج کے ہاسٹل میں گائے کے گوشت پر پوری طرح پابندی عائد کردی تھی اور آج بھی اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ان کے اس عمل کو بردرانِ وطن قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

مختلف قوموں کے درمیان باہمی ہم آہنگی کو فروغ دینے کے سلسلے میں علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یکجہتی اور برادریوں میں ہم آہنگی کو عام کرنے کی کوششوں میں سب سے اہم اور سب سے بڑی کاوش علی گڑھ تحریک تھی۔ سرسید نے اپنے اغراض و مقاصد کی خاطر ۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم کی بنیاد ڈالی تھی جو بعد میں ترقی پاکر محمڈن انیگلو اورینٹل کالج میں تبدیل ہوا اور ۱۹۲۰ء میں یونیورسیٹی کا درجہ حاصل ہوا۔ جہاں اس کا مقصد مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانا تھا وہیں اس ادارے کا مقصدِ اصلیہ تعلیم کے ذریعہ ہندو مسلم میں اتحاد و اتفاق اور مختلف قوموں کے درمیان یکجہتی کی روایت کو مستحکم کرنا تھا۔ سرسید ایک وسیع النظر اور دوراندیش انسان تھے انہیں اس بات کا یقین تھا کہ تعلیم ہی مذہبی تعصبات کو ختم کرسکتی ہے اور مختلف قوموں کو قریب بھی لاسکتی ہے۔اس لیے وہ اپنے مشن کو کسی ایک کمیونٹی تک محدو نہیں رکھ سکتے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی طلباء کی موجودگی نے مختلف برادریوں کے درمیان ہمیشہ سے ہی ایک خوشگوار تعلقات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سرسید جب لاہور کے دورے پر تھے تو انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے صدر دیال سنگھ نے سپاس نامہ پیش کیا تھا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کے متعلق غیر مسلم کتنی اچھی اور مثبت رائے رکھتے تھے۔ان کے غیر متعصب اور ہمہ جہت شخصیت ہونے کا تہ دل سے اعتراف کرتے تھے۔بقول دیال سنگھ :

''آپ کا برتاؤ ابتداء سے انتہا تک تعصب یا خودرائی کے دھبّے سے بالکل مبرّا رہا ہے۔جو عمدہ تعلیمی انسٹیٹیوشن آپ نے علی گڑھ میں قائم کیا ہے اس کے فائدوں سے ہندو اور مسلمان دونوں برابر مستفیض ہوسکتے ہیں'' ۵

جو لوگ مادرِ درسگاہ کو صرف مسلمانوں کا ادارہ تسلیم کرتے ہیں سرسید نے ان کے لیے افسوس کا اظہار کیا تھا۔انہوں نے لاہور میں انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو اس کالج کے قایم کرنے کا ہوا یہ تھا جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں آپ بھی واقف ہیں کہ مسلمان روز بروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے جاتے تھے۔ان کے مذہبی تعصبات نے ان کو اس تعلیم سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں مہیا کی گئی تھی اور اسی وجہ سے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ ان کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جاوے۔اس کی مثال اس طرح پر دی جاسکتی ہے: فرض کرو کہ دو بھائی ایسے ہیں جن میں سے ایک بالکل

Scanned with OKEN Scanner

طاقت ور اور تندرست ہے اور دوسرا بیمار ہے اور اس کی تندرستی زوال پر ہے۔اس تمام بھائیوں کا یہ فرض ہوگا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کریں اور اس کو مدد دیں۔.... مگر میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک سی تعلیم پاتے ہیں" ۶

ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا ادارہ ہے جہاں تمام مذہب و ملت کے طلباء کے لیے یکساں اصول و قوانیں ہیں۔اس کالج کا پہلا گریجویٹ اِشوَری پرساد تھا۔کالج کے بنیاد گزاروں میں جہاں مسلم اساتذہ کا انتخاب ہوا وہیں بہت سے دیگر مذاہب کے اساتذہ نے بھی اس ادارے کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ پہلی بار چار طلبہ امتحان کے لیے نامزد ہوئے اس میں اِشوَری پرساد نے کامیابی حاصل کی اور اس طرح سے پہلے باقاعدہ سند یافتہ علیگ ہونے کا تاج اشوری پرساد جی کے سر ہے۔Discovering AMU کے جلد اول میں عاطف حنیف نے رقم کیا ہے:

"st Jan,1881 Four students appeared in the BA examination.Ishwari prasad 1 was the first student to pass the examination "۷

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنا پہلا پوسٹ گریجوٹ ۱۳۹۱ء میں محترمہ سروجنی دیوی کی شکل میں دیا تھا۔اس طرح سے سرسید نے جو پودھا لگا یا تھا اس نے پہلے ہی دن سے مختلف انواع واقسام کے پھل دینا شروع کر دیا تھا۔اب وہ ایک تناور درخت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں تشنگانِ علم و فن کو سیراب کر رہا ہے۔ سرسید نے پورے ہندوستان کی فلاح و ترقی کے خاطر اس ادارے کی بنیاد رکھی تھی۔کالج کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مذہبی تعصبات و سماجی اختلافات سے بالاتر ہو کر تمام برادری برابر تعلیم حاصل کریں اور ترقی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوں۔

سرسید تاحیات ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار رہے اور مذہبی رواداری کی اعلیٰ قدروں کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔جب ان کے پوتے سر راس مسعود کی پیدائش ہوئی تو سرسید نے خوشی کے اظہار میں ایم۔اے۔او کالج کو سو روپیہ پیش کیا۔ سر راس مسعود کی چار سال کی عمر میں بسم اللہ خوانی ہوئی تھی۔بسم اللہ خوانی کی تقریب کے وقت سرسید نے مذہبی و قومی یکجہتی کی عمدہ مثال پیش کی اور تقریب میں مختلف کمیونٹیز کے افراد کو مدعو کیا۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سر راس مسعود، رام بگھت کی گود میں تھے اور رحمن کے بندے مولوی ضیاء الحسن نے اسے بسم اللہ کی رسم ادا کرائی۔

سرسید کی سوچ تھی کہ ہر حال میں ملک کی سالمیت برقرار رہے۔ ہندو مسلم اور دیگر مذاہب کے لوگ اپنے عقائد پر قائم رہتے ہوئے مادرِ وطن کی ترقی کی خاطر آپس میں اتحاد واتفاق سے رہیں۔ سرسید ملک کی مضبوطی کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہر ممکن کوشش کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ سرسید نے انجمن پنجاب کے جلسہ میں جو خطاب کیا تھا اس سے ان کی خیالات کی بہترین عکاسی ہوتی ہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:

"میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلالحاظ قوم اور مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب سب کا بے شک علیحدہ علیحدہ ہے مگر اس کے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں۔....اے ہندو مسلمانو! کیا ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔" ۸

Scanned with OKEN Scanner

سر سید کی طبیعت کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ ملک وملت کے لیے جو بات مفید سمجھتے تھے اس کے پورا کرنے میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔اس سلسلے میں ان کی ہموپیتھک طریقۂ علاج کو فروغ دینے کی کوشش کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔اس کے لیے انہوں نے 'ہموپیتھک ڈسپنری اینڈ ہوسپٹل' کھولا۔ جس سے بے شمار مریض شفایاب ہوئے اور انہیں دعائیں دیں۔ سر سید صرف سیاسی شعور یا کسی ذاتی مفاد کے لیے قوموں سے یکجہتی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے بلکہ باہمی رواداری اور اخوت کی یہ صفتِ حمیدہ ان کے اندر فطری طور پر موجود تھی۔

سر سید احمد خان کی زندگی کے روشن پہلو اور ان کی تعلیمات ہمیں یہ سبق دیتی ہیں کہ مذہبی ہم آہنگی اور یکجہتی کسی بھی معاشرے کی ترقی کے لیے لازمی ہیں۔آج جب کہ فرقہ پرست طاقتیں ملک کی سالمیت کو داغ دار کرنے کی درپے ہے تو ایسے ماحول میں ان کی تعلیمات کی اہمیت دوگنی ہو جاتی ہے۔آج جب پوری دنیا میں افراتفری اور نفرت کا بازار گرم ہے اور عالمی طاقتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے بضد ہیں۔ جبکہ عصرِ حاضر میں دنیا مذہبی، نسلی اور سماجی تناؤ کا شکار ہے ایسے ماحول میں سر سید کا بقائے باہمی کا پیغام پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ سر سید کی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے وزیرِ اعظم جناب نریندر مودی نے ۲۰۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سالانہ، آن لائن پروگرام میں اے.ایم.یو. کو چھوٹا ہندوستان کہا تھا۔ سر سید کا نظریہ آج بھی مختلف کمیونیٹیز کے درمیان رواداری اور یکجہتی کے فروغ کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حواشی:

۱ منشی محمد سراج الدین: لکچروں کا مجموعہ مع مختصر سوانح عمری، ص: ۳۱۔۴۱، بفرمائش فضل الدین۔تاجر کتب قومی۔لاہور۔۰۹۹۱

۲ مولانا حالی: حیاتِ جاوید، ص ۵۳۱۔۶۳۱، اشرف پریس لاہور، ۶۶۹۱

۳ امام الدین گجراتی و مولوی احمد بابا، آخری مضامین، ص ۰۷، کوپریٹو پرنٹنگ پریس لاہور

۴ مولانا حالی، حیاتِ جاوید، ص ۶۸۷، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۴۰۰۲

۵ محمد اسماعیل پانی پتی، سید احمد کا سفر نامۂ پنجاب، ص ۸۲۲، قوسین تھارٹین، لاہور، ۳۷۹۱

۶ محمد اسماعیل پانی پتی، سید احمد کا سفر نامۂ پنجاب، ۲۳۲۔۳۳۲، قوسین تھارٹین، لاہور، ۳۷۹۱

۷ Atif Hanif,Discovering AMU,volume:1,page No 127

۸ مولانا حالی، حیاتِ جاوید، ص ۶۸۷۔۷۸۶، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۴۰۰۲

Scanned with OKEN Scanner

حسرت موہانی کے سیاسی افکار و نظریات

Mohammad Arif

Research Scholar Department of Urdu

تلخیص: مولانہ حسرت موہانی کا سب سے ممتاز اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سے پہلے مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا اور اس طرح ہند کے تمام باسیوں کے دلوں میں مکمل آزادی کی جوت جگادی۔ حسرت کا مسلک دراصل کانگریس اور مسلم بیگ دونوں سے الگ تھا۔ وہ مصلحت پسندی کے بلکل خلاف تھے۔ اور ملک عزیز کو جلد از جلد آزاد دیکھنا چاہتے تھے اس کے لئے انہوں نے کئی دفعہ سیاسی جماعتیں چھوڑیں، قید کی مشقتیں برداشت کیں اور برطانوی حکومت کو اقتصادی طور پر کمزور کرنے کے لئے تحریک سودیشی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خود بھی شودیشی اسٹور کھولا۔

کلیدی الفاظ: سیاستداں، صحافی، تحریک آزادی، انقلاب، سودیشی تحریک، کانگریس، برطانوی سامراج، مصلحت کوشی، بائیکاٹ۔

اردو کے صف اول کے منفرد شاعر، صاحب طرز ادیب، ممتاز نقاد، نباض ادب، تذکرہ نگار، نامور صحافی، تحریک آزادی میں پیش پیش رہنے والے اور جنگ آزادی کے عظیم مرد مجاہد سید فضل الحسن حسرت موہانی ایک مختلف النوع اور گوناگون شخصیت کے حامل تھے۔ سیاست ان کی زندگی کے نورانی پہلوؤں میں سے ایک اہم ترین پہلو ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، جس کے بغیر جنگ آزادی کی داستان نامکمل سی معلوم ہوتی ہے۔ حسرت موہانی کے سیاسی نظریات کی تشکیل میں دو اہم تحریکوں کا بنیادی حصہ تھا، جن کی نوعیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور متضاد تھی۔ ان میں سے ایک ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی تھی جو کلی طور پر انگریز دشمنی کے جذبات کی پیداوار تھی اور دوسری تحریک سرسید احمد خاں کی تھی جو انگریز دوستی کے جذبات پر مبنی تھی۔ مؤخرالذکر تحریک کے نتیجہ میں ۱۸۵۷ء میں مدرستہ العلوم عمل میں میں آیا جس نے آگے چل کر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی شکل اختیار کر لی جو حسرت کی مادر درسگاہ بنا اور آج علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔

مولانا حسرت موہانی نہ صرف ایک بہت بڑے شاعر تھے بلکہ بہت بڑے انقلابی بھی تھے۔ ان کی سیاسی زندگی طوفان انقلاب کا پتہ دیتی ہے۔ اپنے مضامین اور تقریروں کے ذریعہ انھوں نے قوم کو جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لئے اکسایا۔ سرسید نے مسلمانوں کو سیاست سے علیٰحدہ رکھا تھا حسرت موحانی نے کانگریس کی اہمیت کو جتایا اور اسمیں مسلمانوں کی شرکت کو قومی جنگ آزادی کی ایک اہم ضرورت قرار دیا۔ حسرتؔ کی دلیری اور جانبازی، خلوص وایثار اور ان کی آزادی وبیباکی ایسی خصوصیات تھیں جو ایک سچے انقلابی کے لئے ضروری ہیں۔

حسرتؔ نے جس زمانہ میں سیاست کے میدان میں قدم رکھا اس وقت اس میدان میں آنے سے بڑے بڑے لوگ گھبراتے تھے یہ زمانہ برطانوی سامراجیت کے شباب کا زمانہ تھا محبان وطن کے لئے اس وقت کی سیاست زنجیر وزندان کی سیاست تھی۔ حکومت کے کسی بھی پالیسی کے خلاف لب کشائی ناقابل معافی جرم تھا اور محض شک وشبہ کی بنیاد پر لوگوں کو زندان میں ڈال دیا جاتا تھا۔ ب ۱۸۹۷ء میں بال گنگادھر تلک کی ایک تقریر کو سرکار کی

Scanned with OKEN Scanner

مخالفت قرار دے کر ان کو ۱۸ مہینے کی سزا دی جا چکی تھی۔ برٹش حکمران ہندوستانی صنعت کو کچلنے کے لئے ان پر کمر توڑ ٹیکس لگا رکھے تھے۔ ان باتوں کا ردّ عمل بھی ہو رہا تھا کہ محبان وطن نے برطانوی سامراج کے خلاف آوازیں اٹھانی شروع کر دی تھی اور معاشرہ سیاسی و تہذیبی انگڑائیاں لینے لگا تھا۔

اس پر آشوب، تشدد و بربریت، نفرت و خصومت اور جد وجہد کی فضا میں حسرت نے اپنا بچپن گزارا، جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی سیاسی و سماجی معاملات میں عملی طور پر حصہ لینے لگے۔ ایسے عالم میں جب مضبوط اعصاب کے لوگ بھی حکومت کی دست درازیوں کے خلاف مہر بہ لب تھے ایسے وقت میں حسرت موہانی ان سرفروشوں کی صف میں جا کھڑے ہوئے جو ظلم کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے سیاسی عقائد کے سبب بہت سی مصیبتیں برداشت کیں۔ بی۔ اے۔ کی ڈگری مکمل کرنے بعد بجائے اس کے کہ کوئی سرکاری نوکری یا عہدہ تلاش کرتے بلکہ وہ علی گڑھ میں ہی مقیم ہو گئے۔ اور ۱۹۰۳ء میں وہیں سے اردوئے معلی کے نام سے ایک رسالہ کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی اہمیت کا بھی حامل تھا۔ اسی سال سے وہ انڈین نیشنل کانگریس کے مجلسوں میں بھی شامل ہونے لگے۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :

''مرحوم نے ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی اور مذاق زمانہ کے خلاف کسی اعلیٰ ملازمت کے بجائے علم و فن اور شعر سخن کی خدمت کا تہیہ کیا اور اردوئے معلی کے نام سے ایک بلند پایہ ادبی رسالہ علی گڑھ سے جاری کیا۔۔۔۔۔ اردوئے معلی نوجوان جدید تعلیم یافتہ گروہ کی ادبی خدمت کا دوسرا قدم تھا، مگر مرحوم کی طبیعت میں جو تضاد تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اردوئے معلی کے صحن میں شعر و سخن کے چمنستان کے ساتھ سیاست کا خارستان بھی نظر آیا۔ چنانچہ اس زمانہ میں جب مسلمان سیاست سے جھجھکتے تھے علی گڑھ کا یہ بے باک نوجوان گریجویٹ کانگریس میں شامل ہو گیا۔''

ان کے ذہن میں ان کا مقصد واضح ہو چکا تھا اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنے قلم کا بڑی جرائتمندی اور بے باکی سے استعمال کر رہے تھے۔ اردوئے معلی کے ستمبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں تحریر فرماتے ہیں :

''ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ سر سید اپنے زمانے میں قوم کے رہنما تھے اور اس وقت مسلمانوں کے حق میں انہوں نے جو کچھ کیا بہتر کیا۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیٰحدہ ہونے کی نصیحت اس بنا پر کی کہ غدر کے بعد سرکار انگلشیہ مسلمانوں سے بدگمان تھی اور ان کو بغاوت کا ملزم سمجھتی تھی، تو خوب کیا۔ اگر انہوں نے مسلمانوں کی توجہ کو تمام ملکی معاملات سے علیٰحدہ کر کے صرف اعلیٰ تعلیم کی طرف مائل کیا تو اور بھی خوب کیا۔ لیکن ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا زمانے کی اب بھی وہی حالت ہے جو سر سید کے وقت میں تھی؟ ہم کہتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر ننگ و عار کا موجب کون امر ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی فلاح و بہبود کے لئے خود کوشش نہ کریں، بلکہ دوسروں کی حمایت پر بھروسہ رکھیں اور اپنے جائز حقوق کے طلب کرنے سے صرف ایک خیالی نفع کی امید کی وجہ سے باز رہیں۔ ''

حسرت نے جس وقت علی گڑھ میں قدم رکھا اگرچہ اس وقت علی گڑھ تحریک آخری سانسیں لے رہی تھی لیکن کانگریس تحریک کی مخالفتیں اب بھی ہو رہی تھیں۔ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے اندر جرأت نہیں تھی کہ وہ سیاسی طور پر انگریزوں کے کے خلاف سوچیں یا کوئی اقدام کریں۔ حسرت نے اس روایت کو توڑا اور کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔

کانگریس میں دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک مصلحت پسند اور نرم مزاج گروہ جو سیاسی قرار دادوں کے ذریعہ انگریزوں کو ناراض کئے بغیر ہر طرح کے مراعات اور آسانیاں حاصل کرنے کا خواہان تھا۔ اس اعتدال پسند گروہ کی رہنمائی دادا بھائی نوروجی، گوپال کرشن گوکھلے اور سریندر ناتھ بنرجی وغیرہ کر

Scanned with OKEN Scanner

رہے تھے۔ دوسرا گروہ انتہا پسند اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے تشدد کی حد تک پہنچ جانے والوں کا تھا۔ یہ گروہ قرار دادوں کے بجائے پر زور احتجاج کا حامی تھا۔ حق مانگنے کے بجائے حق چھین لینے پر یقین رکھتا تھا۔ گروہ کی رہبری بال گنگادھر تلک کر رہے تھے۔ اعتدال پسند گروہ کا کہنا تھا کہ محض قرار دادوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کے حقوق اور رعایتوں کی مانگ کی جائے جب کہ انتہا پسند گروہ بضد تھا کہ اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے احتجاجات اور مظاہروں سے کام لینا چاہئے۔

۱۹۰۷ء میں سورت میں کانگریس کا اجلاس ہوا اور اس اجلاس میں یہ اختلاف شدت اختیار کر گیا، جس کے نتیجہ میں بال گنگادھر تلک اپنے حامیوں کے ساتھ کانگریس سے الگ ہو گئے تو حسرت موہانی بھی ان کے ساتھ کانگریس سے علیٰحدہ ہو گئے۔ حسرت موہانی اپنی حریت پسندی، بیباکی اور باغیانہ طبیعت کے زیر اثر انتہا پسند گروہ سے منسلک رہے، اردوئے معلی میں کانگریس کی موافقت میں آواز اٹھاتے رہے اور لوگوں کو اس کی سرگرمیوں سے باخبر کرتے رہے۔ حسرت نے اردوئے معلی کو ایک تحریک کی شکل دے دی، اس کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر سیاسی بصیرت و آگہی کی آبیاری کی، نہایت دلیری کیساتھ مصلحت کوشی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ہندوستانی سیاست کے علاوہ بین الاقوامی اور مسلم ممالک کی سیاست سے ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کو مطلع کیا۔

حسرت موہانی کی سرشت اور فطرت میں بغاوت تھی، چاہے ادب کا میدان ہو یا سیاست اور صحافت کا ہر میدان میں باغیانہ قدم اٹھایا۔ یہی سبب ہے کہ وہ اس وقت سیاست کے میدان میں سرگرم نظر آتے ہیں جب ساری امت مسلمہ اسے شجر ممنوعہ سمجھ کر اس سے دوری اختیار کر تھی۔

حسرت موہانی فقط ایک بڑے شاعر نہ تھے بلکہ بہت بڑے انقلابی بھی تھے ان کی سیاسی زندگی طوفان انقلاب کا پتہ دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے مقالوں اور تقریروں کے ذریعہ امت مسلمہ کو جنگ آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کے لئے برانگیختہ کیا۔ سرسید مسلمانوں کے کانگریس میں شامل ہونے کے خلاف تھے حسرت نے کانگریس کی اہمیت سے لوگوں کو آگاہ کیا اور مسلمانوں سے اپیل کہ کہ وہ جوک در جوق کانگریس میں شامل ہوں۔ حسرت اردوئے معلی کے شمارہ ستمبر ۱۹۰۴ء کے مضمون بعنوان ''نیشنل کانگریس اور پولیٹکل ایجیٹیشن'' میں لکھتے ہیں :

''ہم دعوے کے ساتھ کہ سکتے ہیں کہ جو لوگ اس زمانہ میں بھی کانگریس کی شرکت کو مسلمانوں کے حق میں مضمر سمجھتے ہیں ان کے پاس سوائے اس کے اور اور کوئی قوی دلیل نہین ہے کہ ہم سرسید کی پالیسی کی پیرو ہیں۔۔۔۔۔ غرض یہ کہ اس ساری تحریر کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ سرسید نے جو پالیسی اختیار کی تھی اسے ہم بمقتضائے وقت اس زمانے کے لئے صحیح بھی مان لیں تو اب اس پر قائم رہنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے، وہ ضرورتیں نہیں ہیں، وہ مصلحتیں نہیں ہیں اس لئے کیا وجہ ہے کہ اب وہ پالیسی بھی غلط نہ قرار دی جائے۔ ''

حسرت کی جانبازی، جرأت، بے نیازی، خلوص، نیک نیتی، قربانی کا جذبہ، آزادی کا ولولہ اور بے لوث خدمت ایسی خصوصیات تھیں جو ایک سچے اور ایماندار انقلابی کے لئے ضروری ہیں۔

حسرت نے اپنے سیاسی نظریات و معتقدات کی تبلیغ و ترویج کے لئے اردوئے معلی کو ایک مؤثر ذریعہ کے طور پر استعمال کیا۔ کانگریس کے جلسوں اور کارروائیوں کی رپوٹیں ہوں یا کانگریس کی طرفداری میں مسلم لیڈروں کی تحریریں، ترک موالات کی تحریک کا معاملہ ہو یا آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے اور تبصرے، علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کی مانگ ہو یا انگریز افسروں کی سیاسی چالوں کا تجزیہ و تحلیل، اردوئے

Scanned with OKEN Scanner

معلی کے اوراق ان تمام ملکی اور قومی مسائل سے پر رہتے تھے۔اس کے ذریعہ سودیشی تحریک، غیر ملکی اموال کے بائیکاٹ، یونیورسٹی کے الحاق اور دیگر ضروری مسائل پر آزادانہ گفتگو کی جاتی تھی۔

حسرت موہانی کا مسلک دراصل کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے الگ تھا۔ وہ ہندوستان کی کسی بھی سیاسی جماعت یا گروہ سے زیادہ باغیانہ طبیعت کے مالک تھے وہ صحیح معنوں میں باغی اور سرکش تھے۔ وہ اس وقت تک بغاوت کرنا چاہتے تھے جب تک کہ ہندوستان میں کوئی ایسا نظام نہ رائج ہو جائے جس میں انسان عزت وعافیت کے ساتھ زندگی گزار سکے، جو سب کے فلاح وبہبود کے لئے ہو اور جو نظام انسانی ناموس کی حفاظت کے لئے لازم ہے وہ انگریزی حکومت کو ایک ناجائز اور غیر طبیعی حکومت تصور کرتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ یہ حکومت زیادہ دنوں تک حریت اور آزادی کی آواز کو دبا نہ پائے گی اور آخر کار یہی ہوا کہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئی۔ انگریزی حکومت بھی حسرت کو اپنے لئے ایک بڑا خطرہ خیال کرتی تھی اور ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھتی تھی۔ برطانوی حکومت کے دفتر میں حسرت کا نام نمبر ۳ تھا اور جب کبھی حسرت سفر پر نکلتے تو ایک جگہ کی پولیس دوسری جگہ کی پولیس کو خفیہ طور پر اطلاع دیتی تھی تو ان کو نمبر ۳ ہی کہتی تھی۔

واقعات غدر کے بعد حسرت موہانی اردو شاعروں میں سب پہلے سیاسی قیدی تھے۔ جب انہیں ۱۹۰۸ء میں رسالہ اردوئے معلی میں ایک مضمون شائع کرنے کے پاداش میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑا۔ جیل کے اندر حسرت کے ساتھ بڑی زیادتیاں ہوئیں۔ خصوصاً چکی پیسنے کی مصیبت جس کا آپ نے کاص طور سے ''مشاہدات زنداں'' میں بھی ذکر کیا ہے۔ تقریباً سال بھر تک ایک من آٹا پیسنے کی سخت مشقت سے سابقہ رہا جو عام طور پر دیگر صوبوں میں ایک ماہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن پولیٹکل قیدیوں کے ساتھ نسبتاً زیادہ سختیاں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف آواز اٹھانے اور ہندوستان کے لئے مکمل آزادی کی مانگ کرنے کے جرم میں انہیں ۱۹۱۶ء اور اس کے بعد ۱۹۲۲ء بھی گرفتار کر کے مقید کیا گیا لیکن حسرت نے ملک عزیز کی آزادی کی خاطر ان سبھی مشکلات کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حسرت پر جو افتاد پڑی وہ بڑے سے بڑے قائد اور لیڈر کو ڈگمگا دینے اور اس کے حوصلوں کو پست کرنے کے لئے کافی تھیں لیکن یہ تمام مشکلیں اور سختیاں حسرت کے اعصاب کو متزلزل نہ کر سکیں۔ بلکہ حسرت ان مشکلات کا سامنا کرتے کرتے مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔ جس کے نتیجے میں حسرت کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلی ہم رہاں سے ہم!

حسرت کا سب سے ممتاز اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سب سے پہلے مکمل آزادی کا ریزولیشن پیش کیا اور اس طرح ہندوستان کے تمام باسیوں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان سب کے دلوں میں مکمل آزادی کی ایک جوت جگادی۔ وہ حریت کے جذبے کو اپنی جان اور اپنے اطمینان اور سکون سے زیادہ ترجیح دیتے تھے اور اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی خاطر کسی بھی طرح کی قربانی سے گریز نہ کرتے تھے۔ اگرچہ اس زمانہ میں اس تخیل کے لئے فضا ہموار نہ تھی اور اپ کو مخالفانہ و معاندانہ ردّ عمل سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ مگر ان کے پائے ثبات میں کوئی لرزش نہیں پیدا ہوئی اگرچہ انہیں ناقابل بیان صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلم لیگی ان کے مخالف ہو گئے۔ کانگریسی ان سے بدگمان ہو گئے، تحریک خلافت کے

Scanned with OKEN Scanner

اراکین ان سے بد ظن ہو گئے اور ان سے کوئی ربط ضبط باقی نہ رکھا۔ مگر وہ آہنی ارادوں والا اور مضبوط اعصاب کا مالک مجاہد آزادی اپنی جگہ پر ثابت قدم رہا اور اس کے آیڈیولوجی اور سیاسی نظریات مین ذرا بھی لچک نہیں پیدا ہوئی۔ خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کبھی خدمت انگریز نہ کرتے

کتابیات:

۱۔ حسرت کی سیاسی زندگی، مولانا سید سلیمان ندوی، مشمولہ نگار ۱۹۵۲ء، صفحہ ۱۱۲

۲۔ اردوئی معلی، ستمبر ۱۹۰۴ء

۳۔ اردوئی معلی، ستمبر ۱۹۰۴ء

Scanned with OKEN Scanner

عہد حاضر میں سرزمین بہار کے غزل گو شعراء: ایک مطالعہ

عصمت خاتون

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، پاٹلی پتر ایوورسٹی، پٹنہ

تلخیص: سرزمین بہار قدیم زمانے سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔اس مردم خیز زمین نے کئی مذاہب کے بانی، ہزاروں بزرگانِ دین، اور بے شمار اہلِ قلم پیدا کیے ہیں جنہوں نے اپنی کاوشوں اور جانفشانی سے اس مقدّس سرزمیں کو گلزارِ ارم بنادیا۔ بہار کو صوفیوں کی نگری بھی کہا جاتا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ اردو غزل صوفیوں کی تہذیب سے آراستہ ہو کر ظہور پذیر ہوئی اور ہر عہد میں مختلف ماحول سے گزرتی ہوئی تمام تبدیلیوں میں راہ بناتے ہوئی آگے بڑھتی رہی اور اردو ادب کی سب سے مقبول ترین صنف سخن کا مقام حاصل کیا۔ کسی شاعر نے غزل کے حوالے سے بلکل درست فرمایا ہے کہ: ”، ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے، اس کے زلفوں کے سب اسیر ہوئے“۔ بہار کی یہ خوش نصیبی رہی کہ یہاں ہر عہد میں ماہرِ فن اور اساتذہ پیدا ہوتے رہے۔ جن میں مرزا عبدالقادر بیدلؔ، راسخ عظیم آبادی، جوشش، بسملؔ عظیم آبادی، شادؔ عظیم آبادی لاکھوں ایسے نام ہیں جن کے بغیر اردو شاعری کی تاریخ نامکمل ہے۔ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کی طرح دبستانِ عظیم آباد کی بھی ایک شاندار روایت رہی ہے۔ صدیوں کی طرح آج بھی بہار میں نامور شعراء کی ایک کہکشاں ہے۔ جن میں عالمی شہرت یافتہ پدم شری کلیم عاجزؔ، سلطان اخترؔ، قیصرؔ صدیقی، ظفر مجیبی، ناشادؔ اورنگ آبادی، شکیلؔ دسنوی، عالم خورشید، علیم اللہ حالی، ارمان نجمی، ظفر امام، خورشید اکبر، معراج احمد معراج، ذکی احمد، فہیم جوگاپوری، ظفر انصاری ظفرؔ، افتخار راغبؔ ایسے ہزاروں نام ہیں جنکے نام سے اردو شاعری کی تاریخ کے اوراق روشن اور تابناک ہے۔

کلیدی الفاظ: گلزارِ ارم#عنبریں#، ضوفشانی#خِطّہ#موصوف #برجستگی#روداد #عزاداری# نغزبیاں# تطہیر#ناموعود#

ملک ہندوستان ایک کا ایک خِطّہ جسے دنیا کے نقشے میں بِہار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ خِطّہ قدیم زمانے سے ہی اپنے علمی، ادبی، شقافتی اور سیاسی کارناموں کے لیے سارے جہاں میں مشہور و معروف ہے۔ سرزمین بہار کی تاریخ بڑی روشن اور تابناک ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ بہار کی تاریخ کے کی بغیر ہندوستان کی تاریخ کبھی بھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی تو غلط نہ ہوگا۔۔اس مقدس سرزمین پر کئی مذاہب کے بانی، بڑے بڑے اولیاء کرام، بزرگان دین، صوفی ،سنت، شہنشاہ، سیاست داں، مجاہدین، شاعر اور ادیب اور کئی عظیم ہستیاں پیدا ہوئیں جن کے ناموں سے بہار کی عظمت وابسطہ ہے۔

اس کی خاک سے مہاتما بدھ، گرو گوبند سنگھ، مہاویر جین، حضرت مخدوم جہاں شاہ شرف الدین احمد یحیٰ منیری، شیر شاہ سوری، عبدالرحیم صادق پوری، مولانہ شیخ عبدالرزاق بہاری، شیخ الوقت مولانہ عبدالنبی، مولانہ عتیق بن عبدالسمیع بہاری، مولانہ عبدالسمیع صادق پوری، فاضل بہار حضرت مولانہ محمد ظفر الدین قادری رضوی، چندر گپت موریہ، بندوسار، اجات ستر و، آریہ بھٹ، بمبیسار، شہنشاہ جارسندہ، سمراٹ اشوک،، سید سلیمان ندوی، کلیم

الدین احمد، عبدالمغنی، مظہر الحق، ڈاکٹر راجیندر پرشاد، جے پرکاش نارائن، استاد بسم اللہ خاں ایسے ہزاروں نام ہے جن کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

بہار میں اردو شاعری کے حوالے سے اگر ہم بات کریں تو محمد معین الدین دردائیؔ نے اپنی تصنیف ''بہار اردو شاعری'' میں ملاّ محمد علیم تحقیق عظیم آبادی کو بہار کا سب سے پہلا شاعر تسلیم کیا ہے۔ آپ ملا محمد علیم تحقیق کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''بعض مؤرخین نے مرزا بیدلؔ کے سر پر اوّلیت کا تاج رکھا ہے، لیکن ملا محمد علیم تحقیق عظیم آبادی بیدل سے پہلے گزرے ہیں۔ عظیم آباد کو انکے مسکن اور مدفن دونوں ہونے کا فخر حاصل ہے۔ عالمگیر کے عہد میں تھے، اور شاہجہاں کا آخری زمانہ بھی انہوں نے دیکھا تھا، اور وہ یہ زمانہ تھا جب لکھنؤ کا تو کیا ذکر دہلی میں بھی کوئی اردو کا شاعر موجود نہ تھا۔ فارسی کے علاوہ ان کا اردو کلام بھی ملتا ہے۔

ملا محمد علیم تحقیق ہی کے ہم عصر سید عماد الدین عماد الدینؔ (۱۱۱۶ھ ۱۱۷۳ھ) ہیں۔ اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جب لکھنؤ اور دہلی میں کسی اردو شاعر کا وجود نہ تھا، اس وقت بہار میں کئی اردو شعراء موجود تھے۔''

بحوالہ: بہار اور اردو شاعری از محمد معین الدین دردائیؔ ص: ۱۵، ۱۴

بہار کی اردو شاعری کی تاریخ کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ دکن کی طرح بہار میں بھی اردو شاعری کی پرورش کی جارہی تھی اور اردو یہاں بھی وہ پھل پھول رہا تھا۔ سرزمین بہار کی خاک سے لاکھوں نامور شعراء پیدا ہوئے جن میں ملّا محمد علیم تحقیق عظیم آبادی

مرزا عبدالقادر بیدلؔ، میاں شیخ محمد روشن جوششؔ، شیخ محمد عابد دلؔ، میر مظہر علی جذبؔ، راجہ بہادر راجہؔ، محمد غلام حسین شورشؔ، مرزا محمد علی فدویؔ، حضرت شاہ احسان اللہ چستی نظامی فخریؔ، منشی گنگا لال صاحب دماغؔ، شیخ غلام علی راسخؔ، شاہ ابوالحسن فردؔ پھلواری، شاہ الفت حسین فریادؔ، منشی آنند رام الفتؔ، خواجہ امین الدین امینؔ، شیخ شابت علی شابتؔ، منشی بنی پرشاد دلؔ، شاہ غلام مرتضیٰ جنوںؔ، خواجہ امام بخش امامیؔ، شیخ غلام بخش حضورؔ، منشی منگل سین الفتؔ، کنور سکھراج بہادرؔ، شمس العلماء نواب امداد امام اثرؔ، سید الشعراء علی محمد شادؔ عظیم آبادی، مولانہ ظہیر الحسن صاحب شوق نیموی، حاجی شمس العلماء محمد سعید صاحب حسرتؔ عظیم آبادی، سید محی الدین حسن محویؔ، حضرت صفیر بلگرامی، جناب فضل حق صاحب آزادؔ، ابو الجمال محمد احسن سخنؔ، مولانہ محی الدین صاحب تمناؔ عمادی مجیبی، حافظ سید شاہ محمد شفیع صاحب فردوسیؔ، شاہ اکبر داناپوری، محسن عظیم آبادی، پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدلؔ، پروفیسر اختر احمد اخترؔ اورینوی، سید شاہ عبدالعزیز صاحب عزیزؔ، جناب ڈاکٹر عظیم الدین صاحب عظیمؔ، بسملؔ سنسہاروی، سریر کابری، مسلم عظیم آبادی، شاقب عظیم آبادی، زار عظیم آبادی، پروفیسر اختر قادری، مبارک عظیم آبادؔ بسمل عظیم آبادی، یگانہ چنگیزی، نازش سہسرامی، بی زیڈ مائلؔ، ارتضیٰ حسین ہوشؔ، صابرؔ بہاری، بہاء الدین کریم، عطاا اللہ پالوی، مناظر احسن گیلانی عظیم آبادی، نازش سہسرامی، احمد عظیم آبادی، ضیاءؔ عظیم آبادی، ناصرؔ زیدی، حبیب آروی، احمد عظیم آبادی، جناب جمیل مظہریؔ، پرویز شاہدی عطا کاکوی، اجتبیٰ رضویؔ، بہزاد فاطمی، احسان دربھنگوی، وفا ملک پوری، بیتابؔ عظیم آبادی، نشورؔ واحدی، حسن امام دردؔ، رضا نقوی واہیؔ، کیفؔ عظیم آبادی۔ رمزؔ عظیم آبادی، احقرؔ بہاری، رنجورؔ عظیم آبادی، علامہ واقف عظیم آبادی، شبنم کمالی وغیرہ ایسے لاکھوں نام ہیں جنہوں نے اپنے خونِ جگر سے اردو شاعری کی آبیاری کی جن کے ذکر کے بغیر اردو شاعری کی تاریخ نامکمل ہے۔ عہد حاضر میں بھی بہار کے شعراء روایت کی پاسداری کر رہے ہیں اور اردو شاعری کا چمن گلِ گلزار ہے۔

پروفیسر شاکر خلیقؔ

پڑھیں گی بعد کی نسلیں سند کے طور پر ہم کو

Scanned with OKEN Scanner

رواداری کی رسم خاندانی چھوڑ جائیں گے

عہد حاضر میں سرزمیں بہار کے معروف و مشہور شاعر ذی علم شخصیت کے مالک پروفیسر شاکر خلیق صاحب عرصہ دراز سے آسمان شعر و سخن میں محوِ پرواز ہیں۔ موصوف کا حقیقی نام شاکر احمد یحیٰ ہے۔ آغاز میں آپ شاکرؔ تخلص فرماتے تھے بعد میں اپنے والد محترم کے نام کے بنسبت خلیق تخلص فرمانے لگے۔ اردو ادب کی دنیا میں آپ اپنے قلمی نام شاکر خلیقؔ سے مشہور ہیں۔ آپ ہمہ جہت فنکار ہیں۔ آپ نہایت خلوص طبیعت اور دیندار آدمی ہیں۔ آپ کی تاریخ ولادت ۸ر مئی ۱۹۴۵ء بہ اعتبار سند اور جائے ولادت موضع بھیرو پور (بدر پور) حاجی پور ضلع ویشالی ہے۔ شاکر خلیقؔ صاحب ایک مذہبی اور ذی ذی علم خانوادا کے چشم وچراغ ہیں۔ آپ کے والد محترم کا نام عبدالخالق خلیق اور والدہ ماجدہ کا حجن بی بی صفیہ خاتون ہے۔ آپ کے والد صاحبِ کتب تھے، آپ کی دو کتابیں منظرِ عام آ چکی ہیں جن میں ''تذکرہ آل تراب'' اور ''حاضری'' (سفر نامہ حج بیت اللہ)۔ شاکر خلیق صاحب نے بی۔اے، ایم۔اے، بی۔ایل اور پی۔ایچ۔ڈی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ حصولِ تعلیم کے بعد آپ نے وکالت کے پیشہ کو اختیار کیا۔ پٹنہ ہائی کوٹ اور دربھنگہ سول ہائی کوٹ میں وکالت کی، اس کے بعد آپ سی۔ایم کالج دربھنگہ، صدر شعبہ اردو فارسی کے عہدے پر ۳۱ر مارچ ۱۹۷۱ء کو فائز ہوئے اس کے بعد آپ صدر شعبہ اردو، متھلا یونیورسٹی ہوئے۔ صغریٰ حسن میموریل اردو گرلس ہائی اسکول (دربھنگہ) کے سیکریٹری بھی منتخب ہوئے۔ سابق رکن فرسٹ اردو ایڈوائزری کمیٹی حکومت بہار اور سابق رکن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اپنے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ موصوف ادبی طور پر بہت متحرک اور فعال رہے۔ آپ ایک کامیاب استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ درجہ کے ادیب اور شاعر ہیں۔ کئی زبانوں پر آپ کو عبور حاصل ہے۔ اس کی عمدہ مثال آپ کا شعری مجموعہ ''احتساب جنوں'' ہے جو ۲۰۲۱ء میں منظرِ عام پر آیا جس کا انتساب انہوں نے محترم عامر سبحانی صاحب (چیف سکریٹری، حکومت بہار) کے نام کیا ہے۔ اس شعری مجموعہ میں شامل موصوف کی تحریر کردہ مضمون ''عرض حال'' کے عنوان سے شامل ہے جس میں رقم طراز ہیں:

''احتساب جنوں'' میں اردو کے علاوہ نمونتاً فارسی، انگریزی، ہندی اور علاقائی زبانوں میں میتھلی کلام بھی شامل کر لیا گیا ہے تاکہ اہلِ ذوق حضرات زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکیں اور زبان کی جگل بندی کی چاشنی ان کے کام و دہن کو تادیر ذائقہ پہنچاتی رہے۔''

بحوالہ: احتسابِ جنوں از شاکر خلیقؔ، ص: ۲۲

شاکر خلیقؔ صاحب ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔۔ آپ نے سبھی اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ آپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ آپ کی غزلوں کا پہلا مجموعہ '' اعتراف جنون''(۱۹۹۴ء) میں منظرِ عام پر آیا۔ ''نوشہ آخرت'' آپ کی مناجات، حمد و نعت کا مجموعہ ہے جو (۲۰۰۷ء) میں شائع ہوا۔ آپ کا شعری مجموعہ '' احتساب جنوں'' (۲۰۲۱ء) میں شائع ہوا۔ آپ ایک مقبول شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ درجہ کے ادیب بھی ہیں۔ آپ کی دیگر تصانیف جس کی فہرست یہ ہے:

''جواہرات ادب'' متھلا یونیورسیٹی کی پہلی درسی کتاب ۱۹۷۳ء

متھلا، بہار اور مگدھ یونیورسٹی کی درسی کتابیں ۱۹۷۴ء

''حُسین نوشہ توحید بلخی۔ حیات اور کارنامے'' ۱۹۹۳ء

Scanned with OKEN Scanner

''اوراق پریشاں'' (مضامین کا مجموعہ)۲۰۲۰ء

''اردو کی کہانی فلموں کی زبانی'' ۲۰

''مسلم ایجوکیشن سوسایٹی،'' (انگریزی کتابچہ)۱۹۷۵ء

''روح ادب''

''کائنات جنوں''

''سبد گل۔شادیات و متفرقات''

اس فہرست سے شاکر خلیقؔ کی تخلیقی جہات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔وہ مختلف شعری اور نثری اصناف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔

خلیقؔ صاحب اردو ادب کی دنیا میں بحیثیت شاعر زیادہ مشہور ہیں۔

آپ نے سید شاہ عطاءالرحمٰن کاکوی کے ایماں پر شرف تلمیذ حاصل کرنے کا اعتراف کیا ہے۔شاعری میں شاکر خلیقؔ کا تخلیقی سروکار غزل جیسی روایتی اور نظم جیسی جدید صنف سے بھی رہا ہے۔شاکر خلیقؔ صاحب کی شاعری میں عصری حالات و کوائف اور زندگی کے نشیب و فراز کے تمام پہلوؤں کا عکس صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کبھی ہے 'اعتراف' اس کا کبھی ہے ' احتساب' اس کا
جنوں کے حوصلے کا معترف دیکھو زمانہ ہے

کیسے بیٹی بیاہی جائے گی
اب تو بیٹوں کا بھاؤ ہوتا ہے

گھر کے بٹوارے میں پنچوں کی عجب شازش ہوئی
منہدم گھر کو کیا ملبے کی پیمائش ہوئی

فریبِ زندگی کھائے ہیں اتنے
کہ اب دل کو کوئی غم نہیں ہے

الگ ہو جائے گا جس دن یہ جسم و روح کا رشتہ
ہر اک رشتے پہ اپنی ضو فشانی چھوڑ جائیں گے

ایماں کی جو دولت وراثت میں ملی ہے
شاکر کسی دولت کی تمنّا نہیں کرتے

سلطان شمشیؔ

ہم راہ وفا میں جو نشاں چھوڑ کے آئے
صدیوں وہ ہمیں شام و سحر یاد کریں گے

Scanned with OKEN Scanner

عہد غاضر میں بہار کے غزل گو شعراء سلطان شمشیؔ صاحب کا نام اردو شاعری کے آسمان میں شمش کے مانند چمک رہا ہے۔ آپ کا اصل نام سلطان احمد تخلص شمشیؔ اردو شاعری کی دنیا میں اپنے قلمی نام سلطان شمشیؔ سے معروف و مشہور ہیں۔ آپ کی تاریخِ ولادت ۱۳ر مئی ۱۹۴۵ء اور جائے ولادت مدھوبنی(بہار) ہے۔ آپ کے والد محترم کا نام محمد یوسف اور والدہ ماجدہ کا نام حبیب النسا ہے۔ آپ کی شریکِ حیات کا نام نعیمہ خاتون ہے۔ آپ نے بی۔اے کی تعلیم بہار یونیورسٹی سے حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے

درس وتدریس کے خدمات انجام دیے مگر کچھ برسوں بعد محکمہ ڈاک میں ملازمت کرنے لگے۔ شیلانگ، میگھالے، سمستی پور وغیرہ میں ملازمت کرنے کے بعد خوش نصیبی سے آپ کا تبادلہ دربھنگہ (بہار) میں ہو تبادلہ ہو گیا اور آپ یہاں کی ادبی فضا سے فیضیاب ہوئے اور آپ کی شاعری پروان چڑھی۔ آپ کئی ادبی اور نیم ادبی انجمنوں سے وابسطہ رہے۔ آپ نے " دائرہ ادب" کے نام سے ایک ادبی انجمن بھی قائم کی۔ سلطان شمشیؔ کو قدرت نے ایک شاعر کا دل دے کر پیدا کیا تھا۔ آپ نے کم عمری ہی سے شاعری کرنی شروع کر دی تھی۔ آپ ایک قادرالکلام شاعر ہیں آپ نے سبھی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی مگر آپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ آپ کا شعری مجموعہ "ریت کا سفر" ۲۰۰۷ء میں منظر، عام پر آیا جس کا انتساب آپ نے اپنے والدین اور شریک حیات کے نام کیا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کا تحریر کردہ مضمون ' سلطان شمشی کی شاعری' کے نام سے شامل ہے اس میں آپ شمشیؔ صاحب کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

"ان کی غزلوں میں جذبہ دل کی کیفیت کا رنگ نکھرا نکھرا ہے۔ اس میں راہ وفا کی گفتگو ہے، چشم ناز کی توصیف ہے، زلف عنبریں کی پاکیزگی کا ذکر ہے۔ سلطان شمشی کی غزلوں پر روایتی رنگ غالب ہے۔ وہ کلاسیکی اردو شاعری سے حد درجہ متاثر ہیں۔ انداز بیان بھی قدما کی طرح ہے البتہ عصری معاملات اور معاصر مسائل کی عکاسی سے گریز نہیں کرتے۔

سلطان شمشی زندگی اور اس کے تقاضوں سے واقف ہیں۔ تجربات ومشاہدات سے جو کچھ حاصل ہوا ہے اسے شعری پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔"

بحوالہ: ریت کا سفر از سلبطان شمشی، ص: ۱۷،۱۶،۱۴

ذیل میں ان کی مختلف غزلوں سے چند اشعار پیش کر رہی ہوں۔

مجھے شکایت الم نہیں زمانے سے
گلہ یہ ہے کہ اپنے ہوئے بیگانہ سے

کرب میں مبتلا ہے سارا جہاں
نفرتوں کا ہر طرف ہے سیلِ رواں

کاندھوں پہ اپنی موت لئے آئی زندگی
تم کو خبر نہیں ہے یہ دنیا عجیب ہے

نیا زمانا نئی روشنی تلاشنے والوں
سنبھل کے چلنا کہ جاری سفر ہے تیسہ کا

Scanned with OKEN Scanner

اپنے دامن میں جو لال و گہر ڈالے ہوئے

غیر کے آگے وہ کیوں ہیں ہاتھ پھیلائے ہوئے

سچائی سے آنکھ ملانا کھیل نہ سمجھو کھیل نہیں ہے

اپنی انا کو زندہ رکھنا کھیل نہ سمجھو کھیل نہیں ہے

سلطان شمشیؔ کا دوسرا شعری مجموعہ ''انداز سخن'' ۲۰۲۱ء میں شائع ہوا۔ آپ کا قلمی سفر جاری و ساری ہے۔

منظور عادلؔ

اُجالے مانگتے ہیں بھیک مجھ سے

اندھیرے میں چراغ طور ہوں میں

منظور عادلؔ صاحب کا اصل نام منظور حسن تخلص عادلؔ اردو شاعری کی دنیا میں اپنے قلمی نام منظور عادلؔ سے معروف و مشہور ہیں۔ آپ کی تاریخ ولادت ۱۰ مئی ۱۹۵۰ء اور جائے ولادت ضلع ویشالی (بہار) ہے۔ آپ کے والد کا نام امیر علی اور والدہ کا نام بی بی زینت خاتون ہے۔ آپنے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مدرسے سے حاصل کی اور میٹرک کی سند آپ نے مدرسہ عالیہ سے حاصل کی۔ تعلیم کا سلسلہ جاری تھا مگر حالات سازگار نہیں رہے آپ نے جب بی۔ کام میں داخلہ لیا تو والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ گھر کی ذمہ داری کو اپنا فرض سمجھا اور اپنے خاندانی پیشہ کاشتکاری کو اختیار کیا۔ منظور عادلؔ صاحب ایک نیک انسان اور زندگی سے محبت کرنے والے انسان ہیں۔ کم عمری سے ہی آپ کو شاعری کا شوق ذوق تھا۔ خوش نصیبی سے آپ کے چچازاد بھائی محمد حبیب جو شباب تخلص فرماتے تھے آپ نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ '' اُجالے قسطوں کے'' ۲۰۱۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کا انتساب آپ نے اپنی شریکِ حیات سیدہ خاتون، اپنی اولادیں اور خاندان کے نام کیا ہے۔

آپ کا دوسرا شعری مجموعہ '' جسے ہم بھول گئے'' کے نام سے ۲۰۲۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کتاب میں منظور عادل صاحب کا مضمون ''ناچیز کی سنیے '' کے نام سے شامل ہے جس میں انہوں نے اس کتاب کے شائع ہونے کا ذکر کیا ہے۔ آپ ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ آپ نے سبھی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے، مگر آپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ آپ کی غزلوں میں انسانیت کا درس محبت کا درس جابجا دکھائی دیتا ہے۔ آپ نے قدرت کے حسین منظر کو بھی اپنی شاعری میں بہت دلکش انداز میں رونما کیا ہے۔ عہدِ حاضر کے مسائل کو بھی آپ نے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کر رہی ہوں ملاحظہ فرمائیں:

عشق کا تو مقام کیا جانے

آدمی کو بھی وہ خدا کر دے

ایک قطرے کی کیا حقیقت ہے

یہ سمندر کو بتانے سے رہا

جب سے منسوب ہوئی ہے اُسکے عادل

Scanned with OKEN Scanner

زندگی اور مہکتی ہے غزل میں دیکھو

دنیا نے زندگی کو تماشا بنا دیا

تیشہ کسی کو زہر کا پیالہ تھما دیا

نگار فکر کو ہے تازہ پیرہن کی تلاش

وہ سارے طرز سخن ہو گئے پرانے سے

پہلے دل سے دل کا رشتہ ہوتا تھا

اب عادل یہ رشتہ کاروبار لگے

درد بازار میں نہیں بکتے

گھر کے آنگن میں خود اُگاتے ہیں

راستے میں ہرے درختوں سے

چین ملتا ہے گفتگو کر کے

سبز موسم، رُت سہانی وقتِ شام

چپ نہ رہیے کچھ نہ کچھ فرمائیے

رونقیں رقص میں ہیں پاؤں میں گھنگرو پہنے

بیخودی میں ہے نظارے ترے آجانے سے

ہم غمِ ہستی سے بھی لیں گے خراج

ہے بہار آنے کو مت گھبرائیے

میر سجّاد

زندہ ہیں تو ہم اہل قلم لکھتے رہیں گے

ہر دور کی روداد الم لکھتے رہیں گے

صوفیوں کی سرزمیں پھلواری شریف (بہار) میں آپ کی ولادت ۲۵ جنوری ۱۹۴۰ء کو ہوئی۔ آپ کا نام میر سجّاد اور تخلص سجّاد ہے۔ آپ کے والد محترم کا نام جناب میر محمد شہزادہ اور والدہ ماجدہ کا نام رئیشہ خاتون ہے۔ آپ عہد حاضر کے نامور غزل گو شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ کا شعری مجموعہ ''کوزے میں سمندر'' ۲۰۱۳ء اور ''شہرِ افکار'' ۲۰۱۷ء کو منظرِ عام پر آیا۔ ان دونوں شعری مجموعے کا انتساب آپ نے اپنے والدین کے نام کیا ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

میر سجّادؔ صاحب کی شاعری ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔۔آپ کو قدرت نے ایک حساس شاعر کا دل عطا کیا۔آپ نے انسانیت کا درس،،آج کی تیز رفتار دنیااور حوادث روزگار کو بھی اپنی غزلوں کا محور بنایا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

انانیت کے شکنجے سے آیئے باہر
بڑا وہی ہے جو ہر شخص کو بڑا جانے

مجھے یقیں ہے وہ فیصلہ بدل دے گا
اگر ضمیر کو اپنے کبھی جھنجھوڑے گا

تنہائیوں کی دھند اتنی تیز ہے
ہر شخص جیسے تیر رہا ہے خلاؤں میں

تمام شہر میں رنج وملال ہے پیارے
میری حیات بھی زندہ مثال ہے پیارے

افسانہ حقیقت کا سنائیں گے جہاں کو
انسانوں پہ جو گزرے گی ہم لکھتے رہیں گے

یہی تو قصّہ وحال ہے پیارے
کبھی عروج تھا اب زوال ہے پیارے

وقت سجّادؔ جوں جوں بدلتا رہا
رنگ اپنا غزل بھی بدلتی رہی

مرغوب اشرؔف فاطمی گیاوی

لفظ میں جادو نہیں ہے ایک حقیقت ہے جناب
ہم حفاظت کر رہے ہیں کاغذی تلوار کی

پیغامِ حقیقت کا شاعر، اعلی قدروں کا پاسدار جذبہ ہمدردی سے سرشار خدمتِ خلق سے دلچسپی اور پیکرِ خلوص، سیکولر مزاج اشرؔف فاطمی صاحب عہدِ حاضر میں اردو غزل گو شعراء میں بے حد مقبول ہیں۔آپ کا حقیقی نام مرغوب اشرف فاطمی اور اشرؔ تخلص فرماتے ہیں۔آپ ایک دیندار گھرانے کے چشم وشراغ ہیں۔

Scanned with OKEN Scanner

۔آپ کی تاریخِ ولادت ۵؍ فروری ۱۹۵۱ءاور جائے ولادت موضع بیلا، ضلع اورنگ آباد (بہار) ہے۔آپ کے والد کا نام سید مسعود احمد اور والدہ کا نام سیدہ حبیبہ خاتون ہے۔آپ کی شریک حیات کا نام سیّدہ شاہدہ فاطمی ہے۔آپ نے ۱۹۶۴ء میں میٹرک کی سند آر۔بی۔آر۔ہائی اسکول، رفیع گنج،(اورنگ آباد) سے حاصل کی۔۱۹۶۹ء میں رانچی یونیورسٹی، رانچی سے بی۔ایس۔سی کی سند اور ۱۹۷۲ء میں ایل۔ایل۔بی(بی۔ایل) کی سند بہار کی معروف و مشہور تعلیم گاہ مگدھ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ حصول تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۹۷۴ء میں بہار پولس میں آپ بطور سب انسپیکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے اور اپنے خدمات انجام دیتے ہوئے سینئر ڈی۔ایس۔پی کے اعلیٰ عہدے سے فروری ۲۰۱۱ء میں سبکدوش ہوئے۔ موصوف پیشہ کے اعتبار سے محکمہ پولس میں تھے مگر قدرت نے انہیں ایک شاعر کا دل عطا کیا تھا۔شاعری ک فطری ذوق و شوق آپ کو ہمیشہ رہا مگر ملازمت کی مصروفیت کے سبب آپ نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ جب آپ م ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو علم و ادب اور شاعری کی خدمت کرنے لگے۔آپ کی ادبی خدمات کے لیے ۲۰۱۲ءاور ۲۰۱۴ء میں 'بہار اردو اکاڈمی' پٹنہ نے آپ کو ایوارڈ سے سرفراز بھی کیا ہے۔ آپ ایک کامیاب پولس افسر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب شاعر کی بھی حیسیت سے بھی معروف و مشہور ہوئے۔اشرؔ فاطمی صاحب اپنی تخلیقی سفر کے بارے میں بارے میں لکھتے ہیں کہ :

''میں بھی زمانہ طالب علمی سے شاعری کا شوق پالا ہے جو اُس دور میں دبا دبا سا رہا۔پھر ملازمت' وہ بھی محکمہ پولس میں۔وقت کی قلت اور منصبی مشغولیت نے شاعری نے شاعری بہاؤ شاعری کو متاثر کیا۔پھر بھی تخلیقات ہوتی رہی اور بیاض میں پڑی رہیں۔ملازمت سے سبکدوش ہو کر میں شہر گیا(بہار) میں مستقل طور پر مقیم ہو گیا۔ محترم پروفیسر (ڈاکٹر) محمد منصور عالم صاحب' سابق صدر شعبہ اردو درس و تحقیقات 'مگدھ یونیورسیٹی' بودھ گیا، بھی گیا شہر میں مقیم ہیں۔اُن سے ملاقاتیں بڑھیں تو میں نے ان کو چیزیں دیکھلائیں۔انہوں نے نہ صرف حوصلہ افضائی کی بلکہ قیمتی وقت نکال کر ان چیزوں کی نوک پلک درست فرمائی۔مجھے فخر ہے کہ مجھے اس نابغہ روزگار کی سرپرستی حاصل ہوئی اور انکی استادی کا بھی شرف حاصل ہوا اور ہنوز ہے۔''

بحوالہ: '' خیمہ بہار'' ازمرغوب اشرؔ فاطمی، ص:۱۲

اکیسویں صدی میں آپ کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں ''منزلِ دشوار'](۲۰۱۲ء)''سجر سایہ دار'' (۲۰۱۴ء)''خیمہ بہار''(۲۰۱۸ء)''رنگِ چمن زار''(۲۰۲۳ء) اور ''نظموں کا آبشار''(۲۰۲۳ء) شامل ہیں۔'' نظموں کا آبشار'' جو اپنے نام سے ظاہر ہے اس مجموعہ میں موصوف کی صرف نظمیں شامل ہیں۔اس کے فلیپ پر فلیپ پر ڈاکٹر زین رامشؔ کے تاثرات رقم ہیں۔ڈاکٹر زین رامش نے لکھا ہے کہ :

''فاطمی کی مذکورہ نظموں کا اختصاص یہ بھی ہے کہ انھوں نے نظم نگاری کے بنیادی فنی تقاضوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے سکّہ رائج الوقت تعمیری اور فکری روش سے احتراز کیا ہے اور متنوع عصری موضوعات کو ترجیح دی ہے۔ ''نظموں کے آبشار'' کو ہم معاصر اردو شاعری کی بشارت نو کے طور پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔''

مرغوب اشرؔ فاطمی ایک قادرالکلام شاعر ہیں۔آپ نے سبھی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے مگر آپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔آپ نے اپنی غزلوں میں عہدِ حاضر کے مختلف مسائل جیسے تعصب، فریب، تنگ نظری، سماجی ناہمواری، خود غرضی، جیسے مختلف موضوعات پر اشعار کہیں ہیں۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

میرے دشمن کا میرے گھر آنا

Scanned with OKEN Scanner

یہ بھلا کیسے بے سبب ہو گا
کوئی تو چیز ہے فہم و گماں سے بالا تر
کہ اہل علم بھی اکثر فریب کھاتے ہیں
خندہ پیشانی کے پیچھے مصلحت
گاؤں تک شہری طریقے آ گئے
وہ فخرِ شہر ابھی مجھ سے بد گمان تو ہے
مگر پڑوسی ہے اس کا بھی اک مکان تو ہے
بھیجا بلاوا برسوں پہ وہ بھی رقیب سے
یہ بھی ہے ایک ادا سی میرے مہربان کی
نئی سمتوں میں طائر آب و دانا کے لیے نکلے
حرص کیا ہے ذرا ہم بھی رواجوں سے نکلتے ہیں
رازِ دل عیاں ہو گا درد کچھ سوا ہو گا
بس یہی تو خطرہ ہے حالِ دل سنانے میں

تاج پیامی

تم اپنے عہد میں قانون یہ بنا ڈالو
خطا کسی کی بھی ہو نام تم میرا لکھنا

تاج پیامی کی تاریخِ ولادت ۲۵؍ جنوری ۱۹۴۰ء اور جائے ولادت جگدیش پور (بھوجپور، آرہ) ہے۔ آپ کے والد حضرت عبدالحامد خاں کو آرہ ضلع کے پہلے گریجویٹ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ کے والد محترم پیشہ کے اعتبار سے معلم تھے اور کالج میں تاحیات درس و تدریس کے خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ بھی معلمہ تھیں۔ آپ کے دادا میر بخش خاں آنریری مجسٹریٹ تھے۔ تاج پیامی ایک تعلیم یافتہ اور خوشحال زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے آبا و اجداد شاہجہاں کے دور حکومت میں غزنی (افغانستان) سے ہندوستان آئے تھے اور دلّی فوج میں اپنے خدمات انجام دیے۔ اورنگ زیب کے پوتے شہزادہ عظیم الشان نے جب پاٹلی پتر شہر کو عظیم آباد نام سے بسایا تب ان کے ساتھ ان کر مورثِ اعلیٰ بھی آئے۔ تاج پیامی کو دولت اور شہرت وراثت میں ملی تھی۔ آپ ذی علم شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ نے ۱۹۶۶ء میں انگریزی مضمون میں (ایم۔اے) کی سند مگدھ یونیورسٹی سے اور ۱۹۷۷ء میں جغرافیہ میں (ایم۔اے) کی سند پٹنہ یونیورسٹی سے حاصل کی اور اپنی تعلیم کو جاری و ساری رکھتے ہوئے آپ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور تاج پیامی سے ڈاکٹر تاج پیامی ہو گئے۔ حصولِ تعلیم کے بعد آپ نے اپنے والد کی طرح درس و تدریس کے مقدس پیشہ کو اختار کیا اور اپنے خدمات انجام دیتے ہوئے ۲۰۰۰ء میں (ویر کنور سنگھ یونیورسٹی) سے ریڈر ہو کر شعبہ جغرافیہ (ایچ۔ڈی۔ جین ۔کالج) سے سبکدوش

Scanned with OKEN Scanner

ہوئے۔ موصوف ایک نیک انسان، کامیاب استاد اور مقبول شاعر ہیں۔ادب کی محبت کے سبب آپ کا رشتہ ہمیشہ کاغذ اور قلم سے استوار رہا۔آپ ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر اور ادیب ہیں۔آپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ۔آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''آئینہ غزل'' ۱۹۸۵ء اور دوسرا '' روحِ غزل'' ۲۰۱۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔آپ شاعری کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں عہد حاضر کے مختلف موضوعات کے ساتھ تقسیم ملک کا درد اور زمینداری نظام کے خاتمہ کا کرب بھی موجود ہے۔ڈاکٹر تاج پیامی عہدِ حاضر میں بہار کے نامور اردو غزل گو شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔۔موصوف کی دیگر تصانیف میں

''مزاحیہ شاعری اور چند مزاحیہ شعراء''(۲۰۰۷ء(

''مولانہ وحید الدین خاں اور دیگر مضامین''(۲۰۱۱۴)اور '' شعور تیقید'' بھی منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

منصور خوشترؔ

محبت کرنے والوں کا الگ ایک اپنا مذہب ہے

وہ راہِ عشق میں سود و زیاں دیکھا نہیں کرتے

نئ نسل کے غزل گو شعرأ میں منصور خوشترؔ صاحب کا نام کافی نمایاں ہے۔

آپ کی تاریخِ پیدائش ۳ر مارچ اور جائے پیدائش ضلع دربھنگہ (بہار) ہے۔آپ ادبی طور پر بے حد فعال اور متحرک ہیں۔

منصور خوشترؔ ایک ہمہ جہت فنکار ہیں۔ موصوف نے اپنی کاوشوں او جانفشانی سے جو شہرت پائی وہ قابل رشک ہے آپ ایک اعلیٰ درجہ کے صحافی، افسانہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے اردو ادب کی دنیا میں بے حد معروف و مشہور ہیں۔ہے۔ منصور صاحب ایک بے باک صحافی، افسانہ نگار، تنقید رگار، مضمون نگار کی حیسیت سے بھی کافی مشہور ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ نشر نگاری پر بھی ایکساں اقدرت رکھتے۔ منصور خوشترؔ کی اگر ہم بلخصوص شاعری کے حوالے سے گفتگو کریں تو آپ کے دو شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکی ہیں جن میں پہلا '' کچھ محفل خوباں کی'' (۲۰۱۵ء) جس کا انتساب آپ نے اپنے والدین کے نام کیا۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہر گانوی نے آپ کی غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

''منصور خوشترؔ نے حیات و کائنات کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں اور انکشاف کائنات وذات اور معاشرہ کے انگنت امکانات کو اپنی غزلوں سے محسوس کرایا ہے۔ان کے لہجے میں اور فکری میلان میں قدیم وجدید اور روایت وبغاوت کی جو کشمکش نظر آتی ہے وہی ان کے یہاں صحت منداور تعمیری تشکیک ب گئ ہے۔

منصور خوشتر کی غزلوں میں احساس کا پلہ بھاڑی ہے۔آج کی زندگی نیم کا کڑوا پیڑ ہے۔اس نیم کے پیڑ کی کرواہٹ جب منصور خوشترؔ کی غزلون میں لبادہ اوڑھ کر نظر آتی ہے تو تنہائی کا غم، خواب اور حقیقت کا تصادم، بے چہرگی کا کرب اور صنعتی زندگی کا قہر سامنے آتا ہے۔اایک خاص نوع کی اداسی ہوتی ہے جو ان کے جذبات واحساسات کو مصنوعی ہونے سے بچاتی ہے۔''

بحوالہ: ''کچھ محفلِ خوباں کی'' از منصور خوشترؔ، ص:۱۱،۱۰

Scanned with OKEN Scanner

منصور خوشتر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سیّد احمد قادری صاحب کے تاثرات اس شعری مجموعہ ''کچھ محفلِ خاباں'' کے فلیپ پر درج ہے، وہ لکھتے ہیں کہ :

''جدید شعری منظر نامے پر منصور خوشتر نے اپنی شگفتہ بیانی سے ایک خاص پہچان بنائی ہے۔ان کی شاعری میں فکری آگہی، فنّی نزاکت، ندرت اسلوب اور الفاظ کے مزاج و معنی کے برتنے کی جو کار فرمائی ہے، نیز معمولی موضوع کو بھی اپنے فکری و فنّی فہم وادراک سے تہہ دار بنانے کا جو عمل ہے، وہ اعلیٰ تخلیقی یافت کی ضمانت ہے۔اپنے منفرد لب ولہجہ کی شاعری میں عصری حسّیت، عصری مزاج اور عصری تقاضوں کو شامل کر کے اسے انہوں نے اعلیٰ اور معیاری بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ حسن و عشق کے اظہار میں بھی جو تازگی، شگفتگی اور برجستگی کی ایک خاص فضا اور کیفیت پیدا کی ہے، وہ ان کی شاعری کو منفرد اور معتبر بناتی ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں عصری سیاسی، سماجی اور معاشرتی تقاضوں کی ترجمانی جس سلیقے اور ہنر مندی کے ساتھ پیش کی ہے، وہ ان کے گہرے شعور و آگہی کی مظہر ہیں۔''

منصور خوشتر صاحب کا دوسرا مجموعہ کلام '' کاشہ دل''(۲۰۲۲ء) میں منظرِ عام پر آیا جس کا انتساب آپ نے اپنے استاذ محترم پروفیسر طرزی کے نام کیا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کہ ایسی اب زمانے کی روش ہے
کہ اندر جو بھی ہو، باہر ہے بدلا

سیکڑوں قتل کیس جس نے وہی منصف ہے
شہر کا تیرے ہے دستور نرالا

برا وقت اور کیا ہوگا بے حسی کا
بجھانے پر بدی کا شعلہ اب بجھتا نہیں ہے

نئی تہذیب ہی نے کی ہے نیوروسرجری جو
ہمارا خود، ہمارا چہرا اب لگتا نہیں ہے

فیس بوک اور ٹیوٹر کا زمانہ آیا
کتنے اقدار جو اعلیٰ تھے ہم سے گزرے

ینتا جی نے کب دیکھے بھی
بھوکے، سوکھے، پیلے چہرے

مہربانی ہے نئی تہذیب کی
کر گئی کتنا ہمیں ننگی ہوا

Scanned with OKEN Scanner

کس لئے ان کے اثر میں فرق ہے

ایک ہے مسجد کی مندر کی ہوا

بے وفا لوگوں سے خوشترؔ مت ملو

پتھروں سے شیشے ٹکراتے ہو کیوں؟

موصوف کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے ایک کتاب (۲۰۱۹ء) میں منظرِ عام پر آئی جس کا نام " ڈاکٹر منصور خوشترؔ: نئی صبح کا استعارہ" جس کو ڈاکٹر کامران غنی صباؔ نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب منصور خوشترؔ پر ایک بہترین کتاب ہے جس میں شامل مختلف مضمون انکی شاعری اور شخصیت پر روشنی ڈالتی ہے۔

منصور خوشترؔ کا قلم رواں دواں ہے۔

ڈاکٹر احمد معراجؔ

دیجیے داد مرے ذوق سخن کی معراجؔ

شاعرِ نغز بیاں، شیریں نوا میں بھی ہوں

سرزمیں بہار کے نئی نسل کے شعراء میں ڈاکٹر احمد معراج کا نام سرِ فہرشت ہے۔ آپ کا حقیقی نام معراج الدین خان اور تخلص معراج ہے۔ اردو شاعری کی دنیا میں اپنے قلمی نام ڈاکٹر احمد معراج سے معروف و مشہور ہیں۔ احمد معراجؔ صاحب کا آبائی وطن ارنا (چھپرہ، بہار) ہے۔ موصوف کی تاریخِ ولادت ۷، جنوری ۱۹۸۶ء ہے۔ والد محترم کا نام عبداللہ خان اور والدہ ماجدہ کا نام نجمہ بیگم ہے۔ آپ نے اردو زبان میں (ایم۔اے) کی تعلیم حاصل کی اور آپ نے اپنی محنت اور لگن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعلیٰ سند حاصل کی۔ آپ کو شاعری کا ذوق و شوق طالب علمی کے زمانے سے ہی تھا۔ خوش نصیبی سے حلیم صابر سے شرف تلمذ رہا۔ ڈاکٹر احمد معراجؔ صاحب کی شاعری کا پہلا شعری مجموعہ " صحرائے جنوں" ۲۰۲۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کا اپنے والدین کے نام کیا ہے۔ احمد معراجؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ایم۔ نصر اللہ نصر صاحب لکھتے ہیں کہ:

"احمد معراج کی شاعری حادثات حیات، زندگی کے تضاد و تموجات، انتشار و آویزش کی تعبیر ہے اور عصری کرب و کشمکش کا بیانہ بھی۔ ان کی شاعری کا روح اور روحانیت، عشق اور رومانیت سے بھی گہرا رشتہ ہے۔ اس میں تزکیہ نفس، تطہیر باطن کے ساتھ ساتھ، جمالیاتی اور جذباتی تسکین کا عنصر بھی ہے۔ ایک ہی کیفیت پر احمد معراج کی شاعری مرکوز یا منحصر نہیں بلکہ مختلف کیفیات ہیں جن سے ہر فرد یا معاشرے کو گزرنا پڑتا ہے۔"

بحوالہ: " صحرائے جنوں" از ڈاکٹر احمد معراجؔ، ص: ۲۲

معراجؔ صاحب کی شاعری کا ایک خاص پہلو تصوف بھی ہے۔ موصوف ایک ذی علم شخصیت کے مالک ہیں۔ ایک کامیاب شاعر کی پہچان یہ بھی ہے ہے وہ ادب برائے زندگی کا قائل ہو اور معراجؔ صاحب نے اپنی شاعری میں عہد حاضر کی زندگی کے مختلف رنگوں کی عکاسی بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے ۔ بطور مثال چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ایسے لوگوں کے ساتھ رہتا ہوں

Scanned with OKEN Scanner

جن کے گردن پر اپنا سر ہی نہیں

مارے گئے حیات کے ہاتھوں جو بد نصیب

ان کو لحد کی گود میں آرام مل گیا

ہے بعد موت شدت غم من و عن ہنوز

دل مبتلائے کرب ہے زیر کفن ہنوز

دیکھنے میں کل جو تھی گلزارِ زندگی

چبھ کیوں رہی ہے آج مثل خار زندگی

عزاداری فقط اک رسم بن کر رہ گئی ہے اب

کسی کی موت پر کس ی کو بھلا فرصت ہے ماتم کی

عجیب کشمکش زیست سے گزرنا پڑا

ذرا سی جینے کی چاہت میں روز مرنا پڑا

وہ اکیلا ہی نکلتا تو کوئی بات نہیں

ساتھ آدم کو لئے خلد سے شیطاں نکلا

خوش لباسی پہ ناز کرتا ہے

بے لباسی میں جس کی عمر کٹی

نئی تہذیب کی دیکھی یہ عجب عریانی

خوش لباسی میں بدن جس کا عریاں نکلا

پہلے بیمار ہم کو کیا

پھر دوا دے کر مارا گیا

بعد قضا بھی عشق نے دکھلایا معجزہ

زیر لحد چمکتا ہے میرا کفن ہنوز

ڈاکٹر احمد معراج کو ان کی ادبی خدمات کے لیے کئی انعامات سے بھی سرفراز کیا جا چکا ہے جن میں * بہار اردو اکاڈمی ایوارڈ * قاضی عبدالودود ایوارڈ * وکیل اختر ایعارڈ * شہود عالم آفاقی ایوارڈ * ڈاکٹر جاوید نہال ایوارڈ شامل ہیں۔

موصوف کو شاعری کے ساتھ تحقیق اور تنقید پر بھی عبور حاصل ہے۔ آپ کی کتابیں بھی ترتیب و تالیف کی شکل میں آچکی ہیں جن میں

ا۔ آنکھوں دیکھی: تجزیہ (ترتیب و تنقید)

Scanned with OKEN Scanner

۲۔گلستانِ وارث (تحقیق وتدوین)

موصاف کا قلم رواں دواں ہے اور کی تخلیقات اخبارات اور ادبی رسائل کی زینت بنتی رہتی ہے۔

اسدرضوی

سکون لٹتا رہے گا فضا ہی ایسی ہے

تمہارے شہر کی آب وہوا ہی ایسی ہے

پورا نام سید اسد علی رضوی ہے اور تخلص رضوی فرماتے ہیں۔ادبی دنیا میں آپ اپنے قلمی نام اسدؔ رضوی سے معروف ومشہور ہیں۔آپ کی تاریخِ ولادت ۹ر دسمبر ۱۹۵۶ء ہے اور جائے ولادے محمد پور مبارک، ضلع مظفر پور،(بہار) ہے۔آپ کے والد محترم کا نام سید محمد الحسن رضوی اور والدہ محترمہ کا نام سیدہ نازنین ہے۔ آپ نے بی۔ایس۔ سی۔ کی تعلیم بہار یونیورسٹی، مظفر پور اور ڈپلومہ اِن کمپوٹر سائنس کی تعلیم دہلی سے حاصل کی۔ موصوف نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۴ء میں کیا۔آپ ایک شاعر کے ساتھ ساتھ ایک افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار کی بھی حیسیت سے جانے جاتے ہیں مگر بلخصوص شاعر کی حیسیت سے زیادہ مقبول ہیں۔ اسدؔ رضوی صاحب ایک قادرالکلام شاعر ہیں۔ موصوف کے دو شعری مجموعے جن میں پہلا " پلکوں کے صدف"(۲۰۱۲ء)دوسرا" آدابِ سخن"(۲۰۱۷ء) میں منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

مضمون کی طوالت کی وجہ سے بہت سارے شعراء جن کا تفصیل سے ذکر نہیں ہو سکا جن میں غالب ایازؔ، مراقؔ مرزا، حیدر وارثی، کلیم اخترؔ، ولی اللہ ولیؔ، مظفر ابدالی، عین تابشؔ، پریم کرنؔ، اختر امام انجم، متین عمادی، غیاث انجم، تفضیل احمد، شمیم ہاشمی، حفیظ بیتابؔ، کفیل انور، بدیع الزماں سحرؔ، منصور عمر، کوثر مظہری، جمال اویسی، عطا عابدی، لطف الرحمٰن، شکیب ایاز، سید احمد شمیم، گوہر شیخ پوری، ظفر عدیمؔ، معینؔ کوثر، صباؔ تقوی صاحب وغیرہ شامل ہیں ان سب کی شعری تخلیقات منظرِ عام پر آچکی ہیں اور یہ سب شعراء عہد حاضر کے نامور اردو غزل گو شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

نام کتاب	مصنف	مقام اشاعت	سن اشاعت
احتساب جنوں	پروفیسر شاکر خلیقؔ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۲۱ء
کوزے میں سمندر	میرؔ سجّاد	میر اردو مرکز، بہار	۲۰۱۳ء
شہر افکار	میرؔ سجّاد	دارالاشاعت مصطفائی، دہلی	۲۰۱۷ء
کچھ محفلِ خوباں کی	منصور خوشترؔ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۵ء
اُجالے قسطوں کے	منظور عادلؔ	نیا سویرا فاؤنڈیشن، کلکتہ	۲۰۱۴
خیمۂ بہار	مرغوب اشرفؔ فاطمی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۸۴
پلکوں کے صدف	اسدؔ رضوی	ادبستان پبلی کیشنز، دہلی	۲۰۱۲ء

Scanned with OKEN Scanner

صحرائے جنوں	ڈاکٹر احمد معراجؔ	عرشیہ پبلیکیشنز، دہلی	۲۰۲۲ء
روح، غزل	تاج پیامی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۶ء

شانوی ماخذ:

بہار اور اردو شاعری	محمد معین دردائیؔ		۱۹۴۷ء
تذکرہ شعرائے منیر شریف	سیّد شاہ مراد اللہ منیری	پاٹلی پتر الیتھو پریس، پٹنہ	۱۹۸۸ء
تذکرہ صوفیائے بہار	ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن	سیوہاروی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۲۱ء
تاریخِ ادب اردو (جلد سوم)	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	

میر سجّاد کی تاریخِ پیدائش ۱۵؍ جنوری ۱۹۶۱ء اور جائے پیدائش پھلواری شریف ہے۔

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Migration of Indian girl students to the Gulf: A Study

- **Dr. Sajjad Ahmad**
- Assistant Professor,
- Department of Educational Studies,
- Jamia Millia Islamia, New Delhi-25

- **Abstract:** Migration of Indian girls students to the gulf countries shows a growing trend. Such migration is seen in mostly for pursuing academic career and job opportunities. This paper studies the dynamics of migration among Indian girl students to the gulf and tries to understand the different factors influencing their decisions of migration. The investigation employed a mixed-methods approach and snow ball sampling technique. It tried to explore the experiences of migrated students and has examined the opportunities and challenges they face. It also explores the impacts of India's global image in terms of cultural exchange, gender empowerment and academic diplomacy. The findings has been presented in the form of thematic analysis and offers an understanding upon enhancing India's standing in the global academic arena.

- Key words: Migration, Diaspora, Indian girls, Gulf, Opportunities and challenges Abroad**,**

- **Introduction:** The patterns and dynamics of migration across various regions exhibit significant diversity. This diversity is evident in the ways that migrating individuals influence both their host and home communities. A comprehensive understanding of migration is closely associated with factors such as remittances, social security, and job opportunities, which provide benefits to both migrants and society in numerous ways. Consequently, this understanding is also linked to population mobility driven by job security and workforce demands. The advancements in Information and Communication Technology (ICT) have transformed the global workforce, broadening employment

Scanned with OKEN Scanner

opportunities for skilled individuals. While the globalized workforce has facilitated capital flow, it has also enriched the cultural integration of different communities. As a result, highly industrialized nations frequently attract skilled professionals. Moreover, the socio-economic and cultural implications of migration are significant. The remittances sent by migrants to their home countries not only bolster the national economy but also enable individuals to improve their living standards, benefiting both themselves and their families. This, in turn, contributes to poverty alleviation and enhances productivity levels. From a cultural perspective, migrants are often exposed to a broader spectrum of global cultures, allowing them to engage in a process of comparison, assimilation, rejection, and acceptance of various cultural elements, which fosters inclusivity. Additionally, if the migrants are female, the cultural impact is likely to be more pronounced compared to their male counterparts. With these considerations in mind, this paper explores the migration of Indian female students to the Gulf Cooperation Council (GCC) Countries utilizing primary data for analysis.

- **The migration trends of Indian diaspora:**
- Migration from India to West Asian countries has deep historical roots. The primary drivers of this out-migration have been economic and political factors. Notably, the influx to West Asian nations, particularly the six Gulf Cooperation Council (GCC) countries, namely Bahrain, Kuwait, Oman, Qatar, Saudi Arabia, and the United Arab Emirates (UAE) was significantly influenced by the oil boom that occurred between 1932 and 1967. This period of substantial capital accumulation, coupled with a severe labor shortage had prompted these oil-rich GCC nations to seek industrial labor from Iran, Western countries, and the Indian subcontinent. According to Francoise De Bel-Air (2015), recruitment trends began to favor Arab workers following the Indian independence

Scanned with OKEN Scanner

movement in 1947 and the Arab-Israeli conflict of 1948. Consequently, Yemenis and Egyptians emerged as the predominant groups securing better employment opportunities in the GCC countries. Additionally, after 1968, Palestinians and Iraqis began to establish their presence in the GCC countries, largely due to the political upheaval following the coup (Kapiszewski, 2004).

- However, a different trend of migration to GCC countries emerged between 1973 and 1990. This shift can be attributed to the fact that all Gulf countries attained political independence by 1971. The aftermath of the Arab-Israeli war in 1973 marked the beginning of a new phase of migration across the Arab region. Prior to the 1970s, foreign migrant workers constituted 90% of the workforce in Saudi Arabia. However, the economic boom driven by rising oil prices created an increased demand for migrant labor to fulfill production needs. Consequently, the population of foreign migrant workers surged tenfold by the 1990s, primarily comprising individuals from Yemen, Egypt, Sudan, Jordan, India, and Pakistan. Notably, migrants from India and Pakistan were employed under the kafeel (sponsor) system, which could involve an agency, company, or private individual responsible for issuing employment contracts. The kafeel was obligated to assume all socio-economic and legal responsibilities throughout the employment period and was also tasked with establishing the terms of employment. As a result, migrant workers relied heavily on their kafeel for the duration of their employment (Francoise De Bel-Air, 2015).
- Following the 1990s, the geopolitical landscape experienced significant transformations. The Iraqi invasion of Kuwait in 1990 resulted in approximately three million individuals being compelled to leave their countries, which had previously offered them employment opportunities in the Gulf region. This invasion led to the expulsion of around 3.5 lakh Jordanians and Palestinians from Kuwait, as well as 8 lakh Yemenis from Saudi Arabia. Concurrently, two

Scanned with OKEN Scanner

million Shia and Kurdish individuals either fled Iraq or became internally displaced. The resultant political and economic shifts prompted a substantial change in the policies of Gulf states. Consequently, the proportion of foreign nationals in GCC countries decreased from 72% in 1975 to 31% in the 1990s (Shah, 2004). Data from the United Nations Department of Economic and Social Affairs indicates that by mid-2020, the majority of migrants in GCC countries originated from South Asia, West Asia, and South-east Asia (UN DESA, 2020). Furthermore, it was noted that approximately 70% of non-national migrants were employed in GCC countries, forming a significant part of the labor force. Kapiszewski (2004) posits that this shift occurred as Asian workers increasingly supplanted Arab workers for various social and political reasons. During the decade from 2010 to 2019, India-Saudi Arabia ranked seventh, while India-Oman placed eighth in terms of migrant workforce (UN DESA, 2019b). By 2014, GCC countries emerged as the third largest region for hosting migrants, primarily from India, Pakistan, and Egypt. Thus, the GCC countries became home to the highest number of foreign migrants globally (Thiollet, 2016).

- **Girls migration to Middle Eastern countries:**
- The 2020 data indicates that women represent 35.3% of the total migrant population in Western Asia, marking the lowest percentage of any region globally. Among the Gulf Cooperation Council (GCC) countries, Saudi Arabia, the United Arab Emirates, and Kuwait emerge as the most preferred destinations for girls, in contrast to Qatar and Oman. This preference may be attributed to higher rates of spouse or family migration to Saudi Arabia (743457: 2019), the UAE (792877:2019), and Kuwait (331645:2019) compared to Bahrain (78271:2019), Qatar (97262:2019), and Oman (164781:2019). Furthermore, trends reveal that following the conclusion of the pandemic

Scanned with OKEN Scanner

lockdown, the total number of migrants from India has risen significantly, increasing from 132,675 in 2021 to 204,316 by July 25, 2024, according to the data. However, the country-specific data provided by the Ministry of External Affairs regarding emigration clearance for Indian migrant workers from 2019 to 2024 does not offer a clear breakdown of female migration to GCC countries.

- Indian population are migrating to other than the GCC countries also. However, these numbers are significantly smaller when compared to those migrating to GCC countries. Among the other GCC countries, Malaysia experienced the highest influx of Indian migrants, surpassing the figures for Jordan and Iraq in the Middle East, as well as Lebanon, Thailand, and Indonesia in Southeast Asia. Furthermore, data from the African continent for the years 2021 and 2022 indicates that there was only one instance of migration to South Sudan and Sudan. Thus, the prevailing trend indicates that the discovery and extraction of oil in West Asian countries, particularly within the Gulf Cooperation Council (GCC) nations, have led to an increase in job opportunities, thereby attracting millions of low-cost laborers from outside the region. Consequently, the GCC countries experience the highest migrant population globally. Additionally, certain West Asian nations, including Turkey, Syria, and Lebanon, are witnessing significant numbers of refugees due to the turmoil and conflicts that have resulted in internal displacement within their sub-regions. Therefore, West Asian countries predominantly host two categories of migrant populations: a labor force and Internally Displaced Persons (IDPs).
- The current study aimed to examine the phenomenon of migration of Indian girls, particularly students in the educational sector, which is witnessing a notable increase. Data on migration, both from India and globally, indicates that each year, a growing number of girls seek opportunities in especially in GCC countries, either to pursue their academic qualifications or to explore job

Scanned with OKEN Scanner

prospects. In this context, the study investigates the evolving patterns of migration among Indian female students to GCC countries. It also explored the socio-cultural, academic, and economic factors that led to their decisions of migration. Furthermore, the research captured the experiences of girl students highlighting the opportunities and challenges they encounter in a region. Thus, the primary focus of this research was to understand the implications of female migration on India's global image, particularly regarding cultural exchange, gender empowerment, and academic diplomacy. It also explored how these Indian girls navigate transnational education and contribute to India's soft power and global presence.

- **Methodology** :This empirical study employed a mixed-methods approach to collect data from a diaspora sample. Google response sheets were designed to align with the objectives of the research, facilitating the collection of responses from participants. A snowball sampling technique was implemented to reach the target samples for data gathering. Additionally, telephonic interviews were conducted with participants to explore relevant issues and gain insights into qualitative aspects. The age range of the participants varied from 23 to 70 years. The paper is structured in a descriptive format under various subheadings to address the research questions. Consequently, the analysis of the paper is based on a small sample size, with responses evaluated both quantitatively and qualitatively.
- **Result and findings:**
- **Job deficit and migration of girls:**
- By the year 2020, secondary data indicates that women represent 35.3% of the total migrant population in Western Asia. This figure is notably the lowest among all global regions where females migrate in pursuit of education, employment, or permanent settlement, often with their spouses. Furthermore,

Scanned with OKEN Scanner

the data reveals that since the 1990s, Saudi Arabia, Kuwait, and the United Arab Emirates have drawn the highest number of female migrants in the Middle East, in contrast to Oman, Bahrain, and Qatar. The migration trends were further examined through a questionnaire administered to the sample of girls, who were asked to indicate their city of migration from India. The emerging patterns derived from their responses indicate that, despite the superior educational facilities present in Delhi, the highest rate of out-migration among girls (20%) to Middle Eastern countries for educational and employment opportunities originates from Delhi, India. The limitations of this research, specifically the reliance on a small sample size, may result in skewed outcomes that favor Delhi, where out-migration appears to be more pronounced compared to other regions in India. This phenomenon may be associated with the prevailing job and employment deficits in the country, prompting a significant number of young women to seek better-paying opportunities that offer social security and additional benefits.

- According to the annual report from the Directorate General of Employment in India, gender-specific employment statistics indicate a notable increase in employment rates for women in recent years. The data reveals that both the Workers Population Ratio (WPR) and Labour Force Participation Ratio (LFPR) for females have shown upward trends, suggesting a decline in the unemployment rate. Specifically, the unemployment rate for women decreased from 5.6% in 2017-18 to 3.3% during 2021-22. Nevertheless, the number of educated women graduating from universities in India significantly exceeds the available job opportunities in both the public and private sectors. Consequently, the migration of women is often linked to the employment prospects offered by Middle Eastern countries, which provide social security. Notably, 60% of female respondents indicated that their migration was motivated by job

Scanned with OKEN Scanner

opportunities. Additionally, 13.3% of respondents cited other reasons for migration, including family reunification and relocation with a spouse. The analysis of migration motivations among women reveals that factors such as improved social security (20%), enhanced job opportunities (13.3%), financial support for families (13.3%), and a desire for cultural exposure (13.3%) have influenced their decisions to migrate. Therefore, the prevailing stereotype that women in India are primarily confined to domestic roles can be challenged by the emerging trends in female out-migration data. Approximately 71.5% of the respondents indicated that they relocated in pursuit of teaching positions, while 7.1% each moved for opportunities in the insurance sector, human resources, and other fields. During their migration, the majority of respondents did not have a specific institution or program in mind that motivated their decision to relocate.

- Further investigation of these samples through comprehensive interviews indicates that none of the participants expressed a desire to pursue higher education in the Middle East, primarily due to the higher costs associated with such education compared to India. Consequently, most individuals who migrated had already completed their higher education at their respective levels prior to their relocation. The interviews also highlighted numerous challenges faced by teachers in Indian schools, which often hinder their professional advancement. To qualify for government teaching positions in India, they must pass nearly four semester tests, including both primary and secondary Central/State eligibility tests, in addition to entrance examinations. However, successfully passing these assessments does not guarantee employment as a teacher or financial stability. In contrast, private teaching positions tend to be more exploitative, offering lower compensation relative to the hours worked. Conversely, securing a position in international schools is comparatively easier,

Scanned with OKEN Scanner

providing job security, financial benefits, and additional perks such as medical coverage and free education for teachers' children. Such opportunities are rarely available in Indian private institutions, whether at the secondary or tertiary level. The following excerpts from the in-depth interviews provide further insight into this matter.

- Researcher: • What prompted you to migrate?
- Sample: • Better paid Job opportunity with social and financial security
- Researcher: • But, that you can have here too...
- Sample: • But that is very scanty. The favouritism here in India often hinder the path of deserving candidates.
- Researcher: • Was there any particular institution or particular course in your mind that your were aware of and led you to migrate?
- Sample: • No... As I said, in teaching sector, in India, we have to pass lots of leveled examinations to get inducted into the work force. And that often frustrate any one who have devoted time, money and energy in getting the degree of no use...
- Researcher: • Can you elaborate further 'leveled examinations' that you mentioned?
- Sample: • I wanted to say that while earning the degree of teaching in India, any individual in India has to pass 4 semesters first. But these teaching degree are of no use unless you clear another eligibility criteria for teaching i.e. Centre or State Eligibility Test popularly called C-TET or S-TET. Once you pass this examination too, even then you can not become teacher in government sector where you can have social and economic security with other benefits such as medical facility, leaves benefits, pension and so on.

Scanned with OKEN Scanner

- Researcher: • Then?
- Sample: • You need to further appear in another test as and when advertised by the government for jobs. In Delhi, it is usually advertised by Delhi Service Selection Board (DSSB). But that is also advertised rarely as most of the contractual teachers are hired with no social and financial security. Therefore, I thought to migrate and look for similar types of jobs with world class opportunity, social and financial security and other benefits.

- **Familial Support to Migrated girls:**
- The research aimed to explore the perceptions of families regarding the migration of girls. This inquiry was particularly relevant given that many Indian families adhere to traditional values, which often result in restrictions on the mobility of girls compared to boys, primarily out of concern for their safety. Therefore, it was essential to understand how the family support system was perceived by these migrated girls and the challenges they faced within society. The majority of respondents indicated that they did not experience any familial pressure regarding their migration to Middle Eastern countries. In fact, 93% reported receiving support from their families. Only about 6% mentioned facing difficulties at the family level concerning their decision to migrate (refer to figure-4). These findings suggest that the assumption that families do not support the migration of girls is largely a stereotype. Additionally, the research examined whether these girls felt any societal expectations associated with being female and working abroad. Approximately 79% stated that they did not perceive any societal pressure or expectations while employed overseas as women. Almost 100% responses suggest that they are much comfortable in the host country and feel safe.

Scanned with OKEN Scanner

- **Girls' choice of GCC countries and ramification:**
- A significant number of the girls indicated that they preferred the Middle East over other regions due to the opportunities available and the alignment of faiths and beliefs, which do not interfere with their personal religious practices. Additional factors influencing their choice of the Middle East included family considerations, the employment of their spouses in the region, workplace safety, the appeal of Islamic culture, social security, and the presence of extended family members working there. Most of the girls who migrated maintain strong connections with their families while living abroad, utilizing mobile phones, video calls, WhatsApp, and even traditional letters to stay in touch. This consistent communication allows them to feel at home rather than isolated. They reported that they have adapted to the culture of the Middle East with relative ease and have not encountered significant challenges in adjusting to the region. Many expressed that cultural assimilation has occurred, enriching both their familial and societal cultures since their migration. Furthermore, they noted that their presence has positively impacted India's global image in the host country. When asked about the reasons for this perception, they attributed it to the preference of Middle Eastern countries for hiring Indian workers over those from other nations. They also highlighted that numerous Indians have successfully established small businesses in the region, demonstrating their talent and hard work. Consequently, India's global image has been significantly enhanced due to the migration of Indian girls, contributing positively to the country's reputation. Indian girls in the Middle East have made substantial contributions across various sectors, including education, healthcare, business, and technology, showcasing India's talent and strong work ethic. Several of these girls are also employed as teachers. The female educators have contributed not only their professional knowledge but also a diverse cultural

Scanned with OKEN Scanner

background, highlighting the importance of genuine effort, respect for learning, and a profound dedication to the growth of their students.

- Additionally, the migration of girls in Middle Eastern countries contributes significantly to soft power, cultural exchange, and academic prestige. The participants indicated that the cultural diversity and values they encountered enriched their knowledge, as they had the opportunity to learn from various cultures, including those of individuals from Egypt, Jordan, Iraq, and Pakistan. They expressed a warm reception towards Indian girls and reported no challenges in cultural integration. A deeper exploration with the respondents highlighted the importance of soft power, cultural exchange, and academic standing. Below is an excerpt from one of the samples.

- Researcher:
  - How do you see India's global image in terms of your migration as a girl?
- Sample:
  - It has positively contributed in enhancing India's global image...
- Researcher:
  - On what basis can you say that? Can you elaborate little more...
- Sample:
  - See... our my migration to this country has contributed to develop soft power, cultural exchange, and my academic reputation. As a teacher, when I interact with my students and colleagues from diverse backgrounds. They become enthusiastic in knowing Indian perspectives on several issues including educational values. The daily interactions has contributed to develop soft power by building a positive and respectful image of India
- Researcher:
  - How do they see Indian girls academically as you are hired for teaching here?
- Sample:
  - My migration has allowed me to bring my experience and

Scanned with OKEN Scanner

teaching methods to new contexts. It has not only enhanced my own reputation as a teacher in adapting new environment positively and swiftly but also it has given me opportunity to develop myself as skilled educator. This image of Indians in adapting to new environment of work force has further enhanced India's global image of Indian teachers

- Researcher:
  - Did you find educational system in the M iddle East different from that in India?
- Sample:
  - I am personally not satisfied as this system focuses on good grades rather than proving knowledge. In one sense grading has become synonym of learning. But one thing is very different here is t hat the campuses are very safe specially for females
- Researcher:
  - How about classroom environment ?
- Sample:
  - It is different from India. Here I felt study provides more opportunities. But spoon feeding system is more prevalent. In India at least, spoon feeding system in state schools is non-esxistence.
- Researcher:
  - And administratively? S
- Sample:
  - That also is quite different from India. Administration give a lot of relaxation to students. Students are really very good in communication and presentation, but majority of students lag behind in writing skills. They also are more scared and afraid of assessment and evaluation.
- Researcher:
  - And curriculum?
- Sample:
  - Education system in India is vast .Here they are trying to improve it as they vastly use Modern classroom teaching with

Scanned with OKEN Scanner

the use of technology in teaching and learning and are found to be more structured. Also the educational system places a strong emphasis on Islamic studies and local cultural heritage which is missing in India. You will also see gender wise segregation with separate schools or classes for boys and girls.

- Researcher:
  - What did you like most in methods of teaching & learning comparatively?.
- Sample:
  - The learning here is inquiry-based education. Strong focus on extra-curricular activities for the development is followed. But in India, strong emphasis on competitive exams and for getting higher marks. In India, education is deeply influenced by cultural diversity, with different states having distinct approaches and content based on local languages and traditions. Moral values and respect for elders and community, regional languages and traditions, emphasis on moral values. co-education is common across most schools. Further, in India, teacher-student relationships are often found to be formal, with teachers seen as authority figures who command respect. But you will not find these here. Educational curriculum in Middle East provide more of practical learning and exposure. Encouragement for women's empowerment is prevalent in both countries.

- The migration of Indian women, including educators, has significantly improved India's global reputation. Many respondents noted that they have benefited from opportunities such as selecting career paths, networking, and engaging in cultural exchanges, as well as gaining international exposure through their teaching and studies in Middle Eastern countries. This is

Scanned with OKEN Scanner

attributed to the genuinely pluralistic nature of the educational and work environments in these regions. Furthermore, a majority of respondents indicated that the chance to connect with students and educators from diverse backgrounds has improved their networking abilities, fostered international friendships, and facilitated better cultural adaptation (refer to figure-6). In addition to these advantages, they have gained access to a variety of educational methodologies that prioritize critical thinking and cultural exchange. The active integration of technology in education has also enabled them to utilize modern educational tools, further contributing to their professional growth.

- **Mitigating the challenges:**
- The study also aimed to explore in greater detail the difficulties encountered by these migrated girls and the strategies they employed to overcome them. The findings indicate that approximately 29% of the girls experienced economic difficulties, followed by cultural obstacles at 21%. Additional challenges included academic issues (7%) and gender-specific concerns (7%), among others (refer to figure-7). These challenges primarily emerged during their migration. However, within a few months, they were able to adapt to their new surroundings and address these issues. The economic difficulties were alleviated once their income flow stabilized, which took nearly two months to resolve. Cultural adjustments were achieved more smoothly within about three months, as most of them acclimated to their new environment.
- **Conclusion:** The out-migration of Indian girls to Middle Eastern countries, particularly in the realm of education, is an increasingly prominent trend as they seek academic and employment opportunities abroad. The evolving landscape of migration has underscored the significant influence of socio-cultural, academic, and economic factors on this phenomenon. Consequently, this migration has positively contributed to India's global reputation, especially

Scanned with OKEN Scanner

regarding cultural exchange, gender empowerment, and academic diplomacy. This is evidenced by the preference for Indian professionals in educational institutions worldwide over those from other regions. Nevertheless, the migration of girls to Middle Eastern countries remains comparatively lower than in other global regions where a higher number of girls migrate. Researchers recognize that the insights gained from this study hold substantial importance, as they will assist policymakers, educators, educational institutions, and diaspora communities in formulating recommendations on female student migration and capitalizing on this trend to bolster India's position in the global academic landscape.

- **References:**

Andrzej Kapiszewski (2006). Arab versus Asian migrant workers in the GCC countries. United Nations expert group meeting on international migration and development in the Arab region, population division, department of economic and social affairs, United Nations Secretariat, Beirut Retrived from https://www.un.org/en/development/desa/population/ events/pdf/expert/11/P02_Kapiszewski.pdf

Assous, L.(2000). Regional integration and migration flows: a critical review of recent literature in OECD, Globalisation, Migration and Development, OECD, Paris: 59-73.

Azeez, A., & Begum, M. (2009).Gulf migration, remittances, and economic impact. Journal of Social Sciences, 20(1), 55-60.

Bauman,Z.(2001).Community:Seeking Safety in an Insecure World, Polity Press, Cambridge.

Bustamante, J. (2002). Immigrants' vulnerability as subjects of human rights, International Migration Review, 36(2): 333-354.

Evans, L., and I. Papps (1999). Migration dynamics in the GCC countries: In R. Appleyard Emigration Dynamics in Developing Countries, Volume IV: The Arab Region, Ashgate Publishers, Aldershot.

Fargues and De Bel-Air, (2015) Migration to the Gulf States: The political economy of exceptionalism: In Global Migration: Old Assumptions, New Dynamics, Santa Barbara: Praeger pp.139-166 Retrived from https://www.researchgate.net/publication/279910691_Migration_to_the_Gulf_States_the_political_economy_of_exceptionalism

Scanned with OKEN Scanner

Fergany, N. (2001). Aspects of labor migration and unemployment in the Arab Region, Almishkat Center for Research, Egypt, accessed from the Internet in December 2002, www.worldbank.org/mdf/mdf4/ papers/fergany.pdf.

Girgis, M. (2002). Would nationals and Asians replace Arab Workers in the GCC?", Paper submitted to the Fourth Mediterranean Development Forum, Amman, Jordan, accessed from the Internet in November 2002, http://www.worldbank.org/mdf/mdf4/papers/girgis.pdf.

Government of India (2023). Employment and unemployment scenario in India, Directorate General of Employment. https://dge.gov.in/dge/sites/default/files/202305/Employment_and_Unemployment_scenario_of_India_May_2023.pdf

Hovanessian, M. (1998). The notion of diaspora. Usages and field of semantics", Journal of Anthropologists (72-73): 11-30.

Khadria, B. (2006). India: Skilled migration to developed countries, labour migration to the gulf. Jawaharlal Nehru University, New Delhi, and Asia Research Institute and the Department of Economics National University of Singapore. Retrieved frohttp://meme.phpwebhosting.com/~migracion/modules/ve7/2.pdf

Report on Arab migration in globalized world (2004). Switzerland: IOM International organization for migration

Report on International migration (2019). United Nations: Department of Economic and Social Affairs

Safran, W (1991). Diasporas in modern societies: myths of homeland and return, Diaspora, 1(1): 83-99.

Serow, W.J., C.B. Nam, D.F. Sly, and R.H. Weller (Eds) (1990) Handbook on International Migration, Greenwood Press, New York.

Shah, N.M. (2004).Gender and labour migration to the Gulf countries.Feminist Review, 77(1), 183-185

Shah, N.M. (2013). Labour migration from Asian to GCC countries: Trends, patterns, and policies. Middle East Law and Governance, 5(1-2), 36-70.

Thiollet, Helene (2016). Managing Transnational Labour in the Arab Gulf：External and Internal Dynamics of Migration Politics since the 1950s Retrieved from https://www.researchgate.net/publication/322286389_Managing_Transnational_Labour_in_the_Arab_Gulf_External_and_Internal_Dynamics_of_Migration_Politics_since_the_1950s

World migration report (2024). Switzerland: IOM International organization for migration

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

When Rape Isn't Rape: Justice Restricted in case of Married Women in India

Kamal Goyal,

Research Scholar, Faculty of Law, University of Delhi

Dr. Rahul Kumar,

Assistant Professor, Campus Law Centre, University of Delhi

Abstract: Rape in its all forms considered as a criminal offence and are punishable except rape within wedlock of marriage under 'Bhartiya Nyaya Sanhita, 2023'3 (hereinafter referred as BNS) and even earlier in 'The Indian Penal Code, 1860'4 (hereinafter referred as IPC). It is not construed as rape due to protection provided by exception 2 to sec. 63 of BNS (earlier section 375 of IPC).

However, such marital exception is a major contravention of our Constitution and human rights principles, still is a limb of our Indian Law. Even, presence or absence of consent makes no difference here at all.

Only two instances exist there, where rape within marriage is punishable. Firstly, in case of sexual intercourse by the husband upon his wife while separation under section 67 of BNS (earlier 376B of IPC) and secondly, under child marriage, where girl child is under eighteen years of age.

Because these are only few above-mentioned provisions in existing Indian legal system to punish husband for committing rape upon his lawfully wedded wife, access to justice to such class of women who is married is highly restricted and hence it may be achieved in true sense through criminalisation of rape within marriage in a balanced way on the lines of gender equality and restorative justice.

---

3 Act No. 45 of 2023.
4 Act No. 45 of 1860.

Scanned with OKEN Scanner

Keywords: Marital Rape, Rape within Marriage, Rape, Cruelty, Sexual Violence, criminalisation, Marital Exception, Human Rights, Restorative Justice.

Introduction .1

"Yatraa naryastu pujyunte ramante tatraa Devataa, yatraitaastu naa pujyante sarvaastatrafalah kriyah"- **यत्र नार्यस्तु पूज्यन्ते रमन्ते तत्र देवता:। यत्रैतास्तु न पूज्यन्ते सर्वास्तत्राफला: क्रिया:।।-** is a famous shloka taken from ancient metrical Sanskrit text Manusmruthi which means- where Women are honorified, godship blossoms there, and where women are shamed, all action, no matter how magnanimous remain unfruitful.

Swami Vivekananda had also said "That country or nation that does not give reverence to women have never become reputative, nor will ever be in future".

The Vedas even glorify women as the unique creation of God, a multi-faceted and all-round personality with the power of tolerance, adaptability, adjustability, kindness and integrity.

So, India is a land where women are being considered divine and worshipped as Devi from the ages without any scope of gender biasness. But with the travel of time, the condition of women gets deteriorated and become pathetic in modern Indian society which is an issue of sedate concern.

There are several forms of crime against women prevalent in the our society. But, only offence of rape within marriage would be discussed here in detail.

The word 'Rape' came from the Latin term 'Rapia', which means "to seize".5 Rape is an act of aggression in which women are denied her self-determination. The definition of rape may secede from one state to another as per their respective legislature, but in almost in every country such definition is limited to forced or non-consensual or vaginal penetrations. The definition in many countries also

---

5 G.V. Akshaya and M. Kannappam, A Study on Marital Rape in the Indian Legal Scenario, International Journal of Pure and Applied Mathematics, Vol. 119 No. 17 2018, 1089-1100.https://acadpubl.eu/hub/2018-119-17/1/94.pdf.

Scanned with OKEN Scanner

gives immunity to a particular class of males namely husbands, who cannot be accused of rape of their own wives. Similarly, in the majority of the legal system, the interpretation of term rape does not go athwart the parameters of a patriarchal value system6and male dominance.

Earlier, IPC confered two exceptions where a sexual act without consent will not be deemed to rape. First exception is under a medical procedure or intervention and second one is sexual intercourse under wedlock of marriage by a man with his own wife, if the wife not being under the age of 15 years, do not constitute rape. The said exception had become a burning issue as it establishes that, under a lawful wedlock of marriage, a husband will not be held convicted for raping his own wife. In fact, after 2013, age under above said second exception was extended from 12 to 15 years through amendment in old Criminal Laws.

Thereafter in the past, in a landmark case, Independent Thought v. Union of India,7 the Honorable Supreme Court partially read out such an outmoded exception to the definition of rape. The division bench has ruled out that if a husband under wedlock of marriage rapes his minor wife (i.e. below 18 years), he will not be immunized from Sec. 375 of IPC and is to be held convicted for rape.

The Honourable apex Court explained further that, classification between unmarried and married female child under 18 years of age is artificial and arbitrary. It was reckoned as an unreasonable classification as per Article 148 under Indian constitution, as the classification has no rational nexus with any clear objective that can be achieved. Such exception was also declared unconstitutional on the lines of

---

6 Dr. Vandana, Marital Rape- Exemption under Penal Code, 1860: quest for Recognition and Liability, ILI Law Review Vol. II, Winter Issue 2017.

7 Independent Thought v. Union of India, (2017) 10 SCC 800.

8 The Constitution of India, 1950 Art. 14: The State shall not deny to any person equality before the law or the equal protection of the laws within the territory of India.

Scanned with OKEN Scanner

Article 159 (right against discrimination) and Article 2110 (right to life) of Indian Constitution.

On the lines of recent developments in this matter, even in BNS, above said age limit has been put as18 years in place of 15 years.

Thus now, second exception to section 63 of BNS may be read as: - "Sexual intercourse under wedlock of marriage by the husband with his wife (wife not being a minor), is not considered as rape".

Such developments in this regard have become considerable events for the persons who were combating for rights of child and women. But, not able to get the whole exception declared unconstitutional, it is like moving only a single step towards the conquest for those fighting for providing access to justice to the victimized persons of marital rape through its criminalisation.

2. Historical Background

Rape under wedlock of marital union has not been reckoned in the Indian civilization since time immemorial. In India, marriage is regarded the sacred institution through which any human being authenticates his or her right to procreate. When a person enters into marriage, it is reckoned that there is an automatic or implied consent for any sexual act to his partner.

According to K. Vibhute, this exemption is based on the reciprocal matrimonial contract and this contract takes the right from wife to withdraw her consent to take part in sexual intercourse with her husband.11

The rules to be pursued by a married couple can be founded in the ancient Sanskrit texts like Upanishads, Manusmriti and customs prevailing in our civilization.

---

9 The Constitution of India, 1950 Article 15: The State shall not discriminate against any citizen on grounds only of religion, race, caste, sex, place of birth or any of them.

10 The Constitution of India, 1950 Article 21: No person shall be deprived of his life or personal liberty except according to procedure established by law.

11 K. Vibhute, Rape within Marriage in India, 27 Ind. Bar Rev. 167 (2000).

Scanned with OKEN Scanner

According to Manusmiriti, responsibility of a husband is to defend his wife, her honour and individuality, while a wife has the burden to preserve the home's peace and happiness on her shoulder. Marriage is an everlasting bond and the internal problems between marital partners must never be taken away from their home. A husband should not forcibly bind his wife in marriage or protect her without her wishes under any condition and on these lines; wife must not forcefully pursue love and compassion to the husband at all. Moreover, if the person in front of him is his brother or father, a friend or neighbour, a husband must not ignore or avoid intuitions or warnings of his wife about a man other than himself. A women must safeguard her marriage instantly by each possible effort, if she sees her husband deviating from the direction of marriage; the same also germane for a husband12. Furthermore, a wife under wedlock of marriage is not being reckoned ideal, if she denies for sexual activity or intercourse with her husband.13 It is always considered as a private matter between marital partners which should not be communicated outside the walls of their private space i.e. bedroom.

During Mughal era also, same opinion regarding marriage was in trend and during this era condition of women was extremely deteriorated and pathetic in the society. Even marital rape was not acknowledged as a crime by Britishers during their rule. Lord Macaulay provided exception to spousal rape under rape laws of the country because Lord Matthew Hale, at common law in the seventeenth century, stated that under wedlock of marriage, due to their reciprocal matrimonial consent and contract, the husband cannot be held accountable for raping his lawfully wedded wife because the wife has given herself up to her husband in the said marriage and

12 https://ijcrt.org/papers/IJCRT2105097.pdf

13 Sakshi Kanodia & Ranjabati Ray, Why Penalize Marital Rape, IOSR-JHSS Vol. 21, Issue 9, (10 September 2016) pp. 49-55.

Scanned with OKEN Scanner

for which she cannot retract.14 It does not only affect Indian laws related to rape but also rape laws in many other common law countries.

The statement given by Hale was completely based upon the theory of marital unity15. According to doctrine of "Unity in marriage", a man and women are considered as single entity after marriage.16 So, definitely it is unthinkable for a man to rape himself. This disgusting law of a colonial epoch has not been repealed even in the independent India.

The Hindu Marriage Act, 195617, which confers the components of marital union as well as divorce among Hindus, is also silent about it. All other Indian personal laws have nothing about such a burning issue.

Sec. 375 of IPC (now Sec. 63 of BNS) is based on consent, i.e. whether consent is free or not, and burden to prove lies on the victim. Under wedlock of marriage between husband and wife, it is always envisaged that by entering into matrimonial relationship both have consented for sexual relationship. So, when they are living under marital obligation together, consent is envisaged to be taken. Thus, the issue taken noticed by various legislative bodies and law commissions has been restricted to valid or invalid consent only which is a matter of fact only.

For the first time, 42th Report of Law Commission mentioned the rape under marriage. It was however completely restricted to a condition where legally wedded partners are living separately by a mutual consent or under a decree of judicial separation.18 This amendment was accepted and brought into The Penal Code, 1860 in the form of section 376B (now Sec. 67 of BNS) with a prescribed

---

14 Sir Mathew Hale quoted in Rosemarie Tong, Women, Sex and the Law, 94 (1994).
15 Dr. Vandana, Marital Rape- Exemption under Penal Code, 1860: quest for Recognition and Liability, ILI Law Review Vol. II, Winter Issue (2017).
16 Shobha Saxena,. Crime against Women and Protective Paws, pp. 81, (Deep & Deep Publication Pvt. Ltd., New Delhi) (2001).
17 Act No. 25 of 1955.
18 The Indian Penal Code, 1860, S. 376 B

Scanned with OKEN Scanner

punishment of imprisonment of the either description for a term which shall not be less than 2 years, but which may extend to 7 years, and shall also be liable to fine.

The said commission has made another recommendation to impose criminal liability on the husband for having sexual intercourse with his minor wife, but such recommendation was not accepted.19 Now, it was rejected again on a ground that when two human being enter into marital relationship, then consent for sexual intercourse which is automatic or implied is always there. So, a husband may not be held convicted and punished for rape of his own legally wedded wife as sexual intercourse is a crucial part of marriage.20

The question of validity of such exception to definition of rape was again raised before the Law Commission in its 172th report21 by instituting a writ petition namely Sakshi v. Union of India. But again, the said report denied to criminalise the marital rape by stating a reason that it will amount to excessive interference into marital affairs of two people. This report also demotivated the persons battling for the rights of women under marriage and again gave dominance to the male partner and patriarchal mind set.

Then, in 2012, after Nirbhaya rape case, a committee constituted under chairmanship of Justice J.S. Verma was formed for recommending amendments in Criminal Law System. Such committee has recommended to make laws more effective to deal with heinous crimes committing against women in our Country. Another recommendation made by the said committee was the elimination of exception 2 from sec. 375 of IPC22 (now Sec. 63 of BNS) also. The report indicated that there is no rationale behind giving immunity to the husband for

---

19 Law Commission of India, 42nd Law Commission Report, Penal Code, 1860, (June 1971).

20 Arima Pankaj, Independent Thought v. Union of India: An evaluation of judgment and its repercussion in the field of marital laws, IOSR-JHSS Vol. 22, Issue 11, Ver. 4 (November, 2017) pp. 79-85.

21 Law Commission of India, 172 Law Commission Report, Review of Rape Laws, (March 2000).

22 Justice J.S. Verma (Retd.), Report of Committee on Amendments to Criminal Law, (January 23, 2013).

Scanned with OKEN Scanner

raping his lawful wedded wife. Report also states that having such kind of marital exceptions shows that women are property of husband. While even previously women were considered to be the estate of men, but in the 21st century this view is outdated and not in consonance with human right principles however still existing in our legal system.

In 2014, a case namely State v. Vikash23 has been held by Hon'ble Delhi High Court, in which matter of rape within ambit of marriage was argued in detail. But determinately, the court ruled that in India, marital rape cannot be criminalised as section 498-A of IPC (now sec. 85 and 86 of BNS) is a substantial bolster to deal with its allied matters. In that case, it was also ruled out that, at the moment, there is neither any urge for fresh legislation, nor for the abrogation of exemption clause as well.

Also, in RIT Foundation v. Union of India[24], a bench of the then acting Chief Justice Gita Mittal and Justice C Hari Shankar in the Hon'ble High Court of Delhi said that in a relationship like marriage, both male as well as female partner have a right to say 'no' to physical relations. Meaning of marriage is not that the woman is all time ready, and moreover, it was even held that physical force is not essential for constituting the offence of rape. In the said case, Central government's reactionary stand was that criminalizing rape under marital union would "destabilize the sacred institution of marriage" and could be a weapon to "harass husbands", before Hon'ble Delhi High Court, is utterly disappointing. It is although arduous to comprehend how marital rape is less brutal than triple talaq or polygamy[25].

The Standing Committee of Parliament on Home Affairs in its 167th report also refused to remove exception regarding rape within marriage on a factor that the

---

23 2014 SC 1/14: Special fast track court, Dwarka., New Delhi.
24 WP (C) No. 284 Of 2015: High Court of Delhi.
25 A news 18 Report on July 17 2018: www.news18.com

Scanned with OKEN Scanner

whole family system will suffer due to this step and this can lead to further injustice and may demolish the family structure also26.

In 2015, DMK MP Kanimozhi, through a question submitted in Rajya Sabha, favoured the abrogation of the second exception from the definition of rape provided under IPC27 (now BNS). In the very same year, a private member bill was tabled in Rajya Sabha by the Congress leader Avinash Pandey.28 While introducing the bill, he acknowledged the fact that rape under marital union is a very sensitive issue whereas on the other side he stated why this is a right time to criminalise forced sexual relationship in marriage. The bill even then not get supported and by this reason, he withdrew the same.

This time, private member bill moved in Rajya Sabha in 2018, recognising that the social construct of patriarchy has made women a vulnerable class and this social construct has resulted to the exclusion of them in other social spaces.29 Chapter II of the said bill provides for amendment in rape law by deleting exception two to section 375 of IPC30 (now Sec. 63 of BNS). But, all have gone in vain.

Several statutes like The Prohibition of Child Marriage Act 2006,31 The Protection of Women from Domestic Violence Act 2005,32 The Protection of children from Sexual Offences Act 2012,33 The Juvenile Justice (Care and Protection) of

---

26 The Criminal Law (Amendment) Bill, 2012, One Hundred and Sixty Seventh Report (Presented to Rajya Sabha on 1st March, 2013).

27 India not criminalise marital rape, The Hindu (August 30, 2015). https://www.thehindu.com/news/national/concept-of-marital-rape-cannot-be-applied-inindia/article7154671.ece.

28Private Bill on Making Marital Rape a Crime Tabled in RS, Outlook Magazine (April 24, 2015).

29Dr. Shashi Tharoor, M.P., The Women's Sexual, Reproductive and Menstrual Rights Bill 2018 (November 19, 2018).

30 Dr. Shashi Tharoor, M.P., The Women's Sexual, Reproductive and Menstrual Rights Bill 2018 (November 19, 2018).

31 Act No. 6 0f 2007.

32 Act No. 43 of 2006.

33 Act No. 32 0f 2012.

Scanned with OKEN Scanner

Children Act 201534 have been enacted for protecting the interests of women and children but none of them have covered the issue of rape within marriage.

Thus, Rape under ambit of marriage can be stated as one of the oldest undeclared crimes in society but because of conceptualization of the female body as an estate of husband with patriarchal social structure, rape within marriage, even today, remains unattended and unrecognised which ultimately restrict the accessibility to justice to the married women in India.

3. Glance over the issue through the Constitution

In this part, stress will be given upon the relationship of the State and the woman through the realm of constitutional law by analysing the fundamental rights, fundamental duties and directive principles of state policy along with other residuary powers mentioned under it. But before it, we will also discuss 'public private dichotomy' here that still persists in the interpretation of constitutional law.

Marriage can be consummated in a very personal space and the State is always hesitant to disturb this delicate space. This is to maintain the privacy of citizens and the intrusion thereby through the State in this sphere would disrupt their privacy. Thus, the State does not compel two individuals to marry or divorce against their will.

However, the refusal of the State to enter this private space even in certain specific instances can be problematic also. For example, if a legally wedded wife is subject to cruelty in a marriage, then the State itself have to enter into this private sphere to criminalise this cruelty by husband to his legally wedded wife. If the State does not do so, then such woman will have no legal redressal for seeking justice. Thus, it is important for the State to pierce the veil from this private sphere on some specific occasions.

---

34 Act No. 2 of 2016.

Scanned with OKEN Scanner

Likewise, in case of marital rape, if the State does not pierce the veil from this private sphere, then a woman will definitely remain empty without any remedy when raped by her husband. But such required remedy may be provided by legislature or can be exercised by such class of women only after its criminalisation.

Now, it can be discussed and testified that marital rape is a straightforward infringement of the fundamental rights of a married woman specifically under Art. 14, 15 and 21 of the Constitution of India with the help of arguments given below:

- Article 14 of Indian Constitution states that "The State shall not deny to any person equality before the law or the equal protection of the laws within the territory of India". It therefore avail a safeguard to a people from State discrimination whereas the exception 2 given under Section 63 of BNS (earlier Sec. 375 of IPC) even discriminate with a wife under marital union when we talk about protection from the rape within marriage. Thus, such marital rape exception provided under Section 63 of BNS (earlier Sec. 375 of IPC) is not justifiable classification and thus, a clear contravention of protection guaranteed under Art. 14 of the Constitution.

- Article 15 (1) (i) of Indian Constitution even provides that "The State not to discriminate against any citizen on grounds only of religion, race, caste, sex, place of birth or any of them". So, such exception to the definition of 'rape' is a clear infringement of said Constitutional provisions.

- Article 15 (3) of the Indian Constitution further states that "The State to make any special provision in favour of women and children". It is highly an issue of great shame that despite having such specific provision in our Constitution, legislature has ignored the matter of rape within marriage.

Scanned with OKEN Scanner

- Article 21 of Indian Constitution contains a fundamental right which recognised "Right to live with human dignity" within its ambit. Rape within marriage is a contravention of the right to live with dignity of a woman as well. hence, it is evident that the exception 2 detailed under Sec. 63 of BNS (earlier Sec. 375 of IPC) is infringement of Art. 21 of the Constitution.

Also, protection of the dignity of women is the fundamental duty mentioned under Indian Constitution which casts a duty upon every citizen "to renounce practices derogatory to the dignity of a woman". it again seems that rape exemption under marital union availed by BNS (earlier IPC) is again disharmonious to Article 51(A) (e) of the Constitution.

Most importantly, Preamble of our Constitution talks about securing 'social justice' to the people of India. In case of married women, such social justice cannot be secured without removing marital rape exception as such exception is not in consonance with the social justice principle mentioned in the preamble of our Constitution.

But it is germane to consider that securing such 'social justice' is not mere responsibility of the state but also the collective responsibility of each and every citizen of the country as the Preamble itself has been addressed to whole of the people of the country from the very beginning of it and stated as- 'WE, THE PEOPLE OF INDIA'.

Even then, if every time a woman feels unsafe in her own house, it deemed to be a clear failure of fundamental principles of Indian society and its social justice system as well.

Thus, State is liable to criminalise marital rape at the earliest and also it is the collective responsibility of each and every citizen not to indulge in such type of immoral activity in order to achieve 'social justice' in true sense.

Scanned with OKEN Scanner

4. Analysis of existing remedies available in criminal law

The most relevant provision that has been often used as an alternative to criminalisation of marital rape and to provide justice to its victims is sec. 498A of the IPC (Sec. 85 and 86 of BNS). It was incorporated into the IPC and now in BNS to specifically deal with cases of cruelty against women. However, we strongly believe that this is inadequate for two reasons. Firstly, there is a major difference between cruelty and rape. The nature and act of rape differentiates it from an offence of cruelty. Another factor behind it as this section is not ample enough to deal the cases of rape.

Beyond that, offence of rape is different by the different nature of the offence itself. It is a form of cruelty definitely; but this cruelty is so different from physical violence and mental violence. This is even depicted through the treatment of rape as a distinct offence in the criminal statutes which is different from grievous hurt or assault.35 it could be correct that a victim of marital rape might have alternate mechanisms, however this has no effect on necessity for criminalisation of marital rape.

Cruelty is purely a factual issue based upon of the matrimonial relationship amongst husband and wife, status of their health, culture and temperament in life etc. Moreover, each person experiences mental cruelty differently based on their level of sensitivity, courage, strength, and capacity and resistance to endure such abuse.

It is very difficult and inappropriate to include cases of rape or marital rape within this section of cruelty. The first reason is because the threshold for conviction under cruelty is very high. Secondly, to be convicted under Sec. 85 and 86 of BNS (earlier Sec. 498A of IPC), generally such conduct has to be done repeatedly or

---

35 See IPC 1860. While hurt is covered from Ss. 319-338 in another part, the offence of rape is covered separately from Ss. 375-376E.

Scanned with OKEN Scanner

over a longer duration of time.36 Therefore it is not feasible to convict a person when the forced sexual intercourse is done one or two times only, if to be covered under the periphery of these sections.

Harassment of men by the misuse of this section itself is a matter of great concern. Recently, in Rajesh Sharma v. State of Uttar Pradesh,37 the Court issued directions to foreclose the misuse of section 498A (now Sec. 85 and 86 of BNS). Such remarks regarding its misuse given by the apex Court is an indication of the mentality that adversely affects the various organs of the State and will also make prosecution of cases of rape within marriage more difficult.38

Thirdly, the maximum punishment under sec. 498A of IPC (now Sec. 85 of BNS) is only for three years with or without fine. The maximum sentence for offence of rape is life imprisonment.39 This major difference in the punishment again indicates that the notion of cruelty cannot in any manner deal rightly with the rape or rape within marriage.

Therefore, Cruelty, rape and rape under marriage are different categories of violence against the women and should be treated differently. Taking all of them under one umbrella would not be appropriate and justifiable.

5. Analysis of existing remedies available in civil law

The remedies that available in civil law occupy an uncomfortable place in discussions which are centred around gender-based violence. One of the main factor of this problem is perhaps the belief that emphasizing upon civil remedies which will only encourage the public private dichotomy because it makes gender-

36 Samar Ghosh v. Jaya Ghosh, (2007) 4 SCC 511.
37 Rajesh Sharma v. State of Uttar Pradesh 2017 SCC OnLine SC 821.
38 The Wire, Supreme Court Order on Domestic Abuse Cases Is a Step Back for Women's Rights Law, July 31, 2017, available at https://thewire.in/163011/supreme-court-domestic-abuse-dowry/ (Last visited on December 23, 2017).
39 See IPC 1860, Ss. 375 and 376.

Scanned with OKEN Scanner

based violence a problem only between the perpetrator and victim rather than act of violence against the State itself.40

Meanwhile, it is even not unreasonable to underestimate the relevancy of civil remedies as they allow women to 'do something' rather than relying upon the criminal justice system to act appropriately and in a rapid way to provide their rights and to move outside their private structures.

However, this discussion tends to be clearer when we incline it in context of violence within marriage. This is because matters in context to marriage are governed by family law. In these circumstances, it is of huge importance to have a corresponding civil remedy while criminalising a certain act and further, the criminal and civil remedies exist without any contradiction i.e. harmoniously with each other.

Therefore, while we continually argue for getting it criminalised, we question the efficacy of this criminalisation if family law does not adopt this. We also put our focus on how family law, as it stands today, is not completely prepared to address the notion of marital rape.

The grave concern regarding family law is 'restitution of conjugal rights' which continues to exist in India till today despite being abolished in the United Kingdom.41 This is basically used by men to force their wives for resuming their conjugal relationships.42

Personal laws in India recognise cruelty as a ground for divorce but sexual violence has not been considered specifically as an adequate ground for seeking divorce. This leads to paradox in Indian legal system.

---

40 Lauren M. Gambier, Entrenching Privacy: A Critique of Civil Remedies for Gender-Motivated Violence, 87 NYU L. REV. 1934-1937 (2012).

41 In 1970, the Matrimonial Proceedings and Property Act abolished Restitution of Conjugal Rights in United Kingdom.

42 Flavia Agnes, Hindu Conjugality: Transition from Sacrament to Contractual Obligations in REDEFINING FAMILY LAW IN INDIA, 236 (2008).

Scanned with OKEN Scanner

'Refusal to engage in sexual intercourse' falls within cruelty, specifically under 'mental cruelty'. At the same time, 'forced sexual intercourse' should also amount to cruelty itself without imposing any condition. Thus, cruelty encompasses two different positions.

Primarily, it would seem simple to draw a line between a wife's refusal to have sexual intercourse and forcing the wife to have sexual relationship. However, while analysing different case laws, it is challenging to draw this so-called line, since the majority cases have relied upon the notion that a wife must have sex with her husband.

In fact, the notion of marital rape now largely relies on the changing notion of marital union by woman's right to say 'no' to fulfil her husband's sexual pleasures. But if courts have held that the husband can file a case for divorce if a wife is not engaging in sexual intercourse with him; Married women's right to say 'no' is totally diluted.

How do the courts decide what amount of sexual intercourse is 'required' in a matrimonial relationship and at which point the husband loses his 'right' to sexual intercourse with his partner?43 There is no clear rule as such and it is not a denial for sexual intercourse or inability to perform sexual intercourse, it is rather based upon the judiciary visualizing some basic amount of sexual intercourse required for a marriage which allows the judges to use their discretion in this matter. Moreover, the conflict of ideologies between refusal to participate in the sexual intercourse as a type of mental cruelty as well as right to deny forced sexual intercourse in a marital union is clearly evident.

---

43 The Times of India, Denying Sex a Ground For Divorce: Karnataka HC, April 20, 2012, available at https://timesofindia.indiatimes.com/india/Denying-sex-a-ground-for-divorce-KarnatakaHC/articleshow/12739949.cms?referral=PM (Last visited on November 02, 2024).

Scanned with OKEN Scanner

'Sexual violence' may be included into cruelty. For instance, section 13(1)(i)(ia) of The Hindu Marriage Act44 could be amended to include the sexual violence into cruelty. But it may also have certain reservations like firstly, The Protection of Women from Domestic Violence Act, 200545 brings in 'sexual violence' in the definition of 'domestic violence' under it. If said definition could be used particularly as outline for figuring out cruelty, it could also be in tune with one another and secondly, term 'cruelty' is a gender-neutral term in family law but, offence of sexual violence only perceive women as the victim and not the men. So, it will not be suitable to include 'sexual violence' within 'cruelty'. However, whenever the rape within marriage got criminalised, a wife could file a case for divorce as the conviction of husband for committing marital rape got reckoned as a prominent ground for divorce.

The main concerns covered in this part are more crucial for accrediting the ideological shifts necessary in family law. Particularly, when the victim of sexual violence is not ready to file a case or complaint for rape or if it does not meet with the criteria fit for rape but was a sexual assault. In particular, sexual assault is recognized by The Protection of Women from Domestic Violence Act, 2005,46 as an extremely crucial instrument to ensure the justice delivery to lawfully wedded wife.

In order to address cases of rape within marriage, we have examined the existing criminal and civil remedies available under the current law. As a result, the significance of criminalizing rape within marriage has been established rather than examining alternative remedies, as we discovered that there were inadequate alternative remedies. Such deficiency can be fulfilled through using restorative

---

44 Act No. 25 of 1955
45 Act No. 43 of 2006
46 Act No. 43 of 2006

Scanned with OKEN Scanner

practices moreover with other forms of punishment which will be argued in the next part.

6. Restorative Justice and Marital Rape

Justice is globally becoming more victim centric through restorative practices. But, right now, it is limited to first time juvenile offenders or cases of minor offences. Restorative justice is founded on certain principles like empathy, respect, and an acknowledgement of guilt that recognizes crime as a damage to interpersonal relations as well as social bonds, creating certain responsibilities to repair that damage. It is just not only the offender who has a duty to fix things, but community at large must also become a strong support system for the victim.

Now, trough restorative practices, the focus of administrating justice is shifted from the crime as being an offence against the State to an act that harms an individual. Furthermore, it recognises that offenders might be victims themselves who have been harmed and need social integration and healing.

This has changed the very definition of justice itself. In this concept, victim has a control over the way how he wants justice. Victim can even choose to forgive offender and move on, but without existence of any force or undue influence and only where there is a true acknowledgement of guilt and offender take direct answerablity for his actions instead of blaming the society and other undergoing circumstances.

In a case of offence like marital rape, victim is not just physically harmed, but also psychologically affected and emotionally damaged. Still, it might be possible that a woman who rejects an apology may be passively coerced by her society or community.

It is pertinent here to change the focus from actor to action, only in this way harm caused to all concerned stakeholders can be restored effectively. It is not ethical or

Scanned with OKEN Scanner

acceptable to view their husband just as the husband, but the preparator and his act should be condemned at large.

Although, implementing restorative practices can be beneficial in some rape cases, but cannot fit uniformly in all type of rape cases. Here, the main problem is acknowledgement of guilt which becomes complicated in cases of rape when offenders start externalizing the blame.47 It becomes much complex when it comes to marital rape. This can become successful only where the man as well as society can see beyond the camouflage of his masculinity and the woman can find consolation and support. This is not possible in conventional criminal justice system.

Even, Criminal Law (Amendment) Act, 2018 had reflected in the past precisely a growing retributive trend in the sentencing policy by the legislature for sexual offences. The major change introduced there at that time was the increase of punishment to the individuals convicted for committing offence of rape of a girl under the age of 12 years and 16 years. At a time when most of countries are trying to abolish capital punishment by moving towards a more reformative model of justice, it introduced the death sentence for gang rape of a girl below the age of 12 years. The amendment was done in procedural law also to disallow the offender to apply for anticipatory bail in minor girl's rape cases below age of 16 and to speed up the appeal and trial processes.

Another important concern in introducing restorative practices in rape as well as rape within marital union is the over-reliance on consent in determining whether the offence has been committed. The attention then automatically shifts from the culpability of the offender to acts of the victim. The victim thus suffers from the same trauma again and trying to reaffirm the absence of consent and her innocence

---

47 Kathleen Daly & Julie Stubbs., Feminist Engagement with Restorative Justice, 10 THEORETICAL CRIMINOLOGY 1 (2006).

Scanned with OKEN Scanner

also even where notion of 'no means no' has been widely recognized by the Indian courts and the requirement of resistance to prove non consent is even now not required.

Women are often unable to exercise effectively her choice in giving the consent, this is also a major problem in defining consent in Indian scenario. This is only due to patriarchal social structure and cultural norms.

Legislatures across the world should take a serious note to change the way of justice delivery in cases of marital rape firstly with its criminalisation and focusing more on the expectations of the victims, gender neutrality and changing notions of consent.

Moreover, if we really want to criminalise rape within marriage in a country like India, we should incline our justice delivery system more towards restorative justice rather than sentencing through retributive practices. Otherwise, it cannot be criminalised ever even after a long battle. Even, Mahatama Gandhi once said, "Justice that love gives is a surrender; justice that law gives is a punishment".

However, recently, some petty reforms have been introduced in BNS for incorporating restorative justice practices in our justice delivery system. Section 4(f) of BNS incorporates community service as a form of punishment in our legal system which streamlined restorative justice principles. Further, Section 75 of BNS includes strong protections against sexual harassment, reinforcing gender justice. Moreover, BNS encourages correctional programs for offenders rather than long-term imprisonment for minor crimes. But, these improvisations in our justice delivery mechanism are not sufficient at all and just like cumin in camel's mouth.

In fact, it is need of the hour to criminalise the marital rape on the lines of restorative justice, but it is apparent that the road to justice delivery through

Scanned with OKEN Scanner

restorative practices seems so long in Indian legal system specially in cases of all forms of rape.

7. International Human Rights Obligations and recommendations

India has become party to CEDAW convention with the 189 member States in total and ratified it later in 1993. This treaty is first ever of that kind particularly emphasizing upon the abolition of all forms of discrimination against women.

According to the said treaty, any sex-based differentiation, exclusion, or restriction that has the intent to hinder or negate women's recognition, enjoyment, or exercise—regardless of their marital status—is considered as discrimination and it also includes Rape within marriage as a form of violence against women whereas exception 2 to section 63 of BNS (earlier Sec. 375 of IPC) establishes that sexual intercourse by a man under wedlock of marriage with his own wife, not being under age of 18 years, is not considered as rape. Although the said article does not have a binding effect but still such outdated provision of such a recent Law i.e. BNS is disharmonious and incompatible with it and even treat women with discrimination based upon her matrimonial status.

Moreover, as per general recommendation namely GR 1948 of CEDAW, the state parties are required to take adequate legal measures, such as penal sections, civil remedies, and other residuary provisions, to protect women from all forms of assault. Again, GR 33 also enumerates that States shall ensure to define sexual offences along with marital rape which takes coercive measures into account or focuses on lack of freely provided consent.

The Beijing Declaration and Platform for Action, which India, as a United Nations Member State, ratified in 1995, acknowledged that rape under wedlock of marriage and several other forms of assault against women are just a reflection of the historical imbalance of power between men and women and even States have to

48 https://www.un.org/womenwatch/daw/cedaw/recommendations/recomm.htm

Scanned with OKEN Scanner

enact laws or enforce existing ones in order to penalize offenders and avail women easy access to the justice.49

For implementation of such recommendation, The National Commission for Women (NCW) were constituted. Its main aim also was to ensure and avail a secured environment at workplace. Moreover, to provide protection to women everywhere at all spheres of life, other enactments like Sexual Harassment of Women at Workplace (Prevention, Prohibition and Redressal) Act 201350 and Protection of Women from Domestic Violence Act 200551 had been framed and enforced but still such sensitive and burning issue of rape under wedlock of marriage is open and alive till date just because of irrational exception to section 63 of BNS (earlier section 375 of IPC).

Even, provisions of an International Convention like CEDAW have been adopted in India also by the judiciary in Vishakha v. The State of Rajasthan52 which has been even considered later by the legislature in enacting Domestic Violence Act, 2005.

A number of provisions in UDHR, ICCPR, ICESCR and ICESCR are existing that specifically prohibit marital rape, just like in CEDAW.

Additionally, two UN treaty bodies namely Committee against Torture and Human Rights Committee even acknowledged the assault against women including marital rape which ultimately violates their fundamental rights to life, liberty, and personal security, as well as equal protection from torture and non-discrimination.

Furthermore, according to Article 51(C) of our Constitution, the state should respect all international law and treaty obligations53 and Article 253 even

---

49 World Conference on Women, Report of Fourth World Conference on Women, paras. 118, 124(c,h) UN Doc.

50 Act No. 14 of 2013.
51 Act No. 43 of 2006.
52 Vishakha v. State of Rajasthan, (1997) 6 SCC 241: AIR 1997 SC 3011.
53 Art. 51 (c), Constitution of India, 1950

Scanned with OKEN Scanner

enumerates the authority of Parliament to enact legislation by amending or implementing any treaty.54 These articles in our Constitution make it quite evident that the Indian legislature ought to enact legislation against rape under wedlock of marriage in accordance with these International Conventions.

A unique approach of Universal Periodic Review also exists whereby all of the United Nations' member states assess each other's human rights situation and offer suggestions to one another on how to enhance both their own and other member states' human rights.

To improve the condition of married women in our Country, suffering by limited access to justice, countries that includes Ireland, Honduras, Portugal, Australia, Belgium, Iceland, Namibia, Sweden, France, Lithuania, Canada, and Zambia, through the Indian UPR- 3rd cycle-27th Session, proposed our Country to implement existing laws on all forms of violence including sexual violence against women and minors and also to remove exception regarding rape under wedlock of marriage from the definition of rape and further to adopt other extensive laws to encounter all types of violence, including rape within marital union.55

8. Restrictions to Justice within Marriage

There are several restrictions in our Justice delivery system regarding marriage and allied matters. Offences like rape within marriage are very difficult to report and prove as committed in the private space of marital partners. Even, fear of society is another lacuna as people do not raise voice against the accused and bear everything year to year. That is the main reason why it is unreported and unattended till today and as it is an unreported crime, proper and accurate data is not available regarding the same in our Country till date.

---

54 Art. 253, Constitution of India, 1950

55 UPR27_India_ThematicListofRecommendations_E.pdf.

Scanned with OKEN Scanner

Moreover, fear of abusing the provisions of Law concerning marriage and allied matters is a most crucial issue now a days. Many fake cases are being registered with malafide intention to create pressure upon the opposite party or to demand money and fulfillment of other unjustifiable desires.

In a recent heart-rending case, A police head constable namely Thippanna Alugur, a native of the Handiganur village in Vijayapura and head constable at the Hulimavu police station in Bengaluru died by suicide on alleging harassment by his wife and father-in-law. The death of Alugur occurs days after another as in likewise case Atul Subhash, a 34-year-old engineer, died by suicide in Bengaluru, allegedly due to harassment by his estranged wife and her family members. According to police officials, Alugur had left a one-page death note on which he had mentioned alleged harassment by his wife and father-in-law. Additionally, according to the said police officer, Alugur and his wife got into an aggressive altercation at their rented residence in Electronics City and his father in law made a phone call to verbally abuse Alugur with foul language. The police said Alugur, in his death note, suggested that his father-in-law had asked him to die or else he would "finish him off".56

Chanakya also mentioned in Chanakya Niti that "Ati Sarvatra Varjyet"- "अति सर्वत्र वर्ज्येत"- which means that excess of anything is bad. This is a worrisome scenario that amply indicates that each and every Law should be balanced and in any case, be it husband or wife, person guilty should not be escaped and an innocent should not be victimized or punished.

9. Suggestions

As earlier discussed, justice should be accessible to all of the Indian citizen equally and a rapist should be presumed as a rapist regardless of his relationship with the victimized person and of course the gender itself.

56 https://indianexpress.com/article/cities/bangalore/bengaluru-cop-suicide-wife-harassment-9725662/

Scanned with OKEN Scanner

Moreover, it is much worse than rape as the rapist is someone who was supposed to take care of his/her marital partner. For attaining such rights for the married woman in India, these suggestions should be taken into thoughtful consideration with criminalization of rape within marriage given as under:

1) Exception 2 to section 63 of BNS (earlier Sec. 375 of IPC) may be removed with the inclusion of an explanation to the same section clarifying that marriage is not a defence for an offence of rape.

2) Separate sections may be introduced in BNS (earlier IPC) for definition and punishment of 'marital rape' after concerning its future misuse with gender-neutral approach.

3) Section 67 of BNS (earlier Sec. 376B of IPC) may be repealed in case if rape within marriage is wholly going to be criminalised by the legislature.

4) Only amendment in the substantive law alone is not adequate enough at all. Few amendments in the procedural law in tune with the substantive law are also necessary. For attaining such purpose, suitable amendment should be introduced for improving the investigation and trial procedures.

Scanned with OKEN Scanner

5) In Bhartiya Sakshya Adhiniyam, 202357 (earlier Indian Evidence Act, 1872)58provisions regarding bad character may be amended for removing complexities in prosecution and moreover, a new provision may also be inserted stated as under-

"No presumption of consent in prosecutions of rape cases: There shall be no presumption of consent in prosecutions of rape, even if the accused is the husband of the woman".

6) Only heavy fine or penalty should be imposed for the first-time offenders along with the compulsory counselling on the cost of the accused.

7) Other restorative practices should be introduced as supplemental tools in post sentencing stages of the judicial process to save holy institution of marriage from possibility of its destabilization through retributive punishment.

8) In case, if such an offence committed frequently, strong retributive punishment should be given to such repeat offenders to remove criminal phenomena from the mind frame of such 'domestic culprits'.

9) New parliamentary committees may be formed to analyse each nuance of the intended law to prevent it from misuse before its criminalization with a gender-neutral approach.

---

57 Act No. 47 of 2023.
58 Act No. 1 of 1872.

Scanned with OKEN Scanner

10) A new board namely 'Restorative Punishment Board (RPB)' may be constituted to explore, suggest, control and regulate the restorative practices in Indian legal system separately and in complement with other penal punishments.

10. Conclusion

"Marital rape is not about sex, but about violence; it is not about marriage, but about lack of consent. Rape is rape and it should be penalized whenever and wherever it occurs."59

We are the people of a land which recognises from the ages "Ahimsa Parmo Dharma"- "अहिंसा परमो धर्मः"- which means "there is nothing greater than non-violence." Therefore, the barbarian form of violence in society in this modern era must be contained.

Even, our criminal justice mechanism along with our recently enacted criminal laws is even not in consonance with constitutional provisions with regard to rape within marriage. We should remove this disharmony between existing criminal laws and provisions of Constitution and it can only primarily be removed by removing such marital rape exception from BNS (earlier IPC) which is root cause of whole of the discrimination with the married women in India which is also limiting their access to justice.

Moreover, it is in highly contravention with all international human rights conventions and recommendations discussed above.

As there no adequate existing remedy available there in current civil and criminal law, thus, to attain complete justice by such class of married women, rape under

---

59 Shashi Tharoor, The Citizen. about the private member's bill 'The Women's Sexual, Reproductive and Menstrual Rights Bill, 2018' introduced by him in the parliament.

https://www.thecitizen.in/index.php/en/NewsDetail/index/7/15986/Marital-Rape-Is-Not-About-Marriage-ButAbout-Lack-Of-Consent-Shashi-Tharoor.

Scanned with OKEN Scanner

marital union should be declared as a criminal offence on the lines of gender equality and restorative justice in India, but certainly with the precaution towards the misuse of the provisions.

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Language, Education, and Nationalism: The Arya Samaj's Role in Promoting Hindi as a Cultural and Linguistic Instrument for Social Reform

Richa Raj

Associate Professor Jesus and Merry College

University of Delhi

Abstract: The Arya Samaj, founded by Dayanand Saraswati in the late 19th century, was a reformist religious and social movement that had a significant impact on the cultural, linguistic, and educational landscape of colonial India. Central to its agenda was the promotion of Hindi as a unifying language of instruction and a symbol of national identity. This paper explores the role of the Arya Samaj in the development and popularization of Hindi, particularly in its Sanskritized form, through its educational institutions, journals, and literary endeavours. The Samaj's efforts to reform Hindu society and strengthen the nationalist movement were deeply intertwined with the linguistic revival of Hindi, which became a key instrument in the cultural and intellectual resistance against British colonialism. By examining the Arya Samaj's contributions to the education system and the intellectual discourse of the time, this study highlights the lasting impact of its linguistic and educational initiatives on the formation of modern Indian identity and the central role of Hindi in post-colonial India.

Keywords: Arya Samaj, Dayanand Saraswati, Hindi, Nationalism,Colonial India, Language Reform, Educational Reform, Sanskritization, Cultural Revival,

Scanned with OKEN Scanner

Indian Identity

Introduction:

The Arya Samaj, founded by Dayanand Saraswati in the late 19th century, emerged as a significant force in the social, religious, and cultural landscape of colonial India. A central tenet of the Arya Samaj was its emphasis on reforming Hindu society through education, religious awakening, and the promotion of Hindi as a medium of instruction and national unity. The Samaj's advocacy for Hindi, particularly in its Sanskritized form, played a pivotal role in shaping the intellectual and cultural milieu of the time. This effort was not merely linguistic but deeply tied to a broader nationalist movement that sought to redefine Indian identity in opposition to colonial rule. The Arya Samaj's contributions extended beyond education to the realms of journalism, literature, and socio-political activism, fostering a reformed and unified Hindu identity. Through its institutions, publications, and intellectual engagements, the Arya Samaj laid the foundation for the modern Hindi language and its role in India's national consciousness.

Even though Dayanand Saraswati, the founder of the Arya Samaj, was a native Gujarati speaker, he adopted Sanskrit—the sacred language of the Vedas—as the primary medium of his missionary work upon his arrival in the United Provinces. A distinguished Sanskrit scholar, Saraswati initially used this classical language for his discourses. However, a significant shift occurred during his 1872 visit to Calcutta, where he met Keshub Chandra Sen, the Brahmo Samaj leader. Sen influenced Saraswati to consider Hindi as a vehicle for propagating religious and social reforms. Saraswati's exposure to early nationalist thought in Bengal, particularly from intellectuals like Bhudev Mukhopadhyay and Rajendralal Mitra, further reinforced the importance of

Scanned with OKEN Scanner

Hindi for India's socio-cultural reconstruction. Two years later, in 1874, Saraswati delivered his first public lecture in Hindi in Benares and authored his seminal work, Satyarth Prakash, in the same language. Following criticisms of linguistic "impurity" in its initial edition, he revised and republished it to ensure greater clarity and reach.

Saraswati's advocacy of Hindi as the lingua franca for Hindus, particularly in Punjab—where Urdu and Persian dominated—marked a significant cultural intervention. His efforts were carried forward by prominent Arya Samaj leaders such as Lala Lajpat Rai, Bhai Parmanand, Mahatma Munshiram, Pandit Gurudatt, Lala Saindas, Mahatma Hansraj, and Lala Mulraj, who championed the use of Hindi in various spheres. Arya Samaj's educational institutions played a pivotal role in realizing Saraswati's vision of promoting Hindi as a medium of instruction. While institutions like Gurukul Kangri and its affiliates, such as Kanya Mahavidyalaya (KMV) in Jalandhar, taught a wide range of subjects, including science and mathematics, in Hindi, Dayanand Anglo-Vedic (DAV) colleges and schools used English as their primary medium but contributed significantly to disseminating Vedic ideals. These institutions were also instrumental in publishing scholarly works in Hindi across diverse disciplines. For instance, Professor Maheshcharan Singh of Gurukul Kangri authored textbooks on chemistry and botany as early as 1910–11, while others produced works on ancient Indian history, physics, and chemistry. In 1911, Balkrishna, a postgraduate and history teacher at Gurukul Kangri, authored a detailed history of England and a biography of Akbar, both of which were published by the Gurukul.

The Gurukul's emphasis on teaching higher education subjects in Hindi was widely regarded as a landmark achievement. It was noted that no other country at

Scanned with OKEN Scanner

the time relied on a foreign language as its primary medium of instruction in higher education. Advocates of this initiative argued that adopting a native language for instruction advanced the language's development while fostering progress among its speakers. Such an approach was particularly significant in disciplines like history, political science, and economics. The vision of the Arya Samaj institutions resonated with the idea that their efforts would contribute to the evolution of Hindi as a national language, making it fit to serve as the lingua franca of India. As one observer noted, "I have no doubt your colleges will be the means of furthering the progress of the Hindu language and making it fit to be the lingua franca of the whole of India."

The Arya Samaj's commitment to promoting Hindi is evident from the deliberations of the DAV College Managing Committee in the 1920s, particularly its consideration of establishing a school focused on Hindi instruction. On January 27, 1921, the Committee discussed a draft proposal for a "non-university" school, placing Hindi at the core of its curriculum. The primary objective was to ensure that students could read and write Hindi proficiently and develop an appreciation for Hindi literature by the time they completed their schooling.

Interestingly, the scheme also included provisions for teaching Urdu to students in the 6th and 7th classes who expressed interest, alongside additional Indian vernacular languages if financial resources permitted. English was to be introduced as a second language beginning in the 5th class, while Sanskrit was made a compulsory subject in the 8th and 9th classes. The curriculum included arithmetic as a foundational subject for the first seven years, while history (focused on India and England) and general geography were also integral components.

Scanned with OKEN Scanner

History instruction emphasized civic education, nation-building, and patriotism, especially in the early classes, through stories of national heroes.

The proposed curriculum reflected a holistic approach to education, emphasizing character building and religious instruction, which were allocated dedicated periods. Manual and vocational training were mandatory, with offerings in carpentry, sock-making, hand-loom weaving, bookbinding, painting, polishing, tailoring, shorthand, typewriting, bookkeeping, and simple chemical industries. Physical training was also prioritized, with regular tests ensuring that intellectual progress did not come at the expense of physical growth. Activities such as swimming, wrestling, tree climbing, and fencing, alongside traditional Indian games, were actively encouraged.

The academic progression was structured such that arithmetic would be completed by the 8th class and history and geography by the 9th class. Final examinations required proficiency in Hindi, English, Sanskrit, and one or more elective subjects. In appointing a headmaster, preference was given to candidates proficient in Sanskrit and Hindi, underscoring the school's cultural and linguistic priorities.

The school was scheduled to open on April 13, 1921 (Baisakhi day), with an allocation of 700 in the annual budget for its operation. This initiative was part of the DAV College Managing Committee's broader effort to address criticisms from the "Gurukul" faction, which alleged that the DAV institutions were not sufficiently promoting Hindi and Sanskrit. By incorporating both Hindi and Sanskrit into its educational framework, the Committee sought to reaffirm its dedication to the Arya Samaj's linguistic and cultural mission.

Scanned with OKEN Scanner

One of the Arya Samaj's most significant contributions to society, particularly to Hindu society, was the development and propagation of Hindi as a lingua franca. The Arya Samaj spearheaded the campaign to replace Urdu with Hindi, elevating Hindi to the status of Aryabhasha (the language of the Aryas). This movement was championed by Arya Samaj leaders who actively promoted the Devanagari script, advocating for its adoption in official domains. The institutional foundation for this campaign can be traced back to the establishment of the Nagari Pracharini Sabha in Benares in 1893, an initiative inspired by a speech delivered by Shankarlal, an Arya Samajist preacher.

The Sabha played a pivotal role in securing the recognition of Hindi as a court language in the United Provinces. Similarly, under the Arya Samajist leadership of Sir Pratap Singh, the Maharaja of Idar, numerous princely states in Rajputana adopted the Hindi script for their official correspondence. The Arya Samaj's organized efforts to propagate the teachings of Dayanand Saraswati also extended to formal education, significantly influencing linguistic preferences. For instance, the DAV College was instrumental in popularizing Hindi and Sanskrit in a region historically dominated by Persian and Urdu.

While DAV College aimed to fulfill the broader educational objectives of the Arya Samaj by integrating English and Western knowledge, one of its central missions remained the promotion of Hindi. Urdu was relegated to an optional subject. Reflecting this commitment, the DAV College Managing Committee resolved in 1907 to maintain bilingual records of its meetings in both English and Hindi. By 1914, Persian instruction was discontinued in the BA curriculum of DAV College, marking a decisive shift in language policy.

Scanned with OKEN Scanner

By the mid-1940s, the advocacy for Hindi extended beyond education into industrial practices. Students and teachers of the Dayanand Industrial School demanded the use of Hindi for official correspondence and the labelling of articles manufactured by the industrial branches of DAV College, emphasizing the symbolic connection between swadeshi goods and the swadeshi language. The petition argued:

> "The names and trademarks inscribed on articles manufactured by the industrial establishments of DAV College must be engraved in Hindi (our national language), along with other languages. This will uphold the honour of our swadeshi goods, swadeshi language, and national pride in every respect."

This demand was lauded in Dainik Milap, a prominent newspaper in Lahore, which praised the patriotic fervour of such initiatives:

> "The DAV College Lahore, SD College Lahore ... have submitted essential proposals...The emergence of such demands from students of these colleges is a matter of immense pride for India."

Thus, through its educational and institutional initiatives, the Arya Samaj not only advanced the cause of Hindi but also intertwined it with the broader ethos of nationalism and cultural revivalism.

Hindi Journalism

The Arya Samaj played a pivotal role in shaping the socio-cultural and intellectual milieu of northern India during the nineteenth and twentieth centuries. It served as a crucial agent in providing the upper-caste, literate urban society with symbols

Scanned with OKEN Scanner

and norms to construct a collective self-identity and articulate shared goals. Central to this transformation was the development of a lingua franca for reformed Hindus, or the Aryas, as conceptualized by the Arya Samaj. Hindi, referred to as Aryabhasha (language of the Aryas), emerged as a cornerstone of the movement's vision for a reformed society, particularly in its Sanskritized form. Arya Samaj leaders in the United Provinces were instrumental in championing the Devnagari script and advocating for its adoption in official use. The establishment of the Nagari Pracharini Sabha in Benares, a critical step toward the recognition of Hindi as a court language in the United Provinces, was inspired by a speech delivered by Shankarlal, an Arya Samajist preacher.

Beyond educational initiatives, Arya Samaj leaders utilized the power of print media to propagate their ideals and principles. During Dayanand Saraswati's lifetime, several newspapers and journals were already in circulation. Arya Samachar, published from Meerut, was the first, followed by Bharat Sudasha Pravartak, Arya Darpan (from Farrukhabad and Shahjahanpur), and numerous others, including Ved Prakash, Arya Vinay, Arya Siddhant, Aryavrat, Bharat Bhagini, Rajasthan Samachar, Paropkari, Timirnashak, Brahmavrat, Arya Mitra, Panchal Pandita, Saddharm Pracharak, and Bharatodaya. These publications not only disseminated the Arya Samaj's principles but also contributed significantly to the development of Hindi journalism.

Among these, Arya Mitra, initially published from Moradabad and later from Agra and Lucknow, served as the weekly mouthpiece of the Arya Pratinidhi Sabha. It became a prominent platform for promoting Hindi literature and journalism. Esteemed editors such as Rudradutt Sampadakacharya, who edited Arya Vinay and co-edited Arya Mitra, Padmasingh Sharma, and Mahatma Munshiram, elevated the quality of these publications. Luminaries like

Scanned with OKEN Scanner

Lakshmidhar Vajpeyi, under the pseudonym Sarvanand, Banarasidas Chaturvedi, Satyendra, Ramchandra Shrivastava, and Jaidev Vidyalankar also contributed their editorial expertise. Arya Mitra reached its zenith under Harishankar Sharma, earning praise from literary stalwart Munshi Premchand. Since its inception in 1897, Arya Mitra has played a transformative role in fostering Hindi literature, offering a platform for budding writers and creating awareness of Hindi literary traditions. Many prominent authors began their careers contributing to the publication. Similarly, Padmasingh Sharma, as editor of Paropkari (Ajmer) and Bharatodaya(Gurukul Mahavidyalaya, Jwalapur), emerged as a leading figure in Hindi journalism, encouraging writers and introducing literary luminaries like Nathuramshankar Sharma to the field. Thus, through its extensive engagement with print media, the Arya Samaj not only advanced its reformist agenda but also significantly influenced the development of Hindi language and literature, laying the groundwork for its wider cultural and intellectual acceptance.

Kanya Mahavidyalaya (KMV), Jalandhar, played a pivotal role in promoting Hindi through its publication Panchal Pandita. Initially featuring both Hindi and English sections, the magazine transitioned into a wholly Hindi publication over time. As early as 1901, Panchal Pandita actively advocated for the adoption of Hindi, emphasizing its significance as the mother tongue and as a vehicle for national progress:

> "Ai pathak gan ... yadi aap bharat ki unnati ke sache premi hai ... to devnagri aksharon dwara hindi bhasha ki varnan mein yatna karen."

KMV's publications fostered an intellectual culture among its female students, inspiring them to contribute to periodicals such as Panchal Pandita and Jal Vid

Scanned with OKEN Scanner

Sakha. These articles covered a wide array of topics, including nationalism and household management, thereby nurturing literary skills while promoting socio-political awareness. The Arya Samaj extended its educational reform efforts to the younger generation through initiatives such as the Arya Kumar Parishad, established by Keshavdev Shastri. The inaugural convention of the Parishad was held in Saharanpur, presided over by Lala Lajpat Rai. To further its objectives, the council launched a publication titled Arya Kumar, edited by Shastri. Additionally, in 1914, the Arya Pratinidhi Sabha of Punjab began publishing Arya, a monthly journal that later evolved into the weekly Aryodaya, co-edited by Pandit Chamupati, M.A.

Contributions of Gurukul Kangri to Hindi Journalism

Gurukul Kangri emerged as a prominent center for nurturing Hindi journalism, producing graduates who significantly contributed to the development of Hindi literature and the dissemination of Vedic principles. Among these luminaries were Satyadev Vidyalankar, Ramgopal Vidyalankar, Krishnachandra Vidyalankar, Satyakam Vidyalankar, Dinanath Siddhalankar, Shivkumar Vidyalankar, Kshitijkumar Vedalankar, and Indra Vidyavachaspati. Indra Vidyavachaspati, in particular, distinguished himself as a journalist, writer, orator, novelist, and historian. He served as editor of the weeklies Arjun and Satyavadi, with Arjun eventually becoming a daily publication. These journals not only propagated nationalist ideologies but also mentored a new generation of journalists, many of whom were trained under Vidyavachaspati's guidance.

Vidyavachaspati also played a pivotal role in the Hindi-Urdu debate during post-independence India, championing Hindi as a national language. As president

Scanned with OKEN Scanner

of the Sarvadeshik Arya Pratinidhi Sabha for several years, he contributed extensively to the historiography of the Arya Samaj, authoring a comprehensive multi-volume history of the movement. The Arya Samaj's emphasis on educational and journalistic endeavours not only advanced its reformist agenda but also significantly shaped the linguistic and cultural landscape of India.

Numerous journals and magazines were established by Arya Samaj leaders to promote Hindi language, literature, and reformist ideals. Among the notable publications was Arya Siddhant, a monthly edited by Bhimsen Sharma from Etawah, and Vedodaya, edited by Gangaprasad Upadhyaya from Allahabad (Prayag). The latter continued under the editorship of his son, Viswaprakash, until financial constraints forced its cessation in 1934. Delhi's Shraddhanand and Shuddhi Samachar, both edited by Chidanand Sanyasi, also garnered significant readership. Similarly, Arya from Saharanpur, edited by Kshemchandra 'Suman,' reflected the journalistic training imparted by Padmasingh Sharma and Nardev Shastri of Gurukul Mahavidyalaya, Jwalapur.

Other prominent journals of the period included Hindi Milap (Lahore), Shankar (Moradabad), Ajay and Vijay (Ajmer), Diwakar (Agra), Ved Vani (Varanasi), Vedpath (Jwalapur), Samrat (Delhi), and Nyaya (Ajmer). Punjab's celebrated social activist Shanno Devi published Shakti, edited by Mohansingh Senger, while Santram's Yugantar and Usha advocated for the Hindi language and the abolition of the caste system, respectively. Bhimsen Vidyalankar's Hindi Sandesh was another significant monthly, alongside Rajpal, later renamed Balidan, which commemorated Rajpal, regarded by Arya Samajis as a martyr.

Scanned with OKEN Scanner

The Sarvadeshik Arya Pratinidhi Sabha contributed to this literary tradition by publishing Sarvadeshik, a monthly edited by Sudhakar and Raghunathprasad Pathak, which achieved considerable popularity, including among international readers. Sudhakar was later honored with the prestigious Mangla Prasad Paritoshik award for his work Manovigyan(Psychology). Several Arya Samaj writers have been recognized for their contributions to Hindi literature. Padmasingh Sharma, Jaichandra Vidyalankar, Satyaketu Vidyalankar, Udaiveer Shastri, and Gangaprasad Upadhyaya received the Mangla Prasad Paritoshik for works such as Satsai Sanghar, Bhartiya Itihas ki Rooprekha, Maurya Samrajya ka Itihas, Sankhya Darshan ka Itihas, and Aastikvad, respectively. Chandravati Lakhanpal's Striyon ki Stithi (1934), advocating for women's social reform, earned her the Delhi Hindi Sahitya Sammelan award.

Similarly, Satyadev Vidyalankar received the Radha Mohan Gokulji award, and Haridutt Vedalankar and Vijayendra were honored with the Harjimal Dalmia award for their works Hindu Parivar Mimansa and Radhavallabh Sampradaya: Siddhant aur Sahitya. In more recent times, G.P. Chopra has continued this legacy of literary excellence. These publications and accolades reflect the Arya Samaj's enduring impact on the promotion of Hindi and the broader intellectual and social discourse in India.

Hindi Literature

The expansion of the Arya Samaj in the United Provinces played a pivotal role in fostering a tradition of didactic literature, particularly in the Hindi literary sphere. Krishan Kumar has demonstrated that Mahavir Prasad Dwivedi, a prominent Hindi writer, not only standardized norms for Hindi usage but also aligned these efforts

Scanned with OKEN Scanner

with an ethical framework heavily influenced by Arya Samaj ideals. This influence was evident in literary magazines such as the early editions of Saraswati.

This era marked a deliberate shift from the 'Riti' poetry of the post-Bhakti period, which often celebrated the female form for the pleasure of feudal patrons, to literature imbued with moral and social responsibility. Themes such as child marriage, widowhood, and dowry became central to the poetry of the Dwivedi era, shaped significantly by Arya Samaj's reformist agenda. Narayanprasad 'Betab,' a celebrated Hindi theatre figure and poet, contributed to this tradition through his compositions, like the following verse, which critiques idol worship:

Ajab hairaan hoon, tumhe kyunkar rijhaon mein
Koi vastu nahin aisi, jise seva mein laoon mein.

The Arya Samaj's impact on literary articulations is widely acknowledged in scholarly works. The organization's critique of idol worship and anthropomorphic representations of Hindu deities (avtarvad) inspired poets like Ayodhyasingh Upadhyaya and Ramcharit Upadhyaya, who humanized gods such as Krishna and Ram in their works. Ayodhyasingh Upadhyaya 'Hariaudh' (1865–1947), for instance, authored the mahakavya Priyapravas (1914), which portrayed Krishna as a great human being rather than a divine figure. His work embodied the Arya Samaj's ideals of social service and emancipation.

Similarly, Maithilisharan Gupta (1886–1964), renowned for his poetic contributions, exhibited Arya Samaj influences, particularly in the early phase of his career (1910–1937). Although a Vaishnav and devout worshipper of Ram, Gupta was deeply moved by the Arya Samaj's cultural renaissance. During the

Scanned with OKEN Scanner

centenary celebrations of Dayanand Saraswati in 1924–25, he wrote a poem lauding the Arya Samaj:

Arya Samaj, Arya bhumi par arunoday-sa
Utha ushna, tu saj kar saaj
Arya Samaj! Arya Samaj!

Gupta's works often reflected Arya Samajist ideology, including his critiques of Brahmanical orthodoxy and glorified pilgrimages, as expressed in Bharat Bharti. Similarly, his opposition to cow slaughter was evident in Gau Karuna Nidhi.Gupta's seminal work Saket (written between 1914 and 1931, published in 1932) showcases the Arya Samaj's pervasive influence in Hindi-speaking regions. Terms like aryaputra, devi, and arya illustrate the integration of Arya Samaj ideals into the socio-cultural fabric of North India. Notably, Saket is believed to allude to the Arya Samaj's shuddhi (reconversion) movement of the mid-1920s. Gupta portrays Ram's journey to the jungles of South India as an effort to grant aryatva (Aryan essence) to its inhabitants, symbolizing the Arya Samaj's goal of Hinduizing marginalized communities. Thus, despite being a Sanatanist, Gupta's early poetic oeuvre reveals a profound engagement with Arya Samajist reformist and ideological currents.

Conclusion: The Arya Samaj's impact on the development of Hindi as a national language and cultural instrument is profound and enduring. By promoting Hindi as the language of reform, the Samaj not only sought to enhance the intellectual capacities of its followers but also aimed to bridge the linguistic divide that existed in colonial India. The Samaj's educational institutions, journals, and literary contributions significantly advanced the cause of Hindi, elevating it to a position of national prominence. Furthermore, its alignment with the broader nationalist

Scanned with OKEN Scanner

movement ensured that Hindi was seen not just as a language of instruction, but as a symbol of resistance and cultural revival. Through its tireless efforts in the realms of education, journalism, and literature, the Arya Samaj provided a powerful framework for the articulation of a reformed, modern Hindu identity and contributed to the linguistic and intellectual foundation upon which India's post-independence cultural revival would be built.

References:

1. Krishna Kumar, 'Hindu Revivalism and Education in North-Central India', Social Scientist, vol. 18, no. 10 (October), 1990, p. 8.
2. Ibid., p. 3.
3. Ibid., p. 40.
4. Krishna Kumar, 'Hindu Revivalism and Education in North-Central India', Social Scientist, vol. 18, no. 10 (October), 1990, p. 8.
5. Kshemchandra 'Suman', Hindi Sahitya ko Arya Samaj ki Den, Madhur Prakashan, Delhi, 1970, p. 15.
6. Saddharm Pracharak, 16 August 1911, in Vishnudutt Rakesh (ed.), Swami Shraddhanand ki Sampadkiya Tippadiyan, Gurukul Kangri, 1999, p. 227.
7. Chintamani Vaidya, The Liberator, 8 April 1926, in Ved Prakash Shatri (ed.), Editorial Observations of Swami Shraddhanand, Gurukul Kangri, 2006, p. 70.
8. Proceedings of a meeting of the Local Members of the DAV College Managing Committee, 27 January 1921, File 18, p. 33, DAV College Managing Committee Papers, NMML.
9. Ibid., p. 34.
10. Ibid., p. 35.

Scanned with OKEN Scanner

11. Sudhakar Pande, Shyamsunderdas, Sahitya Academy, New Delhi, 1978.
12. Sri Ram Sharma, The Arya Samaj and its Impact on Contemporary India (In the Nineteenth Century), Institute of Public Administration, Una, n.d., p. 21.
13. Sri Ram Sharma (ed.), Our Education Mission: An Account of the Educational Work of the Arya Nidhi Sabha, Dayanand Anglo-Vedic College, Lahore, Arya Pradeshik Pratinidhi Sabha, Lahore, 1925, p. 22.
14. Proceedings of the DAV College Managing Committee, 17 March 1907, p. 97, Records of the Dayanand Anglo Vedic College Managing Committee, NMML.
15. Proceedings, 7 June 1914, pp. 183–84, Records of the Dayanand Anglo Vedic College Managing Committee, NMML.
16. 'Correspondence regarding the introduction of Hindi for the Office Work', 9 April 1945, File no. 53, Records of the Dayanand Anglo Vedic College Managing Committee, NMML.
17. Dainik Milap, 20 May 1945.
18. Krishan Kumar, 'Hindu Revivalism and Education in North-Central India', Social Scientist, vol. 18, no. 10 (October 1990), pp. 7–8.
19. Sudhakar Pandey, Shyamsunderdas, Sahitya Academy, New Delhi, 1978.
20. Kshemchandra 'Suman', Hindi Sahitya ko Arya Samaj ki Den, Madhur Prakashan, Delhi, 1970, p. 25.
21. Ibid., p. 26.
22. Ibid., p. 28.
23. 'Hamari Bhasha', Panchal Pandita, 15 May 1901.
24. Kshemchandra 'Suman', Hindi Sahitya ko Arya Samaj ki Den, Madhur Prakashan, Delhi, 1970, p. 36.

Scanned with OKEN Scanner

25. Kshemchandra 'Suman', Hindi Sahitya ko Arya Samaj ki Den, Madhur Prakashan, Delhi, 1970, p. 39.
26. See my MPhil dissertation, 'Aspects of Communal Ideology in Colonial India: A Study of Proscribed Communal Literature', Jawaharlal Nehru University, New Delhi, 2005.
27. Kshemchandra 'Suman', Hindi Sahitya ko Arya Samaj ki Den, Madhur Prakashan, Delhi, 1970, p. 48.
28. See Mrinalini Sinha, Specters of Mother India: The Global Restructuring of an Empire, Duke University Press, Durham and London, 2006, p. 119.
29. http://india.gov.in/myindia/padmabhushan_awards_list1.php?start=10 (l ast accessed 22 March 2010).
30. Literary magazine started by the Indian Press of Allahabad in 1900.
31. Krishan Kumar, 'Hindu Revivalism and Education in North-Central India', Social Scientist, vol. 18, no. 10 (October 1990), p. 13.
32. Kshemchandra 'Suman', Hindi Sahitya ko Arya Samaj ki Den, Madhur Prakashan, Delhi, 1970, p. 63.
33. For instance, Lakshminarayan Dubey, Hindi Sahitya mein Arya Samaj ki Abhivyakti, Satyendra Publications, Allahabad, 1986; Shrikrishna Lal, Adhunik Hindi Sahitya ka Vikas, Hindi Parishad, Allahabad, 1965.
34. See Shrikrishna Lal, Adhunik Hindi Sahitya ka Vikas, Hindi Parishad, Allahabad, 1965.
35. Ibid., p. 85.
36. Ibid.

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Patriotism in Verse: Allama Iqbal's Poetry and the Awakening of National Consciousness in Colonial India

Prof. (Dr.) Md. Yahya Saba
Department of Urdu Kirori Mal College,
University of Delhi, Delhi110007

Abstract: Urdu literature particularly poetry is very rich in traditions of patriotic and nationalistic sentiments, which took root and flourished along India's Struggle for freedom. The later half of the 19th century and early 20th century saw an impetus in nationalistic and patriotic activities in the movement for freedom drawing people from all walks of life into its fold including men of letters. The strands of progressive movements in Indian literature specially poetry provided fillip to many modern ideas of patriotism, freedom, equality, equity and justice that formed the core of this movement's edifice. Young and budding Indian poets enthusiastically took to expressing their nationalistic ideas in simple and lucid poems. Their writings clearly demonstrate how nationalist ideologies can instrumentalize literature towards its lofty ends, turning patriotic feelings and love for the motherland into a constructive force.

Even so many Indian writers such as Iqbal were swept away by the nationalist frenzy. Allama Iqbal was a pioneering poet of Urdu and a fiery poet of patriotism. Iqbal was the founder of a new school of Urdu poetry, which blossomed, in the first quarter of the 20th century. Iqbal's poetry evolved from nationalism, and he remained a poet of patriotism till the end, although, switching his loyalties to

Scanned with OKEN Scanner

different levels from being a zealous nationalist in early period of his career to pan-Islamism in later years.

This paper delves into these patriotic motifs within Urdu literature, with particular attention to Allama Iqbal's poetry. His verses, which played a pivotal role in inspiring the national awakening and anti-colonial struggle across the Indian subcontinent, are analyzed in detail. Selected thematic poems and couplets by Iqbal are provided in Roman transliteration, along with English translations to cater to non-Urdu-speaking readers. Through these examples, the paper explores how Iqbal's poetry resonated with and contributed to the subcontinent's movement for independence.

Key words: Patriotic traditions, Indian freedom struggle, Urdu poetry, Allama Iqbal, Poet of the East.

Introduction: Literature had been instrumental in all movements for political and social reforms since the 18th century and later in movements for unification of nations around the world, from the 19th century onwards. The idea of national unity and patriotism was closely linked with the ideals of political rights, economic development and the abolition of all repressive systems. And literature became a potent tool to propound these ideals across nations. The freedom struggle in the Indian sub-continent was also assisted immensely by mass media and literature particularly poetry that wielded greater emotional impact on the masses.

Among the great Urdu poets who sung patriotic compositions Allama Iqbal holds an eminent position. However, his contribution to the stirring of patriotic sentiments among participants in the Indian freedom struggle was watered down due to his support for the idea of Pakistan and pan-Islamism in later years. Few remember today the remarkable contribution of Iqbal to the development of Urdu

Scanned with OKEN Scanner

literature. The resounding strains of Iqbal's hymn to the nation are in abundance like the well-known Tarana-i-Hindi (Song of India):

Hubbe watan, samaaye, aankhon men noor hokar

Sar men khumaar hokar, dil men suroor hokar.

(May love for the nation pervade all, becoming light of the eyes,

Exhilarating the mind and intoxicating the heart.)

Iqbal devoted himself to write his classical poems on patriotism in light of Islamic traditions, reminding its followers of their past glory and virtues which enabled them to bring about in a short span of 30 years since Prophet's migration to Medina and his four immediate successors (Caliphs), an amazing political and social revolution in the history of mankind.

Iqbal's patriotic fervor found finest expression in his elegies on the deaths of national leaders. He wrote on the death of Mahatma Gandhi. It is hard to imagine an Urdu poet writing with such passion about a leader from different part of India today. But the liberation struggle had brought a burning sense of unity among Indians of those times. Nationalism was only one theme of Iqbal's poetry. It equally drew inspiration from human sensibilities, he worked for most of his life in India, and he recalled his ancestral land with passionate pride.

Early Urdu Poetry and glimpses of patriotic tendencies

The beautiful and delightful expression of human emotions and feelings particularly related to love and various other aesthetic inclinations was considered real poetry in the early period, which was presented with economy of words, felicity and subtlety of expression. Sentiments and feelings of attachments were then highly localized. This is the reason that the concepts of nation and nation-state were not developed during this period in the truest sense of the word remarkable during the 19^{th} and 20^{th} centuries. Regionalism and Tribal loyalties were considered patriotism and it also included racial and kinship allegiance. This

Scanned with OKEN Scanner

situation prevailed throughout the world more deeply in the Arab world. Thus we see deep patriotic or loyalist sentiments in the very early epic poems of the Arabic poetry, which were recited by warriors in the battlefield. The same trend is noticed in the Persian poetry also where Iran and its beautiful nature is presented and praised fabulously. Everything beautiful belonging to Iran including its weather is mentioned and praised minutely.

Similar sentiments were reverberated in Urdu poetry also since its very beginning because the early Urdu poets were masters of Persian language and literature as well. However, if we have to find and see the real and first signs of patriotism in somewhat modern sense, we have to look at the declining phases of the Mughal rule in India. The British had gradually started to open up their ulterior designs and Indian intellectuals had begun to realize that they would have to even sacrifice their lives in order to reclaim their territorial and political independence.

In the Indian sub-continent the tradition of patriotism, which is the subject of discussion in this paper originated when an aggressive nation began its occupation of India. A peace loving nation and its citizens were seen protesting this aggression and illegitimate occupation. But this hostile nation succeeded in their imperialistic designs all over India because of their modern techniques of warfare and tyrannical aggression. When they became successful in 1857 to bring Lucknow and Delhi under their control, the Indians slipped into shock for a period. But poetry took the lead to cure the Indian community of this shock and began the fight against the aggressors in an organized manner.

Shahar Ashoob'- a form of Urdu poetry to mourn the destruction of a city- was in the forefront to revive the patriotic emotion during this period and this kind of poetry penned by pioneering poets like Bahishti, Shakirnaji, Sauda, Mir and Nazir after the massacre and destruction in Delhi in 1857 could be placed in such category. Urdu poetry critics have defined 'Shahar Ashoob' and said that real 'sharAshub' is one,

Scanned with OKEN Scanner

which reflects conflicts driven by politics and its effects and results. (Siddiqui; 1987, Page no. 113)

The imprints of patriotism, which could be traced in 'Shaher Ashoobs', were of incipient nature and its more pronounced expression could be seen in later poetry. However, it should be conceded that Urdu poetry took a while to adopt patriotism in its pronounced and complete form till the poetry of Allama Iqbal. Patriotic sentiments first began to emerge in Urdu poetry and among Muslims because the Britishers snatched power form Muslims and also targeted them to ensconce their hold.

The Muslims took time to come out of their shock but when they emerged out from this lull, they had with themselves a clearly defined ideology of patriotism. They gathered strength form the Koran and Prophet's sayings to fight the occupation and suppression of the Englishmen. Iqbal is a shinning example of this awakening.

Generally people consider Iqbal pitted against the notion of nationalism and they are right to this extent. Iqbal considered national, communal and racial chauvinism as dangerous and believed that if these biases acquire the intensity of patriotism they become highly destructive. The prejudice of considering oneself higher than the entire world and treat others with contempt are one such example. Iqbal developed his version of patriotism after hard research and advanced his thought in the light of teaching of Koran and Hadith.

In order to understand the concept of patriotism in Urdu poetry we should refer here to the views of Abul Kalam Azad, he says:

> "I am a Muslim and I do for believe what my Sharia says. Koran says that as selection between matter and forms is natural and the law preserves the real and actual matter, likewise this law also works with regard to beliefs and actions. The ultimate victory is of the action, which is based on truth and reality, and it deserves to be preserved.

Scanned with OKEN Scanner

> Therefore, whenever there is fight between Justice and Injustice, it is ultimately justice, which emerges victorious. Only beneficial things will be preserved on earth and the harmful will be eliminated. For this reason the Koran names the right as truth which is eternal and the evil and false are temporary which are bound to be eliminated." (Azad, 1968 page no. 144, 145,)

In this regard only Maulana talks about rebellion and patriotism and says that:

> 'I have been charged with sedition. But let me understand the meaning of rebellion. Is rebellion the name of freedom, which has not been achieved yet? If it is so then I plead guilty but let me remind that it is also called patriotism when it becomes victorious. Till yesterday the armed leaders of Ireland were rebels but today what titles will the Great Britain bestow on leaders like Devilliers and Graefth. Parnell of this Ireland had once said, "Our work is always first rebellion and then the holy war of patriotism.' (Azad, 1968, page no. 144, 145,)

This is the view of patriotism, which ran in the veins of Urdu poetry, and Iqbal developed his patriotic and nationalistic poetry around this concept. The Urdu poetry has been taken granted to be exponent of love themes. This is true to some extent but it is not entirely true. Urdu poetry has been sensitive to prevailing conditions in every period. The realities of life and views related to it has always been dealt with in Urdu poetry. Outwardly Urdu poetry does not seem to deal much about socio-political issues but t is not true. Urdu poetry has not only taken up these issues and espoused them. But these issues have not been presented distinctly. They have been treated in similes and symbols in every period, and those who appreciate Urdu poetry well, have no problem in identifying those issues covered in allusions.

Let me quote some of these examples here:

Scanned with OKEN Scanner

Nazim-e-mulk so rahe hain haey

(Oh! the rulers of nation have gone to sleep)

Duniya ka nezam ho chukka ab (Mushafi)

(Who will now govern the world?)

Dar se hun sayyad ke khamosh mein rahen hamsafir

(I have been silent fearing the hunter in company)

Kya qafas mein yaad ham ko ab chaman aata nahin

(I no longer remember the garden in the cage) (Jur'rat)

Tabl-e-I'lm bhi paas hai apne na mulk-o-maal

(Neither the drum of knowledge nor wealth and property is with me anymore)

Ham se khelaf ho ke karega zamana kya

(What harm can world inflict on me) (Aatish)

Dil mulk-e-Angrez mein jeene se tang hai

(I am weary of living under English rule)

Rahna badan mein rooh ka qaid-e-firang hai (Nasikh)

(Living under The English domination is like forceful imprisonment)

Bal-o-par bhi gaey bahar ke saath

(The wings were also blown away with spring)

Ab tawaq'o nahi rehaee ki (Wazir)

(Now there is no hope of freedom- (flying)

Bik gaey hain Aah to ghairon ke hath

(Even Grieving has been bought by strangers)

Scanned with OKEN Scanner

Bandah parwar ab ghulam azad ho (Saba)

(O my lord! now this slave is worthy of liberty)

Mar ke chuntegen qafas se ud ke jaengen kahan

(Where will we fly to being free after death?)

Qabil-e-parwaz ab apne nahin sayyad par (Rind)

(Now our ability (freedom) of flight will not be dependent on the hunter's will)

And this feeling of helplessness was so stifling and people thought that there was no hope of this darkness getting over. This feeling of resistance naturally led to the emergence of patriotic feelings. Urdu poetry became the medium to vent this feeling:

Hawa-e-dahr gar insaaf par aee to sun lena

(Take note, if the wind of time is conducive to justice)

Gul-o-bulbul chaman mein hongen bahar baghban hoga (Aatish)

(The flower and nightingale will be in garden, guarded by the watchman outside)

Gar jang se gurez kare koi badshah

(If a king avoids war)

Taj-e-kharoos khub hai uski kulah (Nasekh)

(Then a Cock's crown will suit as his cap)

Jo a'du-e-bagh ho barbad ho

(Whosoever is enemy of garden should be destroyed)

Koi ho gulchin ho ya sayyad ho (Saba)

(Be in favour of garden whether as flower-pluckier or hunter or whatever)

Hasool kuch nahi bulbul dehai dene se

(There is no use sympathizing with the Nightingale)

Sunega baghlon ko gul chin na baghban faryad (Rind)

Scanned with OKEN Scanner

(Neither the flower-pluckier nor the gardeners lend ear to the grief of bystanders)

This is the period when Urdu speakers had felt the need to promote patriotism in order to get rid of English dominance. As the English increased their hostility the general masses turned against them, which led to promotion of patriotism among them. A need for unity was felt among people because they realized that the English were succeeding in their designs by sowing division among Indians and destroying the amity and brotherhood between communities. The emotion of patriotism, which was being promoted, needed the unity among Hindus and Muslims desperately and none other than the first great Urdu poet Mir emphasized this point. He says:

Wajh-e-begangi nahi ma'loom

(I fail to comprehend the reason for this unfamiliarity)

Tum jahan ke ho wahan ke ham bhi hain (Mir Taqi Mir)

(I too hail from the same place as you do)

And later on when Urdu poetry attempted to turn this unfamiliarity into harmonization then Saba Akbarabadi says:

Kufr-o-Islam ke jhagre ko chuka do sahib

(Your sir, let us bury this quarrels of Islam and kufr)

Jang aapas mein Karen sheikh-o-brahman kab tak

(How long will the Sheikh and Brahman fight)

The tradition of this patriotism in Urdu poetry is quite long. I have just indicated only few examples of this in the above lines.

Traditions of Patriotism in Allama Iqbal's Poetry

As far as Iqbal is concerned, his poetry itself began with the emotional theme of patriotism and the environment, which Iqbal lived in, was immersed in a specific form of patriotism. The Urdu poetry was warming up to discard its desolate themes.

Scanned with OKEN Scanner

The Ghazal was being disapproved of because of narrowed space. Above all, a poet like Ghalib had taken the ghazal to such a zenith that no aspect of ghazal was hardly left to be improved upon. In this situation Maulan Muhammad Husain Azad and Altaf Husain Hali, under the influence of Sir Syed Ahmad's prose movement, set out to free the Urdu poetry from the clutches of ghazal and dedicated themselves to popularize poems in Urdu poetry again. Hali rendered distinguished service in this regard, which was vehemently carried forward by Allama Iqbal and people were taken by surprise. Iqbal was writing poetry with a high ideal. He had a deep understanding of world politics and was well acquainted with the philosophies of all religions. He had penetrative knowledge of the English imperialism as well. He had good appreciation of the past, was striving to make the present action-oriented and was laying down grounds for a bright future.

Iqbal wrote poems like 'Himalaya' to awaken his countrymen to the fact that their past was so bright and tried to instigate their patriotic tendencies. He always tried to free the Indian masses form their sense of inferiority. The kind of patriotism Iqbal tried to awaken was so successful that it turned the Independence movement into Jehad for Indian Muslims and they joined the freedom struggle in hoards. Iqbal's poetry proved very crucial for the international integration of Muslims and Hindu-Muslim unity in India. When Iqbal emerged on the horizon of Urdu poetry, the literary atmosphere was quite bright. Literary luminaries like Hali, Shibli and Nazir Ahmad were alive but Iqbal fascinated people with his individualistic style. Iqbal was an epoch in himself and to evaluate his views and beliefs cursorily would be an injustice to him and his period. Prof. Jamil Ahmad Anjum says about Iqbal:

> 'Nobody can deny that Iqbal brought revolution in Urdu poetry by his modern thought and style of expression. Since very beginning his style of poetry became so popular that his contemporaries penned

Scanned with OKEN Scanner

poems in imitation of his style. He is the founder of a new era. The aspect of Iqbal's poetry, which impacted the Urdu poetry most, was his revolutionary poetry. The revolutionary thought of Iqbal was a natural outcome of the social upheavals and the humanity caught in the tentacles of capitalism. The efforts of Iqbal led to emergence of new trend in modern Urdu poetry. The theme of Iqbal like 'Fazilat-e-Adam' (The superiority of human beings) is also found distinctively in the great poet of this period Josh and later on in the poetry of Ahmad Nadim Qasemi. Iqbal did not only influence his contemporary poets but his later generations were also compelled to adopt his thought and style.' (Prof. Anjum, 2007, P. 18).

The revolutionary instinct found in the Iqbal's poetry was really a great change in the Urdu poetry. It strengthened the revolutionary struggles in the country. Iqbal did not use the language of philosophy in his poetry but, even today, his verses solve problems of philosophy, which are considered insurmountable. And this is because of Iqbal's vast studies:

'The intellectual and philosophical sources of Iqbal ranged from Koran to a lot of eastern and western philosophers. One of the spiritual guides of Iqbal was Maulana Rum whose poetic secrets are well known to the world. His Mathnavi, apart from being a collection of poetry and wisdom, is also a source of religious secrets and knowledge of Koran. Iqbal got acquaintance with Turks and Turkish civilization and character in the very beginning. This fact cannot be refuted that Kamal Ataturk played key role in the political success of the Turks. By writing the poem 'An Address to Mustafa Kamal Pasha' Iqbal expressed his emotional solidarity to the Turks. This emotional

Scanned with OKEN Scanner

and sentimental solidarity of Iqbal towards Ataturk and the Turks reflects fully his Islamic camaraderie.' (Ahsan, April 2007, P. 30-33).

The type of patriotism, which Iqbal promoted in light of the teachings of Koran led to confidence building among Muslims and this notion was strengthened that Islam does not create any hindrance in the way of unity among different communities. In fact, the knowledge of Koran provides strength to humanism and faith. It was Iqbal who called the English and their imperialism a deadly poison and said:

Na samjho ge to mit jaoge aey Hindustan walo

(O! Indians awaken! Or you will perish)

Tumahri dastan tak bhi na hogi dastano mein

(And there will no account of yours left in history)

Dr. Muhammad Iqbal (1876-1938) was one of the greatest poets of modern India. He deeply influenced the philosophical and religious thoughts of new-generation Indians. Like Swami Vivekananda, Iqbal also emphasized the need for continuous change and constant action. He condemned being in silent inertia and recommended a vibrant and active worldview, which could change the world. He was basically a humanist. He declared human action as a good and positive quality. He was of the opinion that man should neither surrender to the nature nor to any powerful authority on earth. He should try to conquer these forces constantly. He considered any kind of compromise the biggest sin. He always condemned sticking to traditions and customs. Perhaps because he was a votary of constant action and change, he later supported the partition movement of Muslims despite his initial patriotism towards India.

In the beginning of his poetic career Iqbal wrote poems like 'Himalaya', 'Bacche ki dua'(the prayer of a Child), 'Sada-e-Dard'(The echo of Pain), 'Tasvir-e-Dard' (The Imagery of Pain), 'Tarana-e-Hindi' (The Indian Song), 'Hindustani Bachon ka qaumi geet' (The national song of Indian children), and 'Naya Shewala' (The New

Scanned with OKEN Scanner

Temple) etc. in which he taught patriotism in very effective and affable way. Prior to Iqbal Poets like Hali and Azad wrote poems on patriotism but their concept of patriotism was not as reinforced as in Iqbal's poems. Iqbal was the first Urdu poet to present the concept of patriotism in Urdu poetry in its pure social context. The first poem of his first collection of poetry was 'Himalalya' in which he has put Himalaya on a higher pedestal than the mountain of 'Sina' (where the Moses was granted just a glimpse of God and fainted) because of patriotism. He says:

Aey Himalaya aey fasil kishwar-e-hindustan

Chumta hai teri peshani ko jhuk kar aasman

(O! Himalaya O! The wall of India, The sky pays tribute (kissing you forehead) bending towards your end)

Tujh mein kuch paida nahi derina rozi ke nishan

Tu jawan hai gardish sham-o-sahr ke darmeyan

(There is no sign of antiquity visible in you; you are still young despite the passage of time)

Ek jalwah tha kalim-e-tur-e-sina ke liye

Tu tajalli hai sarapa chashm-e-bina ke liye

(The mountain of Tur-e-Sina was just a reflection for Moses; but you the Himalaya are a manifestation for every healthy eye)

Imtehan didah-e-zahir mein kohistan hai tu

Pasban apna hai tu diwar-e-hindustan hai tu

(Looking simply at you, you appear just a mountain; but in reality you are a protector, the wall of India)

Matla'-e-awwal falak jiska ho who diwan hai tu

Su-e-khalwatgah-e-dil damankash-e-insan hai tu

Scanned with OKEN Scanner

(You are the first structure under the sky to receive the sun rays; you are shelter of heart and refuge of man)

Barf ne bandhi hai dastar-e-fazilat tere sar

Khandahzan hai jo kulah-e-mehr-e-a'lam tab par

(Snow has tied the turban of honour on your head; you are the shining cap of the world-illuminating sun)

Teri umr rafta ki ek aan hai a'hd-e-kuhan

Wadion mein hai teri kali ghatain khemazan

(The old age is glory of you past life; your black clouds are roaming in the valleys)

Chotiyan teri suraiya se hain sargarm-e-sukhn

Tu zameen par aur pahnaey falak tera watan

(Your peaks are in conversation with the stars; you are on earth but the skies are your home)

Chashma-e-daman tera aina-e-sayal hai

Daman-e-mauj-e-hawa jiske liye rumal hai

(The springs of your foothills are the flowing mirrors; the waves of winds seek refuge in your valleys)

Abr ke hathon mein rahwar-e-hawa ke wastey

Tazyana de diya barq-e-sar-e-kohisar ne

(Your peaks have given the clouds fierce lightening to pave the way for winds)

Aey himala koi bazigah hai tu bhi jise

Dast-e-qudrat ne banaya hai a'nasir ke liye

(O! Himalaya you are also a playground; which has been created by nature for elements)

.....

Scanned with OKEN Scanner

Aati hai nadi faraz-e-kuh se gati hui

Kausar-o-tasnim ki maujon ko sharmati hui

(The river flows down singing from atop the mountain; putting the waves of breezes to shame)

Lail-e-shab kholti hai aa ke jab zulf-e-rasa

Daman-e-dil khichtihai aabsharon ki sada

(When the night unfolds its grown-up locks of hair; the heart pulls the sounds of the waterfalls)

Woh khamoshi sham ki jis par takallum ho feda

Woh darakhton par tafakkur ka saman chhaya hua

(The chants sacrifice themselves for the silence of the evening; and all trees get immersed in thoughts)

.....

Aey himala! Dastan us waqt ki koi suna

Maskan-e-aabay-e-insan jab bana daman tera

(O! Himalaya tell me a story of the time; when your valleys were inhabited by humans)

Kuchh bata us sidhi sadi zindagi ka majra

Dagh jis par ghaza-e-rang-e-takalluf

(Tell something about that simple and straight life; on which there was no blot of artificiality and roughness)

Ha dekha de aey tasawwur! Phir who subh-o-sham tu

Daur phichhe ki taraf aey gardish-e-ayyam tu

(O imagination! show us that morning and evening; run backwards in the past O time!)

This is accepted by all that Iqbal commenced a new era in Urdu poetry and there is no poet today who is left untouched by his influence with regards to his style of

Scanned with OKEN Scanner

expression. This is another matter that as very few could achieve the style of Mir; only a handful of poets could also imitate the style of Iqbal successfully. The poet addresses the Himalaya and says that the mountain is like citadel and city fortress for India and it is so high that even the sky bends down to pay its tribute to it. The mountain exists from the creation of this world but it is still young. There is no sign of weakness in it. Only Moses could see manifestation of God on the mountain of 'Tur' but the Himalaya is a complete reflection of God for eyes of the wise. In other words the Himalaya is witness to the absolute power of God. You are just a mountain to the naked eye but in reality you (the Himalaya), have been appointed the guard of India by God. The peaks of Himalaya are always covered with snows, which are in fact the turban of hounour.

Iqbal's poem 'The prayer of a child' which is still sung by kids in primary schools is a patriotic poem. In this poem Iqbal has attempted to mould children's thinking towards nation building:

Lab pe aati hai dua ban ke tamanna meri

Zindagi shama' ki surat ho khudaya meri

(My wish comes to my lips in the prayer; that O God! my life should be like a candle)

Dur duniya ka mere dam se andhera ho jaey

Har jagah mere chamakne se ujala ho jaey

(The darkness of this world be undone by me; every place is illuminated by my sparkle)

Ho mere dam se yunhi mere watan ki zinat

Jis tarah phul se hoti hai chaman ki zinat

(May I be the reason for the shining of my nation; like the flower makes the garden beautiful)

Zindagi ho meri parvane ki surat ya rab

Scanned with OKEN Scanner

I'lm ki shama' se ho mujh ko muhabbat ya rab

(May my life be like a moth O God! May I be in love with the candle of knowledge!)

Ho mera kam ghribon ki hemayat karna

Dardmandon se zaeefonse muhabbat karna

(My aim should be to support the downtrodden; and to be compassionate towards the weak and the oppressed)

Mere Allah burai se bachana mujh ko

Nek jo rah ho us rah pe chalana mujh ko

(O my God! Save me from wrong-doing; show me the right path)

The biggest pain which troubled Iqbal was that the atmosphere of unity and harmony had vitiated in India and its citizens were becoming strangers to each other. Iqbal says in his poem "The Voice of Pain":

Jal raha hun kal nahin padti kisi pahlu mujhe

Han dubo de aey muhit aab-e-ganga mein mujhe

(I am burning and do not find respite anyhow; yes! O fellows! Immerse me in the water of the Ganga)

Sarzameen apni qayamat ki nafaq angez hai

Wasl kaisa yan to ek qaribferaq amez hai

(Our land is filled with disaffection like it will happen on the Judgment's Day; how can people get together when there is discord among the acquaintances)

Badle yakrangi ke ye na aashnaee hai ghazab

Ek hi khirman ke danon mein judaee ghazab

(How strange is the changed colour of this unity into otherness; the separation in the seeds of the same field is very strange)

Jis ke phulon mein ukhwat ki hawa aaee nahi

Us chaman mein koi lutf-e-naghma pairaee nahi

Scanned with OKEN Scanner

(The flower which is not touched by the air of fraternity; that garden is devoid of any melodious elegance)

…..

Kab zaban kholi hamari lazzat-e-guftar ne

Phuk dala jab chaman ko aatish paikar ne

(When did my pleasing speech open it tongue; when the fire of battle destroyed the garden)

This poem of Iqbal vividly portrays the events of Indian history between 1905 and 1945. Iqbal considered Hindu and Muslims the seeds of the same harvest. He borrowed this concept from Sir Syed Ahmad Khan who had said in a speech that India is like a bride and Hindu-Muslims are its two eyes and the beauty of the bride depends on the safety of its both eyes and if it loses its one eye it will look ugly.

Iqbal severely felt the pain of India's enslavement and this feeling is amply depicted in his poem ' the Imagery of Pain' in which he has expressed his sentiments vehemently and effectively. In this poem he has expressed the weaknesses of his countrymen, which are an impediment in the national integration of India and its freedom and progress. Iqbal understood well that communalism and disunity among Hindus and Muslims is on the rise, which will one day destroy the concept of nationalism and Indian national integration. He says:

Nahi minat kash tab-e-shanidan dastan meri

Khamoshi guftagu hai bezabani hai zaban meri

(My story is not worth listening; silence is my talking and my language)

Ye dastur-e-zaban bandi hai kaisa teri mahfil mein

Yahan toa baat karne ki tarasti hai zaban meri

(How is this prohibitions on talking in your party; my tongue is dying to speak out here)

…….

Scanned with OKEN Scanner

Ujada hai tamiz-e-millat-o-aaeen ne qaumon ko

Mere ahle watan ke dil mein kuch fikr-e-watan bhi hai

(The consideration of the nation and laws has destroyed communities; have my countrymen some consideration for their nation in their heart)

Sakoot amooz tul-e-dastan-e-dard hai warna

Zaban bhi hai hamare munh mein aur tab-e-sukhan bhi hai

(The narration of the story of pain counsels silence; otherwise we have tongue in our mouth and urge to speak out too)

This is the time when Iqbal was under the influence of nationalism and patriotism. In this poem Iqbal emerges as a nationalist and exhibits the same patriotic fervor of his poems like Naya Shewala, Tarana-e-Hind and Himalaya. He has openly lamented the divisive tendencies and behavior of his countrymen and warned them that if they do not mend their ways and get united they will be lost in history. He laments the dark future of his country and this poem reflects the wounded soul of a true patriotic citizen. He laments the deteriorating condition of his country in these words:

Rulata hai tera nazarah aey Hindustan mujh ko

Ke I'brat khez hai tera afsana sab fasano me

(Your condition makes me despondent O Hindustan! That your story is the most didactic of all stories)

This stanza is the best specimen of Iqbal's patriotic sentiments. Another famous poem of Iqbal is "Tarana-e-Hind" which presents his patriotic sentiments more emphatically:

Sare Jahan se achcha Hindustan hamara

Ham bulbulen hai is ki ye gulsitan hamara

(Our Hindustan is the best in this world; we are the nightingales of our garden-India)

Scanned with OKEN Scanner

Ghurbat mein hon agar ham rahta hai dil watan mein

Samjho wahin hame bhi dil ho jahan hamara

(Even if we are abroad our heart lies in our nation; consider us being there where our heart resides)

Parbat woh sab se uncha hamsaya aasman ka

Woh santari hamara woh pasban hamara

(Here is the highest mountain, the companion of the sky; it is our guard, it is our watchman)

Godi mein khelti hai e ski hazar nadiya

Gulshan hai jin ke dam se rashk-e-jina hamara

(Thousands of rivers play in its lap; our garden is blooming because of it, the envy of Jennies')

Aey aab-erood-Ganga! Who din hain yaad tujhko

Utra tere kinare jab karwan hamara

(O! the water of Ganges! Do you remember that day; when our caravan descended on your banks)

Mazhab nahi sikhata aapas mein bair rakhna

Hindi hain ham, watan hai Hindustan hamara

(Religion does not teach discord among own fellows; we are Indians and Hindustan is our homeland)

Yunnan-o-Misr-o-Ruma sab mit gaye jahan se

Ab tak magar hai baqi nam-o-nishan hamara

(The Greeks, Egyptians and Romans all vanished from this world; but our footprint and name is still there)

Kuch baat hai ke hasti mit-ti nahi hamari

Sadion raha hai dushman daur-e-zaman hamara

Scanned with OKEN Scanner

(There is something, which does not destroy our existence; or the time has been our enemy for centuries)

Iqbal! Koi mahram apna nahi jahan mein

Ma'loom kya kisi ko dard-e-nehan hamara

(O Iqbal! There is no confidant of our own in this world; does any one know our hidden pain)

India is a country of many religions & cultures and Iqbal believed that this religious diversity gives colorfulness to Indian civilization rather than disturbing its unity. He has expressed this view in his poem 'the national song of children':

Chishti ne jis zameen par paigham-e- haq sunaya

Nanak ne jis chaman mein wahdat ka geet gaya

(The Chishti (Moinuddin Ajmeri) who gave the message of truth on this land; The Nanak who sang the song of unity in this garden)

Tatarion ne jis ko apna watan banaya

Jis ne Hajazion se dasht-e-Arab charaya

(The Tatars who made this land their home; the Hajazis who left Arab for this land)

Mera watan wahi hai mera watan wahi hai

Yunanion ko jis ne hairan kar diya tha

(This is my country, this is my country; the country which had bewildered the Greeks)

Sara jahan ko jis ne I'lm-o-hunar diya tha

Mitti ko jis ki haq ne zar ka asar diya tha

(The country, which gave science and art to the entire world; the earth, which was given the effect of gold by God)

Turkon ka jis ne daman hiron se bhar diya tha

Mera watan wahi hai mera watan wahi hai

Scanned with OKEN Scanner

(The country, which had filled the Turks with, diamonds; this is my country, this is my country)

Tute the jo sitare Faras ki aasman se

Phir tab de ke jis ne chamkaye kahkashan se

(The stars which had broken away from the sky of Persia; this land again gave them light to shine in the galaxies)

Wahadat ki laey suni thi duniya ne jis makan se

Mir-e-Arab ko aaee thandi hawa jahan se

(The place from where the world had heard the rhyme of unity; the place from where the Amir of Arab had received the cool breeze)

Mera watan wahi hai, mera watan wahi hai

Bande kalim jis ke parbat jahan ke sina

(That is my country that is my country; the country whose mountains are like Sina)

....

Janat ki zindagi hai jis ke feza mein jina

Mera watan wahi hai mera watan wahi hai

(Living life in the environment of this land is like living life in the heaven; that is my country that is my country)

The most zealous and powerful sentiment of Iqbal's patriotic poetry is unity and harmony. He firmly believed that without harmony and unity our country couldn't be freed from the chains of enslavement. His best and beautiful poem on this subject is 'Naya Shewala'. Iqbal has employed a very enthusiastic, sincere and unique mode of expression in this poem. In view of the Hindu-Muslim unity Iqbal has used Hindi words beautifully in this poem. He says:

Sach kah dun aye Brahman gar tu bura na mane

Scanned with OKEN Scanner

(I will tell you the truth O! Brahman if you do not mind)

Tere sanamkadon ke but ho gaye purane

(The idols of your temple have turned old)

Apnon se bair rakhna tu ne buton se sikha

(The idols have thought you nursing enmity towards own people)

Jang-o-jadal sikhaye waiz ko bhi khuda ne

(The gods have even thought the preacher fighting)

Pathron ki muraton mein samjha hai tu khuda hai

(You have seen God in the idols of stones)

Khak-e-watan ka mujh ko har zarah devta hai

(But every particle of our nation's land is a God for me)

Aa ghairaton ke parde ek bar phir mita dein

(Come on! Let us once again lift the veil of unfamiliarity)

Bichhron ko phir mila dein naksh-e-doee mita dein

(Let us bring the separated together and discard the notion of otherness)

Duniya ke tirathon mein uncha ho apna tirath

(May our temple be the tallest of all holy shrines of the world?)

Daman-e-Aasman se uska kalas mila dein

(Let us take its pinnacle up to the skies)

Har subh uth ke gain mantar woh mithe mithe

(Let us wake up and sing those sweet chants (mantras) every morning)

Sare pujarion ko mai meit ki pela dein

(Let us make all priests drink the wine of love and friendship)

Shakti bhi shanti bhi bhakton ke geet mein hai

(There is peace as well as power in the songs of the devotees)

Dharti ke basiyon ki mukti preet mein hai

(The salvation of the humans lies in love)

Scanned with OKEN Scanner

Though the relevance of certain poems may have faded over time, Allama Iqbal's poetry remains a quintessential example of patriotic verse in Urdu literature, celebrated for its powerful and evocative expression. His poetic genius effectively conveyed the greatness of the nation, using patriotism as a core theme, while simultaneously addressing the deeper philosophical and existential issues facing society. While contemporaries like Chakbast confined their nationalist vision to a political scope, Iqbal transcended such boundaries, making nationalism and patriotism a gateway to larger discussions about life's fundamental challenges.

Both Iqbal and Chakbast integrated nationalistic and patriotic themes into Urdu poetry, creating an environment that facilitated discourse on the political, social, economic, and cultural challenges of their time. This shift, particularly evident around the First World War, reflected the growing importance of independence and resistance to colonial rule in the national consciousness. Political and social issues began to take precedence over the purely emotional expressions of patriotism, as poets began to address broader societal concerns.

In this context of political upheaval, Iqbal's poetry stood out as a transformative force. According to Urdu critic Dr. Khushhal Zaidi, Iqbal's work was a "painful chapter" in the nation's literary and political history, driven by his deep respect for the nation's greatness and his desire for its rejuvenation. Iqbal's poetic vision merged patriotism, humanism, and national pride, which he viewed as central to the country's rebirth. However, his commitment to nationalism was always tempered by a higher regard for religion, culture, and tradition, which he saw as the ultimate values worth living and dying for.

Unlike many of his contemporaries, Iqbal did not limit his poetic concerns to India alone, addressing global issues without religious prejudice. His nationalistic and patriotic poetry gained international recognition, broadening the scope of Urdu literature. While he began his career writing traditional ghazals, the political and

Scanned with OKEN Scanner

social challenges facing India compelled him to shift toward poetry that addressed the plight of his community and country, filled with calls for national awakening.

In an era marked by fear and defeatism, Iqbal, alongside other poets like Azad, Hali, Saroor, and Chakbast, played a pivotal role in awakening the masses. Iqbal's innovative approach broke with traditional literary conventions, making patriotism and national solidarity the central focus of his work. At a time when Indians had long forgotten the meaning of freedom and patriotism, Iqbal's poetry served not just a literary purpose, but a prophetic one—reviving a sense of national pride and encouraging unity.

Through his verses, Iqbal reminded his countrymen of their glorious past, invoking the memory of great warriors, Sufis, and emperors who exemplified courage, humanity, and brotherhood. His body of work is rich with nationalistic sentiments, often highlighting Hindu-Muslim unity and the shared history of the nation. He also wrote patriotic poems for children, awakening their love for the homeland through vivid imagery of India's natural beauty—its blossoming trees, flowing rivers, and diverse seasons. Iqbal's profound love for his country is evident in every line, as he celebrates its every particle, making his work an enduring testament to the spirit of patriotism.

Iqbal also wrote patriotic poems for children to awaken them to nationalist sentiments from the beginning. In these poems Iqbal mentions the blossoming leaves, flowers and fruits of the garden (India). He loved his country, therefore, sometimes he praises its weather, and at times it rainy season and then he seems to be overwhelmed by the waves of Ganges and Yamuna. In short he loved his country in its every bit and particle:

Pathron ki muraton mein samjha hai tu khuda hai

(You have seen God in the idols of stones)

Khak-e-watan ka mujh ko har zarah devta hai

Scanned with OKEN Scanner

(But every particle of our nation's land is a God for me)

Iqbal loved his country deeply. His nation and its small and big things formed the core of his poetry. He did not look beyond his country like other poets for selecting themes of poetry. He sang praise of trees, plants, flowers, birds, rivers and mountains. He did not leave anything.

The Ghazals of Iqbal also propagates national consciousness and national integrity. His ghazals espouse humanism and brotherhood. Apart from flowers and nightingales he takes up issues and problems of the nation and country in his ghazals. The study of his ghazals shows that he brought out ghazal from romantic atmosphere and infused it with realism.

Conclusion:

This overview of patriotism in Urdu poetry demonstrates that the genre extends far beyond themes of love and beauty. Urdu poetry has also addressed pressing political, social, and moral issues, evolving in response to the changing circumstances of its time. During India's struggle against colonialism and foreign domination, Urdu poetry became a powerful vehicle for patriotic expression, wholeheartedly embracing the cause of freedom. The tradition of patriotism in Urdu poetry, exemplified by poets like Allama Iqbal, elevated the genre, intertwining it with the ideals of national pride and resistance to oppression.

Selected Works and other sources:

1. ABUL EJAZ SIDDIQUI; KASHAF-E-TANQIDI-E-ISTALEHAT MOQTADARA QAUMI ZABAN, ISLAMABAD, 1987.

2. MAULANA ABUL KALAM AZAD, "QAUL-E-FAISAL" ITEQAD PUBLISHING HOUSE, DELHI 1968.

3. PROF. JAMIL AHMAD ANJUM, IQBAL KA ASR URDU SHA'RI PAR, MAHNAMAH QAUMI ZABAN, KARANCHI, APRIL 2007.

Scanned with OKEN Scanner

4. PROF. MOHSIN AHSAN, IQBAL AND TURK, MAHNAMAH QAUMI ZABAN, KARANCHI, APRIL 2007.

5. HAMARI AZADI, ABULKALAM AZAD, MUTARJIM MD. MOJIB, ORIENT LONG MAN LIMITED, 1776.

6. ROSHNI KE DARECHAYS. E. HUSAIN, EDIT BY JAFAR ASKARI E. ACADEMY, ALLAH ABAD 1973.

7. KULYATE AKBAR ALLAH ABADI, FOURTH VOLUM, FIRST EDITION KITABISTAN KARANCHIPAKISTAN 1948

8. TAREEKH AZAD HIND FAUJ, HALI PUBLISHING HOUSE KITAB GHAR DELHI, 1990.

9. INQALAB 1857, P C JOSHI, N.B.T.I DELHI 1992.

10. MAJMUWA KALAM JAUHER EDITED TAJUDDIN, MASJID FATEHPURI, DELHI 1918.

11. TAREEKH TAHREEKE AZADI HIND, FIRST PART, TRASLATED BY ADIL ABBASI TARAQQI 1980.

12. FOGHANE DELHI, TAFAZZUL HUSAIN KOKAB, ACADMY PUNJAB LAHORE 1952.

13. KHAKE DIL JANISAR AKHTAR, LAHOTI PRINT AIDS, DELHI 1973.

14. URDU MEIN TARAQQI PASAND ADBI TAHREEKEDUCATIONAL BOOK HOUSE, ALIGARH

15. NAI DUNIYAN KO SALAM AUR JAMHOOR, ALISARDAR JAFRI,MAKTABA JAMIA LIMITED DELHI, 1972.

16. U P KE MUSALMAN AUR MAHAZE AZADI, FIRST PART,QAZI PUBLISHER DELHI, 2003.

17. URDU SHAIRI KA SIYASI WO SAMAJI PASE MANZAR G. H. ZULFIQAR, MATBAE PUNJAB LAHORE, 1977.

Scanned with OKEN Scanner

18. SHAHER AASHOB EK TAZZIYA, AMIR ARFI, SAQI BOOK DEPOT, DELHI

19. SHAHER AASHOB, MAKTABA JAMIA LIMITED DELHI, 1986.

20. HINDUSTAN KI JIDDOJEHD AZADI MEIN URDU SHAIRI KA HISSA, NUSRAT PUBLISHR, LUCKNOW, 1991.

21. SIRATE MD. ALI, RAIS AHMAD JAFRI NADVI, MAKTABA JAMIA MILLIA ISLAMIA FIRST EDIT, 1932.

22. NAZMON KA INTEKHAB, RAHE MASOOM RAZA, KARIMI PRESS ALLAHABAD, 1960.

23. AZADI KE TARANAY, RAJESH KUMAR, NATIONAL ARCHAIVES NEW DELHI 1976.

24. ZABT SHUDA NAZMEIN, EDIT K. ANJUM & M. HUSAIN, MAJLISE ALI J.ZAIDI, DELHI, 1975.

25. HAMARA HINDUSTAN, JANISAR AKHTAR, BOMBAY 1938.

JOURNALS:

1. AAJ KAL MONTHLY, DELHI, JANUARY 1957.

2. AAJ KAL MONTHLY, DELHI, AZADI NUMBER AUGUST 1957.

3. URDU ADAB, SHIBLI NUMBER, ANJUMAN TARAQQI URDU HIND NEW DELHI 1957.

4. ACADEMY LUCKNOW DOU MAHE, YADGAR HASRAT NUMBER UTTAR PARDESH, 1960.

5. AFKAR JOSH NUMBER, MAKTABA AFKAR KARACHHI, OCTOBER-NOVEMBER, 1961.

6. ASIA SHE MAHE, MEERUT APRIL, MAY, JUNE 1961.

7. KAHTOON ALIGARH, APRIL 1913.

8. FROGH URDU MAH NAMA LUCKNOW JANG AZADI NUMBER, 1957.

Scanned with OKEN Scanner

9. KARI, AMRISAR, MAY 1930.

10. NAYA ADAB AUR KALIM, HAQA ADAB LUCKNOW, NOVEMBER 1940.

11. HUMAYON MAHNAMA LAHOR, FERUARY 1938.

12. YADGAR HASRAT NUMBER DO MAHI, UTTAR PARDESH URDU ACADEMY LUCKNOW 1918.

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Science in science fictions: putting H.G. Wells' The Time Machine in the spectrometer.

Siddhartha Lahon

Physics Department, Kirori Mal College,

University of Delhi, Delhi – 110007, India.

Abstract: In this paper, I look into the aspect of the scientific correctness and way a science fiction may predict futuristic effects on our society as well as affect man's vision in both academically as well as in popular culture. For this purpose, I take H.G. Wells's 'The Time Machine' as a specimen on a petri dish. I look into the concept of evolution presented in The Time Machine. I also investigate how the ideas presented by Wells in The Time Machine about time travel fare with the science of thde last century.

Introduction

The advent of science fiction can be traced back to The Blazing World by Margret Cavendish in mid 1600s. However, Margret Cavendish's work was more of a fantasy work. Modern science fiction as a genre can be thought as born with the publication Frankenstein by Mary Shelley in 1818. H.G. Wells's 'The Time Machine' was published in the year 1895, ten years prior to the publications of the famous work on Special Theory of Relativity(STR) by Einstein in 1905 [1]. H.G. Wells himself and many other deem The Time Machine and few of his works as 'scientific romances' [2]. Many scholars don't see science fiction as prophecy, though the writers often boast its success as prophecy [3]. However, we see a number of

Scanned with OKEN Scanner

science fiction descriptions coming into life in real world decades or centuries later. For instance, the story of a large cannon leaving for the moon was penned down as a fiction by Jules Verne in 1865, entitled 'De la Terre à la Lune' in French. It was translated to English in 1876 [4]. Humans then set foot on the moon on 20 July 1969, hundred and four years later [5], making the fiction becoming akin to prophetic.

The Time Machine forays into a future of society of what has become of humans with a machine which can take a person to the future and back to present. The author calls it a 'Time Machine'. The unnamed person who narrates the journey to future in The Time Machine is referred to simply as the Time Traveller. The Time Traveller travels to 802701 AD in his first of the two journeys to alternative time from the present. As he comes back to the present, he describes what he saw in the journey through time and the society in the year 802,701 A.D. There he encounters the childlike humanoids, the Eloi who lived on fruit based diets and lived in the futuristic yet deteriorating buildings. They spoke a language incomprehensible to the Time Traveller and it was difficult for him to communicate with the Elois due to their small attention span, indiscipline and lack of interest to learn probe for new learning. They appeared to be happy and jolly in the day time but feared the dark. He then encounters another species of humanlike structure, the Morlocks. Contrary to the Eloi, the Morlocks lived in the underground, cannot bear the sunlight, and apparently took care of the industrial works. The Eloi was supposedly the aristocrats of the society kept on adapting to the changing time and similarly, the Morlocks were the resultants of the adaptations of the industrial workers to their living conditions who lived dingy and poor hygiene areas of the industrial areas.

Scientific Evidence of plausibility The Time Machine's depiction of evolution of humans

Scanned with OKEN Scanner

The Morlock and Eloi as races evolved to adapt with their environment, as explanations given by the Time Traveller as [6] –

> "At first, proceeding from the problems of our own age, it same clear as a daylight to me that gradual widening of present merely temporary and social difference between Capitalist and the Labour was the key to the whole position. No doubt it will seem grotesque enough to you – and wildly incredible! – and yet even now there existing circumstances to point that way. There is the tendency to utilize underground space for less ornamental purposes of Civilization; there is the Metropolitan Railway in London, for instance, there are new electric railways, there are subways, there are underground workrooms and restaurants, and they increase and multiply. Evidently, I thought this tendency had increased till Industry had gradually lost its birthright in the sky. I mean that it had gone deeper and deeper into larger underground factories, spending a still-increasing amount of its time therein, till, in the end –! Even now, does not an Easy-end worker live in such artificial condition as practical to be cut off from the natural surface of the earth? .....
>
> .....The too-perfect security of the Upper-worlders had let them to a slow movement of degeneration, to a general dwindling in size, strength, and intelligence. That I could see clearly already. What had happened to the Upper-grounders I did not yet suspect; but from what I had seen of the Morlocks – that, by the by, was the name by which this creatures were called – I could imagine that the modification of human type was even far more profound than among the "Eloi," the beautiful race that I already knew."

Without delving into the socio-cultural aspects of human evolution and putting forth any arguments and discussions about the class differences of Haves and Have-nots, I will concentrate on the physiological evolution of the human race as depicted in The Time Machine. 802,701 AD is long way to go for humans to evolve to two different races like Eloi and Morlocks where languages too changed to an altogether different form. The Homo sapiens or us were evolved about 300,000 years

Scanned with OKEN Scanner

back in Africa. It took 230,000 years to make us cognitively able to communicate stories and spread out of Africa, and about 12,000 years from now, we started doing agriculture. Then we could come to the civilizations, kingdoms, Christianity and so on [7]. The way Homo sapiens have evolved from 300,000 years back to today's tech savvy beings, many of us with prosthetic body parts – including dental fill-ups and implants. It doesn't point to any reason why the 1885's human race cannot evolve to Eloi and Morlocks.

A recent study on the high altitude Tibetan women by a group lead by Cynthia Beall of Case Western Reserve University has found observations supporting evolution and natural selection due to the environmental and sociocultural factors [8]. They studied the lifetime reproductive success of the low oxygen highlands of Nepal by enrolling population of 39 year and older married or pregnant ethnic Tibetan women who were lifelong natives of Upper Mustang. The found that –

> "Populations with a long history of exposure to severe stress and the opportunity for natural selection provide an ideal context to address these challenges. A few populations have thrived for thousands of years under high-altitude hypoxia and exhibit distinctive traits consistent with positive natural selection. Today's ethnic Tibetan population descends from ancestors with roughly 10,000 y of year-round high-altitude residence. Ethnic Tibetans have distinctive biology thought to reflect adaptations in the oxygen delivery system that counter environmental hypoxia."

In 10,000 years, the Tibetan population has evolved to cope with the environmental hypoxia of the high altitudes of the Tibetan region. Their distinctive sociocultural practices, which have been an integral part of the community, and their ways to live to adapt to the low air density of the Himalayan heights induced changes in the way oxygen is supplied to the body. Though the two species that becomes the remnant of human race in the The Time Machine, specially the Morlocks,

Scanned with OKEN Scanner

appear too strange to easily fit in to one's futuristic imagination, the work by Beall et. al. is evidential to project to the plausibility of the possible state of evolution as indicated in The Time Machine.

The Time Machine as a source for popular culture

The concept of time travel as presented in The Time Machine has intrigued science enthusiasts, storytellers, moviemakers, moviegoers and the layman to do their bits about time travel. For instance, The Time Machine was adopted to make sci-fi film, with the same title as the book, in 1960. It was remade in 2002. The action packed series of movies which started with The Terminator in 1984 garnered great interest amongst moviegoers for generations. The Terminator derived two major components of its storyline from The Time Machine – time travel and an apocalyptic future, albeit cyborg based. The franchise made six movies based on the storyline, the latest being released in 2019.

Another film which was based on the concept of time travel that is worth mentioning is Back to the Future. It was the highest grossing movie of the year 1985. The movie was based on the idea that a time machine would activated on of travelling at velocity of 142kmph. Fate ensues that it takes Marty, the protagonist, back to 1955 so that he could alter the past to make the lives of his family and Doc, the inventor of the time machine, better.

On the front of popular science writings, The Time Machine has inspired scholars to work the idea who explored the possibility of making a time machine. In How to Build a Time Machine, Paul Davies explores if the theories in physics allows time travel [8]. Paul Davies exclaims –

> "If you could magically squash the earth to half its diameter (retaining all its mass) it's surface gravity would be twice as big, and so would be the timewarp. Go on compressing, and

Scanned with OKEN Scanner

effect rises. When the radius reaches the critical value of 0.9cm, time stands still. Nothing can escape!"

There are other popular science writings which delve into the matter of time travel with supporting scientific foundations and yet easy to understand by a person with no science backgrounds. One such book is Time Travel in Einstein's Universe by J. Richard Gott III. Gott quotes extensively from The Time Machine to introduce, rather reintroduce, the readers to the popular imagination of time travel! The list is non exhaustive.

Time Travel in Science and how it compares with the Time Travel of The Time Machine

"Any real body must have extension in four directions: it must have Length, Breadth, Thickness, and – duration..... There are really four dimensions, three which we call the three planes of Space, and a fourth, Time. There is, however, a tendency to draw an unreal distinction between the former three dimensions and the latter, because it happens that our consciousness moves intermittently in one direction along the latter from the beginning to the end of our lives." – Time Traveller in The Time Machine [6]

Probably the first person to call time as the fourth dimension to describe the mechanics of objects was Joseph-Louis Lagrange. H.G. Wells built on the idea of time as fourth dimension just like the three spatial dimensions of Euclidean geometry where one can travel through the fourth dimension – time, for that matter there is nothing wrong in calling it the first dimension! He draws comparisons between moving along the spatial directions like left-to-right, backward-forward and up-down with travelling along time to past or futures. He draws parallel between moving upwards and moving along time to past or future in the sense that

Scanned with OKEN Scanner

due to gravity it is difficult to move upwards and one needed ways to have upward motion. Hot air balloons could take one up to certain heights of sky in way back 1783. Now one can overcome the gravity of Earth to go to the outer space. Similarly, argues the Time Traveller, if one can design something to overcome the hidden hindrances against time travel, one can easily go about to different times and he states that he is working on the same. Ironically, gravity was the pulling back string to restrict upward motion in H.G. Wells' parallel-drawing exercise between space and time as dimensions, now scientists are looking into the science version of time travel in the context of space-time curvature due to gravity! This understanding of time as the fourth dimension just like the spatial ones where one can travel this side to that side has led many haywire and to areas as grey as pseudoscience.

It was after the Einstein's publication of STR [2], the idea of time as the fourth dimension became a part of equations of mechanics. The Lorentz transformations of space-time took time as the fourth dimension, albeit as with the 'iota'. It was a result of the STR and the Lorentz transformation that the world came to know about time dilation where time slows down in a moving frame of reference as compared to a frame at rest. That is if a rocket is fired and it is let to rotate around the world a few times, a clock kept in the rocket will be slower than an identical clock on earth. Now, how slow will it run? The clock on the moving rocket will be slower by a factor of square root of one minus square of the ratio of the velocity of the rocket to velocity of light. If the velocity of the rocket gets to the velocity of light in vacuum, then time slows down enough to stand still! If the velocity of the rocket gets past the velocity of light in vacuum, time becomes strange and one may move of strange new universe! However, there are two problems with such time travels. First – the violation of causality, it is well accepted that the cause of

Scanned with OKEN Scanner

anything has to come before its effect. If time travel to past can happen, the effect can precede the cause. It very lucidly elucidated by the 'grandfather paradox'. In my version of grandfather paradox, I go back in time and take my grandfather on a bike ride, even before my father was born. In an unfortunate turn of events, my grandfather dies due to skidding of my bike on the treacherous icy mountain road of Rohtang Pass. How can I come to existence if my father was not born at all? Second, nothing with mass can travel faster than light as per the STR. If anything travels at velocity of light in vacuum, its mass becomes infinite and it becomes imaginary if it breaks the barrier of velocity of light. It is not to say with finality that nothing can move faster than the velocity of light, but if that happens then the STR has to modified, if not discarded. As the STR will not be in its original shape, the proposition of something moving faster than light will lead to time travel too will be displaced!

In 1908, Hermann Minkowski formulated the four dimensional Minkowski space-time8. However, in Minkowski's space-time, one cannot travel forward or backward in time to future or past as envisaged by Wells in the The Time Machine. An event or a person just exists at a point in the space time, it doesn't move anywhere. The world-line in the Minkowski space-time represents the whole history, the whole life of the object. Now, how can time travel be possible in Minkowski space-time? As seen by an external observer at rest, the space-time curves under the influence of gravity along the geodesics (shortest path in simplest words) though for the object/person, its world-line is a free fall. If closed time-like lines (CTL) in Minkowski space are obtained in then one can go back to its starting point. In other words, one can time travel backwards. In 1949, Godel constructed what is now known as Godel metrics in which he found that the framework of Einstein's General Theory of Relativity(GTR) allows Closed Time-like

Scanned with OKEN Scanner

Curves(CTC) which allows one to travel back to the past [10]. Frank Tipler found that if one can construct a sufficient large rotating cylinder, CTLs can be obtained as a solution of the general relativity equations. And a time machine can be made [11]. The catch is that infinitely long cylinder needs to be of mass of at least ten times the mass of sun and it must be rotating a speed of a few billion rotations a second. As easy as it gets!

To Continue

Though theoretically there are solutions to the complex equations of GTR which allows CTCs i.e. a kind of time travel, a time machine is still a play thing of fantasy and science fiction dreamers. Even after 130 years of The Time Machine's first publication, we still all read and fantasize about a time machine and what we would do if we have one!

References

[1] On the Electrodynamics of Moving Bodies, A. Einstein, Annalen der Physik (ser. 4), 17, 891–921, (1905)

[2] Science Fiction Before 1900: Imagination Discovers Technology, pp7, P.K. Alkon, Routledge New York (2002).

[3] Science Fiction and Its Ideas, R.H. West, The Georgia Review, Vol. 15, No. 3, pp. 276-286, (FALL - 1961).

[4] From the Earth to the Moon, Jules Verne, Translated by L. Mercier and E.E. King, Sampson Low, Marsto, Searle & Rivington, London (1876)

[5] https://www.nasa.gov/mission/apollo-11/, visited on 21:31, 07.01.2025

[6] The Time Machine, H.G. Wells, Fingerprint Classics, New Delhi, Reprint 2024.

[7] Sapiens – A Brief History of Humankind, Y. N. Harari, Vintage (2015).

Scanned with OKEN Scanner

[8] Higher oxygen content and transport characterize high-altitude ethnic Tibetan women with the highest lifetime reproductive success, Shenghao Ye, Jiayang Sun, Sienna R. Craig, and Cynthia M. Beall, Proceedings of the National Academy of Sciences of the United States of America, 121 (45) e2403309121, (2024).

[9] How to Build a Time Machine, Paul Davies, Penguin Books, London (2002).

[10] An example of a new type of cosmological solutions of Einstein's field equations of gravitation, K. Gödel, Reviews of Modern Physics 21, 447-450 (1949). Reprinted in Feferman et al., eds., Kurt Gödel Collected Works, Vol. II, Oxford University Press, 1990.

[11] Rotating cylinders and the possibility of causality violation, F. J. Tipler, Physical Review D, Vol. 9, pp. 2203, (1974).

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Museums as Educational Spaces: Connecting the Past with Learning

Dr. Vikram Singh Chaudhary

Associate Professor

Department of History, Kirori Mal College, University of Delhi

Dr. Ruchika Singh

Associate Professor

Department of History, Indraprastha College for Women, University of Delhi

Abstract: This article explores the multifaceted educational roles that museums undertake, highlighting their capacity to provide enriching experiences that enhance both formal and informal learning.

The concept of museum education transcends traditional definitions, focusing on the interactive learning experiences that museums offer. Unlike formal educational settings, museums provide flexible, self-directed learning environments that allow visitors to explore exhibits at their own pace. This spontaneity promotes experiential learning, where visitors engage with artifacts, art, and cultural materials directly. The learning that occurs in museums is often richer and more memorable than that obtained through conventional classroom instruction, as it appeals to multiple senses and connects historical and cultural narratives to personal experiences.

Central to the educational mission of museums is their ability to bridge various disciplines, including history, science, art, and culture. Through hands-on exhibits and interactive displays, museums facilitate interdisciplinary learning that connects different fields of study. For example, a visit to a natural history museum may involve examining fossils while simultaneously learning about evolutionary

Scanned with OKEN Scanner

processes, thereby fostering a holistic understanding of complex concepts. This approach not only captivates students' imaginations but also inspires critical thinking and curiosity, essential skills for lifelong learning.

The planning and collaboration between museum authorities and educators are crucial for maximizing the educational impact of museum visits. Museums can enhance school curricula by developing exhibitions and educational programs that align with academic subjects, thereby reinforcing classroom learning. Teachers can further enrich these experiences by preparing students for museum visits, grouping them effectively, and using educational materials to focus attention on relevant exhibits. This collaborative effort ensures that museum visits are productive and meaningful, allowing students to engage deeply with the material.

In addition to in-house programs, outreach initiatives such as loan kits, guided tours, and summer workshops extend the educational reach of museums beyond their walls. These programs cater to various age groups and learning styles, making museum education accessible to a broader audience. Engaging activities, such as hands-on modeling and environmental exploration, not only develop students' skills but also raise awareness about cultural and environmental issues.

The role of guided tours in museums cannot be overstated. Conducted by knowledgeable staff, these tours provide structured yet flexible learning experiences that enhance visitor engagement. With the integration of audio guides and interactive elements, museums can offer personalized learning experiences that empower visitors to explore topics of interest at their own pace.

In summary, museums are dynamic educational institutions that offer invaluable learning opportunities through their collections, exhibits, and programs. By fostering connections across disciplines, encouraging critical thinking, and promoting hands-on exploration, museums contribute significantly to both formal and informal education. As museums continue to evolve and adapt to changing

Scanned with OKEN Scanner

societal needs, their potential to inspire, educate, and engage the public remains as relevant as ever.

Keywords: Museum Education, ICOM, Interactive Leaning, Experiential learning, Interdisciplinary, Outreach initiative, Guided tours, Critical thinking, Curriculum alignment, Participatory exhibits, Hands-on exploration

According to the International Council of Museums (ICOM) "A museum is a non - profit making permanent institution, in the service of the society and its development and open to the public, which acquires, conserves, communicates and exhibits, researches for the purpose of study, education and enjoyment, material evidence of men and his environment"60. Another definition says "A museum is an institution which collects and preserves material concerned with history, art, anthropology, industry, natural history, and so on, and exhibits them to the general public from an educational point of view, and carries out projects needed to contribute to the public education, study and recreation, and also it researches on the materials."61 Thus museum could be defined as a service provider for the spread of knowledge. There are many more definitions of museums that lay most emphasis on their role on education.

Education is the process of acquiring experiences, commonly known as learning, that leads to positive transformations in human behaviour, particularly in terms of knowledge, skills, and attitudes.

The meaning of museum education is that museums provide a learning situation in which the visitors experience learning. A learning situation is a condition or environment in which all the elements necessary for promoting learning are present. Museums are capable of making a major contribution to education at the formal

60 This declaration made in the Copenhegen 10th General Assembly of the International Council of Museums held in 1974
61 http://www.glocom.org/special_topics/colloquium/20050105_iguchi_museum/

Scanned with OKEN Scanner

and non-formal level. Objects and exhibits form the basis of all educational communication that takes place in a museum. "Learning in museums generally involves a visitor or a group of visitors attending to an object, a display, label, person, element or some mental construct of these. Museum learning has long been examined in relation to attracting power and loading power of exhibits in museums. The information a visitor receives during a museum visit tends to bear a 'contextual map'. The museum visit represents a collection of experiences rather than a single unitary phenomenon."62 Any information obtained during the museum visit is likely to include social related, attitude related, cognitive related and sensory related association. These associations will become embedded in memory altogether with the result that anyone facet of these experiences can facilitate the recall of the entire experience.

Learning environment in Museums

Museums offer unique learning environments that differ significantly from those in schools and colleges. They provide a more flexible, self-directed learning experience, free from verbal instructions, rigid teaching schedules, formal assessments, and the structured control typical of formal education systems. Visitors can explore at their own pace, engaging with exhibits that spark curiosity and promote experiential learning, making museums a valuable space for informal, yet impactful, education. "Learning in museums is a spontaneous process, a personal experience not imposed on the visitor. Learning directly from objects provides a first hand experience to the learner."63 For example, an individual who has seen and handled the sculptures of Mathura art and Gandhara art would have a deeper understanding and appreciation of both styles, easily recognizing their differences, compared to someone who has only read about them in textbooks.

62 Pant, G.N., "Museums, Their Educational Potential". Journal of Indian Museums, 1983.
63 Ranga,B.S., "Museums: Learning resources for Children". Journal of Indian Museums, 1991.

Scanned with OKEN Scanner

Similarly, someone who has visited the Calico Museum of Textiles and observed firsthand the intricate weaves of traditional Indian textiles, such as the Banarasi and Patola saris, will have a much richer insight into the craftsmanship, design techniques, and cultural significance than someone who has only seen images. Likewise, a person who explores fossils and artifacts in a natural history museum will develop a more tangible grasp of ancient life forms and evolutionary processes, far beyond what could be gained from just reading about them.

Museum objects are important part of the cultural and natural heritage of a country. They act as important means of work and represent the basis of work, an object of research for various technical, social and natural science branches such as botany, zoology, history, history of art, archaeology, ethnography, etc. Objects can make unique contribution to our understanding of the working of individuals and societies

The primary role of a modern museum is to transform relics of the past into powerful tools for learning, sparking curiosity, and broadening public understanding. Today's museums are not just repositories of history; they function as dynamic learning hubs—serving as both academies and schools for people of all ages. The educational mission of museums now directly involves collaboration between scholars, educationists, and museum professionals to create engaging and thought-provoking experiences. These experts are responsible for designing educational programs that not only present historical and cultural knowledge but also invite visitors to explore, debate, and connect with the ideas on a deeper level. By doing so, museums inspire critical thinking and adaptation in a way that transcends traditional classroom learning.

Museums offer learning environments that stand in stark contrast to the structured nature of formal educational institutions like schools.

Scanned with OKEN Scanner

a) Museums provide free-choice learning experiences, allowing visitors to explore at their own pace without the constraints of verbal instruction, formal assessments, or the rigid control systems found in schools.

b) Learning in museums is a spontaneous, self-driven process—an immersive personal experience shaped by the interests and curiosity of the visitor, rather than an imposed curriculum.

c) Museums encourage open communication of ideas, concepts, and information through hands-on exploration and discovery, fostering critical thinking and creativity.

d) Museums offer interdisciplinary learning by seamlessly connecting history, science, art, and culture in one space, enabling visitors to make connections across fields that are often taught in isolation in schools.

e) The tangible and visual interaction with real artifacts and exhibits stimulates multi-sensory engagement, deepening understanding and retention far beyond what is possible in a textbook.

Planning on the part of the Museums

Museums hold tremendous potential as institutions that can enhance and complement school education worldwide. Educational programs designed for school children have consistently ranked among the most popular offerings in museums. Regular visits by young students not only reinforce classroom learning but also cultivate an appreciation for beauty in its many forms. When these experiences are embraced during the formative years, they can foster a deeper understanding and even spark specialized interests for the future.

Museums have the incredible potential to enrich school education in numerous engaging ways, primarily through the visual communication of objects and materials. They transform subjects like History, Geography, Art, Physics, Chemistry, Astronomy, Health and Hygiene, Natural Sciences, and Mathematics

Scanned with OKEN Scanner

into vivid, interactive experiences that captivate students' imaginations. For instance, History comes alive as students explore ancient artifacts, such as tools and clothing, allowing them to connect with the lives of those who came before them. Imagine examining a suit of armor from the medieval era, which not only sparks curiosity about historical battles but also provides a tangible link to the past. In Geography, students can delve into Earth's wonders through geological specimens and interactive maps that illustrate tectonic movements and ecosystems. An interactive exhibit on natural disasters can help them visualize the impact of earthquakes and understand their geographical significance, making the subject more relatable.

The educational experiences available in museums can be categorized into two types: those that directly align with the school curriculum and those that broaden students' perspectives, enhancing their general knowledge across the humanities and sciences. To realize these educational goals for school children, museum authorities should proactively develop and provide engaging communication mediums. By doing so, they can create immersive learning experiences that inspire curiosity and ignite a passion for lifelong learning.

There may be several objects and exhibits in many museums which are related to the subjects taught in the school. Exhibition depicting Harappan Culture, Evolution of life, on electricity and magnetism for example, may form part of the display in Art, Natural History or Science museums as the case may be. They usually form part of several other exhibits, some relevant to the school curriculum and others not. When museums do not make a concerted effort to engage school children directly, teachers must find ways to leverage museum resources in their classroom instruction. This process involves identifying relevant exhibits that align with their curriculum, preparing in advance on how to incorporate these resources

Scanned with OKEN Scanner

effectively, and seeking the necessary cooperation from the museum to ensure a successful educational program.

Since school groups represent a significant portion of museum visitors, it is essential for museums to take the initiative in creating exhibits that support school education. Museums currently undergoing development or reorganization have a unique opportunity to consider how their displays can be aligned with school curriculum. For instance, a Natural History Museum focusing on evolution, ecology, or conservation can create exhibits that directly relate to key topics within the school curriculum while still fulfilling their overall mission.

Museum authorities should actively review school curriculum to identify themes and subjects that could be effectively showcased in their galleries. By doing so, they can create a rich educational environment that enhances learning for students and enriches the overall visitor experience.

Planning on the part of the School Teacher

Museum visits by school groups are often unplanned resulting a number of children rushing through the galleries without an opportunity for observation and discovery. This can be avoided and the visits could be made productive only when teachers plan the visit well in advance in consultation with the museum authorities. The class may be grouped into batches not more than 20 children to be taken care of by the education officer or by the teachers themselves. The attention of the students should be focused to the exhibits, relevant to the themes and concepts under consideration and encourage an interactive session with them. Educational materials relevant to the subject, such as work sheets, Information leaflets, etc. should be used.

Scanned with OKEN Scanner

Exhibits for Children

The ancient Chinese saying, "I hear, I forget; I see, I remember; I do, I understand," perfectly explains how participatory exhibits in museums work. These exhibits make learning more engaging and effective. A child's ability to understand information from an exhibit depends on how well they connect the displayed objects to their own experiences.

Participatory exhibits come in many fun forms. For example, kids can walk through realistic dioramas, like a forest or a model of the human heart, making them feel like they are really in those places. There are also hands-on models that children can touch and activate, letting them see how things work. Other interactive features, such as quiz boxes and discovery stations, encourage kids to explore and think critically.

Science museums often have a lot of these interactive exhibits, which allow children to learn by doing. This hands-on experience helps them understand difficult ideas better because they can experiment and see the results for themselves. By turning learning into an active adventure, these exhibits not only capture children's attention but also spark their love for learning.

Learning through Educational Exhibitions

The visual experience is the central consideration in an exhibition. Explanatory notes, settings, talks, films, publication, touch and feel exhibits, etc. make the objects accessible to the child's mind. In an exhibition each object conveys a message to the child. An interesting and interactive exhibition will arouse child's curiosity, inspire wonder, give pleasure and provide a certain amount of teaching. Exhibition attempts to evoke genuine and significant response in the mind of the child. In museums, all exhibitions are arranged around a theme to tell a story or record a fact. The connecting invisible link between the various objects of the

Scanned with OKEN Scanner

exhibitions, when understood by children, bridges the wide gap in their learning process.

Outreach Programmes for children

In addition to in-house programs like film screenings, demonstration lectures, and puppet shows, museums can offer various outreach initiatives that both align with school curricula and complement formal education. One effective resource is the school loan kit, a themed box filled with educational materials on topics such as shells, fossils, food chains, and the solar system. Each loan kit typically includes replicas of original objects, charts, models, color plates, and a teacher's guide, serving as a valuable tool for non-formal education. When designing these loan kits, special attention is given to presenting ideas clearly and concisely, ensuring that users can grasp the concepts quickly. For instance, a kit featuring plaster casts of artifacts from the Harappan Culture or an exhibit detailing the life cycle of various organisms can be utilized by history or biology teachers while covering these subjects.

To maximize the effectiveness of these school loan kits, close collaboration between museum staff and teachers is essential. This partnership helps identify relevant themes for the kits and ensures they are used effectively in the classroom, enriching the educational experience for students.

Summer workshops for students

The museums in collaboration with schools and NGO's can hold summer classes in painting, crafts, modelling or on environment exploration. These programmes not only developed the skill and talent of the students, but also make youngsters aware of environmental and cultural issues and the way they can maintain in contributing conservation efforts.

Scanned with OKEN Scanner

Guided Tours

The most common educational program in any museum is the guided tour, typically conducted by knowledgeable staff members. To enhance the visitor experience, an engaging audio-visual presentation providing a brief introduction to the background of the exhibits can be extremely beneficial before the actual tour begins. Additionally, organizing gallery talks on designated days, advertised in newspapers or through various media channels, allows visitors to engage in discussions about their experiences and insights with one another.

It is crucial that guides possess not only extensive knowledge but also the ability to communicate effectively. A loud, clear, and modulated voice captures attention far better than a low-pitched, monotonous lecture. Moreover, guides should be attentive to the age and interests of their audience to tailor the information accordingly, making the experience more relatable and enjoyable for everyone.

In addition to guided tours, many museums offer audio guides, often referred to as "guide-a-phones." These portable devices, resembling simple tape playback machines, come pre-loaded with information about different exhibits. Visitors can carry these devices around the gallery, allowing them to explore at their own pace, pause for deeper examination, and interact with the exhibits without disturbing others. This flexible approach empowers visitors to personalize their learning experience, fostering a more engaging and informative museum visit.

Furthermore, incorporating interactive elements like QR codes on exhibits that link to additional multimedia content can enrich the educational experience. By blending guided tours with self-paced learning tools, museums can create a dynamic and immersive environment that caters to diverse learning styles and preferences.

Scanned with OKEN Scanner

Education through Publications and Research

Through publications a museum can transmit its research to the scholars and general public. There are three kinds of publications namely.

1. "The outcome of the serious researches conducted on the subjects and published in the form of journals, catalogues, brochures, monographs or books.
2. Publications in the form of reports, guidebooks, introductory leaflets, etc. to familiarize the people with the museum and its activities.
3. Special publications on the occasion of new gallery, special exhibitions, anniversary to popularize the museum within the community."64

The other publications in general are as follows:-

1. News Bulletin:- It keeps the public informed about the activities of the museum. It covers subjects like current activities, announcement of important acquisitions, notices of special exhibitions, lectures, concerts, etc.
2. Handbooks:- It gives a brief outline of the museum, deal with gallery, special collection or a homogeneous group of objects in detail.
3. Picture-Books:- These are the collections of photographs of the masterpieces in a museum with their brief descriptions under a colourful background. Similarly folders, leaflets, guide maps, picture post-cards and transparencies are various other publications brought out by museums to acquaint the people with their special activities.

The education in a museum should be based upon research, which applies specially to museum exhibits. The publication should have social communication and educational values. Apart from providing the fundamentals of knowledge in the specific fields, the museum preserves and provides the basic material for research in practically all the academic disciplines like art, archaeology,

---

64 Nigam, M.L., "Fundamentals of Museology", Hyderabad: Deva Publications,1985.

Scanned with OKEN Scanner

anthropology, science, dance, music, technology, etc. Museums are the best centres of bringing out research works of repute.

References

Biswas, T.K. Museum and Education, New Age International (P.)Ltd., New Delhi, 1996.

Falk, J. H., & Dierking, L. D., "Learning from Museums: Visitor Experiences and the Making of Meaning", Alta Mira Press, 2000.

Falk, J. H., & Dierking, L. D. "The Museum Experience Revisited", Left Coast Press, (2013).

Harison Molly, "Education in Museums, The organisation of museum, practical advice". UNESCO, Paris, 1960.

Hooper-Greenhill (Ed.) The Educational Role of the Museums, London, 1996.

Nair,S.M," Museums in School Education". Journal of Indian Museums, 1991.

Nigam, M.L., Fundamentals of Museology, Hyderabad, 1985, P.P.127-139.

Nigam, M.L., Museum Research and Education in Indian context. Journal of Indian Museums,1982.

Pant G.N., Museums, Their Educational potential. Journal of Indian Museums, 1983, New Delhi.

Ranga,B.S., "Museums: Learning resources for Children".Journal of Indian Museums, 1991.

Sandell, R., "Museums, Society, Inequality", Routledge, (2002).

Watson, S., "Museums and Their Communities", Routledge, (2007).

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Geopolitics of West Asia and India's Regional Engagement

Dr. Saiyad Md Shahnawaz,
ICSSR Post-Doctoral Fellow,
Jamia Millia Islamia, New Delhi,
Dr. Waseem Ahmad,
Assistant Professor, Symbiosis Law School Noida, Symbiosis International (Deemed University), Pune,
Dr. Mohammad Suhail,
Professor, Centre of Applied Remote Sensing and GIS Applications, Samarkand State University named after Sharof Rashidov, Samarkand, Uzbekistan

Abstract: West Asia, known as the Cradle of World's Great Civilizations, the birthplace of Abrahamic religions, the Tri-junction of Continents, the Nursery of World Politics and the Heartland of Energy. It holds immense strategic and geopolitical significance not only for the region and the world but also for India. As, the discovery of oil transformed the region into a global economic center, it also led to destabilizing forces such as political unrest, civil wars, sectarian strife, terrorism and religious extremism. This paper examines the evolving geopolitical landscape influenced by regional and global powers with focus on India's engagement. It highlights India's historical ties through its diaspora and trade activities. It also analyzes how India's soft power and diaspora serve its interests while addressing the growing challenge posed by China's influence in the region. The methods used is a historical analysis of geopolitical changes and an

Scanned with OKEN Scanner

examination of India's strategic approaches. There is a need for India to navigate these complex dynamics to secure its economic and strategic interests.

Keywords: West Asia, India, Soft power, Regional Geopolitics, Diaspora

Introduction: The idea of 'Geopolitics', frequently used in international relations, examines and predicts how governments will act politically on a global scale. Geopolitics as a term was first used at the turn of 20th century by Swedish political scientist Rudolf Kjellen to refers geographical pursuit of a state's interests. It involves the study of how geographical elements viz., location, climate, natural resources, population, physical topography, and others affect its decisions towards foreign policy and where it stands in the international power structure (Deudney, 2023). Although, Haushofer used the phrase 'geopolitik' to shape Germany's foreign policy. However, he was unable to succinctly define this new idea, its main tenet was the concept of the state as a person or organism, over time moulded into a particular national character by its own geography and history (Britannica, 2023). In this sense, the phrase 'lebensraum or 'room to live' was introduced to refer to the area needed by a strong, growing state to support its inhabitants (Murtoff, 2023). Hitler and the Nazi party would adopt this idea in its most violent and militaristic form in upcoming years. However, geopolitics as a subject was progress pertinently in the late 19th and early 20th centuries only, wherein it was impacted by World Wars, Industrial Revolution, and new technologies. Scholars such as Alfred Thayer Mahan, Halford Mackinder, John Seeley, Karl Haushofer, Friedrich Ratzel, H.G. Wells, Nicholas Spykman, Frederick Jackson Turner, E.H. Carr, Vidal de la Blache, and others have contributed greatly in explaining various approaches to contemporary problems and World geopolitics. Mahan's historical analysis of "heartland" and the rise of the British Empire has been regarded a

Scanned with OKEN Scanner

classical work in the history of geopolitics. It has not only given the starting point for the geopolitical debate but also opens a wide canvas for future discourse. Mahan argued that the control of sea routes was decisive point because of the superior mobility over other mode of [land] transport (Mahan, 1890). With the advent of new technologies/Industrial Revolution, the role of land power increased pertinently as rightly pointed out by the Mackinder. He argued that any state that was able to control the heartland would control World politics and thus pose the threat of a worldwide empire. In disagreement, Spykman argued that the "rimland" of Europe and Asia, which was stretched in a crescent, had a tendency to unite would likely dominate the World (Spykman, 1942). On the other hand, German scholars postulated the theory of the 'pan-region', which comprises a centrally positioned continent-sized industrial metropol (or major power) surrounded by a resource periphery, to energize Germany's dominance over the World (O'Loughlin & van der Wusten, 1990).

In this context, the region of West Asia has been one of the richest regions in understanding geopolitics of the region and countries across the World. Both, the economy and human resource are of great concern for changing shape of geopolitics in the region. The influence of power factors and geography of West Asia has been realized by global superpowers and, thus, this has now become a focus of global affairs (Rahman, et. al. 2022). The region turns out none other than the nursery of world geopolitics. Factors such as energy, mineral resources, heritage, human resource, and wealth have contributed greatly in regional geopolitics of West Asia. This region has been regarded as the region of significance in many ways such as the Cradle of World's Great Civilizations, Birthplace of Abrahamic religions, Tri- junction of Continents, and the Heartland of Energy. However, the region of West Asia has overcome all the connotations of discourse and emerged as a miracle of twenty first century, whereas the region

Scanned with OKEN Scanner

passes from various political instability, economic barriers, social change, and surpasses cultural identities, among others. The general level of economic activity was subsistence until the discovery of oil. But soon after the Persian Gulf region's oil was discovered, this became renowned for having a large hydrocarbon resource. The region's economies are now contemporary ones with laissez-faire tendencies (Hitti, 1970). Recent globalization and economic liberalization have had a significant impact on them. Due to a number of essential considerations, including its enormous energy resources, religious significance, geographic proximity to significant countries, history of battles and wars, and the strength of its economies, West Asia has constantly maintained its place in the world's spotlight. Oil in particular has drawn the attention of other nations, including Europeans, Russians, and Americans, particularly since its discovery at the beginning of the 20th century. The Middle East's strategic significance, as defined by Western scholars, is influenced by a number of elements, including its control over important trade routes, distinctive geography and terrain, and the influence of religion and ideology. With a major 31.3% of global oil production, 45% of crude oil exports, and a huge 48.3% of proven oil reserves, the Middle East is recognized as the world's greatest oil-producing region (Rahman, 2009). Due to the involvement of all major powers in its affairs, it is one of the most important regions in the globe. Although, the geopolitics of the region has been studied in limited scope while the actual potential of the region remains unknown.

Literature Review

West Asia has always been a strategically significant region because of its geographical position, historical relevance and enormous natural resources (Abhyankar, 2008). Alfred Thayer Mahan and Halford Mackinder have highlighted the significant importance of the region in world of geopolitics.

Scanned with OKEN Scanner

Mahan's examination of naval power (Mahan, 2022) and Mackinder's notion of the heartland (Mackinder, 2022) both emphasise the tactical benefits of dominating crucial geographical regions. To study the historical perspective, it is important to analyse the current geopolitical developments. In fact, the formulation of geopolitical ideas has been greatly impacted by the occurrences of the late 19th and early 20th centuries. Mackinder's idea proposed that gaining control over the Eurasian heartland would result in worldwide supremacy because of the significance of the region. Spykman's Rimland thesis argues that the strategic dominance of the coastal periphery of Eurasia is of utmost importance (Diesen, 2021). It provides an opposing viewpoint to Mackinder's thoughts. These theories provide a systematic structure for examining the geopolitical tactics used by dominant nations in the Western Asian region.

West Asia has been characterised by a series of hostilities and political instability. The conflicts include the Arab-Israeli conflict, the Saudi-Yemen dispute, conflict in Iraq and the Syrian civil war. These wars have been thoroughly analysed by researchers, who have investigated their origins, developments and effects on regional and worldwide politics. Ilan Pappe's studies conducted in 1992, 2004 and 2014 on the Arab-Israeli conflict together with Acemoglu and Robinson's assessments in 2012 on political shifts in the region provide unique insights into the complicated relationship between local and international influences. The cradle of recent conflict is due to the discovery of oil in West Asia. It had a profound impact on this region. It propelled the region into an economic powerhouse and resulted in unparalleled economic expansion as well as worldwide importance. Rahman (2009) and other scholars have recorded the impact of oil riches on regional politics and its ability to draw the participation of global powers. Scholars such as Hitti (1970) and Azhar (2017) have observed that the geopolitical

Scanned with OKEN Scanner

environment has become more complex due to the uneven economic liberalization and uncontrolled globalization tendencies that have occurred in recent decades.

India's Engagement in West Asia

India's longstanding relations with West Asia is originally rooted in trade and the presence of a substantial diaspora. All these have grown into a significant strategic alliance in modern times. The ancient Silk Road was a pivotal channel for cultural and commercial interactions between India and West Asia. It has been the basis for profound economic and social ties. According to Business Standard July 27, 2023 report, "88.8 lakh overseas Indians live in six Gulf nations,"65 It has been instrumental in making these bonds stronger. It also contributes significantly to both local economies and India's foreign remittances. In today's context, India's relationship with West Asia have evolved beyond mere economic transactions. It has to encompass strategic dimensions. Rahman (2017) highlights that India's soft power showcased through cultural diplomacy, academic exchanges. The significant Indian diaspora has been crucial in the development of goodwill and it strengthened bilateral ties too. India's focus on energy security, trade and counter-terrorism has further deepened its involvement in the region. However, the rising influence of China in West Asia presents a significant challenge for India.

Gaps in Existing Research

Although there has been a lot of study on the geopolitics of West Asia, but still there are important areas that have not been fully explored, particularly in terms of combining historical background with present geopolitical trends. A comprehensive examination is required that could emphasise the responsibilities played by growing nations like as India. Furthermore, the extent to which India's

---

65Business Standard. "More than 66% of 1.34 crore NRIs live in Gulf countries: RTI reply," July 27, 2023. https://www.business-standard.com/india-news/more-than-66-of-1-34-crore-nris-live-in-gulf-countries-rti-reply-123072701032_1.html.

Scanned with OKEN Scanner

soft power and its diaspora impact its strategic interests in the region has not been well analysed. This paper seeks to fill these gaps by offering a comprehensive examination of the geopolitical terrain in West Asia with a particular focus on India's engagement. The study aims to provide a detailed knowledge of how India might navigate the complex geopolitical landscape of West Asia by combining historical perspectives with current advancements.

Emerging Architecture of Geopolitics in West Asia and Its Impact on India

Historical Context and Regional Dynamics

The West Asia region has historically been shaped by the rivalries and influences of various global powers. European countries, imperial Russia and capitalist America have always kept this region under their close watch. These powers have had a lasting impact on the political, social and economic landscapes of West Asian countries. Due to exogenous pressure and international influence, there are instability and conflict always in this region often resulting in instability and conflict (Hudson, 2013). The local rulers, frequently influenced by external forces, have contributed to ongoing strife, with internal divisions based on familial and personal interests becoming most evident during conflicts.

A Brief Reflection of The Key Geopolitical Conflicts of the Region

Arab-Israel Conflict: The foundation of the State of Israel in 1948 marked the beginning of prolonged conflicts between native Arab Palestinians and Israeli settlers. This conflict has evolved from intercommunal strife into political and military confrontations. It remains one of the world's longest-standing unresolved disputes. The area's significance to Muslims, Christians and Jews adds a religious dimension to the predominantly political conflict (Pappe, 2004). External influences such as the support of the United States for Israel and the control of

Scanned with OKEN Scanner

strategic chokepoints like the Suez Canal have further complicated the situation (Chorev, 2023).

Saudi-Yemen Conflict: The current crisis in Yemen stems from the failed political transition in 2011 from President Ali Abdullah Saleh to his deputy, Abdrabbuh Mansour Hadi. The rise of the Houthi militias, supported by Iran and the subsequent Saudi-led military intervention have exacerbated the conflict. It led to significant human and economic losses (Dosari & George, 2020). The humanitarian crisis in Yemen is described by the United Nations as one of the worst ever. It has displaced millions and caused severe malnutrition and disease (HRW, 2021).

Syrian Crisis: Since the Arab Spring of 2011, Syria has been embroiled in a devastating civil war involving multiple domestic and foreign parties. The Syrian Armed Forces, supported by Russia, Iran and Hezbollah face opposition from an international coalition led by the United States and supported by Turkey (Nawaz et al., 2021). The conflict has caused a severe humanitarian crisis with millions of refugees and internally displaced persons (Farinelli, 2020).

Qatar's Economic Blockade and Exit from OPEC: Qatar's strategic shift towards natural gas and its exit from OPEC in 2018, following a blockade by Saudi Arabia and its allies have reshaped regional geopolitics. Qatar has strengthened alliances with Turkey and Iran to mitigate the blockade's impact. It challenges Saudi Arabia's dominance within the GCC and highlighting the limitations of OPEC as a unified oil cartel (Wright, 2018).

Iranian Nuclear Deal and U.S. Sanctions: The unilateral withdrawal of the United States from the JCPOA in 2018 and the subsequent re-imposition of sanctions on

Scanned with OKEN Scanner

Iran have had significant economic and strategic repercussions. These sanctions have hindered Iran's ability to fund large-scale projects and maintain its energy trade, complicating regional dynamics (Ernest, 2018).

Implications for India

India's strategic interests in West Asia are closely tied to its energy stability and regional security. It requires reliable oil and gas supplies from the region. However, the presence of conflicts like the Arab-Israeli war and the Saudi-Yemen dispute poses a danger to this stability. It has the potential to interrupt the smooth flow of energy and have an influence on global oil prices. In order to protect its energy requirements and economic interests India must cultivate positive diplomatic ties with crucial countries in the Western Asian region, like Israel, Palestine, Saudi Arabia and Iran. To Successfully negotiate the complicated geopolitical landscape of the region, India requires careful management of diplomatic relations with at least above said countries. To cultivating strong connections with Israel provides advantages in terms of technology and defence. To support Palestinian self-determination resonates with India's longstanding opposition to colonialism and occupation. India needs to maintain cautious management of its ties with Saudi Arabia and Iran due to the strategic significance of the Chabahar Port project and the need for reliable energy resources. India may enhance its influence and contribute to regional stability by actively participating in peacekeeping and diplomatic activities. It can position India as a mediator in regional crises. Moreover, India's commitment to regional stability also include its concern for humanitarian issues, particularly the crises in Yemen and Syria. It needs enhanced international collaboration and prejudice free intension. India can enhance its soft power and showcase its position as a conscientious global participant by aiding refugees and backing international humanitarian initiatives.

Scanned with OKEN Scanner

India has both prospects and difficulties due to the increasing impact of foreign countries such as the United States and China in West Asia. India may enhance its strategic position by engaging in collaboration with the United States, while simultaneously being cautious to avoid being entangled in regional rivalries. To counter China's growing influence, it is necessary to strengthen economic and strategic relationships with important regional actors, while safeguarding India's interests in the face of changing geopolitical circumstances. India's understanding of the dynamic geopolitical landscape in West Asia is characterised by long-standing rivalries, continuing wars and strategic realignments. India can protect its interests and promote regional stability by adopting a well-balanced diplomatic strategy. As discussed above, India can actively participate in humanitarian initiatives and secure its energy resources. India's proactive involvement and strategic insight would be crucial in handling the complicated issues and possibilities in the evolving West Asian region.

Geopolitical Architecture of External and Regional Powers

United States of America

In terms of external forces, the United States has a long-standing, amiable relationship with the Arab Gulf nations, particularly Saudi Arabia. Due to its location atop the greatest known proven oil reserves in the world, which are crucial to US interests, the Arab Gulf has gained strategic significance (Feierstein, et, al. 2022). As a result, the US has consistently supported the Arab Gulf against a variety of geopolitical dangers (Saab, 2002). In many ways, Saudi Arabia does regard the American military presence in the country to be a privilege (US Department of States, 2022). Security and oil, the two original components, still form the basis of the friendship, but oil continues to serve as its center of gravity. With the exception of Saudi Arabia, which was withdrawn in the aftermath of the 9/11 attacks, the United States maintains defense installations in Iraq and all of the

Scanned with OKEN Scanner

GCC countries. The US also oversees the naval operation Sentinel, which ensures ship safety across the Strait of Hormuz and the Gulf and involves GCC and EU countries (Katzman, 2020). Leaders in Saudi Arabia and the United Arab Emirates believed that the United States was leaving the area under President Obama. This exercise has caused severe alarm, especially in Saudi Arabia and the United Arab Emirates. While imposing 'maximum pressure' on Iran and withdrawal from the JCPoA, the administration of President Trump reformed US Gulf doctrine and attempted to reassure Saudi Arabia and the UAE (Yildiz, 2020). Both the current and past US administrations avoided taking positions in the Saudi/UAE-Qatari impasse, instead calling for GCC unity to be restored. However, a united GCC was considered as a prerequisite for the Middle East Strategic Alliance (MESA), also known as the 'Arab NATO'. The Trump administration announced the MESA project in May 2017, with the goal of bringing together all regional allies of the US, including the GCC, Egypt, and Jordan, and institutionalizing their collaboration on economic, political, and security matters. However, continuous rivalries among regional actors jeopardize the project's viability. Additionally, the Saudis have repeatedly challenged the US hegemony in the Gulf region. Recently, the US has shown a passive attitude of endorsing the winner instead to trying to forge the course of events (Hudson, 2018).

The European Union

The Iranian nuclear deal negotiations were a litmus test for EU's foreign policy instruments. Former High Representative of foreign affairs and security policy of EU, Federica Mogherini and her staff were instrumental in brokering this agreement, and the EU has done all possible efforts to keep it in place even after withdrawal by the United States. The EU and the US share the goal of preventing Iran from developing nuclear weapons capabilities. Europeans are likewise tired of Iran's hostile efforts overseas, as evidenced, for example, by the EU's placing of

Scanned with OKEN Scanner

Iran's security services on the EU Terrorist List in January 2019, in reaction to failed threats on European soil. In reaction to persistent human rights breaches in Iran, the EU implemented sanctions in 2011. Overall, compared to the United States, the largest EU countries have approached the Saudi-Iranian rivalry with more neutrality. A payment system called INSTEX, implemented across the EU in June 2019, was created by Germany, France, and the United Kingdom to safeguard commerce activities between the EU and Iran in areas exempted from US sanctions (Kudahl, et al. 2021; Young, 2019). Due to Saudi Arabia's dismal record on human rights, Europeans are likewise considerably more skeptical on the relationship with the Saudi government. For instances, France, Italy, and the UK have sent military forces to the Gulf during EMASOH, the European Maritime Awareness in the Strait of Hormuz mission, and excluded Saudi Arabia. It was commanded by France and involves eight EU members along with GCC countries, which aims to protect the right of navigation in the Gulf (EPRS, 2022). However, the European countries have yet to develop a cogent strategy for the Gulf region.

The People Republic of China

The People's Republic of China maintains a relatively low profile in Gulf regional problems. Since 1990, the Chinese government took a well-planned and methodical approach to establish diplomatic ties with Gulf countries. Beijing participated in the JCPoA discussions and supports Iran's reintegration into the global market (Scita, 2023). Iran is a key member in China's One Belt and One Road (OBOR) initiative, and it has signed a 'comprehensive strategic partnership' pact with Iran, but it also signed similar accords with Saudi Arabia, the United Arab Emirates, and other Gulf states (Chaziza, 2020; Sarker, et al., 2018). China's main priority in the region is on its oil resources. A quarter of the crude oil that crosses the Strait of Hormuz travels for China. It meets over 40% of China's oil demand (Kassomeh, & Qanas, 2023; Almujeem, 2021). However, China is

Scanned with OKEN Scanner

increasingly looking for opportunities for investments in other Gulf sectors. On July, 10 2018, Chinese President, Xi Jinping, in 8th Ministerial Meeting of the China-Arab Co-operation Forum spoke about collaboration, cooperation, and finding win-win solutions for Beijing and the Arab world (China Diplomacy, 2018). The epidemic of COVID-19 sparked significant humanitarian engagement among the Gulf countries and China (Fulton, 2020). Beijing has so far refrained from deploying naval forces to secure the commerce route via the Strait of Hormuz, however the Chinese Navy stationed in Djibouti provides some power projection capabilities in the region. Beijing also increased its role in Gulf defense through boosting military infrastructure to the region, particularly drones, and conducting joint naval maneuvers with Tehran and Riyadh in 2019 (Gurol & Scita, 2020). Nonetheless, at this point, China is familiarizing itself with the Gulf region and is hesitant to become completely involved in regional politics. China's long-term investments in West Asia might be considered as essential and as a component of China's long-term strategic goals in the area. China's economic growth in the region is unquestionably well-received and has the potential to have a significant impact on local affairs. In fact, China is adhering to its policy of not interfering in local affairs or controversial West Asian problems. China, in contrast to the United States, is anticipated to navigate the Middle East's many ups and downs with caution even in the years to come (Lehr, 2018). Further, the Euro-Atlantic partners have to recognize that China has strengthened its presence in the region by delivering medical help to the Gulf during the global epidemic and carrying out 'mask diplomacy' (Milton-Edwards, 2023). China's financial strength is equally projected to rise, while the naval station in Djibouti offers the possibility for military projection. Given the trend of China's conduct throughout various areas where its economic dominance eventually translates into political influence, it is realistic to expect an ever-more aggressive China in the Gulf region (Lons, 2020).

Scanned with OKEN Scanner

If the Allies fail to rekindle its economic, technological, security, and humanitarian links towards the Gulf, these countries might gradually shift to other global powers, particularly China, to secure regional stability and prosperity.

Re-Emergence of Russian Federation

Russia's active support for the Assad administration, as well as the deployment of Russian airpower and troops on the ground in Syria, propelled Russia into a regional player. Moscow, on the other hand, lacks an overarching plan for the Gulf. Russia fails to maintain a direct military presence in the Gulf, and its economic relationship with the region is limited. However, the military action by Russia in Syria in 2015 gave Moscow the largest impetus to re-enter the West Asian politics (Borshchevskaya, 2022). Aside from supporting Bashar Al-Asa's regime in Syria, Putin administration has not even shown a slight interest in getting involved in any of the region's numerous problems, including the crisis in Yemen, the Arab-Israeli peace process, and the disagreement between Qatar and its neighbors (Charap, et al., 2019; Charap, 2013). Moreover, the confluence of interest in Syria has strengthened the Russian-Iranian cooperation, while this alliance provides a secondary channel for Tehran to reduce the consequences of US sanctions. Moscow's backing for Iran is part of its strategy to challenge the US worldwide hegemony (Yetiv, & Katerina, 2018). However, Iran is an extremely independent actor, and Russia's influence in Tehran is extremely limited. Even during peacetime, the Iranian constitution forbids foreign military presence on its territory (Mousavian & Chitsazian, 2020). Moscow, too, is not afraid to strengthen ties with Iran's regional foes, notably Israel, Saudi Arabia, and the United Arab Emirates. It seems doubtful that Moscow will provide strategic weaponry to Iran, which could irritate Russia's other regional friends, such as Israel (Allison, 2013). Russia and the UAE are both backing the Libyan crisis (Kuznetsov, 2018; Marson, 2018). However, Russia has nearly doubled its exports of weaponry to the region in the

Scanned with OKEN Scanner

last five years and it is expected that with current orders amounting $24 billion, arms sell might be increased by many folds in upcoming years. On contrary, U.S. sales expected to be stable and could be grow nearly $81 billion in next ten years (Lukyanov, 2018). To summarize, Russia's aims in the Gulf appear to be pragmatic and adaptable, prioritizing the safeguarding of past regimes and ensuring the coordination with international oil market activity. Russian officials have suggested establishing a regional security organization similar to the OSCE, but the practicality of this plan is exceedingly doubtful (Borshchevskaya, 2021). Further, China has also shown interest to embark on the foundation for upcoming geopolitical maneuvers in West Asia region (Alami, 2022). Economic growth in the Russian Far East, Central Asia, and the Arctic expected to consolidate strategically Chinese influence in accordance to Jinping's more assertive foreign policy. Beijing has already walked a thin line between cooperating with and competing with Russia, depending on one's point of view (Stronski et al., 2018).

Architecture of India and West Asia Relations

Trade and cultural ties between India and the Arab world date back to the third millennium B.C. Contacts were made between early dynastic Sumerian traders and those of the Kulli civilization in Southern Baluchistan, most likely just after 28000 B.C. The era of the ‘golden age’ of trade links between India and the Arab world may be defined as the time from the establishment of Islam in the 7th century A.D. to about the 10th century A.D. (Mudium, 1994). Based on shared kinship, friendship, trade, and commerce, our ties are still strengthening. The sociocultural connection of Indian Muslims as a result of their holy sites of Macca and Madina being located in this region may be considered as another equally significant element that determines India's foreign policy (Rahman, 2017). More than a lakh Muslims from India perform the Hajj each year. They act as a unifying factor between two areas. Energy and labor have been India's two main economic drivers

Scanned with OKEN Scanner

with the Gulf Cooperation Council (GCC) for the past fifty years. Indian expatriates have made up a sizable, though not dominant, portion of the regional labor market, and India has relied substantially on energy imports from the area. This connection has undoubtedly benefited both parties. However, the relationship is still far less varied and fruitful than it could be. India now occupies a prominent position in global trade. Its commerce increased from $9.5 billion in 2000–2001 to $77.8 billion on average yearly basis between 2011–2015. It is noteworthy to note that since 2011, India has traded more with the rest of the world than China (Anand, 2017), despite total commerce declining in 2015–16, falling to $64.3 billion (a 15% decrease from the previous year).

India's Growing Energy Requirements

India's economy has been expanding steadily in the age of globalization and openness, as have its energy needs. Oil and gas are crucial sources for ensuring the security of the energy supply. In 2017, India was the fourth-largest importer of LNG (Liquefied Natural Gas) and the third-largest user of oil. India has depended largely on the importation of oil and gases from West Asian nations to suit its needs. Saudi Arabia, Iraq, and Kuwait are the three major nations in West Asia that largely meet India's energy needs. The West Asian region provides almost all of the world's gas needs. Therefore, West Asian nations have been of the utmost strategic importance to India. West Asia continues to be essential for ensuring India's energy security since its energy needs are expanding quickly. It is crucial to be aware that more than 4/5 of India's oil and gas needs are met by outside sources (Azhar, 2017). The expansion of the Indian economy has also significantly increased the country's use of oil and gas.

Indian Migration and Diaspora

The early days of oil discoveries and exploration was when the labor migration from India to the GCC began. The revenue of oil exporting and producing nations

Scanned with OKEN Scanner

in the area increased significantly as a result of a sharp rise in oil prices. A great deal of effort was put into several development projects, including building roads and creating amenities like schools, hospitals, homes, airports, offices, and commercial buildings. Due to this, not only highly skilled workers but also semi-skilled and unskilled workers were in demand. India is not just the second-most populous nation in the world, with an excess of labor, but it also boasts a huge pool of highly skilled and educated labor. Indians were the first group of people to go to the Gulf countries as opportunities to make more money appeared, and they were ideally positioned to supply these expanding demands. As a result, chances for these unemployed people to find productive employment are presented by the migration of Indian labor to the Gulf region (Rahman, et al., 2017). In the current situation, these migrants, also known as Diaspora communities, have been actively participating in the social, political, and economic growth of their home countries for many years. These contributions are usually motivated by a feeling of responsibility towards the place of origin, but they are mostly facilitated by deep connections to one's homeland. According to the HCL study, the Indian diaspora has a substantial buying power of almost $300 billion. It indicates Indias significant potential to stimulate economic development. Indian communities and Gulf-based civil societies must be reorganized in order to actively engage in governmental activities. By doing this, India can take advantage of its diaspora and create effective strategies to address the issues caused by Indian migrants to the Gulf. Indian migrants in the Gulf must be seen as soft power, playing a key role for both their home country and the host society.

India's Soft Power Approach

India's soft power is evident in many areas, including international law and multilateral diplomacy, Bollywood, food, yoga, its democratic nature, neutrality, and non-interference. Similar to how we already know that diaspora uses a variety

Scanned with OKEN Scanner

of tactics to influence political allies, the media, international states and non-state organizations, and the governments of both their home and host nations. Political lobbying, media campaigns, fundraising events, the use of contemporary communication technology, election participation, and numerous other activities fall under this category (Gharekhan, 2018). India has a lot of potential to become a world leader by using soft power strategically because it has quickly grown in influence for a young nation in its 75 years of independence (Shivakumar, 2022). Prime Minister, Mr. Narendra Modi, has recently included the use of soft power diplomacy as an instrument for foreign policy. The Indian Diaspora's global presence has grown to be a crucial component in projecting one's soft power influence. They are seen as an essential bridging link between two regions and an unofficial ambassador to foreign policy. It is indisputable that the Indian diaspora in the Gulf has historically received little attention. India has only recently begun to place importance on the Gulf region, as evidenced by the Indian prime minister's diplomatic trips to West Asian nations in general and the Gulf States in particular, including Saudi Arabia, the United Arab Emirates, Qatar, Iran, and Israel. The UAE reciprocated by giving permission for the construction of a temple there. This recent change in posture is the result of a substantial migration of Indian workers into the GGC economies; these workers, who number close to 9 million, have a significant positive impact on both the Indian and Gulf economies.

Conclusions

The past decade has seen the West Asian and Gulf regions embroiled in a cycle of insecurity and instability that fundamentally altered the larger security environment. Structural changes have set free forces that destabilize the region. It led to multi-layered conflicts involving numerous local, regional and global actors. Political unrest, civil wars, sectarian strife, terrorism, religious extremism and secessionist movements have severely impacted the common folk. It in fact led to forced

Scanned with OKEN Scanner

migration and significant economic losses. These issues have created a death-defying security situation and heightened regional rivalries. The threats and security concerns due to these conflicts have significantly affected the international relations of West Asian and GCC countries.

At the beginning, people saw Arab Spring as democratic transformations and a reconfiguration of the regional system. But the second phase has been hampered by a lack of progress and an increase in bloodshed. It happened mostly due to the absence of cohesive backing from international bodies. The current state of unrest has given rise to several security concerns for the local population and has had far-reaching implications for the international community. The changing geopolitical landscape has reduced regional and international interest in political changes, therefore it narrowed the potential for significant transformation. On one hand the United States and Russia persist in their competition by providing military equipment to Gulf states. On the other hand, India maintains a cautious stance as an observer. India's main concerns in West Asia are mostly economic rather than political or hegemonic, like USA and Russia. It requires a cautious approach to the complicated geopolitical panorama. As a result, India's practical approach to its foreign policy in West Asia has been well embraced by other countries in the region. The Indian diaspora residing in Gulf nations strengthens India's influence by using a soft power approaches hitherto they continued strengthening its economic relationships. India's economic stability is heavily reliant on guaranteeing energy security from West Asia. Furthermore, the ongoing crisis in West Asia necessitates that India adopts a more diplomatic and assertive approach. It has the capacity to maintain equilibrium in relationships between competing parties and participate in humanitarian endeavours. India's involvement in peacekeeping activities is vital for safeguarding its interests and promoting stability in the region.

Scanned with OKEN Scanner

Finally, we can say that, India has both difficulties and possibilities in the evolving geopolitical panorama of West Asia. Therefore, India should take a sophisticated and proactive strategy. Due to the region's volatility caused by complicated historical rivalries, continuing hostilities and strategic adjustments, India can effectively handle the volatile situation in West Asia by maintaining diplomatic contacts, using its diaspora and securing its energy resources. It is necessary to understand the deep implications of these geopolitical processes in order to improve India's strategic orientation and promote stability at both regional and global levels.

References

Acemoglu, D. & Robinson, J. (2012). Why Nations Fail: The Origins of Power, Prosperity and Poverty. Crown Publishing Group, London.

Al Jazeera. (2023, March 15). Twelve years on from the beginning of syria's war. Al Jazeera. Retrieved July 30, 2023, from https://www.aljazeera.com/news/2023/3/15/twelve-years-on-from-the-beginning-of-syrias-war

Alami, A.N., Wuryandari, G., Yustiningrum, R.R.E. & Sriyanto, N. (2017). Foreign Policy and Energy Security Issues in Indonesia, Springer, Singapore, p. 13.

Alami, M. (2022). How GCC, China Can Strengthen Their Trade Relations. Arab News, 2022, https://www.arabnews.com/node/2041191/business-economy.

Allison, R. (2013). Russia, the West, and Military Intervention, Oxford University Press, Oxford, UK.

Almujeem, N.S. (2021). GCC Countries' Geoeconomic Significance to China's Geopolitical Ends. Review of Economics and Political Science, 2021.

Anand, A. (2017). Looking West: India's energy requirements and it's West Asia policy. Foreign Policy News. Retrieved July 30, 2023, from

Scanned with OKEN Scanner

http://foreignpolicynews.org/2017/01/09/looking-west-indias-energy-requirements-west-asia-policy/

Azhar, M. (2017). India's Economic Interest in West Asia. In B. Pradhan (Ed.), West Asia in a changing world: The emerging regional architecture and India (pp. 569–571). essay, Academic Foundation. New Delhi

Baghdadi, G. (2014, February 14). Syria peace talks in geneva end in failure. CBS News. Retrieved July 30, 2023, from https://www.cbsnews.com/news/syria-peace-talks-in-geneva-end-in-failure/

BBC (2021). Sheikh Jarrah: Palestinians and Israelis baulk at evictions compromise. British Broadcasting Corporation (BBC- News). Accessed online from https://www.bbc.com/news/world-middle-east-58024060

Borshchevskaya, A. (2021). Putin's war in Syria: Russian foreign policy and the price of America's absence. I. B. Tauris, London. ISBN978 0 75563 463

Borshchevskaya, A. (2022). Russia's Strategic Success in Syria and the Future of Moscow's Middle East Policy. The Washington Institute of Near East Policy. Accessed online from https://www.washingtoninstitute.org/policy-analysis/russias-strategic-success-syria-and-future-moscows-middle-east-policy

BP (2018). BP Statistical Review of World Energy 2018, Accessed online from https://www.bp.com/content/dam/bp/en/corporate/pdf/energy-economics/statistical-review/bp-stats-review-2018-full-report.pdf

Britannica. (2023, August 23). Karl Haushofer. Encyclopedia Britannica. Accessed online from https://www.britannica.com/biography/Karl-Ernst-Haushofer

Cafiero, G. (2018, December 18). Analysis: fighting recedes, but peace in yemen remains distant. Al Jazeera. Accessed online from (July 30, 2023) from http://aljazeera.com/news/2023/7/7/analysis-peace-yemen-remains-distant

Cage, M. (2018). Qatar will leave OPEC. Here's what this means. The Washington Post (6 Dec. 2018). Accessed online from

Scanned with OKEN Scanner

https://www.washingtonpost.com/news/monkey-cage/wp/2018/12/06/qatar-will-leave-opec-heres-what-this-means/?noredirect=on&utm_term=.b68758c726f0

Charap, S. (2013). Russia, Syria and the Doctrine of Intervention. Survival, Vol. 55 (1), pp. 35–41.

Charap, S. Treyger, E. & Geist, E. (2019). Understanding Russia's Intervention in Syria. Santa Monica, CA: RAND Corporation. Accessed online from https://www.rand.org/content/dam/rand/pubs/research_reports/RR3100/RR3180/RAND_RR3180.pdf

Chaziza, M. (2020). The Impact of US Sanctions on Iran's Engagement and Integration in the Belt and Road Initiative. Digest of Middle East Studies, Vol. 29 (2), pp. 167–82.

China Diplomacy. (2018). Xi Jinping delivers a speech at the opening ceremony of the eighth ministerial meeting of the China-Arab states cooperation forum. China's Diplomacy in the new Era. Accessed online from http://en.chinadiplomacy.org.cn/2021-01/27/content_77158712.shtml

Chorev, S. (2023). The Suez Canal: Forthcoming Strategic and Geopolitical Challenges. In: Lutmar, C., Rubinovitz, Z. (eds) The Suez Canal: Past Lessons and Future Challenges. Palgrave Studies in Maritime Politics and Security. Palgrave Macmillan, Cham. https://doi.org/10.1007/978-3-031-15670-0_1

Colgan, J.D. (2014). The Emperor has no Clothes: The limits of OPEC in the global Oil market. International Organization, Vol. 68 (3), pp. 600-613, DOI 10.1017/S0020818313000489

Deudney, D. H. (2023, June 1). geopolitics. Encyclopedia Britannica. Accessed online from https://www.britannica.com/topic/geopolitics

Dosari, Abdullah & George, Mary. (2020). Yemen War: An Overview of the Armed Conflict and Role of Belligerents. Journal of Politics and Law. Vol.13 (1), pp53-65. DOI http://doi.org/10.5539/jpl.v13n1p53

Scanned with OKEN Scanner

EPRS (2022). A strategic partnership with the Gulf – Old ties, new impetus (Policy briefing). European Parliamentary Research Service. Accessed online from https://www.europarl.europa.eu/RegData/etudes/BRIE/2022/739228/EPRS_BRI(2022)739228_EN.pdf

Ernest, J. (2018, December 5). U.S. policy toward Iran after JCPOA. Council on Foreign Relations. https://www.cfr.org/event/us-policy-toward-iran-after-jcpoa

Farah, PD., Cima, E. (2013). Energy Trade and the WTO: Implications for Renewable Energy and the OPEC Cartel. Journal of International Economic Law, Vol. 16 (3), p. 730, DOI 10.1093/jiel/jgt024

Farinelli, F. (2020). Syrian Refugees in Europe: Assessing Challenges, Practices, and Integration Policies. In H. Moodrick-Even Khen, N. Boms, & S. Ashraph (Eds.), The Syrian War: Between Justice and Political Reality (pp. 217-240). Cambridge: Cambridge University Press. doi:10.1017/9781108768016.011

Feierstein, G. M. (2019). Yemen: The 60-year War, Policy Paper 2019 – 2. The Middle East Institute, Washington, DC. Accessed online from https://www.mei.edu/sites/default/files/2019-02/Yemen%20The%2060%20Year%20War.pdf

Feierstein, G.M., Saab, B.Y., Young, K.E. (2022). US – Gulf relations at the crossroads: Time for a recalibration (Policy Memu). The Middle East Institute, Washington DC. Accessed online from https://www.mei.edu/sites/default/files/2022-04/US-Gulf%20Relations%20at%20a%20Crossroads%20-%20Time%20for%20a%20Recalibration.pdf

Ford, RS. (2019). The Syrian civil war – A new stage, but is it the final one? (Policy Paper – 2019 - 8). The Middle East Institute, Washington, DC. Accessed online from https://www.mei.edu/sites/default/files/2019-04/Ford_The_Syrian_Civil_War.pdf

Fulton, J. (2020). China's soft power during the coronavirus is winning over the Gulf states. Accessed online from Atlantic Council:

Scanned with OKEN Scanner

https://www.atlanticcouncil.org/blogs/menasource /chinas-soft-power-during-the-coronavirus-is-winning-over-the-gulf-states/

Gharekhan, C. R. (2018, April 19). The soft power of india. The Hindu. Retrieved July 30, 2023, from https://www.thehindu.com/opinion/lead/the-soft-power-of-india/article23590348.ece

Gurol J., Scita, J. (2020). China's Persian Gulf strategy: keep Tehran and Riyadh content. Accessed online from Atlantic Council: https://atlanticcouncil.org/blogs/menasource/chinas-persian-gulf-strategy-keep-tehran-and-riyadh-content/

Hen-Tov, J. (2012). Communism and Zionism in Palestine During the British Mandate (2nd ed.). Transaction Publishers, New Brunswick, NJ.

Hitti, P. K. (1970). History of the Arabs: From the earliest times to the present (10th edition). Palgrave Macmillan, New York. Accessed online from https://archive.org/details/historyofarabsfr0000hitt/page/n9/mode/2up

HRW. (2021). World Report – 2021 (Events of 2020), Human Right Watch, Washington DC. Accessed online from https://www.hrw.org/sites/default/files/media_2021/01/2021_hrw_world_report.pdf

Hudson, M. C. (2013). Geopolitical shifts: Asia rising, America declining in the Middle East? Contemporary Arab Affairs, 6(3), 458–466. https://doi.org/10.1080/17550912.2013.818777

Jafarova, E. (2014). Solving the Syria knot: dynamics within the UN Security Council and challenges to its effectiveness. Connections 13(2), 25-50. Accessed online from https://www.jstor.org/stable/26326356

Jaffe, A. M. (2018, November 5). Iranian oil sanctions: Myths and realities of U.S. Energy Independence. Council on Foreign Relations. https://www.cfr.org/blog/iranian-oil-sanctions-myths-and-realities-us-energy-independence

JCPOA (2014). Joint Comprehensive Plan of Action. US Department of States. Accessed online from https://2009-2017.state.gov/documents/organization/245317.pdf

Scanned with OKEN Scanner

Kajjo, S. (2020). Syrian Kurds: Rising from the Ashes of Persecution. In H. Moodrick-Even Khen, N. Boms, & S. Ashraph (Eds.), The Syrian War: Between Justice and Political Reality (pp. 268-286). Cambridge: Cambridge University Press. http://doi.org/10.1017/97811087680l6.013

Kassomeh, N., Qanas, J. (2023). Correction to: China and the Gulf States: Economic Relationship, Challenges and Future. In: Kozhanov, N., Young, K., Qanas, J. (eds) GCC Hydrocarbon Economies and COVID. Palgrave Macmillan, Singapore. https://doi.org/10.1007/978-981-19-5462-7_13

Katzman, K. (2020). U.S.-Iran Conflict and Implications for US Policy. Accessed online from Congressional Research Service: https://crsreports.congress.gov/product/pdf/R/R45795

Kingsley, P. Ahmad, R.S. (2022). Israel Evicts Palestinians in Flashpoint Area of East Jerusalem. The New York Times. Accessed online from (08.09.2023) https://www.nytimes.com/2022/01/19/world/middleeast/israel-palestine-jerusalem-eviction.html

Kozhanov, N. (2016). Russian military involvement in the Syrian Conflict: what happens next? In Russia and the Syrian Conflict: Moscow's Domestic, Regional and Strategic Interests (pp. 59-74)." Report of the Head of the League of Arab States Observer Mission to Syria". Accessed online from http://www.columbia.edu/~hauben/Report_of_Arab_League_Observer_Mission.pdf

Kozhanov, N. (2019). Qatar's Exit from the OPEC: Economically Driven, Politically Determined. Gulf Insights Series, Gulf Studies Centre, Qatar University. Accessed online from https://www.qu.edu.qa/static_file/qu/research/Gulf%20Studies/documents/gulf%20insights%205%20Nikolay%20Kozhanov.pdf

Kudahl, C., Bahgat, A. (2021). Study of product standardization policies, procedures and institutions in the GCC and the provision of recommendations to enhance adoption and/or recognition of common standards to enhance trade with and within

Scanned with OKEN Scanner

GCC countries (Policy Paper). EU - Gulf Cooperation Council (GCC) Dialogue on Economic Diversification. Accessed online from https://www.eeas.europa.eu/sites/default/files/documents/Standardisation%20study%20-%20Report%202021%2003.pdf

Kuznetsov, V. (2018). Can Russia, West Cooperate on Libya? Al-Monitor. Accessed online from https://www.al-monitor.com/originals/2017/05/russia-west-eu-cooperate-libya-trump-putin.html

Lehr, D. (2018, July 21). How China is winning over the middle east. The Diplomat. Accessed online from (July 30, 2023), from https://thediplomat.com/tag/china-middle-east-relations/

Levanoni, M. (2020). Proxy Wars in Syria: Exploitation of the Palestinian Issue in the Syrian Crisis. In H. Moodrick-Even Khen, N. Boms, & S. Ashraph (Eds.), The Syrian War: Between Justice and Political Reality (pp. 165-179). Cambridge: Cambridge University Press. doi:10.1017/9781108768016.008

Lons, C. (2020). China's growing presence in the Gulf. Accessed online from IISS: https://www.iiss.org/blogs/podcast/2020/07/chinas-growing-presence-in-the-gulf

Lukyanov, F. (2018, December 28). Will us pullout from syria increase risk of conflict with russia. Al-Monitor. Retrieved July 30, 2023, from https://www.al-monitor.com/pulse/originals/2018/12/russia-us-syria-trump-putin.html

Macalister, T. (2008). Russia, Iran and Qatar announce Cartel that will control 60% of World's gas supplies. The Guardian (news), October, 22 2008. Accessed online from https://www.theguardian.com/business/2008/oct/22/gas-russia-gazprom-iran-qatar

Mahan, Alfred Thayer (1890). The influence of sea power upon history, 1660–1783. Boston: Little, Brown, and company. Accessed online from https://archive.org/details/seanpowerinf00maha/page/n3/mode/2up

Marson, J. (2018). After Military Push in Syria, Russia Plays Both Sides in Libya. Wall Street Journal. Accessed online from https://www.wsj.com/articles/after-military-push-in-syria-russia-plays-both-sides-in-libya-1528372802

Scanned with OKEN Scanner

Milton-Edwards, B. (2023). The survival of small states in the Gulf region: COVID-19, pandemic politics and the future of niche diplomacy. International Politics, Vol. 60, pp. 390–405. https://doi.org/10.1057/s41311-021-00343-y

Mousavian, S.H. Chitsazian, M.R. (2020). Iran's Foreign Policy in the Middle East: A Grand Strategy. Middle East Policy. Vol. 27 (3), pp. 99-114.

Mudiam, P. R. (1994). India and the Middle East. British academic Press.

Murtoff, J. (2023, March 17). Lebensraum. Encyclopedia Britannica. Accessed online from https://www.britannica.com/topic/Lebensraum

Naheem, M.A. (2017). The dramatic rift and crisis between Qatar and the Gulf Cooperation Council (GCC) of June 2017. International Journal of Disclosure and Governance, Vol. 14 (4), pp. 266-267. DOI 10.1057/s41310-017-0025-8

Nawaz, Madiha; Irfan, N. & Ahmad, S.S. (2021). Syrian Civil War: In the Context of Conflict Resolution (Mediation Efforts). Pakistan Journal of International Affairs, Vol 4(1), pp. 565-588.

Nele, Matz. (2005). Civilization and the Mandate System under the League of Nations as Origin of Trusteeship, in: A. von Bogdandy and R. Wolfrum, (eds.), Max Planck Yearbook of United Nations Law, Vol. 9, pp. 47–95.

O'Loughlin, John & van der Wusten, Herman. (1990). The Political Geography of Panregions. Geographical Review, Vol. 80 (1), pp. 1-20. https://doi.org/10.2307/215894.

Pappé, Ilan. (1992). The Making of the Arab–Israeli Conflict, 1947–1951. London: I. B. Tauris, pp. 335.

Pappé, Ilan. (2004). A History of Modern Palestine: One Land, Two Peoples. Cambridge University Press. London.

Pappé, Ilan. (2014). The Idea of Israel: A History of Power and Knowledge, Verso, London.

Parker, J. (2020). The Spillover Effects of the Syrian Civil War: Regional Ramifications for Refugees. In H. Moodrick-Even Khen, N. Boms, & S. Ashraph

Scanned with OKEN Scanner

(Eds.), The Syrian War: Between Justice and Political Reality (pp. 198-216). Cambridge: Cambridge University Press. doi:10.1017/9781108768016.010

Philip, L., Sturge, G., Kirk-Wade, E. (2023). The Syrian civil war: Timeline and statistics (Research Briefing Number 9381). House of Commons Library, UK Parliament. United Kingdom. Accessed online from https://researchbriefings.files.parliament.uk/documents/CBP-9381/CBP-9381.pdf

Rahman, A. (2009). Indian diaspora in the gulf: Problems and prospects. Diaspora Studies, 2(1), 31–51. https://doi.org/10.1163/09763457-00201002

Rahman, A. (2017). The presence of India community a potential factor strengthening Indo-West Asian Relations. In B. Pradhan (Ed.), West Asia in a changing world: The emerging regional architecture and India (pp. 613–625). essay, Academic Foundation. New Delhi.

Rahman, A. Ahmad, W & Suhail, M. (2022). Geopolitics of West Asia – Regional Issues in Global Perspectives (eds.). Vishwagyan Prakashan, New Delhi. ISBN-9789383837366.

Rahman, M., Tan, T.Y. (2017). International Migration and Development in South Asia. Routledge. UK

Reuters (2018). U.S. grants temporary Iran oil waivers to eight countries including China: Pompeo Reuters news dated November 5, 2018. Accessed online from https://www.reuters.com/article/us-usa-iran-sanctions-waivers-idUSKCN1NA1OS

Robinson, K. (2023). Yemen's Tragedy: War, Stalemate, and Suffering. Council on Foreign Relations. Accessed online from https://www.cfr.org/backgrounder/yemen-crisis

Saab, B.Y. (2022). Integrated deterrence with the Gulf. In (eds) Feierstein, G.M., Saab, B.Y., Young, K.E. US – Gulf relations at the crossroads: Time for a recalibration (Policy Memu). The Middle East Institute, Washington DC.

Scanned with OKEN Scanner

Sarker, M.N.I. Hossin, M.A. Yin, X.H. & Sarkar, M.K. (2018). One Belt One Road Initiative of China: Implication for Future of Global Development. Modern Economy. Vol. 09, pp. 623-638. http://doi.org/10.4236/me.2018.94040

Scita, J. (2023). Can China Be the JCPOA's Last Hope? Accessed online from The Diplomat: https://thediplomat.com/2023/02/can-china-be-the-jcpoas-last-hope/

Shivakumar, S. (2022, August 15). As a soft power, india can lead and the world will follow. The Hindu Business Line. Retrieved July 30, 2023, from https://www.thehindubusinessline.com/india-at-75/as-a-soft-power-india-can-lead-and-the-world-will-follow/article65764948.ece

Spykman, Nicholas John. (1942). America's Strategy in World Politics: The United States and the Balance of Power, New York, Harcourt, Brace and Company. Accessed online from https://archive.org/details/in.ernet.dli.2015.12310/page/n1/mode/2up

Stronski, P. Nicole, NG. (2018). Cooperation and Competition: Russia and China in Central Asia, the Russian Far East, and the Arctic. Carnegie Endowment and International Peace. Accessed online from (08.09.2023) https://carnegieendowment.org/2018/02/28/cooperation-and-competition-russia-and-china-in-central-asia-russian-far-east-and-arctic-pub-75673

United Nation. (2020). Situation of human rights in Yemen, including violations and abuses since September 2014. Report of the Group of Eminent International and Regional Experts on Yemen (Advance Edited Version). Human Rights Council, Forty-fifth session (Agenda item 2). Accessed online from https://www.ohchr.org/sites/default/files/Documents/HRBodies/HRCouncil/GEE-Yemen/2020-09-09-report.pdf

Uridisen, K. C. (2018, December 10). Why is qatar leaving opec. The New York Times. Retrieved July 30, 2023, from https://www.nytimes.com/2018/12/10/opinion/qatar-leaving-opec-saudi-arabia-blockade-failure.html

US Department of States. (2022). Integrated Country Strategy (ICS) – Saudi Arabia. US Department of States. Washington DC. Accessed online from

Scanned with OKEN Scanner

https://www.state.gov/wp-content/uploads/2022/07/ICS_NEA_Saudi-Arabia_Public.pdf

Wright, S. (2018). Why Qatar left OPEC - Qatar chose to leave OPEC at a time when the future of the cartel is under question. Aljazeera (Opinion - OPEC), December, 6 2018 (news) accessed online from https://www.aljazeera.com/opinions/2018/12/6/why-qatar-left-opec/

Yetiv, S.A. Katerina, O. (2018). Challenged Hegemony: The United States, China, and Russia in the Persian Gulf. Stanford University Press, Stanford, USA.

Yildiz, A. (2020). Security and political dynamics in the Gulf. Political Committee (PC), NATO Parliamentary Assembly, Sub-Committee on Transatlantic Relations (Report - 038 PCTR 20 E rev.2 fin). Accessed online from https://www.nato-pa.int/download-file?filename=/sites/default/files/2020-12/038%20PCTR%2020%20E%20rev%202%20fin%20-%20SECURITY%20AND%20POLITICAL%20DYNAMICS%20IN%20THE%20GULF.pdf

Young, K. (2019). Mapping economic diversification across the Gulf Cooperation Council. Accessed online from American Enterprise Institute: https://www.aei.org/research-products/report/mapping-economic-diversification-across-the-gulf-cooperation-council/

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

RIGHT TO BE FORGOTTEN VIS-À-VIS RIGHT TO PRIVACY UNDER CONSTITUTION OF INDIA

1. Rahul Kumar,

Research Scholar, Faculty of Law, University of Delhi

2. Dr. Rahul Kumar,

Assistant Professor, Campus Law Centre, University of Delhi

ABSTRACT;The importance of privacy in the digital age has been a topic of extensive debate since the start of this decade. As technological advancements continue, there is massive generation, storage and sharing of personal data on various digital platforms. During this era, both state and non-state actors have witnessed almost an exponential increase in their capacity to gather and analyze data most often without the individual's consent or knowledge. With advancement in digital technologies, informational privacy has become more important forcing legal frameworks and judicial interventions to change. The world's legal system has slowly started interpreting these laws and coming up with new ones to govern Informational Privacy and one crucial factor about Informational Privacy is Right to be forgotten (thereafter referred as RTBF). The RTBF, as a subset of this broader right, allows individuals to request the erasure of their personal data from public or digital platforms, thereby ensuring that their privacy is safeguarded from unnecessary exposure or misuse. The SC in **Justice K.S. Puttaswamy & Anr. v. Union of India & Ors66** affirmed this connection, recognizing RTBF as an part of Right to privacy. The Digital Personal Data Protection (DPDP) Act, 2023 enhances the RTBF in India by establishing a legal mechanism through which individuals can

66 *Justice K.S. Puttaswamy & Anr. v. Union of India & Ors* , AIR 2018 SC 1841

Scanned with OKEN Scanner

seek the removal of their personal data. Following the enactment of the DPDP Act, 2023, the debate surrounding the RTBF in India has resurfaced, raising important questions about its position within the Indian legal framework. To fully understand the implications of the RTBF, it must be analyzed in conjunction with the Right to Privacy, as both fall under the broader scope of informational privacy. This work critically examines the RTBF and the Right to Privacy, considering their constitutional basis under Article 21, recent judicial rulings, and the provisions of the DPDP Act, 2023.

Keywords: Right to be Forgotten, Right to Privacy, DPDP Act, 2023, Data in Digital Age

INTRODUCTION

Privacy is a fundamental element of personal freedom, originating from the Latin term 'privatus,' which signifies something private, secret, or personal, distinct from public or state ownership.67 This concept entails the control over one's personal affairs, allowing individuals to decide what aspects of their lives to keep confidential. Globally, the right to privacy is considered as a basic human right under Art.12 of the UDHR of 1948.68 In India, this right is enshrined as a fundamental right under Art.21 of the Const., a status that was affirmed by the SC in the pivotal case **Justice K.S. Puttaswamy & Anr. v. Union of India & Ors**69

The Puttaswamy case stands as a landmark judgment for several reasons, and one the facet for which it is remembered is its emphasis on recognizing and protecting informational privacy in India. The SC of India held that to make the right to privacy meaningful, the state must establish a robust data protection framework

---

67 Payal Thaorey, *Informational Privacy: Legal Introspection in India*, II ILI L. Rev. 161, 162 (2019).
68 Aysem Diker Vanberg, THE RIGHT TO PRIVACY REVISITED: DIFFERENT INTERNATIONALPERSPECTIVE 56 (2021)
69 *Supra 1*

Scanned with OKEN Scanner

and give due respect to the informational privacy. The Court outlined the state's duty to ensure that such protections are in place, thereby guiding the committee responsible for creating the data protection framework to prioritize these principles. This judgment has significantly shaped the legal landscape concerning privacy and data protection in India, highlighting the necessity for comprehensive measures to protect personal information in the digital age.

The DPDP Act, 2023 strengthens the RTBF in India by providing a legal framework for individuals to request the erasure of their personal data.70 This right is derived from the fundamental right to informational privacy, which is a facet of the right to life and personal dignity under Art.21 of the Indian Const. The SC's landmark judgment in **Justice K.S. Puttaswamy & Anr. v. Union of India & Ors**71 highlighted this connection and established the right to privacy as a fundamental right. The DPDP Act, 2023 builds upon this by granting data principals (individuals) the right to request the erasure of their personal data in certain circumstances.72 The Act also outlines the provisions for the establishment of the Data Protection Board of India, which can adjudicate on complaints related to the violation of data principals' rights, including the Right to Be Forgotten.

The inclusion of the RTBF in the DPDP Act strengthens individuals' control over their personal information in the digital space.73 It allows data principals to seek the removal of outdated, irrelevant, or unnecessary personal data, thereby mitigating potential harm caused by the persistence of such information online. This legislative framework, coupled with the SC's recognition of the right to informational privacy, provides a robust legal basis for enforcing the RTBF in

---

70 Th Digital Personal Data Protection Act, 2023, S.12
71 *Supra 1*
72 Rang Nath Pandey, LAW OF DIGITAL PERSONAL DATA PROTECTION IN INDIA 66 (2024)
73 D P Mittal, COMMENTARY ON THE DIGITAL PERSONAL DATA PROTECTION ACT, 2023 65 (2023)

Scanned with OKEN Scanner

India. It aligns with global trends in data protection and privacy laws, such as the EU GDPR, which also grants individuals the right to erasure

The DPDP Act, 2023 marks a pivotal step in protecting individuals' privacy rights in the rapidly expanding digital landscape.74 By incorporating the Right to Be Forgotten, the Act empowers data principals to exercise greater control over their personal information and seek the removal of data that may be detrimental to their interests. This legal framework, built upon the foundation of the fundamental right to privacy, ensures that the right to informational self-determination is upheld in the digital realm.

In 2015, Russia enacted a law empowering individuals to compel search engines to delete their personal information upon request. This deletion can be pursued on grounds such as legal violations, irrelevancy, or inaccuracy. Similarly, the RTBF has gained significant recognition in other countries, including Siberia and Turkey, reflecting a broader global trend towards enhancing individuals' authority over their personal data.

CONCEPTUAL ANALYSIS OF RIGHT TO PRIVACY AND THE RIGHT TO BE FORGOTTEN

Privacy is a fundamental human right that underpins individual autonomy and dignity, allowing control over personal information, freedom from unwarranted surveillance, and the ability to make personal choices without interference. In India, significant judicial and legislative milestones have marked the evolution of privacy rights, notably the Supreme Court's ruling in **Justice K.S. Puttaswamy & Anr. v. Union of India & Ors75**, which established privacy as a fundamental right under Article 21 of the Constitution. This landmark decision underscored the necessity for a comprehensive data protection framework to safeguard informational privacy

---

74 Puneet Bhasin, PRACTICAL GUIDE TO DIGITAL PERSONAL DATA PROTECTION ACT, 2023 68 (2024)
75 *Supra 1*

Scanned with OKEN Scanner

against threats from both state and non-state actors, emphasizing the critical nature of protecting personal information in today's digital landscape. Historically, privacy was not explicitly recognized as a fundamental right; early judgments, such as **MP Sharma v. Satish Chandra**[76] and **Kharak Singh v. State of Uttar Pradesh**[77], dismissed it as such. However, dissenting views, particularly from Justice Subba Rao, contributed to the eventual acknowledgment of privacy as a fundamental right in the case of **Gobind v. State of Madhya Pradesh**[78]. Further solidifying this right, the Digital Personal Data Protection Act, 2023 empowers individuals to request the deletion of their personal data, thereby enhancing the Right to Be Forgotten and providing greater control over personal information in the digital space.

The RTBF, also referred to as the "right to erasure", is the jurisprudence that gives individuals rights over the deletion of their personal data from online platforms and search engines.79 This right is based on the premise of an individual being entitled to their personal information and, if so wishes, to withdraw consent for the use of that information. When the legal basis for processing data is no longer valid, such as when consent is withdrawn or the data is no longer necessary for the original purpose, individuals can demand the erasure of their data. In the event of a successful erasure request, the data controller must remove the personal data and take reasonable steps to inform any third parties holding or processing the same information to delete it as well. This includes removing any links, copies, or replicas of the data.

The RTBF comes from French law. More correctly termed as the "right to oblivion," this right had the purpose of aiding people who had already served their sentence in readjusting to society by prohibiting the publication of information

---

76 *MP Sharma v. Satish Chandra,* A.I.R 1954 S.C 300 (India)

77 *Kharak Singh v. State of Uttar Pradesh* , A.I.R 1963 S.C 1295(India)

78 *Gobind v. State of Madhya Pradesh A.I.R 1975 S.C 1378 (India)*

79 Rahul Kandharkar, AN INSIGHT ON THE DIGITAL PERSONAL DATA PROTECTION ACT, 2023 112 (2023)

Scanned with OKEN Scanner

about past crimes. The EU Data Protection Directive of 1995 further developed this idea by introducing Art.12, which required member states to provide individuals with the ability to control, rectify, erase, or block data pertaining to them. This is not an absolute right, and there are a number of exemptions to this, including when the data may be required to exercise the right of freedom of expression, compliance with a legal obligation, or performance of a task carried out in the public interest. However, the principle nonetheless remains an important tool for individuals to gain greater control of their online presence and personal information.

The "RTBF" has evolved within the EU context and became a much-hyped legal fight after the landmark judgment in the case of **Google Spain80**. In this landmark judgment, the ECJ held that Google was obliged, being the leading search engine, to remove links to personal data at the request of the EU citizens where the information was obsolete or no longer relevant. This judgment marked an important milestone in the evolution of data protection rights.

The principle of the RTBF was formally established in Art.17 of the GDPR enacted in 2016, which empowers individuals to request the deletion of personal data that is no longer necessary or relevant. This legal framework enhances individuals' control over their personal information in the digital landscape and reflects the EU's dedication to safeguarding privacy in an increasingly interconnected environment.

The incorporation of the RTBF into the GDPR has far-reaching implications, highlighting the need to balance individual privacy rights with the public's right to access information. This regulatory advancement sets a significant precedent for

---

80 Google Spain SL, Google Inc. v Agencia Española de Protección de Datos, Mario Costeja González ,C- 131/12, ECLI:EU:C:2014:317

Scanned with OKEN Scanner

data protection laws worldwide, influencing how personal data is managed and protected across various jurisdictions.

In the landmark judgment of the **TU & RE v. Google LLC**[81], the ECJ determined that the responsibility to prove the inaccuracy of information lies with the data principal. Only when this inaccuracy is established does the duty of the data fiduciary to remove the information arise. Moreover, the court extended the scope of the right to erasure defined in the Google Spain case, now including the removal of photographs or thumbnails even if they link to the original source. This removal, however, must be balanced against the rights and public interest involved.

Close to that time, In 2017, the SC of India, in its landmark Judgement of **Justice K.S. Puttaswamy & Anr. v. Union of India & Ors**[82] decision, given due recognition to the right to privacy as a fundamental right under Art.21 of the Indian Const. This recognition came from a historic ruling by a Nine-Judge Bench, which underscored the significance of privacy in the digital age. The right to informational privacy has become increasingly critical as technology advances, with individuals leaving digital footprints across various platforms, whether private or governmental. Sensitive personal information is readily available on media platforms, particularly social media, which exposes individuals to potential misuse by malicious actors or exploitation by large corporations for personal gain. The "RTBF" emerges as a vital mechanism, allowing individuals to control the spread of their personal information online, thereby preventing the rampant misuse of freely accessible data on the internet. Nonetheless, several High Courts have acknowledged its importance, drawing inspiration from the observations made by Justices Rohinton F. Nariman and Sanjay Kishan Kaul in the Puttaswamy judgment. These courts have issued interim orders that uphold the "RTBF" as an integral element of the

---

81 TU & RE vs Google LLC, CJEU - C-460/20
82 *Supra 1*

Scanned with OKEN Scanner

fundamental right to privacy, signaling a progressive shift towards its broader acceptance and implementation in India.

In the 2023 case of **Vyskh K.G. v UOI** ,83 the Court permitted the masking of names in family and matrimonial cases, citing the RTBF as the basis for this decision.

In the recent case of **ABC v. UOI and Others**84, the HC of Bombay directed to remove the acquittal order of an individual from the official cite of the Court. This decision was made in response to a plea by an individual who had been acquitted but was facing issues in securing employment due to the publicly accessible acquittal order.

RIHT TO BE FORGOTTEN AS A PART OF RIGHT TO PRIVACY UNDER INDIAN CONSTITUTION

The concept of the RTBF has not been explicitly mentioned under the Indian Constitution. However, through a series of judicial pronouncements, the judiciary has recognized and outlined that RTBF is intricately intertwined with the Right to Privacy. In various judgments, the courts have elucidated that the Right to Privacy encompasses not only the protection of personal information but also the right to control and manage one's digital identity. This evolution has been particularly pronounced in cases involving the removal of objectionable or outdated information from online platforms, where the courts have emphasized an individual's right to be free from unwarranted intrusion into their private affairs.

In the Indian context, the Supreme Court's landmark 2017 judgment **in Justice K.S. Puttaswamy & Anr. v. Union of India & Ors**85 of India highlighted that the RTBF is encompassed within the broader right to privacy. This recognition underscored the integral role of RTBF in protecting individuals' personal data and maintaining their autonomy over their digital presence.

---

83 *Vyskh K.G. v Union of India* , WP(C) 26500/2020
84 *ABC v. Union of India and Ors.* , W.P. No. 3499 of 2021
85 *Supra 3*

Scanned with OKEN Scanner

In 2017, the Karnataka High Court made a significant ruling in the case of **Sri Vasunathan v. The Registrar-General**[86], which acknowledged the RTBF in India. This decision allowed individuals to request the removal of their names from judgments that could adversely affect their reputations, setting an important legal precedent for the erasure of personal data in sensitive situations.

Later, in 2019, the Delhi HC took further steps to reinforce this right in the case of **Zulfiqar Ahman Khan v. M/S Quintillion Business Media**[87]. The petitioner sought to have two articles removed from a news website that discussed him in the context of the #MeToo movement. The court recognized the RTBF and the Right to Be Left Alone as fundamental aspects of the Right to Privacy. As a result, it mandated the removal of the articles, highlighting the necessity of safeguarding individuals from lasting reputational damage due to unverified claims.

In 2020, the Orissa HC acknowledged in the case of **Subhranshu Rout v. State of Odisha**[88], that the "RTBF" or the right to be "deleted" is indeed a part of the right to privacy. This case dealt with the removal of objectionable pictures and videos of a girl from social media. The court emphasized that once information enters the public domain, it becomes irretrievable, likening it to toothpaste that cannot be put back into the tube. The Indian Criminal Justice system imposes stringent penalties on accused individuals for serious crimes, yet it lacks mechanisms to protect victims' rights to have objectionable photographs removed from platforms like Facebook servers. The increasing prevalence of harassment, threats, and assaults online has become a significant concern for citizens, highlighting the urgent need for measures to address such insensitive behaviors on social media platforms. The victim in this case struggled unsuccessfully to permanently delete such photos

---

86 *Sri Vasunathan v. The Registrar-General* , 2017 SCC OnLine Kar 424
87 *Zulfiqar Ahman Khan v. M/S Quintillion Business Media*, CS (OS) 642/2018
88 *Subhranshu Rout v. State of Odisha*, 2021 SCC OnLine Del 2306

Scanned with OKEN Scanner

from servers, underscoring the challenges faced in managing one's online presence effectively.

In April 2021, the Delhi High Court, in the case of **Jorawar Singh Mundy v. UOI and Ors.**[89], issued an interim order recognizing the right to be "forgotten" as a component of the fundamental right to privacy.

The Karnataka High Court's ruling in the case of **X v. The Registrar General, High Court of Karnataka & Ors**[90] stands as a landmark precedent, notably recognizing the RTBF as an integral aspect of the right to informational privacy. The counsel for the High Court contended that masking of the name is permissible only for the victim and not the accused. It was stated that merely because he was discharged or acquitted would not mean that his name should not be used as an accused.

"Right to oblivion; right to be forgotten are the principles evolved by the democratic nations, as one being a facet of the right to informational privacy. Countries like France and Italy, had by themselves evolved the concept of right to oblivion, which dates back to the 19th century. Europe, in the European Union has, over privacy and personal data, evolved the principle of right to be forgotten, as a right to be a part of one's right to personality, which encompasses dignity, honour and right to a private life. The aforesaid principles evolved from time to time, can be paraphrased into what could become right to life under Article 21 of the Constitution of India,"

In the case of **Sredharan T v. State of Kerala**[91], the Kerala HC recognized the significance of the RTBF as a fundamental aspect of the Right to Privacy. The petitioner submitted a writ petition under Art.21 of the Indian Constitution, aiming to protect privacy rights and sought the court's intervention to instruct search engines to eliminate the name and personal details of a rape victim, thereby

---

89 Jorawar Singh Mundy vs. UOI and Ors , W.P.(C) 3918/2021
90 X v. The Registrar General, High Court of Karnataka & Ors , W.P. (C) 1137 OF 2018
91 Sredharan T v. State of Kerala Sredharan T v. State of Kerala, WP(C).No. 9478 of 2017

Scanned with OKEN Scanner

preserving her anonymity. The court ruled in favor of the petitioner, affirming the importance of the RTBF, and issued an interim directive for the search engine to remove the victim's name from any published orders on its platform until further notice.

In the case of Karthick Theodore92, the Madras HC ruled that once information becomes public, individuals can no longer claim a right to privacy over it. The court referenced Justice Kaul's opinion, which stated that the RTBF cannot be invoked when public interest is associated with the information in question. Justice Venkatesh emphasized that administering justice publicly serves the public interest. Critics argue that this interpretation misreads the Puttaswamy judgment, which does not suggest that the RTBF ceases to exist once information is public. Justice Kaul's views in the Puttaswamy case indicate that even when individuals voluntarily share information, the state must obtain meaningful consent at every stage of its use.

These judicial statements illustrate that the judiciary acknowledges the RTBF as a vital aspect of privacy, closely tied to Art.21 of the Indian Constitution. Nevertheless, the SC of India has yet to explicitly recognize it as a fundamental right within Indian law. Currently, the RTBF exists mainly as a statutory right under the Digital Personal Data Protection Act, 2023, which provides a framework for individuals to request the removal of their personal data from digital platforms, thus allowing them to manage their online presence. Although judicial interpretations have highlighted its connection to the broader right to privacy, formal recognition as a fundamental right is still pending from the SCof India.

---

92 Karthik Theodore v Registrar General and Ors, W.A.(MD)No.1901 of 2021

Scanned with OKEN Scanner

ENFORCEABILITY OF RTBF IN INDIAN CONTEXT

The enforceability of RTBF against private entities hinges on this interpretation. If personal liberty under Art.21 can be violated by private actors, then the RTBF, as an aspect of the right to privacy, should similarly be enforceable against non-state entities. 93 This is particularly pertinent in the digital age, where private companies like social media platforms and search engines control vast amounts of personal data. These entities can significantly impact individuals' privacy rights, making it essential to extend RTBF protections horizontally. However, recognizing this enforceability raises complex questions about the balance of rights.

One of the most frequent criticisms against the application of the RTBF is whether it could be applied against non-state entities. However, the Const. does not prohibit the horizontal application of Art.21. Art.21 safeguards the personal liberty of an individual, which cannot be violated except by procedure established by law. The Constitution did not limit this protection only to acts of the state; thus, the horizontal application of Art.21 is allowed. The Supreme Court, drawing its powers from Art.32, applied this reasoning in the **Vishaka v. State of Rajasthan94** case, where it issued guidelines that private actors were also required to follow. Similarly, in Paramananda Katara, the Court interpreted Art.21 to impose a positive obligation on private doctors, demonstrating that private entities can be held accountable for protecting fundamental rights.

In **'X' v. Hospital 'Z'95**, the courts observed that when two fundamental rights come into conflict, the right that best serves the public interest must take precedence. But this balancing of public interest against individual rights is bound to become arbitrary. It uses a utilitarian argument that often ignores notions of justice. Take,

---

93 OBLIGATION OF PRIVATE PARTIES TO UPHOLD FUNDAMENTAL RIGHTS, available at https://www.lexology.com/library/detail.aspx (last visited on June 23, 2024)

94 Vishaka v. State of Rajasthan, (1997) 6 scc 241

95'X' v. Hospital 'Z', A.I.R 1999 S.C 495

Scanned with OKEN Scanner

for example,In the case of **Sundarrajan v. UOI**[96], SC granted permission to construct a power plant in Kudankulam based on the fact that the greater public good outweighed the individual violation of Art.21 which was limited to a certain community. Justice Mishra refused this narrow-based utilitarianism theory and held that "the life of some cannot be sacrificed for the purpose of the eventual larger good." Additionally, Ronald Dworkin argues that such calculations, balancing public interest and individual rights, are frequently influenced by inherent biases, failing to apply egalitarian principles. Simply assigning greater value to one side because it benefits or is supported by more people can lead to majoritarianism. Therefore, while public interest is a critical factor, it should not be the sole criterion in judicial decisions.

In cases where individuals acquitted of charges seek to prevent judgments that mention their names from being publicly accessible, the Hon'ble Delhi HC addressed this issue in the case of **Jorawar Singh Mundy v. UOI**[97]. The court granted interim relief to an American citizen of Indian descent, instructing the legal website 'Indian Kanoon' to remove the judgment following his acquittal under the NDPS Act. However, blocking such judgments could hinder public access to the underlying facts and circumstances of the acquittal.

Rather than completely blocking these judgments, a more effective solution might be to redact the names of the petitioners from the text of the judgments. It is important to consider that if every acquittal led to the blocking of judgments, it could overwhelm Indian courts with numerous applications based on this right. Thus, while protecting individual privacy is crucial, it must be balanced with the public's right to access judicial information.

---

96 Sundarrajan v. UOI , AIR 2013 SC (SUPP) 615
97 Jorawar Singh Mundy v. UOI, 2021 SCC OnLine Del 2306

Scanned with OKEN Scanner

LEGISLATIVE ENACTMENT IN INDIA ON RTBF

The legislature has actively contributed to the protection and regulation of digital personal data by enacting the DPDP Act, 2023.98 This legislation aims to strike a balance between individual rights and public interest in the processing of digital personal data. Section 12 of the DPDP Act, 2023 introduces the concept of the right to correction and erasure of personal data, ensuring that individuals, referred to as Data Principals, maintain control over the accuracy and relevance of their personal information. Under Section 12(1), a Data Principal is granted the right to request correction, completion, updating, and even erasure of their personal data that has been processed based on prior consent, including consent given under Section 7(a). This empowers individuals to maintain the integrity of their personal data in line with any legal requirements or procedures currently in force. Section 12(2) places obligations on Data Fiduciaries, the entities responsible for processing personal data. Upon receiving a request from the Data Principal, the Data Fiduciary must take action to correct any inaccurate or misleading data, complete incomplete data, and update any outdated information. This ensures that personal data remains accurate and relevant for its intended purpose. Furthermore, Section 12(3) enables the Data Principal to request the erasure of their personal data through a prescribed procedure. Once such a request is made, the Data Fiduciary is required to erase the data, unless it is necessary to retain it for specific purposes, such as compliance with any applicable laws or regulations. Together, these provisions in Section 12 underscore the DPDP Act's focus on enhancing individual rights regarding the management and protection of personal data, allowing individuals to correct or remove data that is no longer accurate, relevant, or legally required.

---

98 UNDERSTANDING INDIA'S NEW DATA PROTECTION LAW, available at https://carnegieendowment.org/research/2023/10/understanding-indias-new-data-protection-law?lang=en (last visited on June 25, 2024)

Scanned with OKEN Scanner

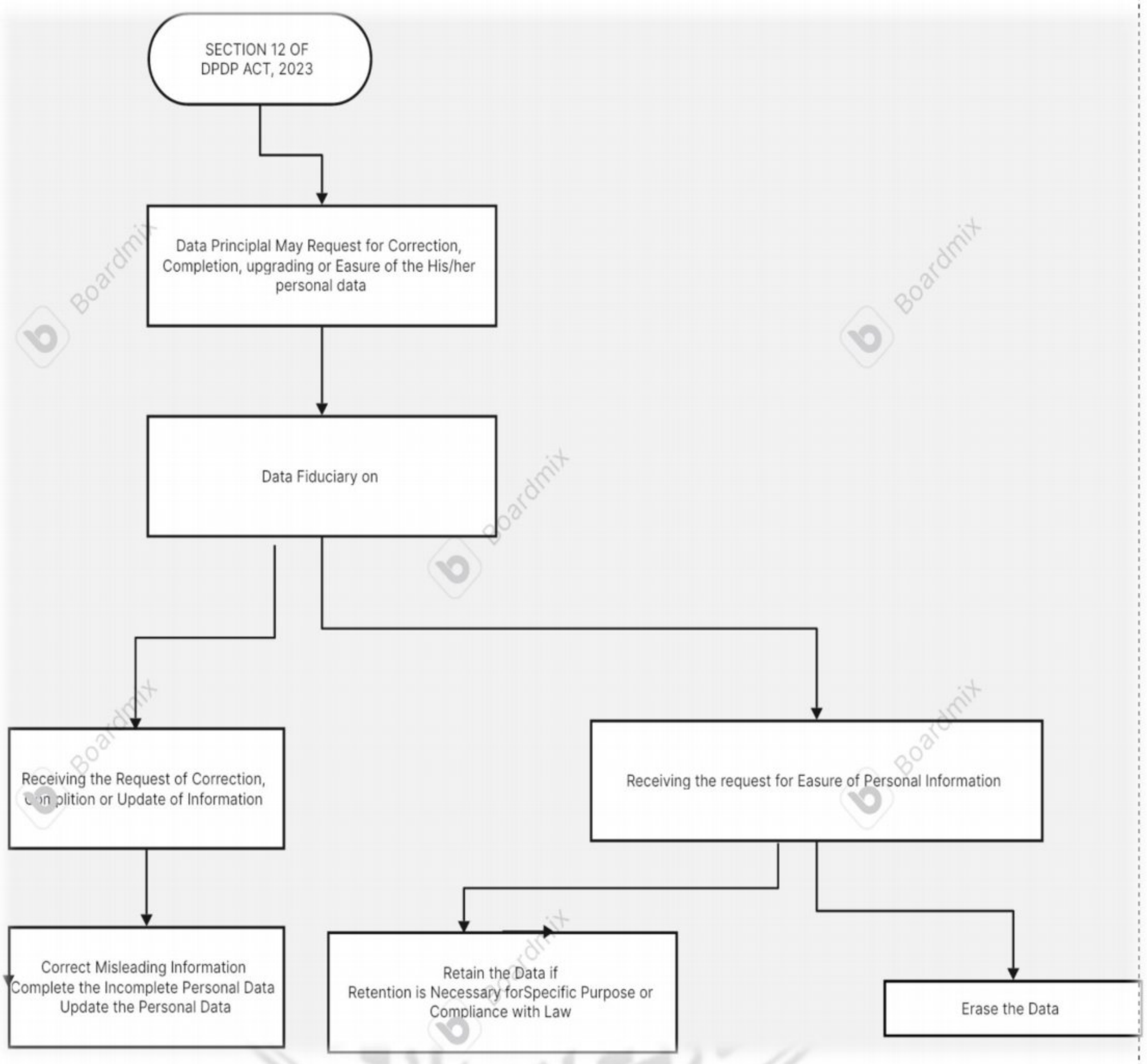

Credit: (This Above Diagram has been designed by the Author with the help of the Boardmix)

RIGHT TO BE FORGOTTEN AND CONFLICT WITH OTHER FUNDAMENTAL RIGHTS

The RTBF is a complex and controversial issue that has been the subject of much debate and legal interpretation in recent years. At its core, the RTBF is a concept that allows individuals to request that certain information about them be removed from public records and online platforms. This information may include outdated

Scanned with OKEN Scanner

or inaccurate information, or information that is no longer relevant to the individual's life or circumstances.

Freedom of speech is a fundamental human right that allows individuals to express their opinions, ideas, and beliefs without fear of censorship or retaliation. It is enshrined in many constitutions and international human rights treaties, including the Universal Declaration of Human Rights. The right to freedom of speech includes not only the right to express opinions, but also the right to seek, receive, and impart information and ideas through any media or medium, including the internet. However, this right is not absolute and may be limited in certain circumstances, such as to protect public safety, national security, and the rights of others. Nonetheless, freedom of speech is considered a cornerstone of democratic societies, as it allows for the free exchange of ideas and promotes open discourse and accountability. In the context of the Indian Constitution, the right to "Freedom of Speech and expression" is protected under Article 19(1)(a). This provision ensures that all citizens of India have the right to express their opinions freely, without fear of censorship or punishment. The Constitution also allows for the freedom of the press, which plays a critical role in a democratic society by providing information, facilitating public debate, and holding the government accountable. However, like all fundamental rights, the right to "Freedom of Speech and expression" is not absolute and is subject to reasonable restrictions. The Constitution empowers the state to impose restrictions on this right in certain circumstances, such as to protect public order, national security, and the sovereignty and integrity of India. The following points elaborate on the discussion surrounding the conflict between fundamental rights and the right to be forgotten:

i. Right to be Forgotten and the "Freedom of Speech and expression"

The RTBF and the "Freedom of Speech and expression" are two fundamental rights that can potentially come into conflict with each other. While the RTBF

Scanned with OKEN Scanner

allows individuals to request the removal of their personal information from the internet, the "Freedom of Speech and expression" protects the right of individuals and organizations to express their opinions, ideas, and beliefs freely. One of the main concerns with the RTBF is that it can be used to suppress legitimate speech, including journalistic content and other information that is in the public interest. For example, a public figure might request the removal of information about their past mistakes or wrongdoing, which may be relevant to their current activities or behavior. Similarly, a company might request the removal of negative reviews or critical comments about its products or services. Critics of the RTBF argue that it can lead to censorship and a chilling effect on free speech. They contend that the right can be misused to silence dissenting voices or to hide information that is embarrassing or inconvenient. Furthermore, they argue that the RTBF can be used to rewrite history, erasing important events and facts that are part of the public record

ii. **Right to Information:** Right to Information is like a protective shield of any democratic government. This right is necessary for the smooth functioning of the democratic machinery. Right to Information is an inseparable part of the freedom of speech and expression codified in Article 19(1) (A) of the constitution, which is understood to be the first requisite of liberty. An important characteristic of freedom of speech and expression is considered the freedom to receive and disseminate information without any obstruction.

Right to information means right of every citizen to access information of public interest, which is under the control of public authorities, in order to ensure transparency, accountability in administration and participation of common man in governance. Information is needed by human beings to realize their full social, political and economic potential. It entails a spectrum of knowledge about various issues and involves different stakeholders from market to government. It is the key

Scanned with OKEN Scanner

which helps make decisions. It is also a public resource collected and stored by government in trust for people. RTBF affects the Right to information of an individual. It will indirectly affect this Right to Information and give a inexpedient right to the state to not disclose information and in turn it minimizes the scope of the general public to access the information.

iii. **Enforceability Against Private Individuals:** The RTBF will normally be claimed against a private party (a media or news website). This raises the question of whether fundamental rights can be enforced against the private individual, which is generally enforceable against the state. Only Article 15(2), Article 17 and Article 23 provides protection against a private act of a private party that is challenged based on its violation of the Constitution.

iv. RTBF and the Freedom of Press

Freedom of the press is a cornerstone of any democratic society. It is a fundamental right that enables journalists to report on events and issues without fear of retribution, censorship, or other forms of repression. free press can serve as a watchdog, holding governments, businesses, and other powerful entities accountable for their actions. Journalists can expose corruption, abuse of power, and other wrongdoing, shining a light on issues that might otherwise go unnoticed. By providing information to the public, a free press can help promote transparency and openness in government and other institutions. This can lead to a more informed citizenry and greater trust in public institutions. A free press can help promote debate and discussion on a wide range of issues, providing a platform for different voices and perspectives to be heard. In many cases, a free press can be the only means by which individuals can have their voices heard and their rights protected. Journalists can report on cases of human rights abuses, discrimination, and other injustices, helping to bring attention to these issues and advocate for change.

Scanned with OKEN Scanner

Freedom of journalism is considered a fundamental right under the Indian Constitution. Article 19(1)(a) of the Constitution of India guarantees the right to "Freedom of Speech and expression" , which includes the freedom of the press. This right enables journalists to freely report, investigate, and express their opinions on matters of public interest without censorship or undue interference from the government or any other authority. However, this right is not absolute and is subject to reasonable restrictions under Article 19(2) of the Constitution, which allows the government to impose restrictions on "Freedom of Speech and expression" in the interests of sovereignty and integrity of India, security of the State, friendly relations with foreign countries, public order, decency or morality, contempt of court, defamation, or incitement to an offense. The implementation of the RTBF could pose challenges for journalists in reporting and presenting news and information to the public. It could lead to confusion and uncertainty in the press and media industry, as they would have to wait for the adjudicating officer's decision before publishing certain content. This would impede journalists from freely sharing information and ideas through the media. The "Right to be Forgotten" may seem like a reasonable way to protect privacy, the implementation of the RTBF has the potential to compromise freedom of the press in a number of ways:

- Censorship of legitimate news articles: If news articles that contain accurate information about a person are removed from the internet as a result of RTBF requests, it could undermine the ability of the press to report on important issues and hold powerful individuals or organizations accountable.
- Limited access to historical information: If individuals have the right to request the removal of historical information about themselves from the internet, it could limit researchers and journalists' ability to access important historical information for investigative reporting.

Scanned with OKEN Scanner

- Increased power to individuals to control the narrative: RTBF could give individuals more power to control the narrative surrounding their actions and past behavior, making it more difficult for journalists to report on the truth.
- Cost and complexity of compliance: The process of implementing RTBF requests can be complex and expensive, potentially resulting in small or independent media organizations being unable to comply, limiting their ability to report on important issues.

Balancing the right to freedom of the press and the "Right to Privacy" is a complex issue. However, there are a few key principles that can help guide the decision-making process:

- Consider the public interest: When assessing the impact of freedom of the press versus privacy rights, it's important to consider the public interest. If the information being reported is of significant public interest, such as exposing corruption or criminal activity, it may be appropriate to prioritize freedom of the press over privacy rights.
- Ensure accuracy and fairness: In reporting on individuals, it's essential that journalists ensure the accuracy and fairness of their reporting. False or misleading information can harm an individual's reputation and should be avoided.
- Use proportionate measures: If an individual's privacy rights are at risk, journalists should use proportionate measures to minimize the harm. This might include redacting personal information or blurring faces or identifying features.
- Consider the context: When reporting on individuals, it's important to consider the context of the reporting. For example, reporting on the private lives of public figures may be deemed more acceptable than reporting on the private lives of private individuals.
- Respect individual rights: While freedom of the press is important, it's also important to respect the privacy rights of individuals. Journalists should avoid

Scanned with OKEN Scanner

reporting on information that is irrelevant to the public interest or that could cause unnecessary harm to individuals.

NEED FOR BALANCING RIGHT TO BE FORGOTTEN WITH COMPETING RIGHTS

The RTBF is not an absolute right and must be balanced against other competing rights and interests. One of the most significant challenges in implementing the right to be forgotten is striking an appropriate balance between the individual's "Right to Privacy" and other rights such as freedom of expression, access to information, and public interest.

On the one hand, the RTBF recognizes that individuals have a legitimate interest in controlling the dissemination of their personal information, particularly in cases where that information is outdated, inaccurate, or no longer relevant. The right to be forgotten can help prevent the stigmatization and discrimination of individuals based on their past behaviors or circumstances.

On the other hand, the RTBF must be balanced against other important rights and interests, such as freedom of expression, which includes the right to receive and impart information, and the public interest in accessing certain types of information, such as news articles or historical records.

The right to be forgotten could potentially be used to suppress information that is in the public interest, such as information about public figures or matters of public concern. Therefore, it is important to strike a balance between the RTBF and other competing rights and interests.

Balancing the right to be forgotten with other competing rights and interests requires a careful and nuanced approach. Here are some key considerations for achieving such a balance:

Scanned with OKEN Scanner

i. **Clearly define the scope and limits of the right to be forgotten**

The first point is to clearly define the scope and limits of the right to be forgotten. This means establishing the types of personal information that can be subject to the right to be forgotten, as well as the circumstances under which the right can be invoked.

The types of personal information that can be subject to the RTBF may vary depending on the legal framework in which the right is being implemented. For example, under the General Data Protection Regulation (GDPR) in the European Union, individuals have the right to request the erasure of their personal data in certain circumstances. This includes situations where the data is no longer necessary for the purpose for which it was collected, the data subject withdraws their consent, or the data was processed unlawfully.

It is also important to establish the circumstances under which the right to be forgotten can be invoked. For example, the right may not apply in situations where there is a legitimate public interest in maintaining the information, such as information about criminal convictions or professional misconduct. Similarly, the right may not apply in situations where the information is necessary for exercising the right to freedom of expression or for the establishment, exercise, or defense of legal claims.

Defining the scope and limits of the RTBF is essential for ensuring that the right is not overbroad or misused. It can also help to provide clarity and certainty for data controllers and processors, who are responsible for implementing the right in practice. This can in turn promote transparency, accountability, and trust in the handling of personal data.

ii. **The second point is to establish clear and transparent rules for implementing the right to be forgotten.** Clear and transparent rules are essential for ensuring that the right to be forgotten is applied in a fair and consistent manner, and that data

Scanned with OKEN Scanner

controllers and processors understand their obligations. Each Data Fiduciary and Data Processor is required to take reasonable security precautions to secure any personal data that is in their possession or under their control. Every Data Fiduciary must have a process and an operational mechanism in place to address Data Principals' complaints. Before processing any personal information about a child, the Data Fiduciary must get verifiable parental consent. A Data Fiduciary is not allowed to treat personal information in a way that could endanger children. A Data Fiduciary is not allowed to follow or observe children's behavior or use targeted advertising for children.

iii. **Criteria for determining whether a request is valid:** Clear criteria should be established for determining whether a request for the removal of personal data is valid. This may include factors such as whether the data is accurate, relevant, or necessary, or whether the data subject has withdrawn their consent.

When considering the public interest, the relevance of the information to the public should be carefully evaluated. Information that is deemed to be of public interest may include news articles, court records, or other types of public records that provide important information about individuals or events that are relevant to society as a whole. However, it is important to note that the public interest in accessing the information must be balanced against an individual's right to privacy. For example, if the information is highly sensitive and could cause harm to an individual's reputation or safety, it may be appropriate to restrict access to that information. In evaluating the public interest, it is also important to consider the context of the information. For example, if the information pertains to a public figure, such as a politician or celebrity, it may be considered more relevant to the public interest than if it pertains to an ordinary individual.

iv. **Process for verifying the identity of the requester**: To prevent fraudulent or abusive requests, a process should be established for verifying the identity of the

Scanned with OKEN Scanner

requester. This may involve requiring the requester to provide identification documents or other forms of verification

v. **Oversight and enforcement:** Mechanisms should be established for oversight and enforcement of the rules and procedures, to ensure that data controllers and processors are complying with their obligations and that the RTBF is being applied fairly and consistently. This can be done by creating regulatory bodies, such as data protection authorities, that have the power to investigate and sanction data controllers and processors who violate the rules

CONLUSION

The Right to Privacy and the RTBF are two deeply interwoven concepts that have gained significant prominence in the digital age, where the proliferation of online platforms and the pervasive nature of digital information pose unique challenges to personal privacy. The Right to Privacy is a broad and fundamental principle that encompasses the ability of individuals to control their personal information and protect it from unwarranted intrusion by the state, private entities, or other individuals. The RTBF, a more specific manifestation of the Right to Privacy, addresses the modern realities of information technology and digital communication. It allows individuals to request the removal of their personal data from the internet when it is no longer relevant, accurate, or necessary, or when its continued availability infringes on their privacy and reputation. This right emerged prominently from European jurisprudence, particularly with the European Court of Justice's decision in the Google Spain case, which underscored the importance of balancing privacy rights against the public's right to access information.

The interconnection between the Right to Privacy and the RTBF is evident in their shared objective of protecting individual autonomy and dignity. Both rights emphasize the necessity of giving individuals control over their personal

Scanned with OKEN Scanner

information, albeit in different contexts. The Right to Privacy provides the broad framework within which the RTBF operates, ensuring that personal data is not exposed or misused without consent. Conversely, the RTBF offers a concrete mechanism for individuals to enforce their privacy rights in the digital realm, addressing specific situations where personal data should be removed from public access.

Judicial pronouncements and legislative developments have further solidified the relationship between these two rights. In India, the recognition of the RTBF as an integral part of the Right to Privacy has been reflected in various court decisions, following the foundational principles set forth in the Puttaswamy case. The DPDP Act, 2023, which includes provisions for data correction and erasure, exemplifies the legislative commitment to operationalizing the RTBF within the broader context of informational privacy. This legal framework underscores the necessity of balancing the RTBF with competing rights, such as the right to information and freedom of expression, ensuring that the erasure of data does not unduly restrict public interest or access to crucial information.

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Unique Models for Access to Schools:

The Context of text

Ruchi Payal

Senior Research Scholar

Subject- Educational Planning and Administration NIEPA

Dr. Dushyant Kr. Shah

Assistant Professor Department of History

Kirori Mal College University of Delhi

AbstractThe paper examines a variety of models from around the globe that aim to universalize education and that have been successful in including the disadvantaged in the formal school system. It examines their causes of emergence, the factors that contributed to their success, the extent to which they can be applied in the Indian context. The Ecological systems theory, developed by psychologist Urie Bronfenbrenner, serves as the foundation for the study's thematic conceptual framework. This theory helps in understanding what models works in a particular place and what doesn't work, the role of the other-than-school factors (Context) needs to be considered while framing the policy (Text) for access to schools, why different paths were taken to reach the same goal of Universalization of School education.

Some of the models that were examined in the former part of the paper include the "Schools of Tomorrow" in Rio de Janeiro (Escolas do Amanha), "Escuela Nueva" in Columbia, "Community schools" in the United States and in the United Kingdom, "Fey Alegria" and "Escolas do Amanha" in Venezuela, the latter part of the paper includes the initiatives in India that has the essence of the above initiatives and how far they were successful in the nation. This study will provide a base for further policy analysis on the access of school education that aims in universalization of formal School Education for all its citizens.

Scanned with OKEN Scanner

Keywords: Universalization, Fey Alegria, Escuela Nueva, Schools of tomorrow, Ecological systems theory.

Introduction

Today, the sight of kids in school uniforms is no longer a luxury that only few can afford. Even in the most isolated, rural regions of our nation, education has come a long way. Education has multiple ways in which it can contribute to the development of the underprivileged. By engaging in beneficial activities, it can address the community's perceived needs and interests, transforming academic study into a life preparation process. In order to promote conscientization, education can also place a focus on functional literacy and numeracy.

Additionally, it can broaden one's perspective on science and provide a foundational understanding of how nature and society work, all while ensuring that one has the practical knowledge and skills necessary for taking care of one's family and running the household. If the TVET sector can find a place that makes sense in the school and higher education curricula, there may be an increase in employment opportunities in the rural sector.

By giving people access to basic education through the schools, we can help them maintain their high levels of productivity by giving them specialized training, making them aware of hygiene and health issues, and keeping them up to date on knowledge and technology. A minimum basic standard level of education is required to be aware of one's rights and responsibilities that deals with instances of corruption, malpractice, and fraud, and remove poverty in addition to having a positive correlation with wages.

It becomes necessary for the already struggling population to enroll and compete in the mainstream educational system in order to diversify their income sources, increase their chances for personal development, stay current with current events,

Scanned with OKEN Scanner

and stay connected to the outside world. But even in the educationally advanced states and their districts, pockets of educationally undeveloped and backward areas exist, that are in dire need of school education for their upliftment, but they are unable to access it for a number of reasons.

Interdependence, which results in a closed economy and the dominance of social conventions and customs in governing their activities, is one peculiar aspect of the unreached community. A unified strategy is required to comprehend the dynamics of the groups existing in society and their unique challenges and needs. A mere school building or qualified teachers sometimes is not enough to ensure the entry of all sections of society into the formal education system. Their particular issues need particular kinds of solutions.

Challenges in Access to School Education

Education remains a right out of reach for many, millions of school-going children remains out of school in the world. As per the Humanium organization, 759 million adults are still illiterate and for the age group 5-12, 72 million children are not even enrolled. This data only talks about basic literacy, not even education, quality education is still a goal far to achieve. The question that arises is-even if government in many nations sponsor free education, why people are not opting for it?

There are a number of reasons why children prefer to stay out of formal education, mostly in the under-developed and developing nations. There are gaps in Supply as well as the demand side. The administration and management might have certain irregularities, the policy provisions might be too rigid. If once the primary education is skipped, then higher education is not possible, it is not something that can be started from anywhere, there is a proper sequence that needs to be followed for step-by-step learning.

Scanned with OKEN Scanner

At times there aren't enough schools. Many of the poorest countries in the world do not have access to the adequate financial resources necessary to create schools. Providing schooling materials along with recruiting and training teachers cost money, and aid from fellow countries generally is not sufficient enough to establish an education system for all children.

Access to education can be challenged due to the difficult geographical locations that are not ideal for small children. There might be severe weather conditions, rough terrain, desert, poor roads or transportation system. Like in Philippines to access nearest primary school one has to travel very far, In India, there are certain terrain are hard to climb, or desert areas in Rajasthan which become too hot to cross after school is over in the afternoon.

Another significant factor that keeps children away from getting education is their disability. There are now more options than ever to provide education for those with disabilities thanks to ongoing technological advancements. For instance, an article from Pundit describes new computer programs that can convert assignments into Braille for blind students automatically, significantly easing their reading of the same materials as their sighted classmates. Accessibility must be considered when developing technology, lesson plans, classroom layouts, and other elements.

For many families, financial restraints become a major obstacle that doesn't allow their children to attend school on a regular basis. Attending school comes with additional expenses beyond tuition fees. Millions of families simply cannot afford the money required for school supplies, uniforms, books, and transportation. The root causes of financial crises are difficult to address, and eradicating poverty is not an easy or quick problem to solve.

Education may have a very low value in certain areas, that keeps the younger generation remain uninterested and out of the school. In certain under developed, impoverished nations, children prefer to learn their ancestral skill set to earn

Scanned with OKEN Scanner

livelihood, rather than attending school and rote learning irrelevant education. Like what is the purpose of learning traffic rules if you are placed in a very remote area with no roads and no income to go to city in the near future and family is facing challenge in earning livelihood?

Lack of relevancy is another reason as explained above. The essence of school gets lost when a child learns something that one can never apply, or not discuss/ make the family understand what he/she learned in school, all the alien education makes them either to not enter or to leave the school early.

Affordability and opportunity cost remain a major reason for the children not to access the reachable school premises. Over 300 million children ageing between 5-17 are either involved in the practice of child labor or employment all over the world. The main reason is financial support to family for food, shelter, clothes and other basic facilities.

Casteism, racism, marginalization of minorities, discriminations in the mainstream schools, deprivation of basic facilities in the existing ecosystem negatively impacts the accessibility of schools. Recently a low caste child was beaten to death by the teacher in government school of Rajasthan, (India) for touching the pot to drink water. These practices further push other members of the society to take their children out of school. The passive stand of authorities, injustice, delayed justice, active discrimination further pushes them to enter into the world of crime rather than education.

Children often feel unsafe while going and returning from home to school because of environmental, animal, or human hazards. There are many ways to overcome this obstacle, including using technology, creating lessons for at-home learning, assigning older or abler students to mentor or tutor nearby lower-level students, giving students access to bicycles or other safe modes of transportation, and more.

Scanned with OKEN Scanner

Social instability, war ridden areas, attack on schools, lack of security, is another reason. Few years back in Pakistan a school was attacked by the terrorists, that lead to so many deaths of children. The impacts of these incidents on the victim families and their neighbors are very deep and it gives them a reason to stay away from schools.

And many more reasons are there that keeps the children out of school and turns into a cyclic trap that further promotes or forces illiteracy on their coming generations. The governments of various nations and international organizations try to turn every stone to change the scenario. Some of these efforts are studied in the next section.

Conceptual Framework

The ecological systems theory, put forth by psychologist Urie Bronfenbrenner, explains how various environmental systems have an impact on human development. The opportunities and risks linked to how youth use their free time outside of the regular school day are of interest to researchers, policy makers, and practitioners. Organized activities, such as after-school programs, extracurricular activities, and events hosted by community-based organizations, are one of the main places where young people spend their free time. Ecological systems theory has been extensively used in research on after-school programs to understand how programs encourage the positive, healthy development of young people from diverse backgrounds.

According to Bronfenbrenner, there are four interconnected categories of environmental systems: macro, exo, meso, and microsystems. These levels range from more substantial, distal settings that indirectly affect development to smaller, proximal settings where people interact directly.

The microsystem, which includes the environments where people interact directly, is the ecological level that is closest to the individual. Sports, academic clubs,

Scanned with OKEN Scanner

community service initiatives, and youth groups with religious affiliations are just a few of the organized extracurricular activities that make up one microsystem. The mesosystem, which is the next level in Bronfenbrenner's ecological hierarchy and involves processes that take place between the various microsystems that people are embedded in, is a moving forward level. Numerous microsystems engage in interactions with activities to influence development. The main microsystems influencing organized after-school activities for youth are families and schools.

The microsystems in which people are involved but not directly embedded make up the exosystem, which is the next outermost level. The other people involved in an individual's life act as a "trickle-down" mechanism for the exosystem to have an impact on development. In terms of extracurricular activities, research at the exosystem level is rather scant, but one particular area of study sheds light on how parents influence their kids' activities. As a result of their prior involvement in activities, parents play an important role. Children frequently engage in the same activities that their parents did when they were kids because parents frequently expose them to those activities.

All these elements of the external ecosystem theory explain how the external ecosystem impacts the children's school education.

Global Models to reach the unreached

All over the world, there are a variety of initiatives that took place to reach the unreached to include them in the mainstream education system.

'Academies' in London:

These are privately run, publicly funded institutions that are exempt from adhering to the federal curriculum. They are arranged in official collaborative structures. Schools that were failing were replaced with new ones, and after that, they were taken out of local government control and put under the management of a

Scanned with OKEN Scanner

government-approved "sponsor" in the form of a not-for-profit trust that was given financial support by the sponsor. An updated version of the "converter academy" is introduced within this.

With the aid of this program, schools that were already performing well could become academy-status institutions of their own volition without the need for a sponsor to assume management of the institution. A dedication to diversity of provision served as the foundation for the policy management of schools receiving government funding. The improvement of schools can undoubtedly be aided by school diversity and choice, which also facilitates the admission of underprivileged students with different needs and expectations. It aids in eradicating the rigid culture of acceptance of failure.

'New school structure' and 'charter schools' in New York: Over 160 public schools, mostly big high schools, were shut down in the less fortunate areas. They opened up new, so-called "small schools of choice" in their place, which were structurally distinct from the earlier ones. New employees were hired, and structural changes in the way instruction was carried out were made. These employees were placed in high-poverty, relatively underprivileged community areas where learning was nearly impossible.

On the other hand, charter schools are publicly funded, open to all students, frequently supported by private donors, and not under the traditional control of school boards. Governments granted charters, which were then periodically renewed. Closing the earlier, more "factory-style" higher schools was primarily motivated by the notion that "when a culture of failure is ingrained, the only option is to sweep the board clean." The SSCs made it simpler to attend to the needs of particular children. They fostered in the schools a "no excuses culture."

Community schools in the United States: According to Peter Block, the word "community" implies both ownership and membership. There are around 5,000

Scanned with OKEN Scanner

community schools existing. These are publicly funded "elementary or secondary school that collaborates with its local educational agency and community-based organisations, non-profit organisations, and other public or private entities to provide a coordinated and integrated set of comprehensive academic, social, and health services that respond to the needs of its students, students' family members, and community members". Community school is a school that offers both public and private services for academics, family support, health facilities, etc. The partnerships at the school that are "results-focused" are built around a set of mutually agreed-upon results and outcomes and are based on identified needs.

It primarily focuses on the low-income communities, and have an approach that stands for family and community engagement, integrated student support, collaborative leadership, expanded learning time and increase of opportunities.

'The schools of tomorrow' in Rio de Janeiro: The focus of the (Escolas do Amanha) Schools for Tomorrow model is primarily on addressing ethos and cultural issues. At-risk districts and schools were the focus of basic education reforms in Rio. The students from "favelas" (low-income neighborhoods frequently run by drug traffickers and other criminal elements) were the focus of attention. These areas receive specialized support, including special infrastructure improvements, books and materials, and hardship pay for teachers, as a result of their high rates of drop-outs and poor performance on standardized tests.

In addition to providing facilities for sports, culture, and social welfare, it promoted an entirely different culture.

6 pillars support these institutions:

• Making sure that they attend school full-time. They spend at least 8 hours a day on-site at school, whether it's for extracurricular activities like sports or science or cultural ones like art. They avoid engaging in criminal activity as a result.

Scanned with OKEN Scanner

• With the aid of science labs and knowledgeable instructors, they promote science courses.

• Increasing access to basic healthcare, with the help of a hardworking group of nurses working in collaboration with the city's Department of Health.

• Increasing the size of the educational district and strengthening ties to the local community.

• Increasing the teachers' capacity by providing them with more instruction in the necessary subjects.

• Offering remedial courses to some students who require them.

According to the residents of these areas who were interviewed, these schools are the only places where their kids can go to escape the upsetting surroundings in which they were raised. They are doing business in hostile environments.

Fey Alegria (Faith and Joy in English) Model of Venezuela:

Fey Alegria as a concept emerged in Caracas, Venezuela in 1955. By 2009, it had an enrolment of 1,508,465 students, out of which 551,270 these were in formal education, 56,902 in semi-distance and radio education, 563,212 in non-formal and alternative education, with 1,206 school centres and these numbers are still growing. It describes itself as "a movement for integral popular education and social development, whose activities are directed to the most underprivileged and excluded sectors of the population." It operates as an NGO that promotes education. Due to their high demand and limited capacity, Fey Alegria schools receive a lot of applications for their few available seats. First preference is given to the child from the less fortunate family. Fey Alegria excels in qualitative assessments in addition to teaching a lot of underprivileged kids.

It is characterised by the convergence of seven characteristics: a focus on community development; a focus on bridging cleavages and links between various groups; the encouragement of a very strong and cogent popular education ideology

Scanned with OKEN Scanner

among its participants; the development of a sense of family and community in schools (which includes the stability of teachers); the promotion of democratic participation in schools; partnerships between governments and civil society; and the targeting of very poor communities with special programmes.

There is a lot of flexibility in the management of these schools. In Latin America, they run with public funds and are privately managed, whereas in Venezuela, since 1990's Government takes care of the salaries of teachers in these schools (Martiniello, 2001, pp. 9). Decentralization in planning, budgeting, decision-making is a main component of these schools, where the initiatives start from the school level, and the principle have the autonomy to prioritize the sequence of budget allocation.

Escuela Nueva of Columbia: It is a term that means New School, that started in 1976 with the financial help of UNICEF and USAID. This model has gained recognition of the three most successful public policy reforms in the world by the World Bank in 1989. It is a flexible educational model that supports people in their efforts to improve their lives by addressing the needs of populations that are widely dispersed or transitory as a result of social or employment factors.

It is described as a primary education system that combines curriculum, community, administrative-financial, and training strategies. This system enables the delivery of a complete primary education as well as qualitative improvement in the country's rural schools. It addresses the technical problems of rural education; the content of the books is relevant and adaptable to local areas in which the students are placed. There are components of workshops, teacher study groups, school visits, internships, etc. for teacher trainings. The teachers are prepared in a manner where they think of these school centres as a point of information exchange for community empowerment and integration.

Scanned with OKEN Scanner

The students learn at their own pace, with multi-grade learning through the help of guidebooks of mathematics, languages, science and social science subjects, but major learning is through discussions among students and guidance of teachers. As per the latest data available there are 20,000 rural schools in Columbia only, and they are present in 19 countries worldwide.

Decentralisation and Deregulation in Education in Finland: Major management, administrative, and regulatory responsibilities for public education have been given to municipalities in Finland. Every year, the school network is updated. Between 1990 and 2007, primarily in rural areas, 1,300 elementary and secondary schools at the basic education level were closed as a result of this restructuring/up-dation of the educational system and in 2008, 95 comprehensive schools were shut down, while 2988 schools were still operational. These schools had a range of student populations: 25 had fewer than 20 students, 34 had 20 to 49 students, and 36 had more than 50 students (Education Statistics Finland 2008).

Decentralized management and constant check with the resources available and societal needs had made it possible to gain the trust of the local societies in which they are placed and built a social cohesion at various levels. There are provisions for supervision, monitoring and self-assessment by the municipalities, schools and external parties of the State to check the quality of education and related services. Its main focus remains on the atmosphere or ecosystem of the school, learning conditions of the classroom, teacher selection, training and recruitment provisions, sensitive management of the student's social backgrounds and learning levels with freedom of modification in the national curriculum as per the local needs.

India's initiatives

All of the aforementioned models are remedies for specific issues that the country or region is experiencing. Thus, only their main points of the problem and the solution can be copied and pasted.

Scanned with OKEN Scanner

This can't be done with a single method, as the demands, developmental level, belief system, ideology of every area will be different. So, a combination of various methods and techniques will be needed, as per the requirements of the settings in which they will be adopted. Every approach should evolve from lessons of earlier indigenous experiences, rather than an imposition from afar. Until unless the provider and receiver have a common vision, there will always remain a gap.

For the inclusion of all the disadvantaged, marginalized section of society in India, a number of programs were initiated that worked well, and resulted in almost 100 percent enrollment rate in India. To ensure that everyone had access to high-quality education, numerous policy planning initiatives and programs—including the DPEP, SSA, Samagra Shiksha Abhiyan, operation Blackboard, the Andhra Pradesh Primary Education Project, the Shiksha Karmi Project, the Lok Jumbish Project, Revamped Kasturba Gandhi Balika Vidyalaya Scheme, Revamped Eklavya Model Residential School Scheme, Unnat Bharat Abhiyan Digital initiatives like: E-pathshala, Diksha, MOOCs on the SWAYAM platform, SWAYAM-PRABHA DTH-TV channels and others—were processed and put into place.

These deal with the access to education for girls, women, SC, ST, and other underprivileged groups of the population was also a priority, the Special Focus Districts, Educationally Backward Blocks, LWE Affected Districts, and Aspirational Districts that were given preference under this plan. It encourages states to improve education in underserved areas. rural girls, primarily from the SC, ST, OBC, Minority, and other disadvantaged sections of society.

Even after achieving a near 100 percent enrolment, India still had a long way to go in the quality of Education provided. Enrollment alone cannot offer a guarantee that every child is receiving a quality education, the drop-out rates are high, there is teacher and student absenteeism, discrimination within the school premises on the grounds of caste, color and gender, and the list of challenges goes on. Only free

Scanned with OKEN Scanner

education will not help, the government schools should reach to a point where there should be a competition in the admission level, rather than No Detention policy to hide the low-level learnings of students. This is only possible when the problem is studied at the local level and their specific solutions are found with the sharing of not only responsibility but also autonomy in decision making at the local level of administration and management.

References

- Corrigan, M. E. (2003). Beyond access: Persistence challenges and the diversity of low-income students. New Directions for Higher Education, 2003(121), 25-34.
- Dryfoos, J., & Maguire, S. (2019). Inside full-service community schools. Simon and Schuster.
- Elwick, A. (2018). New forms of government school provision–an international comparison. Journal of Education Policy, 33(2), 206-225.
- eprints.mdx.ac.uk
- Huerta, L. A., Gonzalez, M. F., & d'Entremont, C. (2006). Cyber and home school charter schools: Adopting policy to new forms of public schooling. Peabody Journal of Education, 81(1), 103-139.
- iie.chitkara.edu.in
- Kline, R. (2002). A model for improving rural schools: Escuela Nueva in Colombia and Guatemala. Current Issues in Comparative Education, 2(2), 170-181.
- Morgan, H. (2014). Review of research: The education system in Finland: A success story other countries can emulate. Childhood Education, 90(6), 453-457.
- Tudge, J., & Rosa, E. M. (2019). Bronfenbrenner's ecological theory. The encyclopedia of child and adolescent development, 1-11.
- West, A., & Wolfe, D. (2019). Academies, Autonomy, Equality and Democratic Accountability: Reforming the Fragmented Publicly Funded School System in England. London Review of Education, 17(1), 70-86.

Scanned with OKEN Scanner

- Wong, M. E., & Cohen, L. (2011). School, family and other influences on assistive technology use: Access and challenges for students with visual impairment in Singapore. British Journal of Visual Impairment, 29(2), 130-144.
- McQuaide, S. (2009). Making education equitable in rural China through distance learning. International Review of Research in Open and Distributed Learning, 10(1).
- White, R. C. (2000). The School of Tomorrow. Values and Vision.
- Ferreira, J. (2011). Primary school challenges in the rural areas of Finland, France and Portugal. Education et societes, (2), 109-130.
- SINgh, S. (2014). An Analysis of Select Models of Rural Education in Developing Nations and Their Possible Applicability in India.
- Osorio, J. C. P., & Wodon, Q. (Eds.). (2014). Faith-based schools in Latin America: Case studies on Fe y Alegría. World Bank Publications.

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Astrology and Muslims some glimpses from pre – Islamic period

Dr. Asad Ahmed

Associate professor

Department of History, Sri Guru Tegh Bahadur Khalsa College,

University of Delhi, Delhi-110007

Abstract: Through astrology is forbidden in Islam, it was a subject of deep curiousity / anxiety among Muslims since time immemorial Muslim kings & elites took deep interest in it and patronized various astronomers/astrologis from time to time . This articles gives an interesting insight into the subject which relatively lesser known facts.

The interaction between Brahmanism and Islam or rather followers of Islam dates back to the Abbasid khalifas. The astronomical text of Brahmagupta and the medical treatises of Charak and Susruta were translated into Arabic into the Abbasid Period[1]. It would be interesting to examine how for the realization of the magnitude of the magnitude of Greek influence on Indian astronomy led to the promulgation of the religious tenets which, according to Pingree, were responsible for the reserved attitude of the Hindu scholars towards the later Muslim astronomical treatises.[2]

There were at least five leading astronomers during the 8th century. One of them, Ya'qub al-Fazari, brought an educated Hindu, Manka, to the court of al-

Scanned with OKEN Scanner

Mansur. It was al-Fazari's son who translated the Siddhanta, and who constructed the first astrolabe[3]. Al-Tusi also synthesized Greek and Hindu mathematics, resulting in the formation of spherical trigonometry in his Shakl al-Qatta[4]. The great jurist Abu Hanifah supported astronomy. The astronomer al-Kashi was one of his followers. The extreme attitude of another reputed jurist, Imam Shafi'I (fl. 8th Century C.E.), who was against scholasticism was later modified by Imam Nawawi and the celebrated Al-Ghazali. It is worth nothing that Al-Ghazali[5] (d. 1111 C.E.) attitude was somewhat ambivalent. In his Tahafut al-Falasifah [Incoherence of the Philosophers], he maintained[6]. Abu Mashar Balkhi (d. 585 A.D.), a famous astronomer of Iran, who stayed for ten long years at Benares to learn astronomy. The cipher and the science of Arithmetic, he said, originated from India, and the inventor was a Brahmin named Asa-and that is why the Persian word for figure 'Hindsa' is a combination of 'Hind' and 'Asa'.

The Muslims, particularly the 'Arab scholars felt very much impressed with the achievements made by India in astronomical and celestial sciences. Ya'qubi (d. 900 A.D.) claims that the earliest book complied on astronomy was Brahama Sapt Sidhant, which was written[7]). He is of opinion that the learned discussions on astronomy and astrology by the Greeks and the Iranians owe also very much to this book[8].

Literary evidence shows that a delegation from Sind visited the court of Caliph Abu Ja'far al-Mansur (A.D. 753-774) at Baghdad in 154/771 or 156/773, and presented an Indian astronomical work, most probably Brahmasphutasiddhanta by Brahmagupta, composed in A.D. 628. It was translated into Arabic, by the order of the Caliph, by Ya'qub bin Tariq (d. A.D. 796) and Ibrahim aI-Fazari (d. A.D. 796 or 806) and exercised influence on Arabic astronomy.

Scanned with OKEN Scanner

Most probably the two earliest Arab authors whose works discuss some elements of Indian astronomy are al-Fazari and Ya'qub bin Tariq. Their translation of the Brahmasputasiddhanta in its complete form is probably lost, but several fragments have been published[9]. The two works, entitled Zij al-Sindhind (astronomical tables) and al-Jami' wa al-Tafriq bi Hisab al-Hind contain Indian elements. Zij al-Sindhind of al-Khwarizmi (d.c. A.D. 850) also exhibits elements of Indian astronomy. Al-Ya'qhbi's (d. 284/867) Ta'rikh and Al-Mas'udi's (d. 345/956) Muruj al-Dhahab and Kitab al-Tanbih wa al-Ishraf record the history of the culture and civilization of the different nations of antiquity including that of India. Among the civilized nation of the world, Al Masudi mentions the Persians, the Chaldeans, the Greeks , the Egyptians, the Turks, the Indians and the Chinese[10]. Firdaws al-Hikmah of 'All bin Rabhan al-Tabari (d. C. A.D. 850) has one full chapter on the Ayurveda[11], and al-Hawi of Abu Bakr Muhammad bin Zakariya al-Razi, published in 22 volumes from Hyderabad, frequently refers to Ayurvedic works. Such references, though not too frequent, are also found in the well-known at-Qanun fi' al-Tibb of Ibn Sina or Avicenna (c. A.D. 980—1037) and other works on Arab medicine.

Kitab al-Fihrist of Ibn al-Nadim (d. A.D. 385/995), a bio-bibliographical work, gives a list of twelve Sanskrit books, dealing with Ayurveda, translated into Arabic. Ibn al-Nadim records the names of Manka and Ibn Dhan who translated Sanskrit works into Arabic an mentions fourteen other Indian astronomers, astrologers and physicians with titles of some of their works. Abu al-Qasim Qadi a'id al-Andalusi's (d. 462/1070) Tabaqat al-Umam is the first world history of science containing one (the first) substantial chapter on Indian science and culture[12]. Al-Biruni's (d. 442/1050) Kitab al-Hind, al-Qanun al-Mas'udi, al-Athar al-Baqiyah and other works are important as they contain useful and near accurate

Scanned with OKEN Scanner

information about Indian astronomy, mathematics, geography, astrology and other sciences not found elsewhere. There are two biographical dictionaries Ta'rikh al-Hukama' of al-Qifti (d. 646/1248), which notice Indian scientists[13], and 'Uyun al-Anba' fi Tabaqat al-Atibba' by Ibn Abi Usaybi'ah (d. 668/1270), which contains one full chapter entitled "Atibba' al-Hind," on India vayds[14] (physicians). Mention should also be made here of the two Works of Yaqut al-Hamavi (A.D. 1179-1227), namely Mu'jam al-Udaba', the first biographical dictionary and Mu'jam al-Buldan, the first geographical dictionary. An Arabic translation by Al-Tamimi, of the Pahlai Zij-i Shatro-Ayar contained Indian astronomical elements as testified by al-Biruni. The well-known work drugs entitled Kitab al-Anbiya 'an Haqa'iq al-Adwiyah by the pharmacologist Abu Mansur Muwaffaq bin 'Ali of Heart contains information derived from Indian medical works[15].

There are several other scientists especially astronomers and mathematicians of Arabic and Persian origin, such as Habash ibn Hasib (d. 300/912), Maslamah al-Majriti (d. 462/1070), Abu Ma'shar al-Balkhi (d. 272/886), Kushyar bin Labban al-Jili (d. First half of the 5th/11th century), al-Uqlidisi (d. 341/952—53) and others, who give information about Indian astronomy and mathematics.

Sanskrit works especially on astronomy mathematics and medicine, were translated into Persian by the Muslims in medieval India. Several Zijes (astronomical tables) compiled in and outside India and other Arabic and Persian astronomic works were also translated into Sanskrit.

A compendium of general medicine, the Majmu'ah-I Diya'I, was written in Persian by Hakim Diya' Muhammad (d. c. A.D. 1336-37) in 737/1336. He was the court physician of Sultan Muhammad bin Tughluq. One of the characteristics of this work is that it discusses how astronomy and astrology can be used for the treatment of diseases[16]. It is a continuation of Majmu-ah-i Shamsiyah, written

Scanned with OKEN Scanner

earlier by Shams al-Din Mustawfi, which was a translation of an Ayurvedic work. This book is an important source for the history of medicine in pre-Mughal India. The historian Muhammad Qasim Hindu Shah, known as Firishtah (d. 1033/1624), wrote a book Dastur al-Atibba' or Ikhtiyarat-i Qasimi in A.D. 1590 which contains some Ayurvedic element[17].

A word about the popularity of astrology among the ruling elite of the Sultanate of Delhi may be added. The early writers who came from Khurasan and central Asian lands to India do not seem to have been sceptical about the scope of the influence of stars on the earth and its inhabitants, although it was contrary to the teachings of Islam. The ulema (orthodox scholars) considered it blasphemous impertinence. Unlike them, the elite, both in central Asia and India, patronized the astrologers. The astronomers practiced astrology in order to earn their livelihood. They prepared astrological tables and horoscopes. It may also be recalled that astrology has already become an integral part of astronomy in central Asia long before the foundation of the Delhi Sultanate through Buddhist influences. For example, Hasan Nizami who came from Nishapur, Delhi during the reign of Sultan Qutbuddin Aibek (AD 1206-10) and wrote the historical work, Taj- al Mathir, mentions the Zodaic, the seven planets and the constellation of the stars, displaying his faith in the roles of the stars and planets over man's destiny. Sadid U'ddin Muhammad Awfi, the Bukhara born immigrant calls Nizam-al Mulk Junaidi Sahib-i Qiran (fortunate one born at the time of the meeting of two auspicious stars). [18]

The statement of Shams Siraj Afif in the defense of astronomy and astrology is worth quoting because it tends to show that the Islamic orthodoxy was opposed even to the intellectual pursuit of astronomy. Afif writes : "Astronomy is one of the fourteen science known to the scholars. But its study has been forbidden by the

Scanned with OKEN Scanner

prophet (of Islam). The ulema (orthodox scholars) also disapprove of it. It is, however, permissible to know the rules, concerning the shadow of the sun and that in a particular month in what degree of what sign of the Zodaic the sun would be, the hours of the short night and the long night and when it(the night) turned into the day". [19]

Ziauddin Barani provides us clues about the interaction and co-operation between the Hindu and Muslim astronomers. According to him, there was considerable observation and experiment. He also tells us that many Hindu and Muslim astronomers were held in great favour, owing to their fame. "The elites of Delhi", says he "could not start any work or undertake any project without considering the astronomer even the wives of Sultan Alauddin Khalji patronized them". [20]

Amir Khusrau's interest in astronomy seems to have encouraged him to gain familiarity with the achievement made by Hindus in scientific fields during ancient times. Extolling their achievements, he say that physics, mathematics, astronomy and divination of the past and the future were known to Hindus. Then he says that he got conversant with the subtleties of their sciences to some extent.[98]

Khusrau devoted a whole sub-head to the learning of the Brahmans and spoke highly of them. Though there are men of letters in other countries, nowhere is wisdom or philosophy better written than in India[99]. The Brahman of India is such a learned man that, as far as knowledge and learning are concerned, he has far excelled Aristotle (one of the three greatest Greek philosophers). All natural sciences, Mathematics and Geography originated in India. Khusrau is proud of proclaiming to his contemporaries as well as to posterity:-

Kin taraf az har taraf-e ahl-i-hunar,

Scanned with OKEN Scanner

Dar talab-e 'ilmo-hunar karda guzar.

Lek ba tahsil-e hikam bahre sharaf,

Barahman az Hind na shud heech taraf[100].

Scholars come to India from all over the world to learn its arts and sciences. But Brahman never went out of India to acquire any knowledge. He did not consider it necessary to go out to improve upon his worth of learning or to seek judgment on it. This is also an apt commentary of an Indian of the early medieval period on his modern countrymen who almost adore foreign degrees and timidly look towards West, for inspiration, guidance and approval, in their pursuits of Arts, Literatures and Sciences. Intellectual superiority was the strongest point today!

1. M.N Yousuf, The Influence of Hindu Science on Indian culture (Islamic Culture, vol XXXVI. 2), pp. 102-118.
2. David Pingree, Muslim Astronomy in Sanskrit (Journal for the history of Arabic science, vol II. 2), pp. 315-330.
3. Bernard R. Goldstein, The making of astronomy in Early Islam (Nuncius vol. I, pt. 2, 1986), pp. 79-92.
4. H.J.L Winter, Formative influences in Islamic Science (Archives Internaonales d'historie des sciences), vol. xxxii (1953), p. 188.
5. M.A.M Khan, "The Muslim theories of education during the middle ages," Islamic culture, vol. XVIII (1944), pp. 418-433.
6. W.M Watt, the faith and practice of AL-Ghazzali(lndon, 1953), pp. 34-35.
7. Tarikhi-I Yaqubi, Vol. p. 92
8. Ibid., p. 105

Scanned with OKEN Scanner

9. This was written to travel from Bandar Abbas and Basra upto any port of India. See M.S Khan, "Impact of Islam on Medieval Bengal," (Islamic Culture, vol LIX, no.3 (July, 1985), p. 170.
10. M.S Khan, "Arabic and Persian source material for the history of science in medieval India (presented at the seminar on "Source Materials in History of Science in India", held under the Asiatic society of Calcutta, 15th Jan, 1986). Published in Islamic Culture (April-July, Nos. 2-3, 1988,fn. 10.)
11. Edited by M.Z Siddiqi (Berlin, 1928), pp. 557-600.
12. K.S. Khan, "An eleventh century Hispano-Arabic source for Ancient Indian Sciences and Culture ," H.K Sherwani felicitation Volume, ed. P.M. Joshi and M.A Nayeem (Hyderabad, 1975), pp. 357-89.
13. For a general introduction to this first dictionary of scientific biography, see M.S. Khan, The Ta'rikh al-Hukama of AL-Qiffti," Hamdard Islamicus, vol, vi, no.4 (Karachi, 1983), pp. 85-96.
14. For details see M.S Khan, " An Arabic Source For the History of Ancient Indian Medicine," Indian Jouranal of Science, vol. xvi, no. 1 (Calcutta, 1981), pp. 47-56.
15. D.M Bose et al., A Concise History of History of Science in History (INSA, New Delhi, 1971), p.47 (henceforth referred to as Concise History).
16. M.Z. Siddiqui, "Unani Tibb in India," Concise History, p. 270; C.A Storey, Persian Literature, vol. ii, part 2 (1971),p. 323; Bibliography, p. 55.

Scanned with OKEN Scanner

17. M.Z. Siddiqui, Arabic and Persian Medical Literature (Calcutta, 1959), pp. 109-10.

18. Iqtidar Husain Siddiqui 'The Origin and Growth of Islamicate Historiography in India: Anaylsis of the 13th century Indo-Persians Historian's approach to the foundation of Muslim in South Asian Subcontinent (Journal of Objective Studies, New Delhi, nos. 1-2, July to October, 1989, pp.65-88)

19. Shams Siraj Afif, Tarikh-i- Firoz Shahi, Bib Ind, 1891, p258.

Tarikh-i-Firoz Shahi, Calcutta Bib Ind.,1862, p.112

20. Nuh Sipihr, ed. Mohammad Wahid Mirza, Oxford University Press, Calcutta, 1950, pp,162-3, also 224-6, for the horoscopes drawn by him.

21. Nuh siphir, p. 162

22. Ibid., p167

Dr. Asad Ahmed hails from an illustrations family of Ghazipur (UP) he graduated & postgraduted from Aligarh Muslim University (AMU) his area of interest is medieval Indian History his teaching experience is about thirty years. He has taught History at four Colleges (namely Dyal Singh, Zakhir Husain, Deshbandhu & SGTB khalsa College) Since 1992 . Currently , he is an Associate Professor in the department of History , SGTB Khalsa College , University of Delhi. Dr. Asad Ahmed has authored two books and various articles. He has authored 2 books and various articles. He has guided many students in their M.phil/Ph.d

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Breaking the Barriers: A Critical Reflection of Presence of Women in the Indian Elite Institutions

Dr Pankaj Deep and Swarni
Department of Political Science and IR,
Gautam Buddha University, Greater Noida,

Abstract: For a democracy to function effectively, it must embody democratic values like liberty, equality, justice and fraternity. Without these, democratic mechanisms become hollow, especially when elite institutions fail to reflect diversity. This paper examines if women, as a distinct social class have substantive representation in elite Indian institutions, that is Higher Education Institutions, Judiciary, Indian Administrative Services and Parliament. While democracy promises equal representation and inclusion, the data reveals that Indian institutions fail to reflect the diversity of the nation, with women occupying only marginal positions, particularly at senior levels. Employing intersectional theory, this study analyzes the intersection of gender with socio-economic, caste, and political networks, examining how familial ties and elite backgrounds often dictate access to power, limiting the representational scope to privileged perspectives. This paper calls for a transformative approach to inclusivity to ensure genuine representation extends beyond token presence, enabling meaningful participation from diverse backgrounds to create an effective democratic process that truly reflects India's social fabric.

Scanned with OKEN Scanner

Keywords: substantive representation, democracy, inclusion, gender justice, inequality.

Introduction

Democracy is a system in which each individual's voice matters and all have an equal role in shaping governance and society. It is not merely a system of governance but a way of life, grounded in rights and discussion, respect for one another, and common values (Rodrigues, 2011:153). It is celebrated as the "highest form of governance or form of institutional management" (Anand, 2022:1), but it relies not solely on institutional frameworks or elections but on the foundational values of liberty, equality, justice and fraternity (Rodrigues, 2002). While elections are a necessary component, they are merely one facet of a broader democratic framework. Democracy's legitimacy stems from its institutions—legislature, judiciary, and public administration—which must reflect the nation's diversity and uphold these values. Without inclusive, representative institutions, a democracy cannot be genuinely called democratic, as the goal is not just participation but meaningful inclusion. Additionally, justice has a very significant link with democracy, as it is a form of 'associated life, grounded on rights and deliberation, mutual respect and the shared ways of life' (Rodrigues, 2011:153), implying it is not a form of government but rather a form of society (Rodrigues, 2002:123).

Political rights and civil liberties, the defining dimensions of democracy (Dahl 1971), have had different effects on the political representation of women (Paxton et al., 2010, p. 5). True representation in a democracy goes beyond symbolic numbers or mere presence. A genuinely democratic institution includes voices from all social backgrounds, genders, and classes in decision-making processes, actively incorporating the perspectives of diverse populations (Sen, 2001). A democracy where half the population—women, for instance—is

Scanned with OKEN Scanner

underrepresented in leadership roles fails to meet the democratic ideal of equality and inclusion.

The glaring underrepresentation of women in positions of power raises compels a critical examination: Is Indian democracy truly inclusive? How does it effectively incorporate women as a social group in democratic processes and its outcomes? Is this underrepresentation due to systemic barriers? Do institutions reflect inherent biases that favor dominant groups, or are they structured to exclude marginalized communities like women? Such questions are integral to assessing a democracy's inclusivity and determining whether democracy in India truly serves all citizens including women. With this background, this paper aims to examine the presence of women in elite institutions in India, such as Higher Education Institutions (HEIs), Judiciary, Indian Administrative Services and Parliament, to critically evaluate their status inclusion as well as numerical strength in reaping the benefits of a democratic society.

Historical Background and Intersectionality

Democracy was initially a system where the "people have all authority" (Furetière, 1690) but it centered on a narrow, privileged segment of the population, excluding significant groups, particularly women, people of lower socio-economic status, and racial minorities. Clark (1939) was the first to pose the idea that "that economic development is a universal process, applicable to all peoples, not just a privilege of the 'civilized' nations" (Przeworski, 2008: 57). As democracies evolved, social movements exposed various inadequacies of representation, which ignore the unique challenges of the marginalised. Today, democratic regimes are facing the challenge of inclusion (Palacios, 2016), where effective democracy demands practices "rooted in values of fairness and justice, fostering a system that

Scanned with OKEN Scanner

represents society's full diversity, across gender, class, race, and identity" (Sen, 2011: 7).

Crenshaw's (2013) concept of intersectionality offers a framework for inclusion, recognizing that overlapping identities shape various experiences of privilege and oppression. Thus, rather than viewing marginalized groups as homogenous, intersectionality emphasizes that democratic processes must support equitable representation that reflects the unique realities of each group.In political and institutional contexts, intersectionality rejects "neutral" representation, urging institutions to enable meaningful participation that respects diverse experiences. By facilitating policies responsive to society's needs, intersectional representation strengthens democracy's core. Without it, institutions risk entrenching superficial representation and ignoring the inequities that hinder democratic engagement. This intersectional framework invites us to consider whether those who occupy positions of power truly represent the interests of the broader population. As data in the next section will reveal, structural, cultural, and socio-economic factors reinforce existing barriers to gender equality in leadership (Tremblay, 2007), highlighting the need to dismantle these biases to create an inclusive democracy.

Social Reality of Women in Indian Elite Institutions

The Democracy Report 2024's scores for India across multiple democratic indices indicate significant challenges in achieving a balanced, inclusive democracy that fulfills both the electoral and liberal dimensions as outlined by Robert Dahl's principles of "polyarchy", as shown in Figure 1. The Liberal Democracy Index (LDI) score of 0.38 places India low on the scale, revealing fundamental weaknesses in both electoral quality and the liberal democratic principles. India is struggling to meet essential electoral standards such as fair

Scanned with OKEN Scanner

elections, freedom of expression, median independence etc., as showcased by Electoral Democracy Index (EDI) of 0.38, which are the key components of a robust and functional democracy. While Liberal Component Index (LCI) is a little higher at 0.62, suggesting moderate protection of civil liberties and rule of law, the Egalitarian Component Index (ECI) score of 0.43 reveals significant inequalities in political participation, suggesting systemic barriers that prevent equal representation of all social groups. Additionally, Participatory Component Index (PCI) score of 0.51 shows a constrained citizen participation beyond elections, such as civil society organisations and local governments. Lastly, the Deliberative Component Index (DCI) score of 0.61 reflects a partial commitment to reasoned, inclusive public debate and decision-making, with room for improvement in respectful consultation and consideration of diverse perspectives. Altogether, these indices suggest that India's democracy, while maintaining basic democratic structures, struggles to uphold an equitable and inclusive democratic system where all citizens actively participate in and influence governance.

Figure 1: India's democratic position

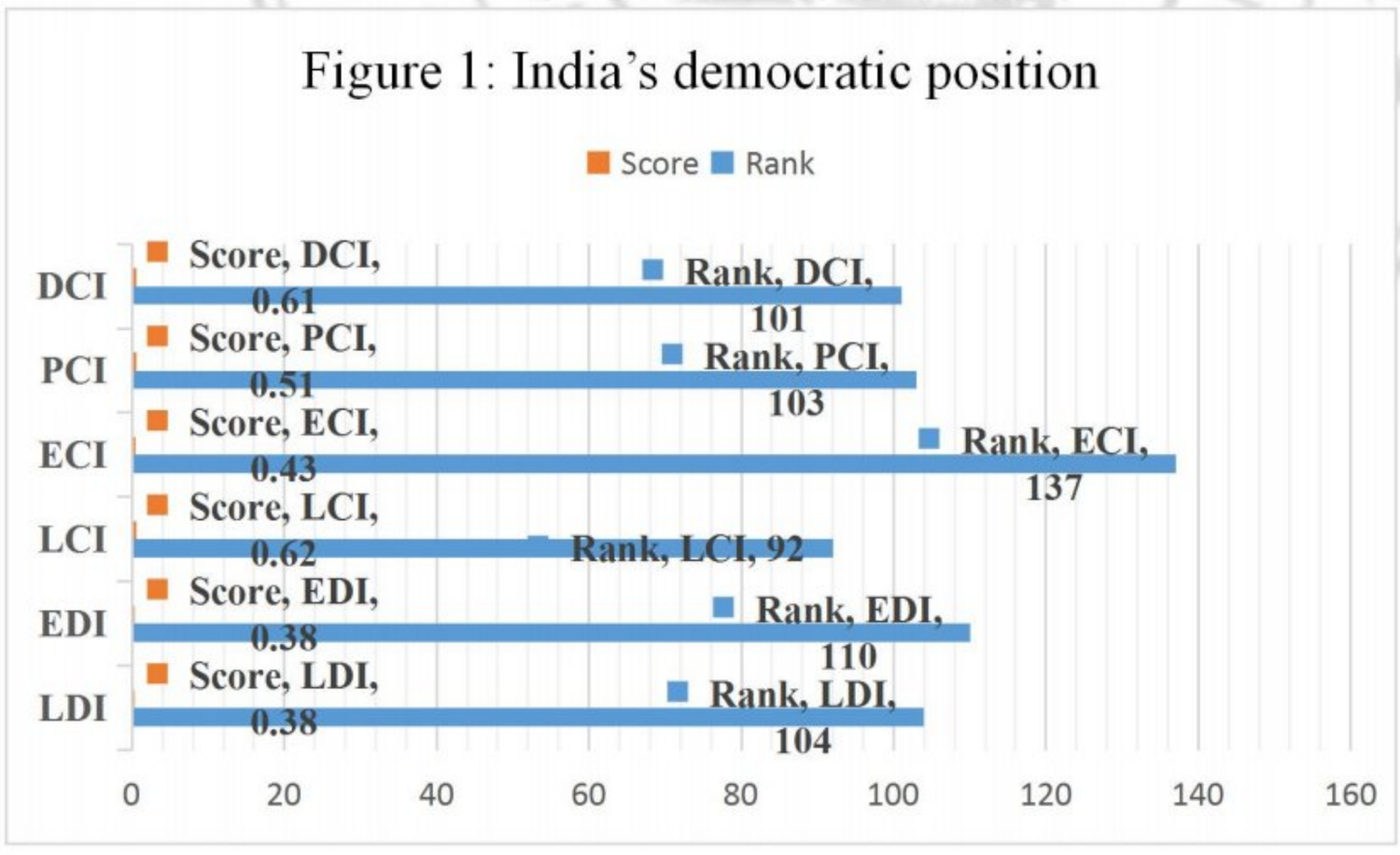

Source: Author's compilation from Nord, M., Lundstedt, M., Angiolillo, F., Borella, C., Gastaldi, L., Good God, A., Natsika, N., & Lindberg, S. I. (2024). Democracy

Scanned with OKEN Scanner

Winning and Losing at the Ballot: Democracy Report 2024. V-Dem Institute, University of Gothenburg.

India ranks 129thout of 146 countries, according to the gender gap report 2024, with a gender parity score of 0.641 with marked disparities in Economic Participation and Opportunity (142nd, 0.398) and Health and Survival (142nd, 0.951) (WEF, 2024). Despite marginal gains, India's Economic Participation score has declined by 6.2% from 2012, reflecting entrenched challenges in female workforce participation (134th, 0.459), wage equality (120th, 0.521), and estimated earned income (135th, 0.286). Only 1.8% of Indian firms have female majority ownership, and women hold top managerial roles in just 6.8% of companies, illustrating structural barriers in female leadership (WEF, 2024). While the rate of female labor force participation remains low, 92% of women work in the informal sector compared to 87% of men, highlighting a reliance on informal work lacking benefits or job security. A stark gender disparity exists in part-time employment, with 45.94% of women working part-time against 13.89% of men, likely due to care giving expectations (WEF, 2024). India ranks 65th in Political Empowerment (0.251), with significant underrepresentation in federal government (17.2% of parliamentarians and 6.9% of ministers are women), underscoring persistent social biases against female political engagement.

Table 1: Post-wise Number of Male & Female Teachers (2021-22)

Post	Total	Male	Female	% Female
Professor & Equivalent	95050	66507	28543	30.03

Scanned with OKEN Scanner

Reader & Associate Professor	121269	73695	47574	39.23
Lecturer/ Assistant Professor	829981	456334	373647	45.02
Demonstrator/ Tutor	53191	18546	34645	65.13
Temporary Teacher etc	74784	38466	36318	48.56
Visiting Teacher	8649	4597	4052	46.85
Grand Total	1182924	658145	524779	44.36

Source: Author's compilation using Government of India. (2023). All India Survey on Higher Education 2021-2022. Department of Higher Education, Ministry of Education.

Figure 2: Post-wise Number of Teachers (2017-18 to 2021-22)

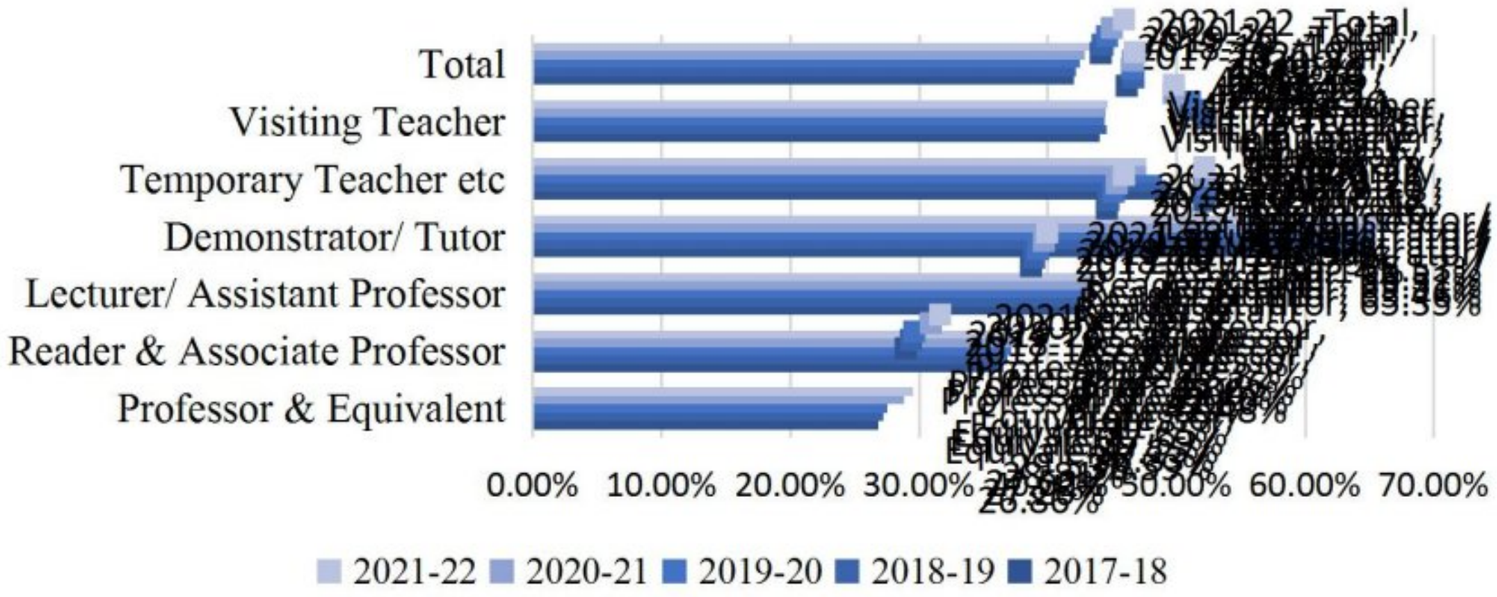

Scanned with OKEN Scanner

Source: Author's compilation using Government of India. (2023). All India Survey on Higher Education 2021–2022. Department of Higher Education, Ministry of Education.

The data on faculty distribution and university types in India, as well as on the gender breakdown across academic positions from 2017 to 2022 as shown in Table 1 and Figure 2, underscores significant gender and structural imbalances within India's higher education sector. Among the total of 1,168 universities, only 17 are designated as women-only institutions, reflecting minimal institutional support for women's exclusive educational spaces, especially compared to the substantial numbers of government and private institutions (240 central and 473 private universities, respectively).

Women comprise 43.4% of the teaching workforce, but this representation diminishes considerably at senior academic levels, indicating a critical imbalance. At the Professor rank, women account for only 30.03%, and their presence marginally improves to 39.23% at the Reader/Associate Professor level. The majority of women faculty are concentrated in lower or temporary positions: they represent 65.13% of Demonstrator/Tutor roles, while holding 47.7% and 44.7% of Temporary Teacher and Visiting Teacher positions, respectively. This distribution suggests that women often enter academia in entry-level or less secure roles but encounter substantial obstacles when advancing to more influential positions.

While there has been an incremental growth in women's representation over the last five years, data showcases that progress towards reaching senior roles in elite spaces have been limited. Women held 29.5% professor roles in 2021-22 as opposed to 26.9% in 2017-18 while associate professor roles have increased to 37.8% to 36.6%, suggesting systemic barriers within academic institutions which restrict upward mobility of women and limiting their access to leadership and decision-making roles. This 'glass ceiling' (Cotter et al., 2001) not only constrains

Scanned with OKEN Scanner

career progression but underscores a lack of effective policies aimed at fostering gender diversity within senior academic ranks.

The uneven gender representation at senior levels and entry level positions raises significant concerns regarding structural support for career advancement of women. While institutions allow entry at initial positions, they fail to sustain their growth in higher roles, which results in a creation and perpetuation of a pattern where women hold roles with less power and fewer advancement prospects, culminating into limited influence in academic sphere. This leadership imbalance but also diminishes the diversity of perspectives that are crucial for a truly inclusive academic environment, suggesting an urgent need for comprehensive policy changes to not only dismantle barriers and but also promote gender equality at the top levels of academia.

Figure 3: Working Strength of Women Judicial Officers in Supreme Court (as on 08.11.2024), High Courts (as on 05.12.2022), and District and Subordinate Judiciary (as on 05.12.2022)

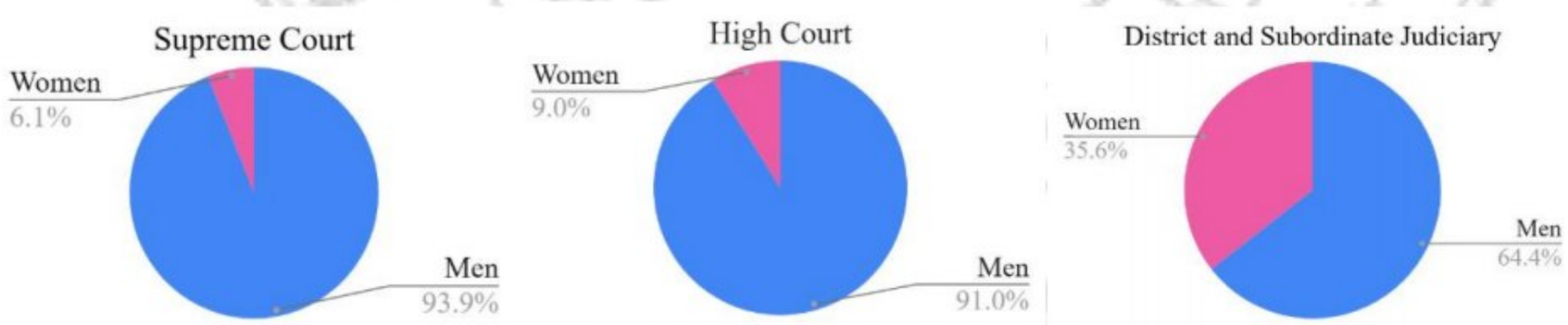

Source: Lok Sabha Unstarred Question No. 2116, dated on 29.07.2022.

The judiciary is a cornerstone of democracy, responsible for upholding the rule of law and ensuring justice for all citizens, regardless of class, caste, or gender. In a diverse country like India, where various social and economic backgrounds coexist, it is essential that the judiciary not only represents but also reflects this diversity. For a judicial system to function justly, it must include voices and

Scanned with OKEN Scanner

perspectives from all segments of society, especially marginalized communities. This inclusion ensures that the judiciary is able to empathise and understand the unique challenges faced by the diverse population of India. Additionally, a diverse and truly representative judiciary contributes not only to a fairer but also a more balanced interpretation of law, thus ensuring that the rights and needs of all citizens are equitably addressed.

However, the representation of women in the judiciary, particularly at the higher echelons, shows a significant gender disparity, as shown in Figure 3. For instance, women make up only 6.06% of Supreme Court judges. The present two female judges of Supreme Court both belong to influential judicial families, suggesting not only a specific socio-economic background but also a network and legacy which is far from that of an average Indian woman. While their achievements are notable, their privileged backgrounds raise a significant question- Are they representing women as a class or are they a representative of their social class? This leads us to a significant intersectional component. Undoubtedly, having women on the bench of Supreme Court is a step towards gender inclusion, but the intersection of gender with class and caste must be considered to truly gauge the inclusion. For example, if the few women to ascend to the highest level of judiciary in the nation predominantly belong to elite privileged backgrounds, then their representation is limited to a narrow segment of the society. Therefore, while the presence of women is crucial, true inclusivity requires representation spanning across all socio-economic identities.

Furthermore, only 9% judges are women in High Court, reflecting a troubling pattern. High Courts serve not only as an appellate body but also as institutions critical for interpretations of constitutional matters and precedents, thus shaping judicial landscape. This lack of representation of women suggests a

Scanned with OKEN Scanner

limited capacity of the court to render justice in gender specific issues, especially in cases where an insight into gender dynamics may lead to more equitable decisions or a nuanced understanding across diverse social divides. Additionally, as High Court serves a pathway to Supreme Court, thus a lack of inclusion here will perpetuate gender imbalance apex judicial body. Lastly, at the district and subordinate judiciary levels, women constitute a measly 35.6%. While this reflects a comparatively higher representation, it is far from parity. Lower courts handle cases which affect daily lives of people, thus having a female judge can bring valuable perspectives that foster empathy and fair outcomes, especially in cases that directly impact women and vulnerable groups.

The decline of women's representation district courts to High Courts and ultimately the Supreme Court highlights a systemic issue in career advancement of female judges, suggesting that structural and cultural barriers hinder their promotion. This lack of upward mobility indicates that while women somewhat manage to join the workforce at the lower level, their opportunities to ascend to positions of a greater influence are limited, which ultimately reinforces male dominance in judicial decision-making. The data also showcases the lack of inclusion and fairness in judiciary as an institution. Without any significant representation from women across all levels, the judiciary risks becoming detached from the experiences of half of the population. Further, when women who do ascend to higher positions come from privileged backgrounds, as seen in the Supreme Court, their ability to represent women from diverse socioeconomic backgrounds is compromised. A judiciary that fails to be inclusive risks losing its legitimacy and the public confidence, as it may seem disconnected from the realities of those who it is meant to serve in a democratic society.

Figure 4: Gender-wise appointment of IAS Officers (1951-2020)

Scanned with OKEN Scanner

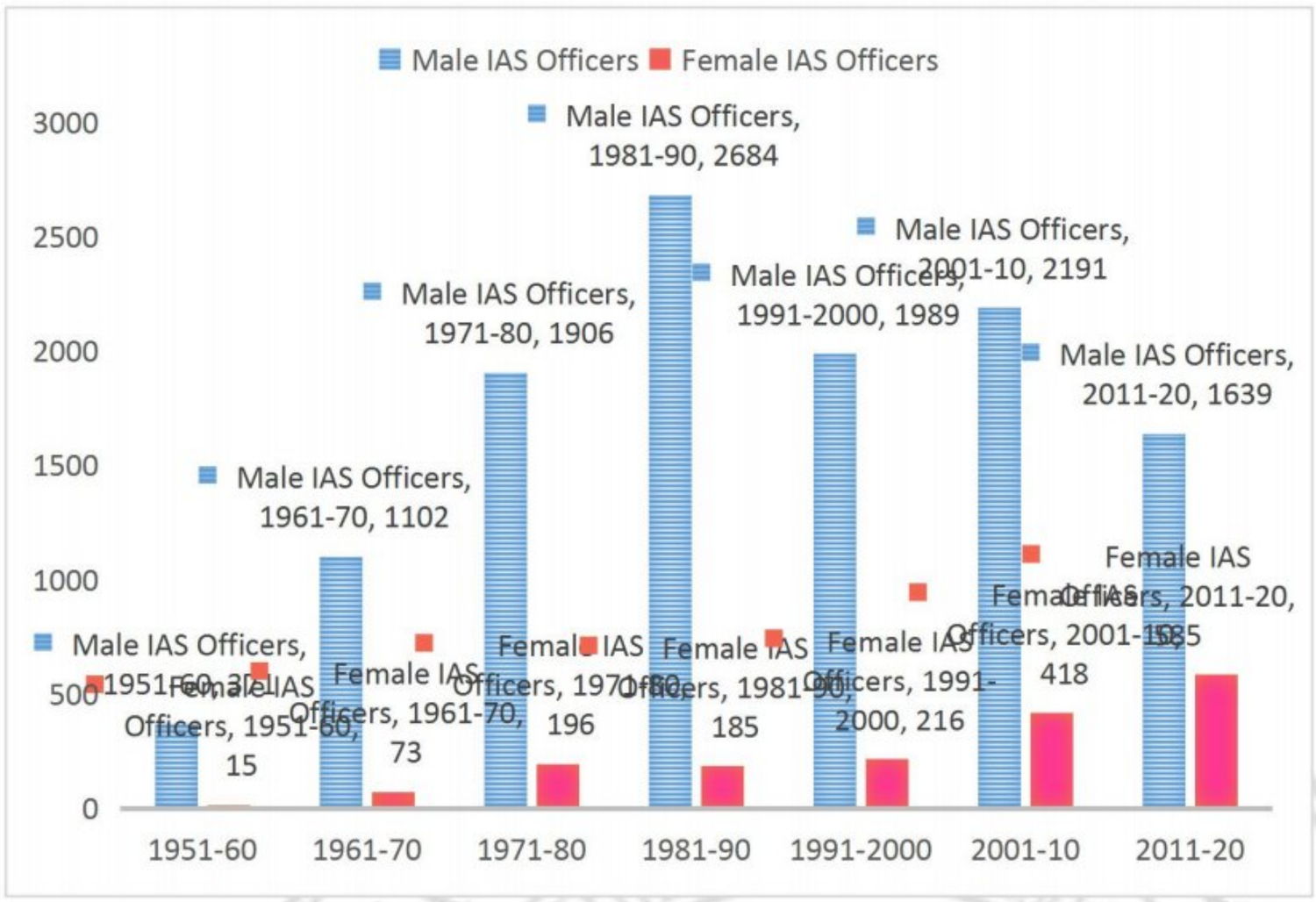

Source: TCPD Indian Administrative Service Officers Dataset (TCPD-IAS), 1951-2020, 2021 Trivedi Centre for Political Data, Ashoka University.

There has been a slow increase of women's representation in the Indian Administrative Service from 1951 to 2020 as shown in Figure 4, from just 3.89% in the 1950s to 26.3% by the 2010s. But despite this rise, women's representation is significantly limited in a critical elite institution which is tasked with the implementation of policies and maintenance of democratic governance. The low percentage of women in the initial years shows the entrenched gender biases and systemic barriers which restricted access to influential roles. Despite recent increases, the data likely reflects the inclusion of women primarily from privileged backgrounds, suggesting that many Indian women—especially those from marginalized and rural communities—remain underrepresented. This exclusion raises concerns about the equitable functioning of democratic institution which ought to represent the diverse population it serves. When women, particularly those from diverse socio-economic, caste, and regional backgrounds, are excluded from high-level decision-making, policies may inadvertently ignore or

Scanned with OKEN Scanner

misunderstand the unique challenges faced by these groups. Such a lack of diversity restricts the IAS's ability to foster social justice and develop truly inclusive policies, potentially perpetuating inequities. To achieve genuine democratic governance and social justice, it is essential that the IAS becomes representative of India's diversity, enabling a more just and balanced administration that addresses the needs of all segments of society.

Figure 5: MPs elected in Lok Sabha (1951-2020), Gender-wise

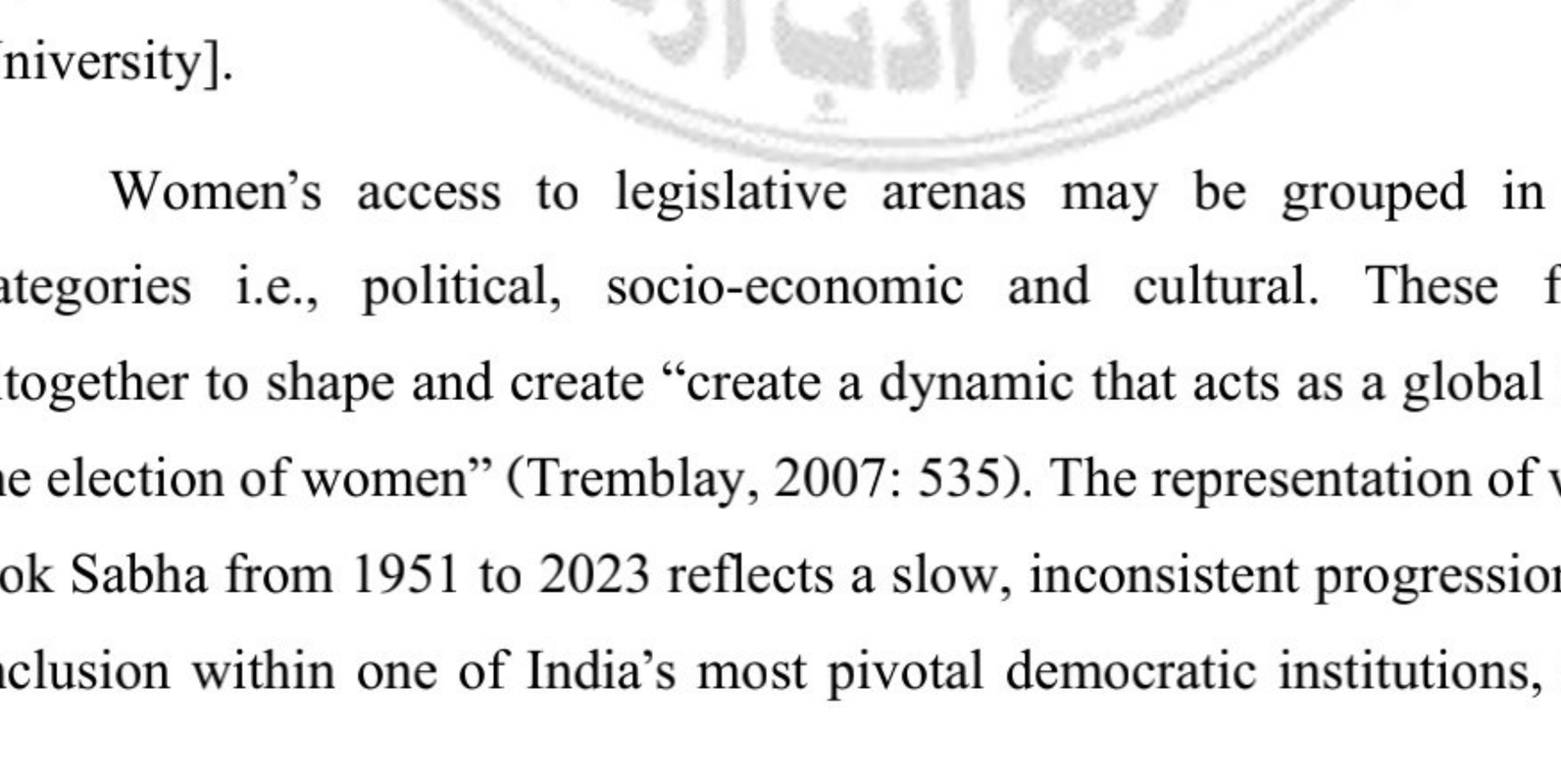

Source: Authors compilations from Hussain, S. (2022). The Impact of Women Representatives on Public Policy A Study of Indian Parliament 2009-2019 [Jamia Milia Islamia University].

Women's access to legislative arenas may be grouped in three broad categories i.e., political, socio-economic and cultural. These factors work altogether to shape and create "create a dynamic that acts as a global incubator for the election of women" (Tremblay, 2007: 535). The representation of women in the Lok Sabha from 1951 to 2023 reflects a slow, inconsistent progression in women's inclusion within one of India's most pivotal democratic institutions, as shown by

Scanned with OKEN Scanner

Figure 5. Women's representation has shown slow, uneven progress, beginning with just 4.42% in the 1st Lok Sabha (1952) and barely exceeding 10% until the 15th Lok Sabha in 2009. This gradual increase—culminating at 14.36% in the 17th Lok Sabha (2019)—reflects shifts in social attitudes, but the slight decline to 13.62% in the 18th Lok Sabha (2023) suggests that this growth is neither stable nor deeply embedded. The data suggests that institutional and societal barriers, such as patriarchal norms and systemic biases, still hinder women's full access to political power, limiting genuine progress toward gender parity in Indian politics.

The proportion of women in the Lok Sabha has increased, but the studies (Hussain, 2022) show that many elected women rely heavily on familial or political connections. In Phase 1 (1952-1971), 45% of women elected to Parliament came from political families, a trend that persisted in Phase 2 (1972-1988) at 48%, and Phase 3 (1989-2009) at 45%. Even in Phase 4 (2010-2019), where 58% of women were elected without political lineage, the remaining 42% retained ties to influential political families. The reliance on political connections suggests that entry into Parliament for women has historically been shaped by gate keeping, with families acting as conduits to political careers rather than a system which promotes equal opportunity based on individual merits. Thus, though the quantity of women in Parliament may have increased, the quality of representation remains insufficient in terms of diversity. Additionally, the data implies that women with political connections tend to primarily represent the interests and perspectives of their political families or affiliations instead of the broader interests of women across different socioeconomic backgrounds. Additionally, political lineage often entails obligations to uphold the legacies, alliances, and policy preferences of their families or political mentors. Consequently, such women may prioritize party and familial loyalty over advocating for issues affecting ordinary

Scanned with OKEN Scanner

women, such as healthcare, education, and gender equality. While they may identify with women's issues in general, their class and status often place them in a position removed from the realities faced by the majority of Indian women, particularly those from marginalized communities.

While the decreasing trend in lineage-dependence from 48% in Phase 2 to 42% in Phase 4 is a promising shift towards a more independent representation, 42% is a significant portion, underscoring a systemic bias that privileges women from elite backgrounds and limits the scope of their representation. Political parties, too, contribute to this bias by preferring candidates with established family names, valuing the "recognition factor" over genuine grassroots support. As a result, these women may be less inclined or even restricted from addressing the broader and intersectional issues that affect women as a diverse class in India.

The representation of women in the Lok Sabha is insufficient in the sense that it is not fully reflective of the diversity of Indian women. Although the number of women in Parliament has grown, the high percentage of women with political lineage questions whether these representatives genuinely reflect the perspectives of women as a collective class or are limited by their ties to political dynasties. True representation should allow women from varied backgrounds—rural, urban, marginalized, and economically disadvantaged—to have equal opportunities for political participation. Only then can women's representation in Parliament evolve to be both numerically and qualitatively sufficient, serving the interests of all women in India rather than just the politically connected few.

Way Forward: Toward Inclusive Representation of women in Democracy

True inclusion of all group/class of society in a democracy requires dismantling systemic barriers that restrict marginalized groups from meaningful

Scanned with OKEN Scanner

participation. Justice within democratic institutions cannot rely solely on universal principles or token representation; it must address distinct social and structural disadvantages, such as those faced by women and economically disadvantaged groups, that hinder full and equitable engagement (Young, 1990). Institutions may appear democratic by electoral results or diversity statistics, but without mechanisms to counter deep-rooted inequalities, democracy serves dominant groups rather than the wider citizenry.

Inclusive representation acknowledges "group difference" (Young, 2000), recognizing that society's diverse social and economic backgrounds lead to unique needs and challenges. Women in power, particularly those from privileged backgrounds, often represent the interests of their class more than those of all women, leading to a narrow representation that overlooks diverse social, economic, and cultural backgrounds. Thus, true democracy requires intersectional representation, where leaders from varied backgrounds can address barriers across caste, creed, and class. Moreover, democratic institutions must foster environments for full, meaningful participation, ensuring that policy formation reflects the voices of all communities. Lacking such inclusive dialogue, democracy risks producing policies that prioritize dominant group interests while ignoring the marginalized. Structural and cultural biases limit advancement, especially for women, and even positive shifts in education and professional achievement cannot, on their own, yield inclusive leadership.

Systemic oppression, deeply embedded in institutional practices, explains why democratic institutions often fall short of inclusivity. Cultural and institutional biases in candidate selection favor specific candidates while systematically excluding others, limiting opportunities for marginalized individuals (Tremblay, 2007). Thus, achieving democratic justice requires not only diverse representation

Scanned with OKEN Scanner

but also the resources and freedoms for all citizens to participate actively in governance. The way forward demands more than increasing diversity within institutions; it requires transformative change that dismantles structural inequalities and embeds the values of liberty, equality, and fraternity across all levels. Real democratic inclusion occurs when institutions become accountable to the people they serve, embracing these values in both structure and practice.

Therefore, there is a need of transformative changes to address the systemic barriers which limit women's representation in India's elite institutions. These barriers tend to stem from the entrenches structural biases and cultural norms which hinder their effective participation in governance and leadership. Actualisation of genuine representation necessitates implementation of institutional mechanisms such as gender quotas, equitable candidate selection processes and support mechanisms. While a bill for increased representation of women has passed in the parliament, only time will tell how it fares. However, these mechanisms alone cannot bring about a truly transformative change. Fostering a societal mindset that recognizes women as equals to men will ensure that structural reforms are enacted in both letter and spirit. Only by the dismantling of these barriers can democratic institutions truly reflect the values of democracy in society, thus creating inclusive spaces for all citizens.

Conclusion

The analysis of women's presence within India's elite institutions—namely Higher Education Institutions (HEIs), Judiciary, Indian Administrative Services and Parliament—underscores a persistent and systemic failure to realize democratic ideals of inclusivity, equality, and genuine representation. Despite the incremental gains in the number of women occupying formal roles in these elite institutions, data reveals a troubling trend: women are underrepresented, especially

Scanned with OKEN Scanner

at higher positions of power and leadership. For example, in Lok Sabha women's representation has only reached 14.36% in the 17th Lok Sabha, despite comprising nearly half the population in electorates. Similarly, in academia, a miniscule 30% of professorial positions are held by women, which is a stark contrast to their greater presence in lower-tier roles such as Demonstrator/Tutor. Within the judiciary, there is critical lack of representation at senior judicial roles, only 9% in High Court and 6.06% in Supreme Court, which further showcases the institutionalized barriers to equitable representation. Through critical examination, it becomes evident that the lack of representation of women and inclusion are not only because of social and cultural biases but from structural and institutional biases embedded within democratic frameworks, which showcases that democratic institutions must be followed not only in letter but in spirit.

Additionally, a significant question about the women in positions of power is raise- do these women truly represent women as a class? The data analysed suggests otherwise. Policies which favor politically connected candidates, limited support for women in advancing of their careers, and cultural biases within candidate selection processes all collectively reinforce these patterns, thus sidelining marginalized voices from decision-making processes. Without an active structural change, these barriers will continue to undermine democracy's foundational values. Therefore, addressing the challenges of gender and intersectional representation in Indian democracy requires transformative changes rather than incremental adjustments. Structural changes such as implementing gender quotas, reducing the reliance on political lineage, and creating supportive policies for women's career progression are essential steps. However, these solutions necessitate a deep commitment to dismantling the deeply rooted biases that limit inclusive representation, which can only be actualised by a change in

Scanned with OKEN Scanner

mindset. Additionally, those in positions to represent must be politically committed to effectively represent their social class. Only through such comprehensive changes can India's democratic institutions embody the principles of liberty, equality, and fraternity, ensuring they serve as inclusive spaces that genuinely represents the nation's diversity.

References

Anand, A. (2022). Democracy in India: Is it an Unfinished Project? Journal of Polity and Society, 12(1).

Antoine Furetière, Dictionnaire universel (Geneva: Slatkine Reprints, 1970 [1690]), v. 1.

Cotter, D. A., Hermsen, J. M., Ovadia, S., & Vanneman, R. (2001). The glass ceiling effect. Social forces, 80(2), 655-681.

Crenshaw, K. (2013). Demarginalizing the intersection of race and sex: A black feminist critique of antidiscrimination doctrine, feminist theory and antiracist politics. In Feminist legal theories (pp. 23-51). Routledge.

Dahl, R. A. (1971). Polyarchy: Participation and Opposition. Yale University Press.

Government of India. (2023). All India Survey on Higher Education 2021-2022. Department of Higher Education, Ministry of Education.

Paxton, P., Hughes, M. M., & Painter, M. A. (2010). Growth in women's political representation: A longitudinal exploration of democracy, electoral system and gender quotas. European Journal of Political Research, 49(1), 25–52.

Rodrigues, V. (2002). The Essential Writings of B. R. Ambedkar. Oxford University Press.

Rodrigues, V. (2011). Justice as the Lens: Interrogating Rawls through Sen and Ambedkar. Indian Journal of Human Development, 5(1), 153–174.

Sen, A. (2001). Democracy and Social Justice. In F. Igbal, Democracy, Market Economics & Development, an Asian Perspective (pp. 7–24). World Bank.

Tremblay, M. (2007). Democracy, Representation, and Women: A Comparative Analysis. Democratization, 14(4), 533–553.

World Economic Forum. (2024). Global Gender Gap 2024 Insight Report.

Young, I. M. (2000). Inclusion and Democracy. Oxford University Press.

Young, I. M. (with Allen, D. S.). (1990). Justice and the Politics of Difference (Paperback Reissue 2011). Princeton University Press.

Zinn, M. B., & Dill, B. T. (1996). Theorizing Difference from Multiracial Feminism. Feminist Studies, 22(2), 321–331.

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

National Human Rights Commission on Institutional Reform and Justice System In India: A Critical Analysis

Dr. Shyam Kumar
Associate Professor, Department of Political Science,
Kirori Mal College, University of Delhi
Tayenjam Priyokumar Singh
Assistant Professor, Department of Political Science
Shivaji College, University of Delhi

Abstract: National Human Rights Commission is very crucial in upholding human rights and driving institutional reform towards a more just society. Acting as an independent body, NHRC possesses the potential to promote governmental accountability and enhance governance by identifying areas of concern and recommending necessary reforms. However, their effectiveness is often challenged by political interference, limited resources, and a lack of robust enforcement powers. This research delves into the impact of NHRC, examining its diverse roles, including investigating human rights violations, offering advisory opinions to governments, harmonizing country's legislations with international human rights norms, and raising public awareness. Political manipulation, selective application of laws, and insufficient independence may undermine the effectiveness of such institutions. Drawing upon the Paris Principles, a framework established by the United Nations (UN), the study proposes strategies to strengthen NHRC more robustly. These strategies emphasize the importance of a clear mandate, a pluralistic and representative composition, and a broad scope of responsibilities. By adhering to these principles, NHRC can enhance its capacity to promote and

Scanned with OKEN Scanner

protect human rights, acting as catalysts for institutional reform and a more just legal system. The research concludes by highlighting the need for ongoing vigilance and broader political reform to ensure the continued effectiveness and independence of NHRC in its pursuit of justice, protection and promotion of human rights.

Keywords: Human Rights, Justice, Autonomy, Resources, Interference

Introduction

The Violation and abuse of the basic human rights, both systemic and incidental, continue to pose significant challenges across the world, particularly in developing countries. Institutions that form the backbone of governance-law enforcement, healthcare, education, and judicial systems- often become sites where human rights abuses are perpetuated, either through neglect, systemic corruption, or intentional actions. To safeguard citizens and ensure that institutions are held accountable, the National Human Rights Commissions (NHRCs) play a vital role. The NHRCs act as a watchdog, facilitating reforms, investigating human rights violations, and making recommendations to improve institutional accountability and justice. As independent bodies, NHRCs can promote governmental accountability and good governance. However, their effectiveness hinges on factors such as political context, resource allocation, and adherence to international principles like the Paris Principles. This research article delves into the impact of NHRCs on institutional reform and justice, exploring their roles, challenges, and potential, with a specific focus on the Indian context.

HHRC: Role and Functions

The National Human Rights Commission, India is a critical institution which promotes and protects human rights throughout the country. Established in 1993, the main role of this statutory body is to investigate allegations of human rights

Scanned with OKEN Scanner

breaches, examine human rights legislation and policies, and offer recommendations to the government on how to effectively implement them (Basu, 2013). According to the Section 2(1)(d) of the Human Rights Act (PHRA), defines "Human Rights as the rights relating to life, liberty, equality and dignity of the individual guaranteed by the Constitution or embodied in the International Covenants and enforceable by courts in India" (NHRC, 2024). One of its key tasks is to serve as a catalyst for India's domestic execution of the international human rights commitments and agreements. It has the authority to investigate human rights infractions, suggest corrective measures, and to monitor and review the compliance of the government with human rights treaties to which our country is a signatory member (Chitimira & Mokone, 2016). The Commission has also the capacity and authority to intervene and inquire in judicial processes which involve human rights problems, as well as to visit jails, mental health facilities, and other sites of confinement to review circumstances and guarantee human rights are protected (Chitimira and Mokone, 2016).

The Paris Principles is a cornerstone for the framework of the operation and foundations of human rights bodies like NHRC across the globe. It was formulated by the UN in 1993. This principle underlines the necessity of giving these organizations a wide mandate, preserving their independence, and providing them with sufficient resources and capabilities to carry out their tasks (Principles Concerning the Status of National organizations, 2005).

The Commission's role in promoting good governance is also significant. It can investigate cases of maladministration, abuse of power, and other forms of governmental misconduct and make recommendations and suggestions to the respective governments for their redressal. The findings and recommendation of the commission will help to improvise the accountability, transparency, fairness and legality of the administration of the respective governments, thereby

Scanned with OKEN Scanner

contributing to the overall improvement of governance in the country. The Commission's work is further facilitated by its participation in networked governance like GANHRI (Global Alliance of National Human Rights Institutions) and regional NHRI networks. These networks allow the Commission to share best practices, coordinate its efforts with other NHRIs, and leverage international support for protection, safeguarding and promotion of the basic human rights in the country (Haragopal, 1998; Reif, 2017). While the Commission has played a vital role in advancing human rights in the country, its effectiveness has been the subject of ongoing debate and scrutiny.

Institutional Reforms Driven by the NHRC

The statutory body has been instrumental in advancing institutional changes aimed at protecting human rights and fostering good governance. As an instrumental nation's human rights body founded on the Paris Principles, the NHRC has been at the forefront of pushing for the safeguard, advancing, protecting and promotion of the basic human rights as a civilised nation in the world (Pegram, 2010).

Its mandate include a variety of duties and functions like investigation of the violations and abuses of the human rights, monitoring and reviewing the execution and implementation of treaties and agreements pertaining to human rights, and advising and giving suggestion to the centre and state government on how to bring and ensure the efficiency and effective realisation of the basic human rights (Haragopal 1998). Through these roles, the NHRC has played an important role in identifying and correcting systemic concerns that threaten human rights, including as police brutality, custody fatalities, and denial of healthcare and education. Its work has had a considerable influence on institutional reforms in India.

A. **Law Enforcement Agencies Reforms**

One of the NHRC's key focus areas has been reforming law enforcement agencies to enhance accountability and uphold human rights. The HHRC has been

Scanned with OKEN Scanner

investigating and checking numerous cases related to the violations of the human rights by the police, including custodial deaths, and has made recommendations to the government to address these issues. For instance, the NHRC has advocated for the implementation of safeguards during police custody, such as mandatory medical examinations and the presence of family members or lawyers, to avoid and prevent torture and other forms and manners if ill human treatments (Chitimira & Mokone, 2016).

Law enforcement agencies are frequent targets of NHRC investigations due to numerous complaints regarding police brutality, custodial deaths, and unlawful detentions. For example, As per the NCRB data, "in the last 10 years, the majority (69 per cent) of 1,004 deaths in police custody have been attributed to either illness and natural causes (40 per cent), or to alleged suicide (29 per cent)" (Bagga, 2020). The NHRC's sustained pressure on law enforcement agencies has led to several reforms. It has recommended the installation of CCTV cameras in police stations to reduce instances of torture, extrajudicial killings, and unlawful detentions. Several states in the country including Maharashtra and Uttar Pradesh have implemented these recommendations in some way or other way. The NHRC's focus on custodial deaths has led to stricter guidelines for conducting autopsies and investigations, ensuring greater transparency and accountability.

The NHRC has also helped to improve the ability and training of law enforcement officials so that they can properly deal with human rights concerns. With addition to all these changes, this body has been playing an important role in supporting national laws, rules, and practices that are more or less consistent and coherence with basic human rights norms and standard across the world. The NHRC's efforts to drive institutional changes have been critical to boosting and leveraging India's practise of promoting and protecting human rights. Through its investigative,

Scanned with OKEN Scanner

advisory, and monitoring powers, the NHRC has been able to uncover systemic concerns and suggest legislative and policy reforms to remedy them.

The NHRC has also been instrumental in strengthening the judiciary's role in protecting human rights. Through its interventions and recommendations, the NHRC has contributed overall to the upbring and development of jurisprudence on issues and concerns related to human rights, particularly in areas such as the rights of marginalized groups, access to justice, and the right of free and fair trial in the courts. The NHRC's recommendations have also led to the establishment and foundation of different specialised human rights courts in the country and the appointment of additional judges to address the backlog of cases involving the human rights violations (Haragopal, 1998).

B. Healthcare and Mental Health Reforms

Another area where the NHRC has had significant impacts on healthcare is in government-run hospitals and mental health institutions. The NHRC has investigated cases of denial of access to healthcare and education, particularly for vulnerable and marginalized communities, and has made recommendations to the government to address these issues (Reif, 2017; Nagarajan et al., 2015). The Commission has also pointed out systemic issues in mental health institutions, where patients were often subjected to inhumane treatment, poor sanitation, and neglect. For example, the NHRC has proposed expanding primary healthcare services in rural and isolated regions, implementing universal healthcare coverage, and enhancing the public education system to provide equitable access to quality education.

After inspections of several mental health institutions, the NHRC's reports revealed inadequate facilities and severe mistreatment of patients. The Commission recommended reforms, which led to policy shifts aimed at improving infrastructure and mental healthcare delivery. It also found that many mental health institutions

Scanned with OKEN Scanner

were operating without adequate medical professionals and with substandard living conditions. The Commission pushed for policy changes, which resulted in improvements in the staffing and treatment facilities in states like Kerala and Maharashtra.

C. Reforms in Educational Institutions

The NHRC has also addressed human rights issues within educational institutions, such as discrimination, sexual harassment, and the denial of access to education for marginalized groups. The NHRC's interventions have resulted in the development of policies and guidelines to ensure inclusive and non-discriminatory practices in schools and universities, and the strengthening of grievance redressal mechanisms to address human rights violations in educational settings.

The NHRC has also focused on educational institutions, particularly in cases of discrimination, corporal punishment, and denial of access to education for marginalized groups. In several cases, the NHRC has taken action against schools and colleges that violated the right to education of students from marginalized backgrounds.

D. **Prison Reforms**

Another area of focus for the NHRC has been the reform of the prison system in India. The NHRC has looked into incidents of human rights breaches in jail, including overcrowding, inadequate living circumstances, and a lack of access to healthcare and legal counsel.

Prisons, often overcrowded and underfunded, are notorious for human rights abuses (UNODC, 2017). The NHRC has actively monitored the condition of prisons and advocated for reforms to ensure the human treatment of inmates. As per the NCRB (National Crime Records Bureau) data from 2020, the occupancy rate in Indian prisons was 118.5 percent, indicating severe overcrowding (NCRB, 2020). The NHRC's interventions have led to:

Scanned with OKEN Scanner

Improved Living Conditions: The NHRC recommended reducing overcrowding by building new facilities or upgrading existing ones. States like Tamil Nadu and Maharashtra have initiated the construction of additional prisons based on NHRC's recommendations.

Healthcare Access: The NHRC has insisted on improving access to healthcare for inmates, especially for those with mental health issues. In some cases, the NHRC has pushed for the creation of separate wards for prisoners with infectious diseases.

Judicial and Police Custody Deaths: According to the most recent data from the NHRC, "at least 17,146 persons died in judicial and police custody--nearly five per day on average- in cases registered in the decade leading up to March 2020" (Paliath, 2020). It directed prison authorities to ensure timely medical care, implement reforms to reduce overcrowding and improve basic sanitation in prisons (Vasudevan, 2017).

The NHRC's recommendations have led to the development of prison management guidelines, the establishment of independent oversight mechanisms, and the enhancement of rehabilitation and reintegration programs for prisoners.

E. Addressing Discrimination and Violence

One of the NHRC's key focus areas has been addressing discrimination and violence against marginalized communities, such as religious minorities, Dalits, and indigenous peoples.

The NHRC has examined several examples of human rights abuses against various groups, including hate crimes, police violence, and denial of access to basic services. The NHRC's actions have resulted in the setting up of guidelines and policies for the protection of the rights of disadvantaged populations, as well as the strengthening of accountability systems to guarantee that perpetrators of the violations of the human rights are being held to responsible and accountable. The NHRC's work has also helped marginalized populations express their rights and

Scanned with OKEN Scanner

participate in decision-making processes that influence their lives. The NHRC's engagement with civil society organizations and its efforts to amplify the voices of marginalized groups have been instrumental in ensuring that their concerns are heard and addressed by the government. Overall, this statutory body has been a backbone institution for driving institutional reforms to safeguard, protect and promote the dignity, liberty and basics rights of a human being in the country.

Ensuring Justice through NHRC Investigations

The NHRC's investigative powers have been crucial in ensuring justice for the victims pf the violations of the human rights in the nation. Through its investigations, the NHRC has uncovered and documented numerous instances of human rights abuses, including extrajudicial killings, torture, and the denial of access to essential services (Chitimira & Mokone, 2016).

The NHRC's investigations have led to the identification of systemic issues and the formulation of recommendations to the government to address these problems. For example, the NHRC's investigation into the deaths of civilians during security operations in Manipur resulted in the Commission's recommendation for the establishment of a special investigation team to ensure accountability and the provision of adequate compensation to the victims' families (Sriram, 2018).

The NHRC's investigations have also served as a catalyst for legal reforms, with the Commission's findings and recommendations leading to the reforms and amendment of the relevant laws and the development of new guidelines to prevent similar human rights violations in the future. With addition to its investigative role, the NHRC has helped raise awareness and promotion of human rights culture in India. This body's public education campaigns, training initiatives, and collaboration with civil society organizations have helped to mainstream human rights ideas and enable underprivileged populations to advocate for their rights. It has played a critical role in advancing institutional reforms to preserve and

Scanned with OKEN Scanner

promote human rights throughout the country. The NHRC has helped to enhance critical institutions like as law enforcement, the judiciary, healthcare, and education via its many initiatives, which include investigations, recommendations, and public education.

Despite the obstacles and constraints, it has encountered, this body has been playing a significant role in fostering and strengthening human rights in the nation and holding the government responsible for its duties under the laws and norms in the international human rights bodies. Through its many interventions and recommendations, the NHRC has played an important role in advancing institutional reforms to preserve and promote human rights in India. Despite ongoing obstacles, the NHRC's work has helped to advance human rights and enhance India's democratic institutions.

Challenges and Limitations of NHRC

Despite its achievements, the NHRC has faced several challenges in effectively carrying out its mandate.

1. **Political Interference:** Political pressure may compromise the independence and impartiality of NHRCs, hindering their ability to investigate sensitive cases or criticize government actions.

2. **Lack of Resources:** Inadequate funding and staffing can limit the capacity of NHRCs to conduct thorough investigations, monitor human rights situations effectively, and engage in robust public outreach. It often operates with limited resources, which hampers its ability to conduct in-depth investigations or follow up on cases (Kumar, 2001). For instance, the commission's effectiveness might be hampered by its limited budget, which in 2023-23 stood at a 7000 Lakhs (NHRC, 2024).

3. **Limited Enforcement Powers:** Many NHRCs lack the power to enforce their decisions or compel governments to implement their recommendations. The

Scanned with OKEN Scanner

recommendations put forward by this body are advisory in nature and are also not legally binding in any of the institution. But its recommendations are highly impactful and morally responsible. Its recommendations are advisory in nature and often not legally binding. Institutions can ignore or delay implementation without facing significant consequences. This can weaken their impact and ability to bring about meaningful change.

4. **Lack of Public Awareness:** Limited public awareness about the role and functions of NHRCs can restrict their ability to receive complaints, gather information, and mobilize public support for their work.

5. **Bureaucratic Hurdles:** Bureaucratic delays and inefficiencies can hinder the NHRC's investigations and its ability to provide timely redress to victims. This can undermine public trust in the institution.

Major Initiatives to Strengthen and Enhance NHRS's Impacts:

1. **Ensuring Independence:** The independence of NHRCs from political intervention is critical. This may be accomplished through open appointment procedures, secure financing channels, and legal safeguards against undue influence.

2. **Enhancing Powers:** Granting NHRCs greater enforcement powers, such as the ability to issue binding decisions or compel government action, can strengthen their effectiveness in promoting institutional reform.

3. **Increasing Resources:** Providing adequate resources, including funding and staffing, is essential for NHRCs to carry out their mandate effectively. This includes investing in investigative capacity, research, and public outreach.

4. **Promoting Public Awareness:** Raising public awareness about the role and functions of NHRCs can empower citizens to access their services, file complaints, and participate in holding institutions accountable.

Scanned with OKEN Scanner

Conclusion:

The NHRC has made significant contributions toward reforming institutions and ensuring justice in cases of human rights violations in the country. Through its investigations, reports, and policy recommendations, the Commission has influenced reforms in law enforcement, prisons, healthcare, and education. However, to enhance its impact, the NHRC must be granted more enforcement powers, better resources, and greater autonomy to operate without political interference. Strengthening the NHRC is essential to ensuring that institutions are held accountable and that human rights are upheld across all sectors of governance. By addressing the challenges and implementing the recommendations outlined above, NHRCs can strengthen their impact and contribute to a more just and equitable society.

References:

Bagga, R. (2020). Over 60% Of Deaths In Police Custody Are Within 24 Hours Of Arrest. IndiaSpend. https://www.indiaspend.com/over-60-of-deaths-in-police-custody-are-within-24-hours-of-arrest/

Basu, D. D. (2013). Introduction to the Constitution of India (21st ed.). Lexis Nexis.

Chitimira, H and Mokone, P. (2016). The Functions of Selected Human Rights Institutions and Related Role-Players in the Protection of Human Rights in Zimbabwe. Potchefstroom Electronic Law Journal, Vol. 19, pp. 1-40.

Haragopal, G. (1998). Good Governance: Human Rights Perspective. Indian Journal of Public Administration, 44(3), pp. 297-306. https://doi.org/10.1177/0019556119980306

Haragopal, G. (1998). Good Governance: Human Rights Perspective. Indian Journal of Public Administration, 44(3), pp. 297-306. https://doi.org/10.1177/0019556119980306

Kumar, C. R. (2001). Role and Contribution of National Human Rights Commissions in Promoting National and International Human Rights Norms in the National Context. Indian Journal of Public Administration, 47(2), pp. 222-236. https://doi.org/10.1177/0019556120010207

Meier, B.M., Bottini, F.L., Bueno, d. M. J, Habibi, R., Sekalala, S, & Gostin L.O. (2023). A critical juncture for human rights in global health: Strengthening human rights through global health law reforms. PLOS Glob Public Health, 3(12): e0002663. https://doi.org/10.1371/journal.pgph.0002663

Nagarajan, S., Paul, V. K., Yadav, N., & Gupta, S. (2015). The National Rural Health Mission in India: its impact on maternal, neonatal, and infant mortality. Seminars in fetal & neonatal medicine, 20(5), pp. 315–320. https://doi.org/10.1016/j.siny.2015.06.003

National Crime Records Bureau. (2020). Prison Statistics India- 2019. Ministry of Home Affairs, Government of India.

National Human Rights Commission (NHRC). (2024). Annual Report 2023-2024. Government of India. https://nhrc.nic.in/activities/annual-budgets

National Human Rights Commission (NHRC). (2024). https://nhrc.nic.in/about-us/about-the-Organisation

Scanned with OKEN Scanner

Paliath, S. (2020). Deaths In Police/Judicial Custody every day over 10 years, but few convictions. IndiaSpend. https://www.indiaspend.com/5-deaths-in-police-judicial-custody-every-day-over-10-years-but-few-convictions/

Pegram, T. (2010). Diffusion Across Political Systems: The Global Spread of National Human Rights Institutions. Human Rights Quarterly, Vol. 32, No. 3, pp. 729-760, Available at SSRN: https://ssrn.com/abstract=2465584

Ramcharan, B.G. (2005). Principles Relating to the Status of National Institutions (The Paris Principles). Nijhoff Law Specials, Vol. 62, pp. 199-202 DOI: https://doi.org/10.1163/9789047415114_016

Reif, L. C. (2017). The UN guiding principles on business and human rights and networked governance: Improving the role of human rights ombudsman institutions as national remedies. Human Rights Law Review, 17(4), pp. 603–632. https://doi.org/10.1093/hrlr/ngx034

Rose, T. (2013). A Human Rights-Based Approach to Journalism: Ghana. Journal of International Communication, Vol. 19, Issue 1, pp. 85-106. https://doi.org/10.1080/13216597.2012.737347

Sriram S. (2018). Availability of infrastructure and manpower for primary health centers in a district in Andhra Pradesh, India. Journal of family medicine and primary care, 7(6), pp. 1256–1262. https://doi.org/10.4103/jfmpc.jfmpc_194_18

United Nations Office on Drugs and Crime (UNODC). (2017). Handbook on Strategies to Reduce Overcrowding in Prisons. United Nations Publications. https://www.unodc.org/unodc/en/justice-and-prison-reform/tools.html

Vasudevan, S. (2017). Human rights, police reforms, and the NHRC in India: A critical review. Indian Journal of Public Administration, 63(4), 574-591. https://doi.org/10.1177/0019556120170630 47

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Postcolonial English Literature and the Writings of Kashmiri Pandits

Mr. Jitendar

Assistant Professor Department of English,

Ramjas College University of Delhi

Prof. Rekha Shrama

Department of English

Himachal Pradesh University Summer Hill, Shimla

Abstract: The evolving nature of globalisation, multiculturalism, and the virtual world has rendered literature, culture, and identity critical domains for investigation in postcolonial literary studies. The critical approach to postcolonial literature challenges the established conventions of literary and cultural studies. Post-colonialism is an umbrella term that encompasses, inter alia, cultural studies, multiculturalism, popular studies, feminism, subaltern studies, postmodern studies, and various branches of knowledge such as history, politics, sociology, and philosophy. Postcolonial literature provides platforms for individuals to manifest their identities through diverse modes of literary expression. This research paper endeavours to elucidate the struggle for identity by Kashmiri Hindus (Pandits) through their writings. Postcolonial literary theory has been employed as an analytical framework to evaluate the writings of displaced Kashmiri Pandits.

Keywords: Post-colonialism, Multiculturalism, Popular Studies, Globalization.

Scanned with OKEN Scanner

Introduction

Postcolonial literature presents a diverse range of research in postcolonial studies by scholars from diverse fields. The literature primarily focuses on writers and writings originating from previously colonised nations. Postcolonial studies encompass ethnicity, gender, race, religion, politics and culture. The adjective "postcolonial" refers to the theories and writings of post-colonialism and should not be confused with the term "post-colonial", which denotes a period after colonisation. The postcolonial world of displaced communities globally became a subject of scholarly inquiry following the end of colonisation. This research paper endeavours to examine the culture and identity of Kashmiri Pandits within the postcolonial literary context and investigates how the ethnic identity and cultural affiliation of a group become contentious issues among the populace of a secular democratic country with evolving perspectives.

Resistance against the dominant forces in various aspects of society characterises postcolonial literature in the contemporary world. The postcolonial era challenged dominant knowledge systems in pursuit of identity and to establish independence in different branches of knowledge. Prominent voices of postcolonial literature emerge not from Western and American countries but from those nations which were once subjugated and dominated by the British, such as Chinua Achebe, Edward Said, V. S Naipaul, Homi Bhabha, Salman Rushdie, Derek Walcott, Gayatri Spivak, Sam Selvon and others. Notably, from the 1950s onwards, numerous renowned intellectuals and literary theorists addressed the atrocities and discrimination individuals endured in colonised countries. Furthermore, the exile and migration of people from their native lands to adopted lands created new mixed, hybrid societies that clashed culturally and ethnically (Abdulqadir 5). The central premise is to examine postcolonialism as a literary discourse in India, where identity politics and the quest for belongingness establish their presence in

Scanned with OKEN Scanner

social and academic discourses. Postcolonial theorists such as Edward Said, Ngugi wa Thiong'o, Frantz Fanon, and Chinua Achebe explore and define postcolonial literature, addressing issues about politics, globalisation, principles, its origins, and concerns, encompassing various areas and theories that influence the literary works of contemporary world literature. A seminal text that significantly shapes the field of postcolonialism is Edward Said's Orientalism, wherein Said, the scholar, coined the term "Orientalism" to define the ways through which non-European and non-Western culture, literature, societies, and people were portrayed by thinkers and intellectuals from the West (Kohn and Reddy 3).

In his seminal work, The Wretched of the Earth (1961), French philosopher Frantz Fanon examines the dehumanising effects of colonisation on the psychology of colonised subjects. This significant text explores and provides a platform for discussing the shortcomings of postcolonial societies. The primary methodology employed in postcolonial literary theory is colonial discourse analysis, through which literary works are examined. Theorists endeavour to deconstruct and critique the discourses in which colonial relations are constituted, exploring colonialism's representational strategies and subject positions. “Within the field of postcolonial studies, diverse approaches and perspectives exist for examining literature, including postcolonial, postmodernist, structuralist, and post-structuralist frameworks” (Raja 2019). Peter Joseph in, “Man as a Victim of Alienation and Loss of Identity” (2012), talks about the dilemma that the postcolonial age is creating in front of the people who are on the verge of losing their identities

Despite striking and distinguishable progress in science and technology, the present age is characterized by moral debasement, godlessness, religious conflict, lawlessness and the loss of human values in society. This can be perceived in the breakdown of traditional, social, moral and religious values and the loss of one’s self and identity. People suffer from religious loss, moral distress, social

Scanned with OKEN Scanner

discrimination, pessimism, domestic anguish and problems related to gender and race. Since advancement has become interchangeable with corruption and degeneracy of contemporary life conflict has become part and parcel of life (Joseph 2).

Postcolonialism offers a broader framework to understand themes and perspectives in Kashmiri literature, mainly as it explores the layered experiences of conflict, migration and identity. While Kashmir was not conventionally colonized, it endured many forms of political control, from Mughal and Dogra rule to the complex dynamics post-Partition. "This history is reflected in literature that captures the fractured identities and the quest for self-definition" (Zia, 2019). The displacement of Kashmiri Pandits and subsequent diaspora have led writers to explore exile, the pain of separation, and the alienation of cultural fragmentation, echoing postcolonial themes of diaspora and tormented identity. "Hybridity is an unavoidable characteristic of postcolonial literature, where traditional and modern identities intersect in tension. It is a recurring theme that reveals how characters grapple with community versus individual belonging" (Bhabha, 1994). "Literary narratives and storytelling emerge as an act of resistance, allowing Kashmiri writers to "write back" to dominant discourses on issues like militancy and marginalization, reclaiming agency over their identity and challenging stereotypes" (Rushdie, 1991). The anguish of conflict is a recurring motif, with literature capturing collective memories of violence, mirroring postcolonial explorations of collective trauma and the struggle to protect identity and memory. Spiritual and cultural identity also play significant roles, with writers drawing on native philosophies and folklore to reaffirm their cultural identity, much as postcolonial literature worldwide reclaims native traditions. Postcolonial literary theory, therefore, enriches the understanding of Kashmiri literature's complex interplay of trauma, displacement and migration in a broader postcolonial context.

Scanned with OKEN Scanner

The Kashmiri Pandit community has played an essential role in preserving and promoting Kashmir's rich literary and cultural heritage, especially in the face of challenges posed by them during insurgent movements and displacement. The community, well-known for its intellectual achievements, has worked hard to revive its language, history, and identity through literature. Works ranging from historical records to spiritual writings, oral traditions, and contemporary literature exhibit their dedication. In the past, Kashmiri Pandit authors have painstakingly preserved their society's traditions, culture and important historical events. One of the most significant contributions is Kalhana's Rajatarangini. The book offers insights into the kings and society of medieval Kashmir through a unique fusion of literary style and historical narratives.

The Pandit community's efforts to conserve Kashmir's historical narratives are highlighted in this paper. Kashmiri Pandit writers have carried on this tradition in the contemporary era, examining the beauty of the Valley and hardships while addressing socio-political upheavals. The Kashmiri Pandit group has played a significant role in maintaining the Kashmiri language and conserving history. To keep Kashmiri alive, many Pandit writers have continued to create plays, essays, and poetry in their language. In their writings, well-known poets and authors like Dina Nath Nadim, Rahman Rahi, and Moti Lal Saqi, Manav Kaul have encapsulated Kashmiri philosophy and culture, showing their commitment to promoting language and tradition. Kashmiri Pandits have preserved Hindu and Shaiva spiritual works essential to their religious and philosophical legacy. Kashmiri Pandits have preserved texts such as the Neelmath Purana and other Shaivite traditions, interpreted, and frequently translated for a wider audience by community academics. Kashmir's literary and artistic legacy has been enhanced by the community's continued adherence to its spiritual and philosophical foundations. The experience of relocation and loss became a significant theme in Kashmiri

Scanned with OKEN Scanner

Pandits' literature following their departure from the Valley in the 1990s. The anguish of losing their nation and a strong desire to maintain their identity are reflected in this work corpus, frequently referred to as the literature of exile. By highlighting the hardships of the Kashmiri Pandit community in their novels, memoirs and poems, writers like Siddhartha Gigoo, Varad Sharma, Rahul Pandita, T. N. Dhar, and Bill K. Koul have made sure that future generations become aware of the difficulties their community faces.

Rich oral traditions, such as folklore, folk songs and legends that express their mythologies and cultural values, have been preserved by Kashmiri Pandits in addition to written writings. As we go back through the millennia, the Vedic era signifies a significant turning point in the ancient history of Kashmir. The Sarasvati River, which some scholars believe shares the same name as the Jhelum "River that runs through the heart of Kashmir, is mentioned in the Rigveda, one of the oldest sacred texts in ancient India. The Vedic hymns hint at the earliest religious ideas and rituals developed in this abundant valley and provide insights into the socioreligious environment of the region" (Mehrdin et. all 193). Recording and enacting these oral traditions has preserved a collective memory of Kashmiri Pandits before exile. Documenting elders' oral histories and tales is one of the most important steps in maintaining and transferring this cultural legacy to future generations.

The Kashmiri Pandits have founded many literary and cultural groups nationwide to promote its literature and legacy. These platforms serve as venues for disseminating and discussing literary works that represent the experiences and goals of the community. The literature can flourish despite geographical distance. In addition to helping to preserve the literary legacy, this accessibility exposes readers who are not Kashmiris to the distinctive stories of the community. "Pluralism and tolerance are apparent in the teachings, sayings, writings and

Scanned with OKEN Scanner

behaviour of Sufi saints from Lal Ded to Shaikh Noorudin" (Lone 27). In order to keep traditional Kashmiri stories exciting and current in modern settings; several writers have also adapted them for digital media. The community upholds Kashmir's literary heritage while promoting a feeling of continuity and identity among generations by bringing fresh viewpoints that reflect historical origins and contemporary resiliency. Some Kashmiri Pandits' writings have tackled the problem of lost identity in postcolonial literature. The issue of identity in modern society is clarified by the growing number of migration and exiled groups, discussions on hybrid governments, and laws in different nations with heterogeneous ethnic and socio-cultural populations. The difficulties that exiled populations face today were discussed in the report. Postcolonial literature elucidates the marginalization of a nation, class, community and society that Kashmiri Pandits manifest in their literary works. An attempt has been made in this research paper to study the writings of Kashmiri Pandits and their statelessness in the post-colonial world.

In their book The Empire Writes Back (1989), Bill Ashcroft and Tiffin define the role that postcolonial literature and writings can play in asserting the identities of marginalized ethnic groups. They further said, "Postcolonial literature seeks to assert the richness and validity of indigenous cultures in an effort to restore pride in practices and traditions that were systematically degraded under colonialism and after the independence of colonial countries. Revising history to tell things from the perspective of those colonized is thus a major preoccupation of postcolonial writing" (Ashcroft et. all 5).

Since the inception of its civilisation, India has integrated individuals from diverse backgrounds and walks of life. In the era of globalisation, as the contemporary world faces numerous challenges, ethnicity and identity are becoming significant phenomena globally. The Kashmir valley in India saw a dramatic rise in

Scanned with OKEN Scanner

communalism in the 1990s, which led to the forcible eviction of more than half a million Kashmiri Pandits by Pakistan-sponsored terrorists. The terrorists are thought to have forced between four and six lakhs Kashmiri Pandits to flee the valley amid an increase in inter-communal violence. Women were sexually assaulted, their homes were looted, and hundreds were killed in the middle of the day. This essay examines the physical and psychological suffering that Kashmiri Pandits face both in their native country and in the places they have adopted around the globe. Postcolonial theory was used to examine the subjugation and oppression of Kashmiri Hindus who were stateless and in exile.

Postcolonial theory is prominent in literary studies as a huge part of it involves looking into the ways in which representation in literature and cultural practices continue to uphold and reproduce colonial thought when it comes to discourse about the non-West. Postcolonial literature includes not only literature by writers from colonized regions and diaspora writers but also readings and interpretations of canonical western works through a postcolonial lens (Quayson Web. 22 August 2022).

Novelists like Salman Rushdie, Maya Angelou, V.S. Naipaul, Sam Selvon and Wole Soyinka depicted the dilemma of exiled and migrated communities, picturing the quest of those migrated people and their identity. In his book The Mimic Men (1967), V. S Naipaul and Sam Selvon, in his book The Lonely Londoners (1956) explores, "how stateless individuals struggle for the creation and resistance of their threatened identity" (Halloran 27). Postcolonial theory believes that "the world we inhabit is impossible to understand except in relationship to the history of imperialism and colonial rule" (Elam, 2019). It also takes the form of opposing colonized knowledge production systems in all areas of life, which upholds Western viewpoints as superior and universal and disbelieving in all other viewpoints and knowledge systems. Because identity issues are prevalent in all

Scanned with OKEN Scanner

postcolonial communities, they might be regarded as the most significant and complex questions and conversations in postcolonial literature. This dilemma came to light due to the post-colonial era's changed environment and the difficult circumstances that newly freed nations and countries faced as they sought to define their identities. Mercer asserts, “Identity only becomes an issue when it is in crisis when something assumed to be fixed, coherent and stable is displaced by the experience of doubt and uncertainty” (Mercer 43).

Concerns about survival, safety, security, nationality, opportunity, identity, and a feeling of belonging are just a few of the many difficulties these people face when forced to leave their native country, whether for planned or unexpected reasons. At a time when the Valley was in ruins and the majoritarian population dominated a supposedly secular state, it was necessary to look into and understand the condition of a minority in the state. In a multicultural country like India, where a person's identity is shaped by their culture, which is a combination of their beliefs, customs, values, laws, and preferences, it is crucial to make sure that everyone, from majority to minority groups, is fairly represented in all spheres of life, including scholarly, political, and everyday discussions. This study uses Kashmiri Pandits' literary works to examine how a marginal community in the valley manifests itself. These life stories of pain, identity crises, and threatened existence in the postcolonial world are examined in this research article. Additionally, it provides insight into the lives of Kashmiri Pandits, whose status is unstable, ambiguous, marginal, and seemingly non-existent. Crowds began congregating and throwing stones at the homes of the valley's minority communities on the chilly winter evening of January 19, 1990s, as pro-Pakistan sloganeering began to come from the mosques around the valley. Posters urging Hindus to leave their homes and women or convert to Islam and join the separatist movement surfaced.

Scanned with OKEN Scanner

Arun Anand in one of his article talks about exile of Kashmiri Hindus, "Thousands of Hindus left through the night. According to a report by Jammu-Kashmir Study Centre, a Delhi-based think tank, by March 1990, more than 90 per cent of the Hindus residing in the Valley had left their homes. They were living in inhuman conditions in camps in Jammu, hoping to go back, but then gradually the hope faded away and a large number of them shifted to other parts of the country. Meanwhile, most of the Hindu's houses were burnt down in the Valley and whatever was left of their movable properties was looted. 19 January is considered among the blackest days in post-independence India" (Anand 2).

Accordingly, the current paper provides an analysis of the conditions of Kashmiri Pandits, who left their homeland and live in a condition of uncertainty, through their literary works. Postcolonial theorists and critics consider the issue of homelessness as important part of literary studies. Kashmir's history, or the Kashmir dispute as a continuation of India-Pakistan's foreign relations dispute, has been an essential topic of literature. Writers have tried to go beyond and depict the human side of the story, i.e. the agony and trauma which Kashmiri Pandits experienced in their homeland during the phase of militancy in the 1990s. Kashmiri Pandits, writings are on various issues, looking into the migration of their community from the valley. Different writers elaborate the various aspects of migration, pain, nostalgia about their past, life in Kashmir, plans and life in various migration camps, ultimately resulting in identity crises. Kashmiri Pandits' Writings describe the conflict's human experience, an artistic fusion of personal and historical perspectives. The collection of writings by Kashmiri Pandits presents an extraordinary exploration of memory, loss, and migration. The narratives delve into the themes of belonging, identity, and the pain of exile, vividly illustrating the trauma experienced by the Kashmiri Pandit community. Through their stories, authors like Siddhartha Gigoo, Somnath Dhar, T. N. Dhar, M.L. Bhatt and Bill K.

Scanned with OKEN Scanner

Koul paint a sombre picture of persecution, cultural estrangement, and a longing for a homeland that defines the lives of countless exiles. In this context, A Fistful of Earth and Other Stories (2015), by Siddhartha Gigoo, captures this painful nostalgia as characters attempt to rekindle fragments of their past and resurrect memories of a homeland now lost in the past. In his collection of sixteen stories, Gigoo explores the Kashmiri Pandits' deep-rooted connection to their homeland and their alienation in their adopted lands. Burdened by their past, his characters reflect the collective suffering of a community whose dreams and memories of Kashmir are gradually eroded by time. With sensitivity and depth, Gigoo invokes the essence of heritage in peril, reminding younger generations of their ancestors' sacrifices in the face of violence and displacement.

M.L. Bhatt describes his experience as a Kashmiri Pandit exiled from his native land in his 2017 book The Odyssey of Kashmiri Pandits: Destination, Homeland and Panun Kashmir. Bhatt incorporates the Pandit community's commitment, customs, and broader cultural fabric—all of which became sources of conflict in a divided valley—and in his own story. His writing explores the hardships and acrimonious experiences of Kashmiri Pandits living in migrant camps. The story gains depth from Bhatt's observations on Kashmiri Shaivism and the vibrant Hindu culture, which show how these components created a unique identity that migration could not eradicate. Similarly, Bill K. Koul's 22 Years: A Kashmir Story (2018), which tells the story of Billu, a Kashmiri Pandit who returns to his birthplace after two decades of migration, offers a moving, fictionalized account of his belongingness. His early years in the valley, where his identity was originally developed but subsequently abandoned due to violence, left him with severe scars that are revealed by his journey through memory and nostalgia. Billu's return is marked by disillusionment despite his renewed love for Kashmir, highlighting the terrible

Scanned with OKEN Scanner

effects of persecution and the deep sense of loss experienced by displaced Kashmiri Pandits.

The tales of twenty-nine Kashmiri Hindus and Pandits are woven into a tapestry of shared grief in Siddhartha Gigoo and Varad Sharma's 2015 book A Long Dream of Home: The Persecution Exodus and Exile of Kashmiri Pandits. These accounts exposed how the minority Pandit population, whose lives were permanently altered by the violence of the 1980s and 1990s, was affected by social unrest and political conflict. The book eloquently depicts the disintegration of a formerly diversified social fabric and the eerie memories of Kashmir that remain in the hearts of those compelled to flee via stories of mistrust, violence, and shattered communal harmony. My Frozen Turbulence in Kashmir (1991) by Jagmohan Malhotra is another significant work highlighting the situation of the Kashmiri Pandits. It offers a more comprehensive, critical perspective on the area's history, political unrest, and inter-communal conflicts. Former Jammu and Kashmir Governor Jagmohan describes his personal experiences during two pivotal times during his term in office. His narrative explores the religious and political conflicts that resulted in the exile of Kashmiri Pandits, emphasizing how different sociopolitical factors influenced these developments. He offers an unbiased viewpoint on Kashmir's turbulent past while reflecting on the pervasive problems of marginalization and discrimination faced by Pandits.

The lives of Kashmiri Pandits in Kashmir are also briefly described in Somnath Dhar's 1997 book Jammu and Kashmir. Many people have been particularly fascinated by “the earthly paradise,” as the Mughals called Kashmir. The area and its inhabitants, who are renowned for their talent, knowledge, and tolerance, are the subject of the novel. It facilitates comprehension of the coexistence of Kashmiri people and the evolution of Kashmiri society both during and after colonization. The writings of Kashmiri Pandits expose the profound sorrow and longing for a

Scanned with OKEN Scanner

lost identity experienced by their community. The erasure of their heritage, the breakdown of social structures, and the scars of communal violence are central to their narratives. Examining these works through the lens of postcolonial literature reveals how colonization's legacy of displacement and loss persists as individuals and communities grapple with divided loyalties and a fractured sense of self. In essence, these works collectively form a powerful testament to the resilience of the Kashmiri Pandits. Their personal, fictional, or historical stories reflect a shared memory that defies time, preserving the cultural and emotional ties to a homeland that is, for many, now only a dream.

Conclusion

In conclusion, one of the most critical themes in Kashmiri Pandits' works is the look for identification and a sense of belonging. The authors, novelists, and theorists explore different arguments regarding identity difficulties in postcolonial literature. The writings of Kashmiri Pandits have been analyzed by situating them within the framework of postcolonial literary studies. As a summary of the entire debate, it is widely accepted that postcolonial politics is driving the idea that crises are one of the consequences of colonialism. The crises had something to do with the reality that people and communities that had been colonized were now struggling to discover who they truly were in the face of polarizing politics in their states and nations.

Works Cited and Consulted

Abdulqadir, Saman. "The Crisis of Identity in Postcolonial Novel." Proceedings of INTCESS15- 2. Istanbul, 2015. pp. 1–9.

Anand, Arun. "31 years on, 19 January is still a dark day for Kashmiri Pandits as they wait for exile to end." The Print, Web 12 December 2021, p. 1.

Bhabha, H. K. The Location of Culture. Routledge, 1994.

Bhabha, K, Homi. The Location of Culture. London: Routledge, 1994.

Bhatt, M. L. The Odyssey of Kashmiri Pandits: Destination-Homeland-Panun Kashmir. Chennai: Notion Press, 2018.

Bill Ashcroft, Gareth Griffiths and Helen Tiffin. The Empire Writes Back. New York: Routledge, 1989.

Gigoo, Siddhartha Varad Sharma. A Long Dream of Home: The Persecution, Exile and Exodus of Kashmiri Pandits. New Delhi: Bloomsbury India, 2018.

Scanned with OKEN Scanner

Gigoo, Siddhartha. A Fistful of Earth and Other Stories. New Delhi: Rupa Publications, 2015.
Halloran, Thomas F. (June 2007). —Postcolonial Mimic or Postmodern Portrait? Politics and Identity in V.S. Naipaul's Third World. Literary Criticism. pp. 27.
Jagmohan. My Frozen Turbulence in Kashmir. New Delhi: Lancer Publishers, 1991.
Joseph, S. John Peter. "Man as a Victim of Alienation and Loss of Identity: A Critical Assessment of Chaman Nahal's The Womb." Dr. M. F. Patel, Dr. B. K. Sharma. New Aspects of Indian Writing in English. Jaipur: Sunrise Pub. & Distributors, 2012. p. 2.
Kaul, K. Bill. 22 Years A Kashmir Story: One Lakh Pandit Families May Have One Lakh Stories. New Delhi: Vitasta Publications, 2017.
Lone, Mudasar Ahmad. "Role of Sufi Philosophy in the Formation of the Composite Culture of Kashmir: An Analysis." Asian Journal of Multidisciplinary Studies Vol. 8, Issue. 3, 2020, pp. 27.
Mehrdin, Nadia, Hina Kanwal, and Qadeer Anjum. "Exploration Of Ancient History Of Kashmir And Prevailed Literature Under The Hindu Rulers." Journal of Namibian Studies: History Politics Culture 35 (2023): 192-207.
Mercer, Kobena. Welcome to the Jungle: Identity and Diversity in Postmodern Politics, in Jonathan Rutherford (ed.), Identity: Community, Culture, Difference, London, Lawrence & Wishart, 1995.
Quayson, A. What is postcolonial literature? The British Academy. Web 2 January 2020. https://www.thebritishacademy.ac.uk.
Raja, M. (2019, April 2). What is Postcolonial Studies? Postcolonial Space. https://postcolonial.net.
Rushdie, S. Imaginary Homelands: Essays and Criticism 1981-1991. Granta Books, 1991.
Spivak, Chakravorty, Gayatri, 'Can the Subaltern Speak?' Colonial Discourse and Postcolonial Theory: A Reader, Ed. Patrick Williams and Luara Chrisman, New York: Columbia University Press, 1994.

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Vidura's Disapproval: A Prelude to the fall of the Kuru Clan

Dr. Praveen Kumar Anshuman
Associate Professor Department of English
Kirori Mal College (North Campus)
University of Delhi, Delhi – 110007

Abstract: This article explores Vidura's discomfort with and disapproval of the game of dice in the Mahābhārata, a pivotal episode that foreshadows the destruction of the Kuru dynasty. It delves into the concept of Dharma as the essential foundation of human existence, contrasting it with the inherent destructiveness of Adharma. The narrative examines the inevitability of actions dictated by individual swabhāva (nature) and varṇa (intrinsic disposition), highlighting their interplay in shaping decisions and their consequences. By juxtaposing Vidura's wisdom with the Kuru clan's disregard for his counsel, the article underscores the tragic inevitability of destiny the driven by collective failures. It emphasizes Dharma as the harmonizing force of the cosmos, offering profound insights into human consciousness and its evolution toward cosmic awareness. Through the philosophical lens of Bhagavāna Kṛṣṇa's teachings as perpetuated in the texture of the Mahābhārata, the article elucidates the moral complexities of the epic and its enduring message: peace and balance must guide actions, even amid emergent crises. This study serves as a reminder of the timeless wisdom embedded in the epic, urging readers to align their lives with the principles of Dharma.

Scanned with OKEN Scanner

Keywords: Disapproval, Dharma Restoration, Philosophy, Swabhāva, Consciousness

There is no doubt that it is only because of the angle going to one extreme, the tightened thread comes into its full display. What is seen at the extremist position is not normally visible from the axis that is either on the other extreme or at the middle. And when the destruction is at hand, all and everything starts working in the same direction. And if the destruction was not to take place, something will definitely work for its elimination (Agarwal, 2015). In the battle of the Kurukṣetra, there are many instances which are generally quoted by the readers saying that the Pāṇḍava-s also took recourse to the foul means in order to win the battle (Patel, 2018). But it is not so easy to decipher in such a superficial way the complexities of the timeless narrative. What is visible works differently on invisible planes and what is invisible does not look likewise.

Introduction

In the Mahābhārata, what is of the superlative significance is the restoration of the 'Dharma' (Sharma, 2017). The question is pertinent to ask why 'Dharma' is so essential in the life of the people of the time. In fact, the 'Dharma' is essential, for it is the experience which gives a dignity to the human life (Das, 2019), a dignity which no other species might be able to claim. Without its presence, man is nothing but one of the species of the animal kingdoms, that is, homo-sapience (Verma, 2016). If one is full of love, compassion, and truth, one is 'Dhārmic'. What else can define other than this for being a 'Dharmic' person? If one is otherwise, one is 'Adhārmic' (Chandra, 2020). Without 'Dharma', living one's own life is not a problem. All the animals, birds, insects, creatures, trees, flowers and plants all are living their own lives without having any sense of 'Dharma' in their lives (Iyer, 2021). But they do have its presence but unconsciously (Sarkar, 2020). They are not just aware about it, nor are they able to experience the same. The harmony and symphony in the universe is what is called 'Dharma' (Yadav, 2018). Expect human

Scanned with OKEN Scanner

beings, the entire cosmos is in a great balance, that balance is called 'Dharma'. The difference which has been acquiesced by the scriptures is that of the degree of the consciousness that each creature has acquired (Reddy, 2019).

Apart from human beings, rest are the ones who have little consciousness. It is only the entity of the human beings that is greater degree of conscious when compared to all other species (Singh, 2021). Not only this, human beings can also be more and more aware of their own existence (Sharma, 2022). This is why there are questions upon questions in human life endlessly. 'Do they ever end?' is, in fact, the real question (Patel, 2018). Here is the play of the 'Dharma' which gives answers to all the enquiries one may dwell into. The journey of 'Dharma' begins from this axis that human life is a "conscious" entity. If it is conscious, it can be more conscious. If it can be more conscious, it can be supremely conscious. If it can be supremely conscious, it can then be conscious at the level of the cosmos (Sarkar, 2020). This is where the psychological and psychoanalytical dimensions come into function in which they talk of the multiple layers of consciousness and the unconsciousness like, on one hand, individual consciousness, collective consciousness, super consciousness, cosmic consciousness and, on other, unconsciousness, sub-consciousness, collective unconsciousness, cosmic unconsciousness respectively.

This endeavour of trying to know human life from the dimensions of consciousness and the unconsciousness is what is like "being" on the journey of the 'Dharma'. Rest is the digressed ideas about it, coming out only of little understanding about it. It is the realization of the individual entity with full consciousness that results into the blissfulness, joy and ecstasy. Rest can have only its illusions, never the real experiences, for whatever is experienced in life comes as a knowledge when we consciously know about it. Things which do not give the conscious experience are forgotten like having received no knowledge. So, it is

Scanned with OKEN Scanner

clear what the journey of 'Dharma' would be like. The realization in absolute conscious state of being is what the realization of the 'Dharma' is in its totality (Kumar, 2022).

Intertwining of Swabhāva and Varṇa

It is this experience that has manifested itself in all the scriptures through different narratives, anecdotes, stories, parables, fables, etc. (Singh, 2021). All the people in life have different varṇa-s that they come with and this is what is termed by D. H. Lawrence as 'the religion of the blood'. Who one is, is in one's own blood (Chandra, 2020). This is what is carried by every individual in her/his utter distinctiveness. It is unchangeable. This is why it is said that "swabhāva" (nature) of anyone actually never changes. It is this "swabhāva" that prescribes the path of someone. It is this "swabhāva" which has been called as varṇa in the Indian 'philosia'. It is this "swabhāva" on the basis of which one was called a 'Brāhmaṇa' or a 'Kṣatriya' or a 'Vaishya' or a 'Śūdra'.

As the "swabhāva" does not change, similarly one can't change one's own varṇa as one cannot change one's blood or the blood group. One may be born in any so-called religion, caste, creed, culture, place, but one's varṇa shall always be with what s/he is born. And unless one knows one's own varṇa, one will never know what one's own swabhāva is. So, knowing one's own swabh*ā*va will let one know what varṇa one is of. Both are interchangeable. If one knows one's own varṇa, one will know what one's "swabhāva" is (Reddy, 2019). Or if one comes to know of one's "swabhāva", one will know which varṇa one belongs to. The knowledge of the "swabhāva" or, say varṇa, let one know the path that one has to trek in life. That is why there are many instances in the past (for example, Viśvāmitra) that tell that someone was born among the people of one varṇa but s/he belonged to the other varṇa her/himself. This was the reason why s/he changed the varṇa later on like a born Kṣatriya converting into a Brāhmaṇa or the vice versa or the like.

Scanned with OKEN Scanner

Vidura's efforts to restore Harmony

It is in this scenario all the temples are consecrated. If one does not know the inner arithmetic, one can only and only misinterpret things, and the misinterpretation shall lead to nothing but a misrepresentation of thousands of things that may not be repaired back. As a result, the new narrative that some readers out of their pseudo knowledge think to narrate or to draw will have farfetched repercussions which can never bring the "harmony" and the "balance" that the Indian philosia has called as 'Dharma', the ultimate flowering human life into "knowledge" and "understanding" (Das, 2019). This is perhaps the smallest section among all the units but it offers so many dimensions understanding which enables the readers to acquaint themselves with new vistas of thinking and contemplation. In this section, Vidura who was one of the pivotal characters as the prime minister was bypassed by the King and was ordered to carry the invitation forward to the Pāṇḍava-s even when the former clearly indicated the possible consequence. Some of the questions are very pertinent to be asked here for which answers must be sought (Kumar, 2022). Had the Pāṇḍava-s rejected the proposal of the King for playing the game of dice as they apprehended its outcome already, one thing is sure that there would never have happened what took place later on. But the next question is if they could really deny it. Why was Yudhiṣṭhira not able to deny the proposal which in itself was going to destroy the entire clan?

In this regard, some of the significant points are very necessary to understand. Bhagavāna Kṛṣṇa who has instructed Arjuna to kill the people on the other side of 'Dharma' is not at all for war, for which He seems to be siding with. But it is not truth at all, for it was Kṛṣṇa himself who was all for peace. He started philosophising about to go in the battlefield only when He finds that all the doors to peace are closed. The best part of in the philosophy of Kṛṣṇa comes when He is of the opinion that one should accept the situation whole-heartedly when there is

Scanned with OKEN Scanner

no other alternative. Peace is what is of the prime significance (Kumar, 2022). Peace, according to Kṛṣṇa, cannot be sacrificed for anything. If one microscopically observes, one will find that He does not provoke Arjuna to indulge into war. All He wants him to do is to see the indestructible in the other and the fight has to be taken with the peaceful mind. It can be seen that it was He who tried his level best to bring peace among the bothers, which was outrightly rejected by Duryodhana at every juncture.

According to Kṛṣṇa, peace is the only way to live a life of joy and ecstasy but if all the doors to it are closed, then whatever is done to restore the same will be a 'Dhārmic' act. In the process of the restoration of peace, the central thrust of it has not to be altered. It has always to be remembered that Kṛṣṇa's emphasis is on 'all the doors to peace'. If any door is open, and one has not tried that, and takes recourse to anything other than it, then all the efforts taken by one will be called an adhārmic act (Verma, 2016). So, when Kṛṣṇa is telling Arjuna to kill the people who are falling on the other side of (the restoration of) peace, all He means to say is that the peace cannot be restored if they are not eliminated as they stand for and with all that is destructive force. And this act needs to be executed by Arjuna knowing well that no one essentially dies but the presence of the evil characters come as an impediment on the path of truth and life in the corporeal world (Das, 2019).

So, unless there is a sufficient reason for the rejection or all the options have been exhausted, Yudhiṣṭhira could never have taken the decision. One more idea may strike here and which is also debated about the Pāṇḍava-s that they too engaged themselves into unfair means in order to win in the battle. Kṛṣṇa is alleged to have helped them in His own way (Kumar, 2022). And Yudhiṣṭhira is also said to have committed the act telling lies in the midst of the battle due to which Droṇa got killed. But here it has to be remembered that they were the emergent situations.

Scanned with OKEN Scanner

What is done in an emergent situation can never be done in a normal situation. That is what 'Āpata Dhārma' is all about (Das, 2019). It has also to be remembered that all that Kṛṣṇa, Yudhiṣṭhira or the other Pāṇḍava-s were doing had the central concern of restoring the "peace" and spreading the same all around.

Compulsion arising out of Kṣatriya Varṇa

So, it is clear that the decision of rejecting the invitation call could not be done especially by the one whose varṇa is of a Kṣatriya type (Verma, 2016). It is not in the very blood of this Varṇa. Once invited, one has to accept, whatsoever the cost. This section thus is a precursor of what is going to happen. And one thing is always sure that if good has to happen, it will happen. If the bad has to happen, it will also happen. If any of the persons had violated her/his pledge, commitment, bondage, swabhāva, things would have been different. For example, if Yudhiṣṭhira had rejected the invitation, there would have been no game of dice. Even if he accepted it, his defeat would not have been there if he had he not accepted Śakunī as proxy for Duryodhana in the game of dice. If Bhīṣma had broken his commitment to the throne, he would have stopped all the nonsense which was taking place (Kumar, 2022). Had Dhṛtarāṣṭra not surrendered before his blindly ambitious son Duryodhana, there would neither have been any Assembly Hall nor any game of dice. Had the King listened to the counsels of Vidura, his minister, there would not have been any consequent proceedings. After all, if taking lessons from the game of dice, Yudhiṣṭhira had rejected the next invitation which was sent to him by the King immediately after they departed from Hastināpura, there would not have been the 'sequel' and thus there would not have been the life of Pāṇḍava-s turned into exile.

Likewise, there are numberless instances which prove that things might have changed, had they happened differently. This would have happened if the fate of

Scanned with OKEN Scanner

the Kuru clan was to be constructive. But when it is going to be destructive for it, all and every decision will dead towards the same. The only difference and distinction that a text like the Mahābhārata has are the sides of 'Dharma' and 'Adharma'; or the intention of the restoring peace or fighting out of one's jealousy and hatredness (Verma, 2016). The epic Mahābhārata when seen in its entirety is presenting all the aspects of life – good or bad, positive or negative, bright or dark – in one ambit and the best thing is that it has something within its fabric which makes it a text entirely on a different plain. It has the message of 'Dharma' which is absent in all other literary pieces. It is 'Dharma' that makes a person know what he could be even in the midst of a battlefield.

Conclusion

The present text in which the different decisions were taken by different characters has all these possibilities which actually happened from which the message of the 'Dharma' and its presence need always to be extracted, for if the text is seen without its acknowledgement, the very height this epic has achieved will come down (Kumar, 2022). And the text of the Mahābhārata cannot be seen at a level where people are, rather it has to be seen at the level where people have to reach. Then the justice will be done to the text and the same will thus disseminate into the life of all the readers in general by giving them the eternal joy and the perpetual knowledge. So, as the destruction of the Kuru clan was going to happen, all that was taking place was in accordance with that. It has also to be remembered that there are many occasions in which one can take the decision once and then it cannot be undone (Verma, 2016). (For example, if one is asked to take one of one's legs up, one is free to choose any of the legs, left or right, to take up. But once one has taken one of the legs up, one has lost the freedom to select the other leg then. Freedom has its own limitations too. Even freedom is not free absolutely (Das, 2019). So, the intricacies of freedom also need to be understood in order to how

Scanned with OKEN Scanner

things and how they work in life.) Thus, we see in this section the bypassing of the minister Vidura by the King who sends him to Indraparastha in order to invite the Pāṇḍava-s for the game of dice.

References:

1. Agarwal, R. (2015). Dharma and human consciousness in the Mahābhārata. University of Delhi Press.
2. Chandra, D. (2020). Understanding varṇa in the Indian context. Journal of Ancient Indian Studies, 10(3), 45-56.
3. Das, K. (2019). The philosophy of Dharma and its implications in human life. Journal of Indian Philosophy, 22(2), 112-129.
4. Iyer, S. (2021). The role of Dharma in cosmic balance. Indian Journal of Spirituality, 19(4), 75-89.
5. Kumar, M. (2022). Consciousness and spirituality in Mahābhārata. Journal of Indian Studies, 18(1), 58-72.
6. Patel, N. (2018). The moral dilemma of the Pāṇḍava-s in the Mahābhārata. International Journal of Sanskrit Studies, 13(5), 22-37.
7. Reddy, R. (2019). The psychological dimensions of Dharma. The Journal of Philosophy, 11(3), 34-49.
8. Sharma, P. (2017). The restoration of Dharma in the Mahābhārata. Indian Journal of Mythology, 26(4), 19-29.
9. Sharma, P. (2022). Swabhāva, varṇa, and the path to Dharma. Journal of Hindu Studies, 33(1), 88-102.
10. Singh, A. (2021). The interrelationship between consciousness and Dharma. Philosophical Perspectives on Dharma, 9(2), 48-63.
11. Sarkar, B. (2020). Unconsciousness and the cosmic balance. Indian Journal of Metaphysics, 17(6), 10-23.
12. Verma, A. (2016). Exploring the nature of Dharma in Mahābhārata. Studies in Indian Culture, 21(3), 45-59.
13. Yadav, R. (2018). Dharma and the cosmic law in Hindu tradition. The Journal of Hindu Philosophy, 15(3), 72-85.

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Beyond Beating Love's Drum: Glimpses of Upanishadic Thought in Mirabai

Dr. Aditi Govil

Ph.D. Associate Professor,

Swami Shraddhanand College,

University of Delhi, Delhi

Abstract: This paper analyses the extent of impact of Upanishadic philosophy in a 16th century Bhakti saint, Mirabai's padas. The paper discusses how she retold the complex Upanishadic concepts of omniscient Brahman, maya, karma, rebirth, meditating upon God, union of Brahman and atman, Moksha, fickleness of mann etc. through her simple and lucid love poems. These concepts formed a deep undercurrent to her philosophy. The only differences were between the sakar and nirakar worship and that of jnana marg and bhakti marg. But these differences were complementary, not exclusive of each other.

Keywords: #Mirabai # Upanishads # maya # karma # samsara # mann #naam-smaran

Introduction

The figure of Mirabai, a 16th century bhakti saint from Rajasthan, has occupied popular imagination since centuries now. Associated with krishna worship, she has been lauded as one of the greatest Bhakti poets in Hindi. Beginning with Bhaktmal of Nabhadas in 16th century, she has been discussed in a variety of ways by near contemporary and later writers from all disciplines such as her life, legends around her, miracles, anecdotes, her devotional poetry, perceptions about her among

Scanned with OKEN Scanner

various social groups, her depiction as a rebel Rajput queen against patriarchy etc.[xxiv] Mira has also been associated with high Hinduism. According to Kumkum Sangari, the liberalising and dissenting forms of Bhakti merge as a powerful force which selectively use the metaphysic of high Hinduism (maya, karma, rebirth) and derive moral legitimacy from transformation of some prescriptions of Smritis and Puranas (as sources of law) into an internal ethic.[xxv] Kumkum Sangari analyses her religious belief as stemming from these texts and dharmashastras. However, it is a truism that the core doctrines of Hindu philosophy run deep in Indian society at all levels, sometimes even irrespective of religion. And the first contribution comes from the Upanishadic philosophy which forms a deep undercurrent to most of the Indic philosophical systems. Mira's eclectic philosophical world is a shining example of this. Among other influences, she has imprints of Nath panth [xxvi] and Upanishads. Also, the ideas of so-called 'high Hinduism' are present in almost all Bhakti saints, regardless of caste, class and gender. And since these ideas were given a profound form when Upanishads were written, this paper seeks to exclusively discuss the extent of Upanishadic philosophy in Mira's padas.

Nature of 'God' in Upanishads and Mirabai's Padas

To begin with, Upanishads see Brahman (God) as omniscient and pervading in all body and matter as Brihadaranyaka Upanishad says, 'sa va ayam purushah sarvasu purshu purishayo nainen kinchana navritam nainen kinchanasamvritam.' [xxvii] Isha Upanishad and Svetashwatara Upanishad also attest to the same.[xxviii] The monistic influence of Nasadiya sukta on identification of Brahman with Atman in Upanishads is evident on Mira as well. In Brahma Parinam vada of Uddalaka in Chhandogya Upanishad, the physical frame that separates Atman from Brahman is artificial. Though this Brahman is formless, it is identical with life and is spiritual. Here, Mira's Krishna, although having a form (sakar) is also a Brahman. In Shrimadbhagvadgeeta, Krishna says, Brahmano hi Pratishthaham (I am the source of Brahman).[xxix] Kathopanishad says, 'aish

Scanned with OKEN Scanner

sarveshu bhuteshu gudhomana prakashate, drishyate tvagrayaya budhhaya sookshmaya sookshmadarshibih i.e. God resides in everyone but remains unseen due to maya and is only seen with mind's eye through God's grace.[xxx] And hence, union of her atman with Krishna (Brahman) is sought by Mira who says, 'mhare hirday vasya murari... and also calls Him omniscient or 'antarjami'. In one of her padas, she says, 'kyun tarsavo antarjami ...'[xxxi] . This is how Mira's Krishna becomes Brihadaranyaka Upanishad's 'puri shete sah purishayah purusho va' .[xxxii] Upanishads thus treat Brahman as a primordial reality and as the lord, sustainer, protector of the world, without whom the world cannot exist. Similarly, Mira calls Krishna her helper, master of the universe and the one who removes obstacles and pleads Him to help her attain moksha- Mira re Prabhu Girdhar nagar, bedo paar lagajyo ji .[xxxiii]

Upanishads such as Brihadarayaka call the Brahman indescribable- 'itthan yat kimapi moortamvamoorta vastu vartatey tena samam na brahmasti...' i.e. Brahman cannot be described as having either a form or formless. It also says, 'dvai vav brahmano rupe, moortam chaiv, amoortam cha...'[xxxiv] Mira similarly talks about impossibility of describing God. She says, 'virad barvane ganatam na jaana, thaka ved purana' [xxxv]

Transmigration of souls

Brihadarayaka Upanishad has serious discussions on transmigration of souls in the form of a dialogue between Rishi Yajnavalkya and Raja Janak. Responding to the query of Raja Janak on this matter, Rishi Yajnavalkya says that a soul takes rebirth as per its past karma - Vartman Janma purvasya janmano dharmadharmau soochayati. He also says- 'sa yatraymanimanam nyeti jaraya vopatpata vaanimanam nigachhati yadyathamram vodumbaram va pippalam va bandhanat pramuchyat evamevayam purusha aibhyoangebhyah sampramuchya punah pratinyayam pratiyonyadravati pranayaiva.' i.e. when body gets feeble and old, the prana leaves and the soul seeks another birth to suffer karma.[xxxvi]

Belief in samsara (transmigration of souls) is closely connected to the theory of karma. Kathopanishad says, 'yonimanye prapadyante sharir tvayay dehinah. Sthanumanye

Scanned with OKEN Scanner

anusayanti yatha karma yathashrutam.' It likewise says- ' sasyaniv martyah pachyate sasyamivajayate punah.' It also mentions Brahman as ultimate decision making authority of karma when it says, 'nityo nityanam chetanashchetanana meko bahunam yo vidadhati kaman.' [xxxvii] Chhandogya Upanishad as well says, 'ath khalu kratumayah purushoyatha kraturasmilloke, purusho bhavati tathetah pretya bhavati sa kratum kurveet'. It also says, 'ta ih vyaghro vriko va simho va varaho va keeto va patango va dansho va mashako va yadyadbhavanti tada bhavanti' .[xxxviii] Svetashwatar Upanishad also says that samsara leads to delusion and the soul suffers due to past karma. It says, 'sarvajeevay sarvasansthay brihante, asmin hanso bhramyate brahmachakray'.[xxxix] Brihadarayaka Upanishad also says that the rebirth is decided according to the past karma.[xl] Mira confirms to this theory when she says- 'kaanyi mharo janam bar bar; purbata Kaanyi punna khoontyan, maansa avatar'. She calls the world 'kubudh ro bhando' and 'karam ri kugat kumavai' as she believes that it is impossible to escape the fruits of karma. She also writes 'Mira Hari ke haath bikani, janam janam ri dasi' and 'Purab janam ri Preet purani' and 'janam janam ri kwaran'. Further she says, 'Mira dasi janam janam ri.' She believed that her bhakti was a gift of good deeds of previous birth- 'Mira ne Girdhar milya ri, purab janam ro bhag' and she is fearful that if she fails in her bhakti, she may have to take birth again, that is, she won't attain Moksha- 'ulat janam phir aasi'.[xli]

Moksha the ultimate goal in Upanashadic Traditions

Moksha therefore is the ultimate aim. About it Svetashwatar Upanishad says, 'sookshmatisooksham, kalilasya madhye, vishwasya srashta ramanekarupam, vishwasyaikam pariveshtitaram, jnatva Shivam shantimatyaantameti' i .e. one who is able to know Shiva through sadhna, is able to attain peace and is free from samsara.[xlii] Mira repeatedly expressed the desire to cross the ocean of life and attain moksha. She says, 'bhausagar tar jasya,' which she believes is in the hands of Krishna, 'jug jug bheer hari bhagwan ri, deejyo moccha niwaj' and 'Mira peeda soi jaane, maran jeevan jin haath' . [xliii]

Scanned with OKEN Scanner

The destructability of the world is another major theme in the Upanishads. Brihadarayaka Upanishad says that whatever has a form or is formless, seen or unseen, small or big, ultimately meets death - 'yadidam sarvam mrityorannam…'.[xliv] Kathopnishad also says, 'shvobhava martyasya yadantakaitat…tavaiv vahastav nrityageetay.'[xlv] Mira expresses the same sentiment when she says, 'jetai deesai dharan gagan ma, te tai uth jaasi…yo sansar chahar ri baaji, saanjh padyan uth jaasi' i.e. whatever matter and planets are seen on earth and sky are all temporary. The world is like a game of gamble which ends when evening falls. She also says, 'bhosagar jag bandhan jhootha, jhootha kul ra nyati,' i.e. the worldly relations are temporary. She further says, 'jag maya ra supna ri' i.e. this world is but a delusive dream.[xlvi] Brihadaranyaka Upanishads says- 'yathashastram bhojyo heyashcheti vaidikah' i.e. world is both to be relished and despised (bhojya and heya).[xlvii] Similarly, Mira on one hand relishes the form of sakar Krishna, His lila and the manner in which he carries out his social responsibilities. On the other hand , she sees the world as futile and her existence in it as not worth it.[xlviii]

Aspects of remembrance of God

Since Mira is devoted to Krishna, she is yearning to meet him. And to have his darshan, she lays stress on the importance of naam-smaran. Through it or dhyana, a sadhak, with a pure heart, may get darshan of God. Kathopnishad also says, 'na sansdrishe tishthati roopamasya na chakshusha pashyati kashchanainam, hrida manisha manasabhiklipto ya etad vidurmritaste bhavanti' i.e. a sadhak who lovingly and constantly meditates upon God is able to see Him with his/ her mind's eye'.[xlix] Mundakopnishad suggests that, 'na chakshusha grihyate na api vacha, nanyairdevaistapsa karmana va, jnanaprasaden vishuddhasattvastatastu, tam pashyate nishkalam dhyaymanah'.[l] Svetashwatar Upanishad also says, 'adih sa samyoga nimitta hetuh…devam svachittasthamupasya poorvam' i.e. a sadhak should try to realise the primeval, timeless and beloved Brahman.[li] Upanishads suggest dhyana/sadhna to the same goal for which Mira prescribes naam-smaran. While the former is an attribute of jnana marg, the latter

Scanned with OKEN Scanner

is specific to bhakti marg. The basic idea, however, is the same- to remember and consequently, to realise Brahman, to get His darshan and attain moksha. Mira expresses the same desire when she says, 'bhaj man charan kanwal avinasi ' that is, one must chant the name of indestructible, immortal God and 'bhajan bina nar pheeko i.e. anyone who doesn't sing the praise of God is unrewarding. She also says 'piya thare naam lubhani ji, naam letan tirta sunya, jag pahan pani ji, i.e. the one who chants the name of God gets moksha. She further says, 'sanwaro umaran, sanwaro simran, sanwaro dhyan dharan ri' . ..mharo man sanwaro naam ratai ri and 'Mai mhan govind ra gun gana.' [lii]

To realise God, however, there is a condition, which is to control the volatile mann in the first place. Upanishads say, 'vrittinam nirodhen ekagrena mansa jeevatmatmanorbodhah sambhavati.'[liii] i.e. human soul realises supreme soul only when it controls the fickleness of mann. Mira searches for this Sachhidanand form of God in Krishna and when her mann reposes after reigning in its volatility, she declares- 'Chanchal chit chalyani na chale, bandhya prem janjeer', thereby using the tool of love to control it. [liv]

Conclusion

To conclude, the complex Upanishadic philosophy is retold in Mira's simple padas to a significant extent. The Upanishadic concepts of an omniscient Brahman, maya, karma, rebirth, meditating upon God, union of Brahman and atman, Moksha, reining in of the fickle mind etc. are woven deeply into the fabric of her padavali. There is also a subtle balancing of both the utility and futility of the world which is described in the Upanishads. She balanced it through the celebration of Krishna's lila beside a pressing desire to leave the world and unite with Krishna. The only difference lay between the sakar God of Mira and nirakar God of Upanishads and their jnana marg where Mira's took bhakti marg. But these differences were not fixed, paradoxical and exclusive of each other, as the basic underlying concepts remained the same running through the period of centuries with their essential dynamism and fluidity. In Mira's retelling of these concepts, the form of God or His formlessness

Scanned with OKEN Scanner

became immaterial. There is no paradox between the formless (nirakar) God of the Upanishads and sakar (form) of God-Krishna of Mira. In lucid language and commonplace expressions, Mira wove the complex Upanishadic philosophy into her padas in an effortless manner.

Endnotes

Nabhadas, *Shri Bhaktmal*, Vrindavan, 2017, pp. 708-18; Kumkum Sangari, *Mirabai and the Spiritual Economy of Bhakti*, Economic and Political Weekly, Vol. 25, No. 28 (Jul. 14, 1990), p.1537; Parita Mukta, *Upholding the Common Life: The Community of Mirabai,* Delhi, 1994.

Kumkum Sangari, *Mirabai and the Spiritual Economy of Bhakti*, EPW, Vol. 25, No. 28 (Jul. 7, 1990), p. 1464.

Swami (Dr.) Om Anand Saraswati and Prof, S, Samdani, *Mira Padmala*, Jodhpur, 2022, p. 14 *(herafter Mira Padmala*)

Pandit Kavyateerth Shivshankar Sharma, *Brihadaranyakopnishadbhashyam*, Ajmer, Vikram Samvat 1984 (Reprint), Brahman- 5, kandika- 19, p. 394 (*hereafter Brihadaranyaka Upanishad*).

H.D. Goenka, *Ishadi nau Upanishad*, Geeta Press, Gorakhpur, Vikram Samvat 2074, *Ishopanishad*, Mantra -1, p.28; *Svetashwataropanishad*, chapter-3, Mantra-9, p. 465 (hereafter *Ishadi nau Upanishad)*.

Shrimad BhagawadGeeta, Geeta press. Gorakhpur, Vikram samvat 2073,14.27.

Ishadi nau Upanishad, Kathopanishad, Ch.1, valli-3, mantra-12, p. 131.

Mira Padmala, pp. 90, 103.

Brihadaranyakopnishad Bhashyam, Ch. 2, brahman 5, kandika- 15, p. 380

Mira Padmala, pp. 14,21,22,24,28,30,32,41,55,64,65,68,69, 84,91,100,108.

Brihadaranyakopnishad Bhashyam, Ch. 2, Brahman- 3, kandika-1 and 6, pp. 293, 315.

Mira Padmala, p. 30.

Brihadaranyakopnishad Bhashyam, Ch. 4, Brahman- 2, kandika -2, pp. 599; ch. 4, Brahman- 6, kandika -3, p 697; Brahman-3, kandika- 10, p.622; ch. 4, brahman- 3, kandika- 37, p. 658.

Ishadi nau Upanishad,Kathopanishad, Ch.1, valli.1, mantra-6, p.80; valli-3, mantra -7, p.126; Ch-2, valli-2, mantra -7, 13, pp.150, 155.

Kavyateerth Pt. Shivshankar Sharma, *Chhandogyopanishad*, Tonk, 1867, Prapathak- 3, khand- 14, Pravak- 1, p.441; prapathak-6, khand- 11, pravak-3, p.782 (hereafter *Chhandogyopanishad*).

Ishadi nau Upanishad, Svetashwatar Upanishad, Ch. 1, mantra-6, p. 438; also see Ch. 5, mantra- 11, p. 499.

Scanned with OKEN Scanner

Brihadaranyakopnishad Bhashyam, Ch. 4, Brahman-4, kandika-5, p. 668.
Mira Padmala, pp. 2, 27, 29, 35, 47, 54, 66, 80, 86, 90.
Ishadi nau Upanishad, Svetashwatar Upanishad, ch. 4, mantra- 14, p. 483; chapter -6, mantra - 16, p. 515. Also see *Brihadaranyakopnishad Bhashyam,* ch. 4, brahman- 4, kandika 8, 12, p. 679; Chapter-6, Brahman -2, kandika- 15, p. 754.
Mira Padmala, p. 2, 68,78, 81,100, 101.
Brihadaranyakopnishad Bhashyam, chapter -2, brahman-2, kandika -10, p. 439.
Ishadi nau Upanishad, Kathopnishad, chapter-1, valli- 1, mantra- 26, p.95.
Mira Padmala, pp 2, 42, 99.
Brihadaranyakopanishadbhashyam, ch.1, brahman-1, kandika-2, p.24.
Mira Padmala, pp.3-5,7,8,16-17, 20, 23-24,30-33,39, 41- 42, 45,60,64,89, 100.
Ishadi nau Upanishad, Kathopanishad, Ch. 2, valli- 3, , mantra-9, p. 163.
Ibid., Mundakopnishad, Tritiya mundaka, khand-1, mantra - 8, p. 271.
Ibid.,Svetashwatar, ch-6, mantra -5, p. 506.
Mira Padmala, pp. 2, 8, 24, 56-57, 60.
Brihadaranyakopanishadbhashyam, ch.2, brahman - 2, kandika-1, p.276-77.
Mira Padmala, p.6.

Selected Bibliography :

Goenka, H. D., *Ishadi nau Upanishad*, Geeta Press, Gorakhpur, Vikram Samvat 2074..
Mukta, Parita, *Upholding the Common Life: The Community of Mirabai,* Delhi, 1994.
Nabhadas, *Shri Bhaktmal*, Vrindavan, 2017.
Sangari, Kumkum, *Mirabai and the Spiritual Economy of Bhakti*, Economic and Political Weekly, Vol. 25, No. 28 (Jul. 7 and 14, 1990).
Saraswati, Swami (Dr.) Om Anand and Prof, S, Samdani, *Mira Padmala*, Jodhpur, 2022.
Sharma, Pandit Kavyateerth Shivshankar, *Brihadaranyakopnishadbhashyam*, Ajmer, Vikram Samvat 1984 (Reprint).
- *Chhandogyopanishad*, Tonk, 1867
Shrimad BhagawadGeeta, Geeta press. Gorakhpur, Vikram samvat 2073, 14.27

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Subaltern Struggles and Imperial Designs: The Role of Untouchable Soldiers in the Battle of Plassey

Dr. Ajeet Kumar,
Associate Professor
Department of HistoryAtma Ram Sanatan Dharma College
University of Delhi، Dhaula Kuan, New Delhi

Abstract;The Battle of Plassey represents a crucial turning point in history, where the British and French East India Companies achieved victory over the Nawabs of Bengal. However, it's important to shed light on the overlooked contributions of untouchable soldiers who played a pivotal role in supporting these companies, despite facing marginalisation. Understanding the circumstances surrounding their recruitment and acknowledging their incredible courage can provide a more comprehensive perspective. Recognising and commemorating their contributions would be a positive step towards honouring their impact on history.

Keywords: European company, Native Indian Army, Nawab, Robert Clive, Dusadh.

Introduction

The eighteenth-century world was known for power games, war, aggression, invasion, betrayal and struggle. The war location was scattered from European soil to Indian soil. It was a time when many changes were seen in the political and economic fields. This was the period remembered for the fierce power struggle. As a result, the European powers and tottering Indian powers came in front for the showdown of supremacy. The Battle of Plassey on 23rd June 1757 was an epoch-

Scanned with OKEN Scanner

making event in the history of the colonial world. The battle of Plassey weakened the Nawabs and strengthened the British East India Company. It proved chivalrous for Robert Clive and unchivalrous for Siraj ud Daulah. It exposed the hollowness of the unity of Indians and the bravery of the native depressed class army who fought on the side of Europeans. This Indian venture in Plassey had a background of European wars and the industrialisation process in Europe. Moreover, Britain was the first country in the mid-eighteenth century to experience industrialization which necessitated colonial aspirations. The aims and ambitions of England for trade led to fierce competition with the European powers. The European nations were engulfed in wars but desired to win over the colonies for trade and profit, both in and outside colonies in Europe. These powers were fighting dual wars with a motive to control trade initially. On the one hand, the Seven Years' War (1756-63) was fought on European soil between different European countries; on the other hand, the French and British were grappling to take hold of India. In India and America almost simultaneously, and during the same worldwide struggle, occurred the decisive emergence of the British power above the French. For Indians, both the Nawabs and Britishers were foreigners. But this notion of foreigners was based on religion. The recruitment into the European army was preserved for high castes initially which was monopolized later by upper castes. So, “the dominant castes of Hindustan, Bhumihar Brahmans and several clans of Rajputs, made themselves into the dominant castes of the Company’s sepoy army, not only culturally, but also numerically. As a result, the Company’s regiments, self-perpetuating institutions as never before, became inward-looking preserves of Hindustani elite power.” (Kolff, 2013;264) The untouchables at this time were aspiring to secure jobs in the military for better opportunities as ordinary soldiers or jobs suited to their occupations. It was the only service at this time available where they could earn a living with respect and dignity. The Indian untouchable soldiers due to hard work

Scanned with OKEN Scanner

and honesty reached or attained the post of Jamadar, Subedar and Subedar Majors. Such ranks in the military marked the greatest accomplishment by the untouchables and they were respected within the society. Within untouchables, a few castes were frontrunners namely dusadh, dhusia, doms and dhanuks as far as the Battle of Plassey was concerned. The untouchable soldiers helped the Britishers topple the Nawabship in Bengal and enabled the British to capture power. It was untouchables who joined the army of the British East India Company. The Indian army composed of untouchables also brought victory for the British in India as well as outside India. In this paper, I aim to highlight the following: 1. Why were untouchables recruited by the British East India Company? 2. Within untouchables, which caste was considered for recruitment into the army? 3. What was the role of untouchable soldiers in the Battle of Plassey? 4. How was the Battle of Plassey important for Indians and Britishers?

Background of British East India Company and Bengal Native Army

The East India Company was established in 1599 by a group of merchants. They opened their first factory in Surat in 1612 and built Fort St. George in 1640 The first expedition to Bengal was sent from England in the same year. It consisted of two ships, and the crews were warmly welcomed by the Nawab of those provinces. As a result, the Company decided to pursue trade and eventually established a factory at Hooghly in 1650-51. Although the Bengal settlements existed independently, they relied on Fort St. George for support. Additionally, their trade was regulated by the Native government of Bengal, which prohibited them from having any military power beyond a symbolic "ensign and thirty men" to show respect to the main agents. In 1581 Bengal became independent of Madras, Mr. Hedges being sent from the latter place as the Company's "Agent and Governor in the Bay of Bengal and the factories subordinate." In 1651, a decree issued by Shah Shuja allowed British exemption from trade duties by paying a small sum of Rs.

Scanned with OKEN Scanner

3000. In 1668, Bombay became the Company's main trade centre after it was acquired from the Portuguese Empire as a matrimonial gift. By the end of the century, the East India Company had a major presence at Madras, Calcutta, and Hughli in Bengal amongst others. These early arrangements were entirely peaceful, but the company wanted more control and more power that would give even greater returns to its private investors. There was a continuous power struggle between the Nawab and the company regarding the privileges and concessions. Sometimes the order was overruled by the Delhi Durbar. However, with the setting of the rule of Alivardi Khan in Bengal, a strict order was passed to all the European companies to maintain neutrality within Bengal. It was in the mid-18th century that the East India Company gained the right through a royal charter to raise its army, principally to protect its assets like warehouses and man its fortifications. The more concessions increased greed among the British companies. Under these circumstances, Nawab had to intervene to control the British expansion in Bengal. The strictness of Nawab upon European companies in Bengal led to a fallout situation and factions among Nawab courtiers. The death of Alivardi Khan on 21st April 1756 and the succession of young Nawab Siraj ud Daula led to a final breach among companies and courtiers which resulted in the Battle of Plassey.

History Writings on Battle of Plassey

There is a gap in writing history on the Battle of Plassey from a subaltern perspective. The dominant historians of Imperialist, Nationalist and Marxist portrayed this battle as the cleverness of Robert Clive and European superiority in terms of warfare, weakness of Nawab of Bengal, insidious fighting amongst Nawab's supporters and courtiers, succession issues for the nawabship, misuse of dastak and private trade by Europeans, the building of fort without nawab's permission, trade rivalry between European powers etc. There was no denying the fact that all the above-stated factors were responsible for the Battle of Plassey.

Scanned with OKEN Scanner

However, undermining the role played by untouchable soldiers in the Battle of Plassey was equally denying the real truth of history. It was highlighted and written that the battle was fought on the ground for several hours. For a foreign country like England, manpower was essential and core for any achievement. These untouchable soldiers were the backbone of the army and military forces at a very crucial time. The writings of a few imperialists and others had given due importance to the role of the native Indian army and sepoy deployed by the Europeans. However, they did not mention the persons who were mainly comprised of untouchable castes. J.R. Seeley pointed out that "our acquisition of India was made blindly. Nothing great that has ever been done by Englishmen was done so unintentionally, so accidentally, as the conquest of India." (Seeley,1883;179) The period and events under discussion are extensively documented in works by British historians and officials such as Elphinstone's Rise of the British Power in the East; Scott's History of Bengal; Malcolm's Life of Clive; Orme's History of Hindoosthan; Mill's History of British India; Thornton's History of British India; Ive's Voyage and Journal; Stewart's History of Bengal. Notably, James Mill's History of British India along with the posthumously published The Rise of the British Power in the East by Monstuart Elphinstone, are particularly renowned for their analytical rigour and impartial presentation of their subject. These writings were written to suit their masters and denigrate the divisions within Indian society on various counts. There was a tendency in history writing to highlight the facts that suit their views and positions. Three different imperialist theories have been propounded to explain the conquest of Plassey. As per the Defensive theory, the conquest of India was handy work to be a defensive response to rivalry for trade between the French and English East India Company and the weakening of central power i.e. Mughal empire. However, Philip Mason pointed out that "conquest was to expel the French threat to English East India Company

Scanned with OKEN Scanner

and project its trade." (Mason, 1998;181) It was the French East India Company that had control over trade, particularly in southern India. The propounder of turbulent frontier theory stated "that in a disorderly subcontinent the security of Bengal, Madras and Bombay could only be safeguarded by the extension of British authority." (Galbraith, 1960;152) As a result and need of the hour British by whatever means intruded and ventured into the eastern coast, one of the wealthiest provinces of India. Eric Stokes in his seminal work viewed "the English East India Company as constrained to transform itself into a territorial power because of the insecurity caused by the collapse of the Mughal Empire and the emergence of a rival European threat to its trading areas from the French." (Stokes, 1973;142) The British government wanted to secure trade with the native rulers and from other European companies. However, Judith M. Brown explained it differently by stating that "this was not only the desire of quick profits for the company and personal ambition of some factors but also an extension of European rivalry which led to the conquest of Bengal." (Brown, 1994;45-51) How could an extension of rivalry be beneficial for the British? Lastly, Ian Bruce Watson judging from psychologist theory of imperialism expressed that "the psychology of the English officers was a more important factor for conquest than any other. It was the personal urge of the officers like Robert Clive for self-assertion." (Watson,1980;52-70) Thus, all three theories pointed out the urge for the conquest of Bengal by citing different reasons. However, P.J.Marshall thought that "until 1784, there was no conscious or consistent British policy for political conquest in India. The growth of territorial empire in India was neither planned nor directed by Britain but was the initiative of the company officials operating in India which decided the course of action, despite the absence of any policy directives from London in favour of conquest and colonization." (Bandyopadhyay, 2004; 37) It was the urge of the company officials with the changing political circumstances of weakening core and strengthening of

Scanned with OKEN Scanner

periphery which inspired them to intervene in local affairs. C.A. Bayly pointed out that "even after the 1780s, the imperial expansion was primarily motivated by the fiscal and military needs of the company, rather than interests of trade." (Bandyopadhyay, 2004; 38) These writings may be useful in explaining the motives of the British Raj but with the changing times, there is policy change. Moreover, European wars were more vital for any European country at this point. Philip Lawson made it clear that "in the middle of the eighteenth century the Europeans gained a decided technological edge over the Indians and this paved the way for victory as a policy of aggression and state imperialism by proxy." (Bandyopadhyay, 2004; 39) In the writings of Dr. B.R. Ambedkar, it was mentioned that "India was conquered by the British with the help of an army composed of Indians." (Moon, 1993;85) Dr. Ambedkar raised a very pertinent question here, mentioning "But who were these Indians who joined the army of their foreigners? Who were these people who joined the army of the East India Company and helped the British to conquer India?" (Moon, 1993;85-86) There was no denying the fact that the native Indian army composed mostly of untouchables played an important role in the decisive battle for the British Raj. Thus, Professor J.R.Seeley remarked that "India can hardly be said to have been conquered at all by foreigners, she has rather conquered herself." (Seeley,1883;237) For a clear-cut understanding of the statement, the initial recruitment process and composition of the native Indian army must be examined which was highlighted by Stephen P. Cohen, Manas Dutta etc. in their writings. Tirthankor Roy pointed out that "the first major military encounter between the Company and a provincial army, the battle of Plassey (1757), has been described as 'a transaction, not a battle', by an Indian historian." (Roy, 2010;5) The nature of the battle can be disputed but how European companies grew in strength and captured territories by becoming powerful. The strength of companies was the native soldiers which was not given

Scanned with OKEN Scanner

importance in the history writings. It was the most important factor but the subaltern class hardly mattered for the dominant class. Why have European companies started recruiting native people? Was it a compulsion or necessity for the European Companies?

Positions of Untouchables Before Conquest

The battle of Plassey played a dominant role in the establishment of British rule in India. Before the coming of Europeans, the untouchables were looked down upon. The institution of caste did not provide many opportunities for these untouchables to be in service or administrative posts. They were occupied with traditional and menial jobs based on the caste system. On the other hand, the upper castes had an advantage in occupying the most suitable jobs. These jobs were monopolized by Brahmans, Bhumihars and Kshatriyas who brought their kith and kin and native people belonging to villages and towns. There was no entry of untouchables. These untouchables were engaged in occupational jobs based on the caste system in society. After the coming of Europeans in India, they needed local people to be part of their administrative structure. The European countries after the Industrial Revolution needed raw materials, cheap labour and markets of the colonies to carry forward the production and distribution of goods. The industrialization process in Europe caused them to search for new colonies for the needs of the factory system. As a result, there was competition within the European powers to acquire colonies and to compete with each other. Such fierce competition and rivalry led them to get support from the local nawabs, rulers and people. These European powers started collaborating with the regional powers in such a situation. Moreover, to consolidate power, they needed people in various capacities to support them. In India, the French East India Company and British East India Company were trying to acquire the territories in various parts of India.

Scanned with OKEN Scanner

The international situation for both powers was forcing them to compete with each other. Firstly, the war of Austrian succession (1740-1748) amongst various European countries was not restricted to Europe, but also spilled into their trading countries namely India. The war between France and England ended in 1748, which had brought peace for some time in Europe. As a result, both powers to strengthen their power in the colonies started recruiting Indian troops. It had double-edged advantages for both Europeans and Indian natives. These European powers did not in capacity to spare regular troops for India. To manage the affairs in India, both these powers needed a large number of soldiers. Though the British managed to send the English troops to India in 1754 to control the military affairs, it was inadequate. It was under these circumstances that Europeans started recruiting the local untouchables into military service. Why do they choose untouchables? Was caste not a stigma in the army? How did they manage to convince the upper-caste soldiers? Secondly, with the declaration of the Seven Years' War in 1756 which continued till 1763, these European companies once again struck in a fierce battle at both places. In a situation like this, they had no other way but to depend upon local natives for the safety and security of their trade and further expansion. Both these international battles during the beginning of the mid-eighteenth century provided an opportunity for the Indian untouchables to be part of the decorated army positions, a different experience altogether. The circumstances had provided an opportunity for the native people to secure a position in the army. For untouchables, caste identity in society prevented them from finding such services. The societal stigma of caste, hierarchy and inequality amongst untouchables remained a touchstone to relive a different life with discipline and dignity and earn self-respect with great valour. These opportunities transformed their life and also equally served the purpose of European companies who needed manpower to fulfil their daily needs. Although Indian untouchables

Scanned with OKEN Scanner

were not granted any high rank, the dignity of labour was preserved in the service of the army. With these limitations of untouchable soldiers, they acquired the available opportunity and made the best use of it to bring further transformation into society. These opportunities not only transformed their way of life but in the long run, made them able person to lead a dignified life.

Recruitment of Untouchables as soldiers in the British army

The untouchables of India were the backbone of the British army. It was highlighted that "members of many different castes, including a large number of low and "spurious" castes, had traditionally maintained a strong foothold on military employment." (Kolff, 2013;263) Initially, they played an important role in acquiring and acquisition of territories in India. They were employed by Britishers as sepoys, guards, watchmen etc. Manas Datta has pointed out that "English East India Company gave new opportunities to the lower castes, providing them with occupational and social mobility and socio-economic improvements." (Datta, 2016;58) The untouchables becoming a part of the army allowed them to gain respect and security in society. It was a noble profession to serve in the army forgetting the past occupational menial work. It became respectable to wear a uniform which was considered equal among all. The army discipline and rules and regulations made them understand the various nuances of society where they were looked down upon in rural India. It was also important that not all untouchables got the opportunity to serve in the army. The most suitable and qualified in all respects were selected to serve in the army. This also enhanced their prestige within the untouchables. The uniform of the army adorned by untouchables provided a sense of equality and devotion for the work gave utmost satisfaction forgetting the experience of the society based on caste. The opportunity to do different work from the traditional one marked the departure in prestige among the untouchables. It was a new learning experience which provided an impetus to move upward and

Scanned with OKEN Scanner

start a new beginning. Such recruitment in the army played an important role in the life of untouchables. They were not different from others but they were lacking in the opportunity. It was pointed out that "the arrival of the East India Company on North India's labour market did after all mean a break with tradition. The Company was in a position to establish a monopoly as an employer of soldiers, at least at the state level." (Kolff, 2013;264) Under the British East India Company, they felt the utility of serving in the army and proving their ability for such work. The purpose of recruiting untouchables into the army proved fruitful which made them superior in the consolidation of the power in India. They needed manpower to reduce the conflict and win over the enemies. In foreign countries, the British needed much support from the natives to control the natives. It served the dual purpose which was not at all an easy task. Initially, they recruited the people who were willing to serve mainly untouchables and tribals. Hence, the Britishers relied upon a few untouchable castes which could serve their purpose.

The recruitment of sepoys started in the early part of the 18th century by the French which was later on emulated by the Britishers. It was in 1748 that "a small body of sepoys was raised at Madras after the example set by the French, for the defence of the settlement." (Seeley, 1883;30) Professor J.R. Seeley remarked that "an idea of conquering India was deliberately conceived by French men." (Seeley, 1883;30) The foreign manpower by these European powers had been replaced by the Indian manpower. The first chance of associating with the British troops was taken by upper-caste Hindus and simultaneously, they inducted their relatives and friends making it look more homogeneous. Stephen P. Cohen has remarked that "when political systems are engaged in warfare they tend to draw more heavily from low castes for manpower." (Cohen, 1969;454) This situation provided more opportunities for untouchables for social mobility. However, it was not a

Scanned with OKEN Scanner

continuous trend. Many a time, peasantry volunteered in times of crisis, but they returned to traditional occupation in peacetime.

Anand A. Young stated that "when Robert Clive organized the first sepoy battalion in Bengal in the 1770s, several recruits were drawn from Bihar, probably including some from Saran. By the mid-nineteenth century, the district had provided as many as 10000 sepoys." (Young, 1979;43) Similarly, Dr. B.R. Ambedkar mentioned that "the men who fought with Clive in the battle of Plassey were the Dusads, and the Dusads are untouchables." (Moon, 1993;86) The recruitment of Dusads in the army in Bengal was most significant as per their prevailing socio-economic conditions. These soldiers were loyal to the British but at the same time, they were also concerned with their career and recruitment in the army by the foreign powers. They had been suffering from the caste stigma since time immemorial which prevented them from performing in different walks of life. This was a life-changing opportunity which all of them wanted to continue honestly and dedicatedly. G.W.Briggs in his seminal work pointed out that Jaiswars were with the troops that fought with Robert Clive at Plassey." (Briggs, 1920;23) Dirk H.A.Kolff pointed out that "lower caste sepoys, such as Pasis who had contributed much to the centuries-old Purbiya tradition of mobile labour and had helped fight Clive's battles." (Kolff, 2013;265) Such references point towards the need of the British to recruit people belonging to untouchable caste without any discrimination. It was serving their purpose at the same time these people felt empowered to receive jobs like this. It was remarkably pointed out by J.R. Seeley that "in India we (Englishmen) we had at the outset a sense of inferiority in comparison with them (French) and fought in a spirit of hopeless self-defence and fear of the French." (Seeley, 1883;30) The fear in the minds of colonial administrators about the rival company forced them to recruit suitable persons of untouchable caste to defend their dignity and power as an outsider. It was both a need as well a

Scanned with OKEN Scanner

necessity for the British company to take native people into the army. To strengthen their power, manpower needed much attention when competing tendencies were obvious and declared for trade supremacy. The international (European) wars and results had a direct bearing on these European companies in the colonies to compete with each other to maintain supremacy for the sake of maintaining the status of an imperial country. A country like India that had an abundance of all the requirements that these competing countries needed in the eighteenth century. In the absence of weak central power and equally rival regional powers, they were searching and waiting for an opportunity to dismantle completely to catch hold of power in their hand. For European companies, caste was not a criterion for the initial requirement of manpower in saving the profiting business and subjugating the rival company. Bhagwan Das pointed out that "untouchables joined the armies of the East India Company when they turned to empire building." (Das, 2008;8) It was true that the East India Company needed manpower to fulfil the ambition of making India one of the colonies in South Asia. These untouchable soldiers fought for the cause of the company and with their courage and valour, they were recognized as valiant soldiers.

In 1757, Major Lawrence, a British officer, assigned Robert Clive, a British military leader, with the task of reorganising the Indian troops into regular, well-structured battalions. It was during this year that the Battle of Plassey took place, which gradually diminished the French influence and paved the way for the expansion of the British East India Company's territories in India. The French influence was mainly present in the east and south of India, which allowed the Nawab of Bengal, a Muslim ruler, to feel secure from any other foreign powers. After the expansion of the military, there was a significant increase in the number of troops at its disposal. This led to the creation of the first regular native Indian infantry battalions, which comprised a team consisting of one British captain, two

Scanned with OKEN Scanner

lieutenants, several British sergeants, 42 Indian non-commissioned officers, and 820 Indian ranks and files. These battalions marked a significant milestone in the history of the Indian military, as they were the first organized units that were trained and equipped to fight in the traditional European manner. The officers in the army were Britishers and in lower ranks Indians. These compositions straightforwardly point towards the hierarchical status which the British army was maintaining. Robert Clive, a British officer who served in India, made a significant contribution to the British colonial rule in India. He was the first British officer to equip Indian troops entirely, which was a remarkable achievement. The East India Company bore the expenses of this equipment, and it was popularly known as 'Sarkar'. His efforts played a vital role in expanding British influence in India. During the British colonial era, the native Indian soldiers or sepoys played a significant role in the British army. These soldiers were even dressed in British 'Red Coats' by their commanders, which eventually led to the coining of the term 'Lal Paltan' for such units. The sepoys held a special place in the popular notion and an essential component of the British army's military might in India. Their uniform held a unique significance in the psyche of the people. On a personal level, these soldiers felt empowered in their assigned duties. During the Battle of Plassey, Robert Clive led a valiant army that included 950 European troops, consisting of 250 men of His Majesty's 39th Foot, 2,100 Indian troops (sepoys and topazes), 60 sailors, and 100 artillerymen equipped with eight 6-pounder guns and two howitzers. The British army, though outnumbered, displayed remarkable courage and resilience in the face of the Nawab of Bengal's army, which boasted a formidable 35,000 infantry, 15,000 cavalry, and 53 pieces of artillery, including 18, 24, and 32-pounders. On the battlefield, a small French unit led by St. Frais supervised the artillery and manned some guns. Despite being outnumbered, the British soldiers comprised of untouchables were steadfast and played a crucial role.

Scanned with OKEN Scanner

Their intelligence and bravery led to the death of the commander of the Nawab's army. This shows that, while numerical strength is important in an army, the courage and skill of individual soldiers can make all the difference.

Conclusion

The Battle of Plassey fought in 1757 between the British East India Company and the Nawab of Bengal, Siraj ud Daulah, is a significant event in the history of colonial India and holds immense importance for both Indians and the British. Initially, the British were fearful of the French company, and the Nawab of Bengal was apprehensive about the British's growing influence in the region. It is noteworthy to mention the contribution of untouchable soldiers who fought for Robert Clive during the battle. Although it was common to have untouchable soldiers in the Indian army, it was not until the Battle of Plassey that the idea became important for the East India Company's administrators. The untouchable soldiers played a crucial role in the battle, displaying remarkable bravery and discipline despite being discriminated against based on their caste. The victory of the British army over the Nawab's forces was largely attributed to the untouchable soldiers who were pillars of strength. Despite their significant contribution, the role played by the untouchable soldiers had previously been overlooked in historical accounts. Dr. Ambedkar had written about it and highlighted the importance of untouchable soldiers, who had helped the British win the battle. This victory was a turning point in the history of colonial India, and it gave the untouchable soldiers some recognition and opportunities for growth in the colonial administration. As a result, their socio-political and economic conditions improved, and they were able to assert their basic civil and political rights later on, as evidenced by the anti-caste movement. The contribution of the untouchable soldiers in the Battle of Plassey highlights the importance of recognizing and acknowledging the neglected groups from immemorial times, regardless of their caste or social status. The untouchable

Scanned with OKEN Scanner

soldiers fought with full vigour and zeal, and their bravery paved the way for further advancement once given the opportunity.

References:

Kolff, Dirk H.A., Peasants fighting for a living in early modern North India in Zurcher, Erik Jan (ed.), Fighting for a Living: A Comparative Study of Labour, 1500-2000, Amsterdam University Press, Amsterdam, 2013, p. 264.

Seeley, J.R., The Expansion of England, Cambridge University Press, Boston, 1883, p.179.

Mason, Philip, The Men Who Ruled India, Rupa & Company, New York, 1998, p. 181.

Galbraith, John S., The "Turbulent Frontier" as a Factor in British Expansion, Comparative Studies in Society and History, Jan. 1960, Vol. 2, No. 2, p.152.

Stokes, Eric, The First Century of British Colonial Rule in India: Social Revolution or Social Stagnation? Past & Present, Feb. 1973, No. 58 (Feb. 1973), p. 142.

Brown, Judith M., Modern India: Origin of an Asian Democracy, Oxford University Press, New Delhi, 1994, pp.45-51.

Watson, Ian Bruce, Foundation for Empire: English Private Trade in India 1659-1760, Vikas Publishing House, Delhi,1980, pp. 52-70.

Bandyopadhyay, Sekhar, From Plassey to Partition: A History of Modern India, Orient Longman Private Limited, New Delhi, 2004, p. 37.

Bandyopadhyay, Sekhar, From Plassey to Partition: A History of Modern India, Orient Longman Private Limited, New Delhi, 2004, p. 38.

Bandyopadhyay, Sekhar, From Plassey to Partition: A History of Modern India, Orient Longman Private Limited, New Delhi, 2004, p. 39.

Moon, Vasant (ed.), Dr. Babasaheb Ambedkar Writings and Speeches, Vol. 12, Education Department, Government of Maharashtra, Bombay, 1993, p. 85.

Scanned with OKEN Scanner

Moon, Vasant (ed.), Dr. Babasaheb Ambedkar Writings and Speeches, Vol. 12, Education Department, Government of Maharashtra, Bombay, 1993, pp. 85-86.

Seeley, J.R., The Expansion of England, Cambridge University Press, Boston, 1883, p.237.

Roy, Tirthankar, Rethinking the Origins of British India: State Formation and Military-Fiscal Undertakings in an Eighteenth-Century World Region, Working Papers No. 142/10, Department of Economic History, London School of Economics, Houghton Street London, June 2010, p.5.

Kolff, Dirk H.A., Peasants fighting for a living in early modern North India in Zurcher, Erik Jan (ed.), Fighting for a Living: A Comparative Study of Labour, 1500-2000, Amsterdam University Press, Amsterdam, 2013, p. 263.

Datta, Manas, (2016), The Army as a Tool for Social Uplift: The Experience of the Paraiyans in the Madras Presidency Army, 1770–1895, Social Scientist, Vol.44, p.58.

Kolff, Dirk H.A., Peasants fighting for a living in early modern North India in Zurcher, Erik Jan (ed.), Fighting for a Living: A Comparative Study of Labour, 1500-2000, Amsterdam University Press, Amsterdam, 2013, p. 264.

Seeley, J.R., The Expansion of England, Cambridge University Press, Boston, 1883, p.30.

Seeley, J.R., The Expansion of England, Cambridge University Press, Boston, 1883, p.30.

Cohen, Stephen P. (1969), The Untouchable Soldier: Caste, Politics and the Indian Army, The Journal of Asian Studies, Vol. 28, No. 3, p.454.

Young, Anand A, (1979), Peasants on the Move: A Study of Internal Migration in India, The Journal of Interdisciplinary History, Vol.10, No. 1, p.43.

Moon, Vasant (ed.), Dr. Babasaheb Ambedkar Writings and Speeches, Vol. 12, Education Department, Government of Maharashtra, Bombay, 1993, p. 86. The Dusadh caste in Bihar was an untouchable caste. Still, the people belonging to the Dusadh caste

Scanned with OKEN Scanner

work in police stations such as Chaukidar and Dafadar due to their historical past during the colonial period.

Briggs, G.W., The Chamars, Oxford University Press, Bombay, 1920, p.23. The Jaiswars were inhabitants of the eastern part of the U.P. belonging to the depressed class. They were recruited by Europeans as menial servants and house servants. Some of these sub-castes were tanners, some of them made shoes and many were day labourers.

Kolff, Dirk H.A., Peasants fighting for a living in early modern North India in Zurcher, Erik Jan (ed.), Fighting for a Living: A Comparative Study of Labour, 1500-2000, Amsterdam University Press, Amsterdam, 2013, p. 265.

Seeley, J.R., The Expansion of England, Cambridge University Press, Boston, 1883, p.30.

Das, Bhagwan (ed.), Untouchable Soldiers: The Mahars and the Mazhbis written by Ardythe Basham, Gautam Book Centre, 2008, New Delhi, p. 8.

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Genealogy, Graves, and Global Networks: Exploring the Hadrami Diaspora in the Indian Ocean

Archana Kumari

Ph.D Scholar

Department of History

Delhi University, Delhi

Abstract: Engseng Ho's The Graves of Tarim provides a comprehensive exploration of the Hadrami diaspora across the Indian Ocean, tracing its mobility, identity formation, and the pivotal role of genealogy in shaping its sociocultural and religious fabric. The book investigates how graves, as sites of pilgrimage and identity, serve as enduring links between migrating communities and their origins, transforming notions of place, belonging, and legacy. Ho examines the diaspora's transnational networks, rooted in patrilineal descent and genealogical traditions tied to Prophet Muhammad, revealing how these frameworks facilitated cultural transmission, legal practices, and social cohesion. Through an analysis of historical texts and personal narratives, the study highlights the dynamic interplay between mobility and stasis, exemplified in practices like pilgrimage, marriage patterns, and the evolving role of kafaa in maintaining lineage integrity. The work situates the Hadrami diaspora within the broader discourse of global mobility, challenging Eurocentric frameworks by illustrating how non-Western societies fostered transregional connections long before modernity. The significance of graves and the movement of individuals and texts is emphasized, showcasing how these elements shaped hybrid identities, and sustained diasporic networks. Ho explores the socio-political impacts of the Hadrami diaspora, including its integration into

Scanned with OKEN Scanner

the courts and spiritual leadership of various Indian Ocean polities, underscoring its resilience and adaptability across shifting imperial contexts. By examining key historical transitions—such as the rise of Muslim empires, the shifting trade routes, and the diaspora's role in new Muslim polities—Ho weaves a narrative that connects individual biographies with macro historical processes. The book ultimately offers a nuanced understanding of how the Hadrami diaspora negotiated identity, belonging, and continuity across space and time, contributing to the broader field of transnational and diasporic studies.

Keywords: Hadrami's, Tarim, Ayadarus, Adeni's, Hadramawt, Tarīqa 'Alawiyya, Bā 'Alawi', Habib Nuh al-Habshi, Ahmad al-Junyad, Shafi, Muwallads, Kafaa

Introduction

Engseng Ho's The Graves of Tarim provides a rich and nuanced analysis of the Hadrami diaspora, originating from Hadramawt—a historic region in present-day Yemen—situated along the South Arabian coast. The Hadramis, known for their strong sense of identity and interconnected social structures, dispersed across the Indian Ocean, creating intricate transnational networks that spanned centuries. Through an interdisciplinary lens, Ho explores the mobility of this diaspora, emphasizing the centrality of graves and genealogy in shaping their collective identity.99 Graves, as Ho argues, hold profound significance in diasporic contexts. For migrants, the location of burial often eclipses the place of birth in symbolic importance, serving as both a physical endpoint and a metaphorical origin for future generations. These sites not only memorialize the dead but also act as enduring points of connection for the living, anchoring a dispersed community to shared histories and lineages. For those separated from their families by migration,

---

99 Engseng Ho, *The Grave of Tarim: Genealogy and Mobility Across the Indian Ocean,* (Berkley, 2006), pp. xix-xx.

Scanned with OKEN Scanner

visiting ancestral graves provides a tangible link to their origins, forging continuity across time and space.100 At the heart of Ho's study lies the concept of genealogy, which he examines as a multifaceted framework encompassing moral, philosophical, historical, and legal dimensions. The Hadramis carried their genealogical traditions across the Indian Ocean, integrating them into diverse cultural and religious landscapes. This genealogical transmission became a cornerstone of their identity, reinforcing ties to patrilineal descent while adapting to new environments. Through an analysis of lineage, Sufi practices, and historical texts, Ho brings the Hadrami diaspora into sharp focus, addressing its historical 'absence' by making its presence felt within the broader narrative of global and transnational history.101 This introduction frames the Hadrami diaspora not merely as a community of movement but as a dynamic network sustained by shared genealogical and cultural practices. By weaving together, the personal, religious, and political dimensions of Hadrami lives, Ho's work offers a compelling exploration of how diasporic identities are constructed, transmitted, and transformed over time.

Mobility and Question of Identity

Engseng Ho discusses how scholars have traditionally associated mobility with 'modernity' and often linked it to the rise of Western societies. Claude Lévi-Strauss termed Western societies and individuals as historically 'hot,' signifying their open, adaptable, and dynamic nature, while non-Western societies were considered 'cold' in contrast. In recent anthropological developments, there has been a shift to acknowledge the historical mobility of non-Western societies and cultures. This new anthropology of mobility reintroduces the idea of progress, which was

---

100 Ibid., p. 3.

101Andrew Shryock, Review of *The Graves of Tarim: Genealogy and Mobility Across the Indian Ocean*, *Anthropological Quarterly*, vol. 80, no. 1, (Winter 2007), pp. 265-270.

Scanned with OKEN Scanner

previously discarded, particularly in the context of technological mobility and its obsession with speed. For a long time, societies, cultures, and religions have exhibited mobility, involving intricate interplays between absence and presence in various dimensions like tactile, visual, auditory, affective, aesthetic, textual, and mystical. Engseng Ho illustrates this concept through the event of the destruction of the grave complex of Abu Bakr al- ʿAydarus' in Aden on September 2, 1994. Al-ʿAyadarus was known as the patron saint of Aden, and his tomb attracted thousands of patrons during the city's annual festival. This incident is closely connected with the Hadrami diaspora, a mobile diaspora that predates Columbus's journey to America and was present in places like Calicut on the pepper coast of India before Vasco da Gama's arrival.102 The Adeni's mobility was notable as he travelled from Tarim, Hadramawt, to Aden in 1484, where he played a significant role in the city's commercial and religious activities. He also travelled to regions like Ethiopia, Mecca, Medina, and northern Yemen, spreading the influence of Islam. Other members of his lineage migrated across the Indian Ocean to East Africa, Western India, and Southeast Asia, with the graves of these individuals becoming pilgrimage sites with shared rituals and liturgical manuals. Visiting graves has been a common practice in Islamic societies, where it shapes the boundaries between Sufis and their fundamentalist detractors. The graves became sites of contention among transregional and international constituencies. The place of death, rather than birth, became more significant for these individuals, creating representational value. Additionally, by gaining modern education and qualifications over generations, members of this lineage became cabinet members of the southern secessionist state.103 Therefore, the attack on the Adeni's tomb was

---

102 Engseng Ho, *The Grave of Tarim,* (Berkley, 2006), pp. 9-10.

103 Ibid., pp. 13-14.

Scanned with OKEN Scanner

an attack on his identity and his lineage. In the discourse on mobility in history, land is seen as unique because of its immobility, which carries the potential for moral transformation. However, this transformation can be viewed with scepticism, as it may serve as a channel for corruption or personal gain. In diasporic societies, mobility is encouraged and often signifies movement toward moral development. Mobility expands the field for resource and power exchange. The discourse of mobility serves to represent and objectify movements, which can be channelled, controlled, diverted, and debated. Over the past five centuries, the Hadrami diaspora across the Indian Ocean has developed a powerful discursive tradition, leading to the prominence of individuals and families with Hadramawt origins in various economic, political, religious, and intellectual roles in Eritrea's history. They have demonstrated resilience, adaptability, and shared ethical values, enabling them to accumulate capital, build power, and exert influence in Eritrea. They have adeptly navigated through different regimes, including the Ottoman Empire, Khedival Egypt, Italy, Great Britain, and Ethiopia, using their abilities to adapt and succeed. The Hadrami diaspora embarked on journeys across the Indian Ocean, ushering themselves into what contemporary historians often refer to as the world or global history. In stark contrast to the Europeans, whose primary motivation for movement was conquest and trade, enforced through naval monopolies, the Hadramis fostered extensive connections with the diverse communities of the Indian Ocean region, primarily in domains falling under the broad umbrella of religion. These voyages left behind a distinct trail, etched by the presence of mosques, tombs, and educational institutions. Some have even termed this network of pathways as a Sufi order, known as the Alawi Way.104

---

104 Engseng Ho, *The Grave of Tarim,* (Berkley, 2006), pp. 20-29.

Scanned with OKEN Scanner

Grave as Pilgrimage Site

In Engseng Ho's book, he refers to these graves as sites of pilgrimage, which are often located along the paths of Hadrami diasporas' movements. These graves serve two essential purposes. First, they facilitate the movement of people, who have various reasons to travel, resulting in diverse itineraries and durations. Second, these pilgrimage sites are intricately connected to the movement of texts, including pilgrimage manuals and prayer litanies compiled from other sources. These texts link the names of saints to one another, much like how the voices of reciters and prayers echo the names of these individuals at the gravesite. Engseng Ho's perspective on pilgrimage sites suggests that they serve as places of return for those who have migrated. Each return is unique, as every journey away and back differs, bringing new experiences to these locations. While these pilgrimage centers may not readily reveal their secrets when viewed through the usual lenses of politics and economics, they are better understood as places of enrichment and growth. 105Pilgrimage to Hadramawt primarily revolves around the tombs of Ba¯ Alawi saints and scholars. The Ba¯ 'Alawī, recognized as direct descendants of the Prophet Muhammad, have migrated around the Indian Ocean, spreading their Sufi tradition, the Tarîqa 'Alawiyya. Central to this tradition is the veneration of the Ba¯ 'Alawi's pious ancestors. For Ba¯ 'Alawi' living abroad, traveling to Hadramawt constitutes a diasporic return. Ba¯'Alawi' scholars have also framed these journeys as pilgrimages, which broadens the concept of Hadramawt from a point of sayyid origin to a more diverse place with many families and histories.106 Engseng Ho also mentions the tomb of the Prophet Hud, which has become a significant pilgrimage site and one of the largest annual pilgrimages in Hadramawt.

---

105 Ibid., pp. 7-8.

106 Ismail Fajrie Alatas, 'The Poetics of Pilgrimage: Assembling Contemporary Indonesian Pilgrimage to Hadramawt, Yemen', *Comparative Studies in Society and History*, vol. 58, no.3, (July 2016), pp. 607-635.

Scanned with OKEN Scanner

Additionally, he discusses the grave of a Hadrami sayyid, Habib Nuh al-Habshi, in Singapore, noting that the building housing the grave resembles a Hindu chandi more than a Muslim saint's tomb. This site attracts pilgrims from various regions, including Malays, Hadramis, Arabs, Chinese, and Indians. The distribution of such graves across the Indian Ocean showcases the diversity of visitors, emphasizing that the diaspora cannot be understood solely in ethnic terms. Engseng Ho also highlights the efforts of Ahmad al-Junyad, a member of the sayyid lineage, in transforming Tarim from a mere destination to an origin. He confronted various challenges, such as family quarrels, foreign rules in Tarim, and the upkeep of ancestral sites. His work aimed to make Tarim a place of return, and he authored manuals, like "Salve for the Sickly," for visiting the graves of Tarim. These manuals guide proper actions to turn the visit into a pilgrimage, fostering a sense of community. In this context, the graves serve as meeting points for mobile texts and individuals, and resolute localists like al-Junyad find meaningful work in maintaining and investing in these places. Burial, as per al-Junayad's manual, initiates the process of return, grounding and fixing the value of these locations, whether for mobile or sedentary, foreign, or local individuals.107

Marriage Pattern and Dilemma of Muwallads

Engseng Ho's exploration of the Hadrami diaspora underscores the profound significance of genealogy, as illuminated in two seminal texts by Abd al-Qadir al-'Ayadarus and Muhammad b. Abi Bakr al-Shilli. In 'The Travelling Light Unveiled,' al-'Ayadarus intricately weaves genealogy into a multifaceted tapestry of places, dates, and individuals, entwined with esoteric, mystical dimensions from God's earliest creations. This narrative delves into how genealogy, through conquest, marriage, concubinage, and various modalities of exchange, assimilated with the self-

107 Engseng Ho, *The Grave of Tarim,* (Berkley, 2006), pp. 195-199.

Scanned with OKEN Scanner

conceptions of diverse peoples, transcending the boundaries of sayyids and non-sayyids, Arabs and non-Arabs. Conversely, al-Shilli's 'The Irrigating Fount' transforms genealogy into an exoteric science of law, serving as a moral guide that determines permissible marriages, inheritance distribution, and obligations of visitation and aid. Al-Shilli explores the gendered dynamics within Sayyid lineage marriages, where men can marry non-sayyids, but women face restrictions. This asymmetry, favouring the expansion of the sayyid community, particularly through the identification of children with the father's line, facilitated the diaspora's self-reproduction and growth, despite its initial male migration.108 The migration of the diaspora led to the evolution of genealogies, holding two crucial dimensions. These genealogies not only facilitate tracing origins but also foster new connections among communities of diverse backgrounds, fostering mutual relations through shared family and religion. This dual nature involves a coexistence of closed and open aspects, particularly in terms of patrilineal and matrilineal ties within the framework of kinship. Gender asymmetry plays a central role, where the successful integration of these aspects' hinges on the control of women's choices in marriage. The underpinning theory for such control is found in canonical texts composed abroad, exemplified by al-Shilli's legally infused genealogy/biography, "The Irrigating Fount." This interplay of closedness and openness is not a static tension but a dynamic process of signification, exerting discursive control over an expanding sphere of exchange rather than rejecting or stifling it. In this sense, a diaspora offers distinctive ways of delineating the movements of individuals and overseeing the myriad comings and goings across space, time, and culture.109 Ho delves into the issue of kafaa, which surfaces in the

---

108 Ibid., pp. 152-53.

109 Engseng Ho, *The Grave of Tarim,* (Berkley, 2006), pp. 197-198.

Scanned with OKEN Scanner

marriages between sayyids and non-sayyids in the Arab community of the Netherlands East Indies. The ensuing notoriety and opposing fatwas between 1905 sparked a jurisprudential dispute, leading to the issuance of a fatwa called kafaa, emphasizing the sufficiency, equality, and suitability of a spouse for a sharifa. This resolution, while initially addressing unions between Arab sharifas and non-Arabs, transcended race and focused on genealogy as a comprehensive and precise framework for evaluating individuals.110

The Hadrami diaspora's history across the Indian Ocean unfolds as a captivating saga of secrecy, exaggeration, and grandeur. Descendants of the Prophet, revered and marrying princesses, ascended to leadership roles in Muslim states across Africa, India, and the Malay Archipelago. The diaspora positioned itself as a worthy competitor for native affection, emphasizing noble lineage and contributing to the ruling echelons of various societies. The moral concerns surrounding muwallads, offspring born of foreign mothers, are explored within the context of patrilineal genealogies. These genealogies, expansive enough to accommodate matrilineal dimensions, enabled transcultural travel, linking places like Surat and Mecca back to the origins in Hadramawt and Tarim. Daughters were expected to return genealogically through marriages aligned with kafaa, while sons embarked on geographical returns akin to pilgrimages for education and moral development. Despite the poetic records, family histories, and travelogues documenting muwallads returning to Hadramawt since the late nineteenth century, challenges persisted. Engseng Ho draws from oral history, particularly interviews with individuals like Ali from Indonesia, highlighting hurdles such as passport issues. For muwallads, obtaining a Yemeni passport based on their genealogy proved easier, reinforcing their connection to the Hadrami class. A significant obstacle faced by muwallads was the struggle with a sense of home. Many, especially those brought to Hadramawt in

110 Ibid., pp. 173-174.

Scanned with OKEN Scanner

their teens or later, expressed dissatisfaction and a desire to leave. Sensitized to the dissonance between their upbringing elsewhere and their new, often unwelcoming, environment, muwallads grappled with a sense of alienation. This sentiment, intensified by limitations on job opportunities due to their noble lineage, perpetuated their ambivalence toward Hadramawt.111 In conclusion, Engseng Ho's comprehensive exploration of the Hadrami diaspora unveils the intricate interplay of genealogy, cultural dynamics, and legal frameworks shaping the history and challenges faced by this unique community across the Indian Ocean. The diaspora's ability to navigate these complexities reflects the resilience embedded in its genealogical roots, despite the hurdles encountered by muwallads in their quest for a sense of home and belonging.

Conclusion

Engseng Ho's book delves into a fascinating exploration of the Hadrami diaspora across the Indian Ocean, tracing their integration into various regions over generations. The study draws on two significant works by Hadrami sayyids, namely al-Adyarus' "The Travelling Light Unveiled" and al-Shill's "The Irrigating Fount," shedding light on the crucial role of genealogy. It emphasizes the heightened importance of the place of death in the lives of migrating communities, as it becomes intertwined with individual identity. The book underscores the significance of graves in migrating communities, establishing how the deceased can connect with family and friends through visits to these resting places. It delves into the importance of inscriptions on gravestones, highlighting how names on these stones serve as a catalyst for conversations between visitors and the departed, transforming graves from silent monuments to interactive legacies. A pivotal theme explored is the parallel journeys of individuals and texts across the ocean, particularly among the Hadramis, especially the sayyids. The practice of bringing texts as letters of

111 Engseng Ho, *The Grave of Tarim,* (Berkley, 2006), pp. 223-229.

Scanned with OKEN Scanner

introduction during travels, starting from the sixteenth century, is discussed. These Hadrami texts not only facilitated movement but also bore historical consequences, creating hybrid versions influenced by Arabic genres. The book delves into the creation of new Muslim polities across the Indian Ocean due to shifts in long-distance trade routes. The transition from the Persian Gulf to the Red Sea brought Hadramawt and Aden into greater contact with Egypt, the Hejaz, and India. This shift resulted in the emergence of a transoceanic world for Islam, characterized by a common allegiance to the Shafi school of Islamic law. The simultaneous rise of the Ottoman Empire, Safavid dynasty, and Mughals in India in the age of gunpowder intensified commercial and political relations in the western Indian Ocean. This period saw the creation of new Muslim states with the arrival and incorporation of foreigners into positions of rule and influence. Port cities, especially Gujarat, served as pivotal nodes for exchanges between these empires. The book elucidates the role of Hadrami Sufis in Gujarat, serving as spiritual patrons, leaders, and state officials. It explores the changing roles of religious adepts, such as Ulugh Khan, Rayhan Badr al-Din Jahangir Khan, Sharwan Khan, Ghalib Khan, and Bijli Khan, shedding light on their diverse contributions and influences.112 In essence, Engseng Ho's work unravels the intricate tapestry of the Hadrami diaspora, intertwining individual journeys, textual legacies, and the geopolitical shifts that shaped the Indian Ocean world of Islam.

References:

Engseng Ho, The Grave of Tarim, (Berkley, 2006).

Ismail Fajrie Alatas, 'The Poetics of Pilgrimage: Assembling Contemporary Indonesian Pilgrimage to Hadramawt, Yemen', Comparative Studies in Society and History, vol. 58, no.3, (2016).

112 Engseng Ho, *The Grave of Tarim,* (Berkley, 2006), pp. 99-107

Scanned with OKEN Scanner

Andrew Shryock, Review of The Graves of Tarim: Genealogy and Mobility Across the Indian Ocean, Anthropological Quarterly, vol. 80, no. 1, (2007).

Syed Farid Alatas, 'Hadhramaut and the Hadhrami Diaspora: Problems in Theoretical History', in U. Freitag and W. G. Clarence-Smith, (ed.), Hadrami Traders, Scholars, and Statesmen in the Indian Ocean, 1750s–1960s, (Leiden, 1997).

Benedict Anderson, Imagined Communities: Reflections on the Origin and Spread of Nationalism,(London, 1991).

Arjun Appadurai, Modernity at Large: Cultural Dimensions of Globalization,(Minneapolis, 1996).

C. A. Bayly, Empire and Information: Intelligence Gathering and Social Communication in India, 1780–1870,(Cambridge, 1996).

Linda Boxberger, On the Edge of Empire: Hadhramawt, Emigration, and the Indian Ocean,1880s–1930s,(Albany, 2002).

Abdalla Bujra, The Politics of Stratification: A Study of Political Change in a South Arabian Town,(London, 1971).

Sheila Carapico, Civil Society in Yemen: The Political Economy of Activism in Modern Arabia, (Cambridge, 1998).

Steven C. Caton, Peaks of Yemen I Summon: Poetry as Cultural Practice in a North Yemeni Tribe,(Berkeley, 1990).

Robin Cohen, Reframing Pilgrimage: Cultures in Motion,(London, 2004).

Michael Laffan, Islamic Nationhood and Colonial Indonesia: The Umma below the Winds, (London, 2003)

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Accessible Infrastructural and Learning Environment: Positions and Possibilities

Dr. Sunil Kumar

Assistant Professor, Department of Education,

University of Delhi- 110007

Pooja Sharma

Ph.D. Scholar, Department of Education,

University of Delhi- 110007

Abstract: Students with visual disabilities have their academic concerns, which make an impact on their day-to-day learning. Like others, they have limited opportunities to interest or choice based educational access. They usually struggle in accommodating themselves in institutional environment specifically in academics and infrastructural arrangements. Their frequent encounter with institutional environment many times impact their learning outcomes and restricted their participations in many of activities significant for their professional growth. This paper explored the perception of the student teachers of teacher education institutions at Delhi University. The authors tried to analyze the existing infrastructural and learning environment conditions in teacher education institutions and highlighted their immediate concerns. Based on the results and findings of the study, the authors suggested some suitable accommodation strategies with special reference to infrastructure-related support systems, classroom instructions, need-based learning materials, adapted assessment systems, and accessibility unit resource support. These suggested strategies will support providing an accessible learning environment and help in minimizing their exclusion during their study.

Keywords: Accessible infrastructural environment, inclusion, reasonable accommodation, accessible instructional strategies.

Introduction: The Indian Constitution guarantees equality to all citizens, but persons with disabilities have, in reality, been suffering from stigma,

Scanned with OKEN Scanner

discrimination, and neglect due to socio-psychological and cultural factors. Historically, people with disabilities have lived in India alongside others, but their treatment and attitudes have varied over time. In terms of education, even the Gurukula education system, which advocated basic education principles for people with disabilities, didn't satisfy the social expectations of prospective populations. It is evident from the history of disability studies that in terms of social and economic empowerment, education is the most effective tool. Let's talk about education at the higher education level. The journey from school education to higher education has not automatically happened. Still, many worldwide initiatives and national policy perspectives played significant roles in attaining this level, particularly regarding disabled people. Disabilities in higher education have a different context regarding access and opportunities. Persons with disabilities have limited access to higher education. The Indian context of disability and higher education is characterized by a variety of educational structures and systems, as well as a variety of different policies that address students with disabilities.

In India, During the Ninth Five-Year Plan, the University Grants Commission (U.G.C.) launched a program popularly known as the Higher Education for Persons with Special Needs (H.E.P.S.N.); this program focused on recognizing the need for special education programs as well as infrastructure for students with disabilities (N.C.P.E.D.P., 2004). One more program, Inclusive Education of Children and Youth with Disabilities (I.E.C.Y.D.), talks explicitly about inclusive education for students with disabilities in higher education. This program is an action plan in which provisions have been made to give equal importance to people with disabilities in accessing higher education. Its provisions focused on increasing access to secondary, higher, and vocational education for young people with disability. The program also emphasized the disabled-friendly assessment system and the availability of special educators and rehabilitation professionals with

Scanned with OKEN Scanner

experience in disabilities as needed to assess teachers at all levels. The National Policy for Disabled Persons in 2006 directed the state of India to provide a barrier-free environment that supports the independent functioning of persons with disabilities so that they can participate without assistance in their day-to-day activities. Emphasis has been placed on the policy to make buildings, transportation facilities, public places, and educational institutions accessible. Here, the authors also want to highlight the provisions under the most improved and revised version of the Person with Disability Act 1995, which was launched in the year 2016 and is popularly known as the Right to Person with Disability Act-2016(RPwD-2016). RPwD-Act 2016 talks about every concern of disabled persons, makes provisions accordingly and elaborates on every provision comprehensibly. The act covered 21 disabilities; the number of disabilities increased from 7 to 21.

One of the critical concerns that researchers want to highlight is that access to the classroom and buildings may be one of the biggest challenges for a person with locomotor disabilities. It is made mandatory for all educational institutions to provide inclusive education with reasonable accommodation according to their individual needs in terms of course structure, medium of instruction, and modes and means of assessment. Section 32 of the R.P.W.D. Act 2016 creates a mandatory obligation for all government educational institutions to provide 5% reservation for the person with benchmark disability, including upper age relaxation of five years for admission to an Institution of higher education (I.H.E.).

The new education policy 2020, with particular emphasis on equitable access to quality higher education for all students with specific emphasis on socio-economic groups, further stresses ensuring sustainable refers in schools and higher education (N.E.P. 2020) because the concerns of equity and inclusions are pretty similar across the school and institutions of higher education. The policy also ensures that all buildings and facilities are accessible and disabled-friendly. **N.C.P.E.D.P. (2005)**

Scanned with OKEN Scanner

surveyed 119 universities; the data revealed that about 0.1 % of students of different disabilities were admitted as per 3% reservation rates. Now, the reservation has increased to 5%.

The latest guidelines of U.G.C. that came out in July 2022 on provisions for students with Special learning disabilities highlighted the report of the National Sample Survey Organization (N.S.S.O., 2011) that in India, 2.2 % of the total population is disabled. Here, it is essential to mention that this data consists of only seven disabilities, as mentioned in P.W.D. Act 1995. Out of the total disabled population, only 1.46 Crore people are literate. The number may have increased after 2016 when the Rights of Persons with Disabilities Act came out, which specified 21 types of disabilities. Now, the population of persons with disabilities also has increased.

The U.G.C. guideline also highlighted the adapted instructional strategies according to the nature of disabilities, keeping in mind the learning style of disabled students. The guidelines also suggested the kinds of assistive devices required to cater to their needs. There are several suggestions for universities to follow for the retention of different types of disabled students; it also illustrates the pedagogical support system required for students with benchmark disabilities. The last chapter of this document (U.G.C. guidelines) emphasized accessibility and pedagogy for different learning-disabled students in higher education. This policy supports and focuses on using Different instructional methods to meet the needs of more students with learning disabilities due to the variety of ways they learn. This broader framework will support the professionals in higher education. Higher education institutions should have to make accessible environments for students with disabilities.

Providing and managing support services for students with disabilities is a complex task. Every kind of disability is unique and requires separate provisions of

Scanned with OKEN Scanner

inclusion. To establish a universal design for teaching and learning, we need to address all types of diverse concerns across disabilities. There are numerous challenges to overcome, including the availability and accessibility of resources, training of in-service teachers, pre-service teachers' awareness about diversity and special needs of students with disability among staff, effective referral services, as well as emotional and pastoral support for these students to reveal their disabilities and minimize stigma (Allard, 1987; Hall &Tinklin, 1999).

Students with disabilities can use various support services in higher education institutions to improve their learning experiences. Universities are responsible for providing these students with a safe and conducive learning environment. These students will be able to experience better employment opportunities and improved living conditions through participation and learning in general or regular education classes.

This paper is an attempt to highlight the concerns and challenges faced by the institutions of higher education as well as students with disabilities, specifically in teacher education. The authors of this paper tried to incorporate the research work related to this work. **Azad (2008)** suggested in his work that higher education has a significant role in employability, empowerment, and national development. Higher education is considered a contributory factor for ensuring social justice for deprived sections of society, including people with disabilities, by making education accessible to them and, in the process, improving the quality of life of the nation as a whole. **Warnock Committee Report (1978)** emphasizes the importance of reassessing the needs of students with disabilities well before they enter the world of higher education. Many disabled students are unaware of the provisions for admission into higher education. **U.G.C. (2008)** directed the universities to establish resource units that enable the unit to provide the necessary guidance and develop awareness and counselling of students with disabilities

Scanned with OKEN Scanner

(Jameel, 2005). **N.E.C.P.E.D. (2004)** emphasized that the infrastructure facilities for the student with disability to be designed in such a manner that enables them to access the classroom, laboratories, toilets, etc. easily. Of the total youth in India, 6% have access to higher education, which when applied to disabled youth population 1.44 million disabled youth should have access to higher education. However, the reality presents a different picture: only 0.1% of students with disabilities are enrolled in various universities.

Some international-level research studies also highlighted that it is a difficult task to provide an accessible environment to students with disabilities. Most studies revealed that past policies have been implemented gradually, and progress has often been slow. The main barriers to these are the social, economic, and pedagogical nature created by society, institutions, and the country itself. And there is a need to take some essential steps for the inclusive education of children with disabilities in higher education. Further, every University must facilitate an inclusive teaching and learning process, and support mechanisms must be built up for visually as well as disabled students [Hieman (2006), Howell's (2005), and Hall's (1999)]. Some studies indicated significant differences between institutions in how policies are implemented. In the same way, how students experienced their academic careers varied greatly from institution to institution and department to department. Several policies were written for disabled students regarding access, enrolment, and buildings. The researcher found significant gaps between policy and its implementation on the ground level (Wilson in 2003).

Considering the work done in different countries and India, it has been found that there are so many systemic hindrances and challenges in establishing inclusive setup in higher education. Authors in this work tried to explore and study the existing infrastructural and academic concerns of students with visual disabilities in higher education. This research work has been entitled as "**ACCESSIBLE**

Scanned with OKEN Scanner

INFRASTRUCTURAL AND LEARNING ENVIRONMENT: POSITIONS AND POSSIBILITIES."

OBJECTIVE OF STUDY:

1. To study student teachers' views on infrastructural and learning environments in their respective teacher education institutions.
2. To identify immediate concerns of student teachers with visual disabilities in their studies.
3. To suggest some instructional strategies for reasonable accommodation of students with visual disabilities.

Methodology: A descriptive survey method of research was used to conduct this research work. Qualitative paradigm of research has been adopted and an ethical framework (in- terms of maintaining the confidentiality and informed consent of participant) was designed to conduct this piece of research work

Sampling: A Simple Random Sampling technique was used to select the 20 visually impaired student- teachers pursuing their B.Ed. from all the four colleges of teacher education under University of Delhi. Five students from each college have been selected randomly to get the sample of 20 visually disabled students.

Tools: An in-depth semi structure interview schedule and an observation schedule were prepared by the authors to collect the data for this study. The items of tools have been prepared by covering all the necessary elements (infrastructure-related support systems, classroom instructions, need-based learning materials, adapted assessment systems, and accessibility unit resource support) keeping in mind the objectives of the study. The tool was finalised after expert validation.

Data collection, Analysis, and Interpretation:

The data has been collected by the authors through self-prepared tools covering all the described themes. The collected data has been coded and classified thematically. No specific statistical parameters have been used for analysis. The

Scanned with OKEN Scanner

collected data has only been analysed qualitatively. A few responses from the sampled population have been converted into percentile scores. The respondents' specific narratives were recorded with specific care and placed as were they and tried to be analysed.

FINDINGS OF THE STUDY

Awareness level of students with respect to the Admission Policy

The majority of respondents were well aware of the process of admission. All of them admitted that the institution's admission committees had supported them to take admission to their particular courses. However, some respondents showed unawareness of their reservation policy and selection procedure. All the participants responded to the question about the scholarships, what they received, and the agency where they received. The particular institution supported them in completing the codel formalities to get the scholarships.

Infrastructural Support System: Accessibility and Concerns

The location of the building was accessible, but there was no available tactile path within the building, no available tactile route to reach the classrooms, office, and faculty member's office, even to the enabling unit, Library, computer room, Drinking water, and in fact, toilets.

"We encountered many problems of accessibility immediately after admission in the course for two or three months, but now we are familiar with our classroom, office, and canteen. We face problems when we need to move to classrooms other than our assigned classrooms. At the initial phase of our course, many of our peers supported us in accessing many places in the building, and now we are adapted to our institution. It will be easier for we people if they may be sign board outside every classroom".

The majority of the student teachers had shown their concerns regarding the access within the building and suggested installing a coding system and tactile path to be there in their respective institutions. They rarely received any support other than VI

Scanned with OKEN Scanner

students to reach inside the classrooms and other parts of the building like the Library, labs, canteen, etc, as responded by a large number of participants.

Classroom instructions: Accessibility and Concerns

The majority of students responded that classroom instructions are used by most of the teacher educators to suit their linguistic needs. "The institution tried to club all the students with disabilities only in one section, which sometimes creates an excluded environment for us. Most of the teachers tried to communicate bilingually in Hindi and English, understand our learning barriers, and focus on our immediate learning concerns in the class." Moreover, the responses collected from the sampled population indicated that the pace of teaching is appropriate as per their diverse needs. The educators repeat their instructions, give individualized attention to them, and try to make accommodations and adaptations according to their needs. Generally, the discussion method is used by the teachers in the classroom; teachers use many illustrations to conceptualize the teaching content. Most of them have different views on the method of teaching as lecture method. They also faced problems completing and submitting their assignments in a time-bound manner. Sometimes, teachers give them extra time, but most of the time, they have to submit the assignment with their nondisabled peers.

Availability of the Course Material

Most of the available course material is in a foreign language, English. All the institutions have not prescribed any particular book for any course; generally, different reading material is required to go through the course content in Bed and Med. "The available reading materials provided to us are in PDF format, but sometimes only a few are in our specified medium of instruction. Only a few of the reading materials are in accessible format and easily available. Most of the time, we have to depend on our peers to provide the course material in PDF and recording format. All teachers allowed us to record the ongoing discussion during the class. Only one-third believe that teachers are not allowed to record the discussion. We

Scanned with OKEN Scanner

always keep our learning material in audio and pdf formats on our laptops". The respondents expressed that teachers do not use appropriate aids in class. Most of the student teachers replied that no course-related books in Braille are available in the Library. Most of them believe that PDFs of course books or eBooks should be provided to the library. During the purchase of library books, the concerns of visually disabled students must be considered.

Accessibility Unit: Resource Support and Facility Available

The accessibility unit or Enabling units were available in all the sampled teacher education institutions. However, there is a scarcity of reading material, many aids, and appliances or assistive devices, audio recordings, and braille material. Efforts have been made for many years by the concerned institutions to strengthen their Enabling Units. It is observed that there is a financial crunch before the institutions. There are no specific annual grants for the strengthening of resource support system for the students with disabilities. Only two institutions have braille printer in functional condition. The availability of Braille printers, recording devices, adapted laptops, and other assistive devices were not appropriate as per the strength of students. Many of the devices are old versioned and even not functional. The enabling units of all the sampled institutions supports the students with disabilities to complete all paperwork required to get scholarships and coordinates between the organizations that offer scholarships for the students with disabilities. The institutions also support them by providing scribes during their examination, But to complete their assignments in various subjects, they face many challenges due to the nonavailability of writers. Sometimes, it becomes difficult to arrange the scribes; most teachers allow the students with disability to submit assignments in typed format to resolve the scribe issue, as the majority of the participants responded.

Scanned with OKEN Scanner

School experience program and Field observation

The views of the participants regarding School Experience Programme have also been analysed, and it has been found that the institution's committees give special care for the allotment of schools for disabled students for their field engagement activities. They have been given the nearest and easily accessed schools by clubbing them in groups of non-disabled peers. The non-disabled peers are especially counselled to facilitate their disabled peers during field engagements (schools and other visit outside the institutions). The respected schools have also been requested to facilitate the students with disability to complete their assigned projects. During the class teaching experience, they are facilitated by their peer student teachers.

EDUCATIONAL IMPLICATIONS AND RECOMMENDATIONS

For Institutions of Teacher Education

1. One significant study finding revealed that accessibility to the institution is a problem for students with disabilities. Hence, it is suggested that the institution work on this issue and make provisions to manage the tactile path to access all spaces of the building.

2. This study exposed that the student-teachers with disability were not very aware of the provisions for them; therefore, it is suggested that special awareness programs or counselling session should be designed considering the policy perspectives.

3. Although the University has already constituted a help desk for the students during admission processes, but they need continuous support for their accommodation in the institution immediate after admission. Hence, the institutions should organise seminars, conferences, and induction programmes for non-disabled students to support their disabled peers.

Scanned with OKEN Scanner

4. The study revealed that some institutions have established their Enabling/accessibility Units. Best-suited practices should be adopted for the students with disabilities in the existing infrastructure.

5. The condition of the enabling unit in the sampled institution is not at par with the needs of students with visual disability; although the Enabling units are functional, the critical concern is the lack of assistive devices, infrastructure, and learning material in accessible format due to financial crunches for these units. It is suggested that the Enabling Units should be provided with continuous financial grants to enable them to benefit visually disabled students.

For Teacher Educators

1. The medium of instruction plays a significant role in the process of learning. The suitable approach for students with visual disability is to provide instructions in audio format and in their respective styles of learning. It has been found that students with visual disability face challenges in opting for the medium of instruction. It is advised that teacher educators should consider this concern and try to provide the opportunity to the students with disability in their respective language. The bilingual instructional mode would be more suitable for them.

2. Most of these student-teachers have Hindi as the medium of instruction in higher education, specifically in teacher education. It is suggested that to include students with disabilities in a general setting; teacher educators should keep in mind the language barrier and try to make their teaching language appropriate to them.

3. Another vital concern of student-teachers with a visual disability is the methodology adopted by their teacher educators. The method of teaching should be appropriate as per the needs of learners. It has been observed that most teacher educators consider the concerns of students with visual disabilities, but sometimes, it becomes difficult for them to change the methodology according to the needs of students with disabilities; the reason may be the lack of expertise of teacher

Scanned with OKEN Scanner

educators to teach the students with disabilities, and presence of non-disabled in the same class. Hence, it is suggested that the teacher educators working in teacher education institutions should be given opportunities to attend short-term courses specifically designed to handle students with visual disabilities.

4. Another critical concern of students with visual disabilities highlighted in the study was assessment approaches adapted to evaluate their course-work assignments, projects, and examination scripts etc. and it has not been taken care of as per their ability to perform or complete in the desired format as expected from non-disabled peers. Some flexibility is required to given to them for submission of assignments in typed format if they do not have writer. It is suggested that all teacher educators make the approach flexible while considering the concerns of students with visual disabilities.

5. Diverse class composition plays a very significant role; hence, it is suggested that class or section allocation can be made keeping in view the strength of disabled and nondisabled students.

6. The provision to sit in the examination has already been made in several university notifications and by the University Grants Commission and University examination guidelines. The R.P.W.D. Act 2016 has already addressed the need for students with visual disabilities. The students with visual disabilities can be oriented before the examination.

For Peer Group

1. One of the findings of the study revealed that the non-disabled peers of disabled ones many times do not support them in the same class. Many non-disabled have their first experience of learning with them. It is suggested that a sensitization program should be organized by the institutions. Few volunteer students can be identified to support the disabled. A committee of volunteers can be constituted at

Scanned with OKEN Scanner

the institutional level. Proper recognition should be given to their innovative ideas and work to help disabled students.

2. The initial phase of students with disabilities in the institution always becomes critical for them; this phase requires an immediate support system. Any institution, with the support system of old volunteer students, can plan to accommodate disabled students. In institutions like teacher education, second-year students can assist the newly admitted one.

3. The study highlighted one primary concern of disabled student to attend their school experience program and field observations. Again, a new environment and accessibility issues come before them; one more time, they need the support of their peers to access the classrooms and prepare and transact lessons in someone's presence. They also have to observe the lessons, classroom processes, and many school activities. They can only complete all these projects with the support of their peers. It is suggested that guidelines be prepared by S.E.P. and F.O. committees for nondisabled peers to support them.

4. There should be a flexible mechanism for appearing in the examination so that support can be obtained from peers. It is suggested that peer or volunteer groups can help to identify the scribe for them.

References

Allard, W.G., (1987). Keeping L.D. students in college. Academic Therapy, 22 (4), 359 365.

Ambati, R. N., (2010). Policy and Provisional services for supporting students with disabilities in higher education institutions in Andhra Pradesh, India, Indian Journal of Social Development, Vol. 10, No. 1, PP. 69-88.

Hall, Tinklin., (1999). 'Disabled Students in Higher Education', Scottish Council for Research in Education, 61, Dublin Street, Edinburgh.

Heiman, T. (2006). Social Support Networks, Stress, Sense of Coherence and Academic Success of University Students with Learning Disabilities. Social Psychological of Education, Vol. 9, pp: 461-478.

Scanned with OKEN Scanner

Howell, (2005). 'Higher Education Monitor', South African Higher Education response to Students with Disabilities, Equity of Access and Opportunity, University of the Western Cape', Council of Higher Education, No.3, September, 2005.

J.L. Azad., (2008). Financing and Management of Higher Education in India , Gyan Publishing House ,New Delhi.

Jameel, S. S., (2011). Disability in the context of higher education: Issues and concerns in India. Electronic Journal for Inclusive Education, 2(7), 3.

Ministry of Law and Justice, Govt. of India (2016). The rights of persons with disabilities act, 2016. New Delhi: Ministry of Law and Justice, Govt. of India.

Ministry of Social Justice and Empowerment (1995). The Persons with Disabilities (Equal Opportunities, Protection of Rights and Full Participation) Act. New Delhi, India.

Ministry of Social Justice and Empowerment (2006). National Policy for Persons with Disabilities. New Delhi, India.

N.C.P.E.D.P. Survey (2004). http://www.ncpedp.org/policy/pol-break01.html

N.C.P.E.P.D. (2005) Status of mainstream education of disabled students in India available online at http://www.ncpedp.org/eductn/ed-resrch.html

Policy, N. E. (2020). Ministry of human resource development, government of India. Retrieved October, 20, 2022.

The Warnock Report, (1978). Report of the Committee of Enquiry into the education of handicapped children and young people retrieved from http://www.dg.dial.pipex.com/documents/docs3/warnock10.shtml.

UNESCO (United Nations Educational, Scientific and Cultural Organization). (1997), 'Provision for Students with Disabilities in Higher Education: A survey' University of Cambridge, Teaching Students with Visual Impairments, Disability Research Centre, Cambridge. Accessed from http://www.admin.cam.ac.uk/univ/disability/practice/pdf/visual.pdf

Wilson, Tinkling, & Ridell., (2003), 'Disabled students and Multiple Policy Innovations in Higher Education' Research briefing for learning and Teaching support Networks, Website.

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

History in Religious Performances: A Case Study of Bengal and Odissa

Ranjan Kumar
Associate Professor,
Swami Shraddhanand College, University of Delhi
Vijaya Laxmi Singh
Professor, Department of History,
University of Delhi

Abstract: Buddhism, as an elaborate religious belief, was the first religious connection established with Bengal. Under the four centuries of the Buddhist rulers (8th to 12th century C.E.), it acquired the patronage needed. Some parts of Bengal and Orissa, therefore, experienced the creation of a religious ground for Buddhism based on Tantracism. The merger of regional deities and the amalgamation of different religious and cultural faiths in the Bengal region were the reasons for the slow intervention of Hinduism in the early medieval period. This paper attempts to study the resultant changes in prominent religious practices, their purpose in society, and their development. It will also problematize the issue of interconnectedness among several religious performances to understand their origin and significance. This paper will also discuss the changes in the genre of literature and the historical understanding of the changing circumstances in which the text or parallel texts were composed and performed.

Keywords: Dharma Thakur, Gājan, Charakpuja, Mara Khela, Gaudiya, Satya-pir, Mohima Dharma

Scanned with OKEN Scanner

1. Introduction

In the history of Indian culture, spirituality, and intellect had an important base as an ultimate source of knowledge. Vedic texts essentially formed the foundation for everything that evolved into a complex socio-religious phenomenon in India.[lv] J. Gonda believed that the wide range of customs and beliefs in many of the cultural provinces of India, as well as in many of the perspectives on historical events and relationships, demonstrate the awareness of continuity. Modern orthodox faiths assert that an early religious legacy persists, modified, purified, and tailored to meet the needs of succeeding generations. This idea of continuity with responsible factors has been explained by Maurice Phillip in his book 'Evolution of Hinduism', where he has discussed in detail the stages of the advancement of Hinduism. In his text, Maurice has emphasized various Indian philosophies and their contribution to Hinduism, giving it a wider and more compounded religious shape.[lvi] According to him, there was a disintegration of Vedism as well as a reaction of Brahmanism to the influence of Buddhism.[lvii] So the change in the religious process was both due to internal and external factors. In historiography too, there is an emphasis on how Buddhism had a larger impact on religious ideas and their process of change. With the advent of new philosophies and a significant amount of external influence, there was a process of intermingling and amalgamation of different cultural ideas. This process included indigenous cults and practices, and a transition of religious ideas took place with the help of regional culture and language.[lviii]

2. Religious traditions in Early Medieval Bengal

Bengal in the post-Gupta phase had a greater influence of the Buddhist Tantra on social groups and gender.[lix] This can be helpful to understand the later developments of writings and religious beliefs in Bengal. Given the significant influence of

Scanned with OKEN Scanner

Buddhism, the compositions of Puranas and Upapuranas in Bengali became crucial for intentional homogenization.[lx] Quoting M.N. Srinivas, Kunal Chakrabarti mentions the social aspects of Sanskritization as both facilitating social mobility and the process of cultural integration.[lxi] Defining it as a tradition involving the mutual interaction of dominant and local cultures, it has been further defined as a two-dimensional interaction where the dominant had its sociocultural influence on the local tradition, and the local traditions were also providing content for its amalgamation with the dominant one.[lxii]

Another important aspect of studying religious perspectives in the past is the study of religious patronage through charters or grants. In this context, examining copper plate charters of a specific rule aids in comprehending the patronage that a ruling class provides. The study of the nature of religious patronage and its transition within a period helps us understand an existing religious process and its recipients. It also helps in understanding the different practices that developed around such religious patterns. Studying these texts specifically can justify the impact of such patronage on the religious writings and literary culture of the period. The earlier works on ancient Indian charters or land grants addressed many of these aspects, specifically discussing their impact on society and state formations.[lxiii] Later research incorporated the study of its impact on other aspects of society. A very important field of study that benefited from it is religious study because the study of a charter or land grant for a particular region also defines the nature of the patronage given to the recipients.[lxiv]

3. Political background and religious developments

By examining it through the lens of previous literature, we can discern a persistent change in the character of religious patronage. The religious patronage during the

Scanned with OKEN Scanner

transitional phase of Bengal had a direct and indirect involvement of the ruling or subordinate class. The ruling class had little to do with the religious faith of their dynasty.[lxv] However, the pattern of religious patronage to the donee under the Pāla and Sena rule is different from the earlier rulers. The Pala and Sena experienced a notable difference from the Gupta rulers, who issued land grants through local administrative officers under the king. During this time, the majority of the donors were local rulers, and the recipients were brāhamanas who immigrated from other regions. In south-east and south-west Bengal, there was a similar pattern in the sixth and seventh centuries records, where almost all the land grants were by the subordinate chiefs in favour of brāhmanas as recipients.[lxvi] During Pala rule, we find a gradual shift of donors from subordinate chiefs to the king themselves. The beneficiaries, or donee, were the individual brāhamanas; according to records, almost all of them were emigrants of other grama. The ruling class needed this particular situation to legitimize their rule. To attain this, brāhamanas were brought and given grants. So, the shift in patronage was to gain the legitimacy of the subjects and establish control over different regions.[lxvii]

This has also been defined as Pala's religious pluralism, an attitude of inclusiveness where all Hindu beliefs were given respect.[lxviii] Early Buddhist rulers of the Pala dynasty specifically gave charters and land grants to Vihara or Viharika (Buddhist monasteries) that they individually built. Charter records indicate that monasteries and temples in North Bengal initially received land grants between the eighth and twelfth centuries, with the donors hailing from the subordinate class. Further, the data on land grants shows that after the rule of Gopala II, there was a shift in religious patronage where both the donors and the recipients changed. The king becomes the donor, and the emigrant individual brāhmanas becomes the recipient.[lxix] The land grant records of Sena rulers of the north, western, central, and southern

Scanned with OKEN Scanner

parts of Bengal had a similar nature of religious patronage, where almost all the land grants were by the king to the emigrant brāhmanas.[lxx] It was the religious and social culture of Bengal before the establishment of Brahanism and their pluralistic religious attitude that was responsible for their survival in the later phase.[lxxi] During Pala rule, there was inter-religious harmony, and the indigenous people and Buddhism lived harmoniously. This flexibility and the religious-social culture emerging out of it were the reasons why Pala rulers were chosen and continued for many centuries.[lxxii]

4. Religious Writings in Bengal

The religious belief that emerged around the god Dharma in Bengal is bound to a limited role and does not invade the cosmic evolution and dissolution process.[lxxiii] Since Buddhism, as an elaborate religious belief, was the first religious connection established with Bengal, under the four centuries of the Buddhist rulers, it acquired the patronage needed. So, from the 10th century C.E. onwards and till the 12th century C.E., some parts of Bengal experienced the creation of a religious ground based on Mahāyāna and Hinyanā Buddhism. Later, Hinyāna belief gained a liberal outlook, and from the 10th century onwards, it gained an esoteric influence, which helped in the development of ideas based on Tantra. The new thoughts and beliefs based on Tantracism are Vajrayana, Kalchakrayāna, and Sahajayāna. Out of these, Vajrayāna and Sahjayāna belonged to Bengal.[lxxiv]

The Pala rulers gave patronage to Bengali literature and numerous genres of writings emerged in Bengal. The Charyapada, written between the 8th and 12th centuries by the Siddhacharyas, or the teachers of the mystic are considered as initial development of the Bengali literary culture. It focuses on the esoteric doctrine, yogic theories, and Sahjayana practices.[lxxv] The liturgical texts Sūnyapurān and Dharmapujavidhān of Ramai Pandit were written in early medieval Bengal. In these writings god is described as formless, stainless, supreme, and the creator of all.[lxxvi] These texts narrate the story

Scanned with OKEN Scanner

of a supreme god Dharma Thakur who is also mentioned as Nirajana. The first text, Sūnyapuran, is dedicated to the worship of Dharma Thakur (also known as Dharmaraj and Dharma), a Hindu deity of death and justice. Worshipped in Bengal as a special village god, Dharma Thakur has some similarities with the later Buddhist religious ideologies. The second text, Dharmapujavidhān, is more on the Dharma worship and its association with Shaivism and Vaishnavism. There are numerous references to covering deities which includes almost all the Hindu gods and goddesses.

4.1Religious Performances in Bengal

Gājan

Gājan[lxxvii] is an important religious festival in Bengal. It is celebrated for twelve days preceding Visuvat, the spring equinox, during the dark fortnight of Chaitra (the month of March or April). This festival is in praise of Dharma Thakur, who is associated with fertility and healing among the lower caste, the Doms.[lxxviii] The image of God is identified with sila, a black round stone with metallic eyes, and equally important are the terracotta animal figurines used in the worship. Before the performance, all the participants accept the clan of Dharma. This ceremony of acceptance is termed gotra dharan. All the participants who accept the gotra of Dharma Thakur follow the prescribed food habits and clothes during the festival. This phase of religious ceremony for the one who accepts the clan of Dharma is called sanyās, and the performers are called sanyasi.[lxxix] It includes a copper ceremony (tamra sanskār), as mentioned in the liturgical text, Sūnya Puranā.

Aadya anaday devi noilen sthiti |

Jatha hoite pandit hoilo upasthiti ||1

Man pawan kalpana maya |

Aadi anadi Niranjan aadyakaya || 2

(Sūnya Puranā, p. 136)

Scanned with OKEN Scanner

These lines are in the chapter Ath Tamra Dharan. It narrates the process of the copper ceremony to include one and all who disclaim fantasy and desire and purify their minds. The poem mentions the process of converting a devotee into the clan of Dharma and the participation of all five priests to control and relieve the feelings of desire, attachment, and illusion in the devotee.

Apawitra tamrake pawitra ke kelo |
Bisai Boliya gosain honkar padilo ||4
Aasiyat wishwakarma dilo darshan |
Aagya koro gosain kono prayojan ||5
Sun bacha Wishwakarma bhoger gua khaye |
Chari wanner tamra gathan kori dey ||6

(Sunya Puran, p. 116)

For the purification of the tamra, god Vishwakarma[lxxx] appears and performs the smelting (tamra sanskār). At this point, the officiant proceeds with a series of invocations followed by the formulas of the dejāsi, who call Dharma in chorus to attract him.[lxxxi] This purification process is still in continuity, where the copper bracelet or ring is offered as a rite of passage to conversion.[lxxxii] This is followed by Khelā (games), also mentioned in the text, Sūnya Puranā. This game includes a procession and the piercing of body parts with metal arrows or vegetable fibers. It is similar to the reference to self-sacrifice mentioned earlier, where, to please Dharma Thakur and for the blessings of offspring and victory, Ranjabati and her son Lausen performed it. The most important part of the festival is the carak puja (hook swinging). In this puja, the sanyasis hang themselves by piercing their skin through metal hooks and swinging their bodies from a platform suspended on a pole called a carak gāch. There is a reference to marā khela too, but it doesn't appear to be confirmed in any ritual manual.[lxxxiii] With time, we find some changes in the religious ceremonies

Scanned with OKEN Scanner

where the object of worship is in continuity but the process of religious performance has changed. Many of the processes not mentioned in the text were put into practice, which justifies the transition in the religious process.

There has always been a connection between the story of Sristi Patan in Sūnya Purānā and the religious performance of Gājan. In the fifth part of the chapter, after the birth of Brahma, Vishnu, and Siva, all three gods dedicate themselves to asceticism when Dharmaraj meets them in the form of a corpse. After their birth, all three gods were without eyes and were sitting in meditation for the auspicious sight of their deity, Dharma. Floating on water, the corpse form of god Dharma reached Bramha and Vishnu, who unknowingly let it float in the water. Later, the corpse reached Siva, who recognized him and was blessed with three eyes, Trilochana. With the gift of sight, Siva sang in praise of Dharmaraj and requested that he bless his brothers with the blessings of sight. Dharmaraj, after blessing all of them, turned toward Adyasakti. He says that being of the female gender, she will conceive all the living beings, and Siva (Mahesh) will marry her in her next life.

He rūpe kara chisti kahi ji tumhare |

Mahesh Kariba bibhā janma janmāntare ||221

(Sūnya Puranā, p. 22)

Supreme gave the responsibility of the world to four of them and then sat on Ulluk(bahan or vehicle) and remained suspended in the void.

Chari janāa sristi bhār dila parātpar |

Ullūk āsane rahu sūnyar upar ||224

(Sūnya Puranā, p. 22)

In the text, Sūnya Puranā, we can see a shift of worship from Dharma to Saiva observance. In the mangal kavya literature, there is a reference to the marriage of Siva,

Scanned with OKEN Scanner

and in the Gājan, he is worshipped as a ploughman deity. In Gājan, Siva is linked with the fertility cycle of the earth. Gājan represents what is shared and common among the people of the same land, ignoring their caste and status.[lxxxiv] It is an act of mass participation based on the worship of the ānchal god, Dharma. Mass participation and religious performance are crucial components in the study of the local areas. It is based on stage performances dedicated to the glory of a religious cult where performers, through their religious acts, prey on the health, economic well-being, and happiness of the entire community.

Charakpuja; Mara Khela in Bengal

The performances at the end of Gajan called the 'dance of the death', mara khela (playing with the corpses). This practice emerged around the worship of Dharma Thakur, gradually shifted to the worship of lord Shiva. This shift with the efforts to bind the practice in sastric perceptions is quite evident from the text 'Dharmapuja Vidhan'. The language and the pattern of writing with the use of chalit bhasha (modern Bengali), suggests indicates the impact and imposition of the dominant culture on the trible or local culture.[lxxxv] The practice of playing with the corpses is considered as an essential act to please Dharma Thakur and the performers perform it with dissatisfaction because of administrative restrictions implemented for hygiene reasons.[lxxxvi] The belief developed around it considers it an act to please the ultimate or supreme god for the welfare of the society. It is also believed that these performances with the help of the dummies, instead of the act of self-sacrifice, conducted nowadays are done just to fulfil religious responsibility. The common belief is that such offerings are accepted only when these are performed with real corpses. The performers seek the urgency of these acts in real form during natural disasters and the set of beliefs that has developed around agricultural practices considers that during the time of famine and drought, it is necessary to perform that act in its real form to ease the society from the fear of the sacred.[lxxxvii]

Scanned with OKEN Scanner

Gaudiyā Vaishnavism in Bengal

Vaishnavism in Bengal is associated with Chaitanya Prabhu, born in Navadwip in 1485.[lxxxviii] In his early life, Chaitanya was inspired by Ishwara Puri in Gaya and got motivated towards spirituality. Ishwara Puri was a Buddhist monk of Madhav Sampradaya. His ideas helped Chaitanya become an emotional mystic.

> The first sprout of the desire tree of devotion was manifested in the person of Shri Madhavendra Puri, and that sprout developed into a sapling in the person of Shri Ishwara Puri. Then, in the person of Shri Chaitanya Mahaprabhu, who was also a gardener himself, the sapling became the trunk of an enormous tree—the desire tree of devotion
>
> (Chaitanya Charitamrita Adi, 9. 10–11)

The beginning of 'Samkirtana', where the name of Lord Krishna (Incarnation of Vishnu) was chanted with singing and dancing, was the assertion of the public right of freedom for divine worship.[lxxxix] After receiving his spiritual teachings, Chaitanya took on the responsibility of religious teaching and established a Sanskrit school called 'tol' in Nawadwip.[xc]

After accepting sannyasa and renouncing the pleasures of life, Chaitanya started sermonizing the religious belief of Krishna bhakti and developed his idea of Vaishnavism. This later consolidated the philosophy of Achintya-bheda bhed vada, the association of Chaitanya with Madhva, and his philosophy with 'Sampradaya'. From the 10th to the 12th centuries, there is a change in the story of Krishna, where, from an incarnation of god, Krishna becomes god himself, and his worship develops on the belief in a final union with god through passion.[xci] Final union, or embracing beloved and renouncing material aspects, is the core belief and symbolizes one's ignorance of social existence and disregard of norms of morality.[xcii] Love for

Scanned with OKEN Scanner

Krishna elevates a romantic union to a divine aspect, arousing the faith of Vaishnavism and serving as a path to salvation.[xciii] The component of parakiya, love for other women or married women, emphasizes the denial of everything that comes between the ultimate union. This idea of love and union provided a new platform for religious belief, spiritualism, and a corpus of cultural and religious pursuits in Bengal.

4.2 Religious Practices in Orissa

Satya-pir

In Orissa, in the southeast corner of the Jagannath, the image of Vishnu, who holds a conch, a wheel, a club, and a lotus, is worshipped as Satyanarayan. To attract the masses here, only the name has been changed. The popularity of Satya-Pir in Orissa might have been exploited in this way in the seventeenth and eighteenth centuries. The entire story of the birth of Satya-Pir is described in the Skanda Purana and the pala[xciv] of Srikavi Pandit, Sitaram Das, and Kavikarna. People accepted Satyanarayan as one of the Trinaths. Later on, he was identified as Jagannath. This is purely to enhance the glory of Satya-Pir. [7]

In the Orissa state Gazetteer, it has been recorded that diverse forms of ballad singing originated in Bengal and spread to Orissa during the 17th-century Muslim rule. This phenomenon is closely linked to Satya-Pir, a cult that may have been established to promote Hindu-Muslim unity. Kavi Karnapura has written sixteen palas for the efficacy of worshiping Satya-Pir, each with different stories. It is true that after the puja, the pala is sung by a band of singers and musicians. The band uses mridanga and symbols as accompanying instruments. Gradually, it got rooted in the soil of Orissa. Medieval Oriya musical poetry entered its domain, making it more literary than musical. Here music and poetry got married, while in its original form, it remained associated with the worship of Satya-Pir with the singing of Bengali pala.

Scanned with OKEN Scanner

Pancha Sakha Dharma and Mohimā Dharma in Orissa

With the assimilation of the later Tantric beliefs of Buddhism and Vaishnavism (Gaudiya), the Sahajiya cult of Vaishnavism emerged as Pancha Saktā in Bengal and Alekha Mahima Dharma (Fig.3,4) in Odisha.

Nāgāntak Vedāntak Yogāntak jete |
Nānāproti Vidhire Kohile toi chite ||
Goraksanathanka vidya viransinha Ajna |
Mallikanathanka yoga Bauli pratijna ||
Lohidas kapilanka saksimantra jete |
Kahile je jemanta se hoichhi gupte ||

(Sūnya-Samhita, Ch-X)

These lines of Sūnya Samhita, written by Santakabi Achutananada Das in the Odiya language, narrates the secret existence of later Buddhist schools, including 'Nagantak' following Nagarjuna, Vedantak, and Yogantak or Yogacharya.[xcv] Though practiced in a hidden form, all the sects mentioned in this text represent the tantric philosophy in Orissa during the sixteenth century. The acceptance of this belief was due to the esoteric practices of devotion responsible for the massive interest among the common population.[xcvi] Other writings also mentioned the popular worship of the Panch Dhyani Buddhas in Odisha during this period.[xcvii]

During the rule of Prataparudra[xcviii], Chaitanya visited the temple of Jagannath in Orissa[xcix] and settled in Puri for the rest of his life. In the final eighteen years of his life, Chaitanya fortified the Vaishnav belief in Puri, and his intense devotion and religious ecstasy solidified his image as the incarnation of Lord Jagannath.[c] This entire development can be kept congruent with the religious developments of the

Scanned with OKEN Scanner

local cults of Bengal. A similarity of persecution, suppression, and transition toward the Vaishnav religion is quite evident with the continuity of the earlier religious credence. The result was the robust Vaishnavite movement, which developed around Lord Jagannath.

The Panch Sakha cult developed around the devotional poetry of five illustrious Vaishnav poets in Orissa. Achyutanand Das, Balram Das, Jagannath Das, Ananta Das, and Yasovanta Das sang the glories of Krishna.[ci] The works of Achyutanand, Balram, and Jagannath are of high emotional spirituality. Sūnya Samhita, Gupta Gita, Siddhanya Dambari, Vishnugarbha Purana, Dharma Gita, and Stuti Bhajans are the important writings on Sūnyata and the theory of the void's incarnation. Achyutananda had numerous influences from Gurus, and he developed his belief in Sūnya, the attributeless supreme god. After pilgrimage to sacred places, he returned to Puri and, with four of his contemporaries, initiated the new religious movement. The new movement resulted from the merger of the spiritual practices of Vaishnavism, Buddhism, and Tantricism.[cii]

Mohima Dharma was a religious belief founded by Mukund Das, also known as Mohima Swami or Gosain. A saint of Brahmin origin with the influence of Buddhism, Mukund Das, helped in the emergence of this belief in Orissa in the late nineteenth century. It is an obscure religious belief against idol worship. It propagated the idea of a formless indigenous god.[ciii] A belief based on the idea of complete submission to Alekh Brahma for the transmigration of the soul became a popular faith among the common man of Orissa. [civ]

5 Conclusion

In all the religious performances of medieval Bengal and Orissa, there were some similarities and continuities with the early medieval religious texts written in Bengali. All the religious practices were based on a similar pattern i.e. the worship

Scanned with OKEN Scanner

of local deities, specifically of the Dharma cult, revered by peasants and lower working classes. However, there were important variations too. In the early medieval period Upapurana-S*ū*nyapur*ā*n written in Bengali, there were stories of Dharma Thakur and religious performances of Gajan, Charakpuja and Mara khela were based on them. In these performances, the idea of the supremacy of Dharma Thakur over all other Puranic Gods and Goddesses was evident. This remained the case during the Pala rule when the donors were regional heads and the donees were the religious centers. During the Sena rule, however, the rulers became the donors and donees were those Brahmins who were brought in from other regions. This change impacted the socio-religious arrangements which was reflected in the individual renditions of the religious performances. They exhibited the changed circumstances of their creation. A similar tendency can be seen in the religious performances of Orissa too, where the idea of the supreme deity gradually shifted to the religious performances praising Shaivism and Vaishnavism. The earlier practices that had developed here were Gaudiy*ā* Vaishnavism, Satya pir, Panchasakha, and Mahima Dharma. Dharmapujavidh*ā*n, as a religious text, exemplifies this shift since it was written in praise of Hindu Gods and Goddesses. It showed the influence and acceptance of the dominant Brahmanical religious writings on the lower classes.

With time, it can be reasonably said, that the older and more widely known texts were modified and used in regional religious performances. During this transmission, the religious practices of Bengal and Orissa underwent change. The performers used the texts with some additions and not surprisingly, applied the simplified versions of the complex verses of early medieval Bengali literary texts.

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Navigating Economic Growth: Unravelling the Influence of FDI, Exports and GDP Deflator in India through VECM and Granger Causality Analysis

Vipul Singh

Assistant Professor,

Department of Economics, Hemvati Nandan Bahuguna Garhwal Central University,

Aprajita Kimta

Ph.D. Research Scholar,

Department of Economics, Himachal Pradesh University Shimla.

Bipin Kumar

Assistant Professor,

Department of Economics, Hemvati Nandan Bahuguna Garhwal Central University,

Sapna Semwal

Assistant Professor,

Department of Geography, Hevati Nandan Bahuguna Garhwal Central University,

Abstract: The primary goal of this research is to thoroughly investigate the relationship between Economic Growth, Foreign Direct Investment (FDI), Exports, and GDP Deflator in the Indian context. The research utilises data from reliable sources such as Statista, Macro Trends, and the Reserve Bank of India (RBI) from 2001 to 2022. It employs advanced econometric techniques like the Johansen Cointegration Test and Granger Causality Test to analyse the dynamics of these economic variables. The results of the Johansen Cointegration Test reveal a strong and long-lasting connection between Economic Growth and the combination of Foreign Direct Investment (FDI), Exports, and GDP Deflator over a prolonged

Scanned with OKEN Scanner

period of time. Nevertheless, the Granger Causality Test results provide a contrasting depiction, suggesting a lack of statistically significant causal connections between these variables. These contradictory results highlight the intricate nature of economic processes and stress the need of implementing comprehensive approaches in the formation of economic policies. It indicates that policies designed to encourage Economic Growth, attract FDI, and promote Exports should include wider aspects such as domestic investment, human capital development, and institutional quality. Furthermore, placing a high priority on improving exports and strategically attracting foreign direct investment (FDI) in industries with technology gaps are crucial methods for promoting economic growth in India. Overall, this research enhances our comprehension of the relationship between Economic development, Foreign Direct Investment (FDI), Exports, and the GDP Deflator in India. It emphasises the need for comprehensive strategies to promote long-lasting economic development in the nation.

Keywords: VECM, Economic Growth, FDI, Exports, Granger.

Jel Code- F21,C32,E31.

Introduction

Economic growth stands as a pivotal aspect of national development, reflecting the collective aspirations and endeavours of a nation towards prosperity and welfare enhancement. Within the context of India, a burgeoning economy with a diverse array of challenges and opportunities, understanding the intricate dynamics governing economic growth becomes imperative. In the complex tapestry of India's economic landscape, the threads of economic growth, foreign direct investment (FDI), exports, and the GDP deflator are interwoven, shaping the nation's trajectory towards prosperity. Against the backdrop of a rapidly evolving global economy and domestic imperatives for development, understanding the dynamics of these variables becomes paramount. This paper embarks on a meticulous exploration of

Scanned with OKEN Scanner

their relationships, employing sophisticated econometric tools to unravel the intricate web of influences and causations that define India's economic journey. India's economic narrative over the past few decades has been one of transformation and transition. From the era of planned development to the landmark reforms of the early 1990s, the Indian economy has undergone a paradigm shift towards liberalization, globalization, and market-oriented policies. These reforms unleashed a wave of dynamism, opening up the economy to foreign investment, trade, and technological advancements. Consequently, FDI emerged as a potent force driving economic growth, bringing in capital, expertise, and technology to fuel various sectors of the economy. The significance of exports in India's growth story cannot be overstated. As a large and diverse economy, India possesses a vast reservoir of human capital, natural resources, and entrepreneurial energy. Export-oriented policies have enabled the country to leverage these strengths, tapping into global markets and enhancing competitiveness across sectors. However, challenges such as infrastructural bottlenecks, regulatory hurdles, and global market volatility have necessitated a strategic approach towards export promotion. Meanwhile, the GDP deflator, as a measure of inflation, serves as a critical barometer of macroeconomic stability and purchasing power. Inflationary pressures can erode the real value of output and disrupt consumption patterns, posing challenges to sustainable economic growth. Against this backdrop, understanding the dynamics of the GDP deflator and its interaction with other economic variables is essential for policymakers in crafting effective monetary and fiscal policies.

As of the current period, India finds itself at a crossroads, grappling with a myriad of challenges and opportunities on the economic front. The COVID-19 pandemic has inflicted significant disruptions, disrupting supply chains, dampening consumer demand, and stalling economic activities. While the Indian economy

Scanned with OKEN Scanner

exhibited resilience in weathering the initial impact of the pandemic, the road to recovery remains fraught with uncertainties. FDI continues to play a pivotal role in India's economic resurgence, albeit amidst shifting global dynamics and evolving investment patterns. The government's push for 'Make in India' and initiatives to improve the ease of doing business have bolstered investor confidence, attracting FDI inflows across various sectors. However, structural impediments such as bureaucratic red tape, regulatory inconsistencies, and infrastructural deficiencies pose challenges to realizing the full potential of FDI inflows. On the export front, India has made significant strides in diversifying its export basket and tapping into emerging markets. Sectors such as information technology, pharmaceuticals, and automotive components have emerged as export powerhouses, contributing substantially to foreign exchange earnings and employment generation. Nevertheless, the looming spectre of protectionism, trade disputes, and supply chain disruptions underscores the need for a strategic reorientation of export policies. Amidst these dynamics, the GDP deflator assumes renewed significance as policymakers navigate the delicate balance between inflation management and growth promotion. The Reserve Bank of India (RBI) has adopted a prudent approach towards monetary policy, balancing the imperatives of supporting growth while ensuring price stability. However, persistent inflationary pressures, fuelled by supply-side constraints and global commodity price fluctuations, pose challenges to the central bank's mandate. In light of these developments, the analytical framework adopted in this paper assumes heightened relevance. By leveraging advanced econometric techniques such as the Vector Error Correction Model (VECM) and Granger causality analysis, the study seeks to disentangle the complex relationships among economic growth, FDI, exports, and the GDP deflator. The VECM facilitates the identification of long-term equilibrium relationships and short-term dynamics among the variables, offering insights into

Scanned with OKEN Scanner

their interdependencies and adjustment processes. Similarly, the Granger causality analysis provides a deeper understanding of the directional causality between the variables, shedding light on the temporal precedence and predictive power of one variable over another. In doing so, it elucidates the pathways through which FDI, exports, and inflationary pressures influence economic growth and vice versa. This paper endeavours to deepen our understanding of the intricate nexus between economic growth, FDI, exports, and the GDP deflator in the Indian context. Against the backdrop of a rapidly evolving economic landscape and the imperatives of sustainable development, unravelling these relationships assumes critical importance. By leveraging advanced econometric techniques and drawing insights from the current economic scenario, the study seeks to provide actionable insights for policymakers, stakeholders, and practitioners. In doing so, it aims to contribute to informed decision-making and the formulation of policies that foster inclusive and sustainable economic growth in India.

Review of Literature

Understanding the intricate dynamics that underpin economic growth is essential for gaining insight into India's economic landscape. This comprehension particularly focuses on the multifaceted relationships among foreign direct investment (FDI), exports, GDP growth, and inflation, as gauged by the GDP deflator. A comprehensive literature review seeks to delve deeply into these connections, drawing from a wide array of studies to offer a holistic understanding. Foreign Direct Investment (FDI) has garnered recognition as a pivotal driver of economic growth in India over the years. The correlation between FDI inflows and economic growth is established as positive and enduring. The influx of FDI capitalizes on various fronts, bolstering productivity, catalyzing technological advancements, and augmenting export competitiveness. Consequently, it serves as a linchpin for overall economic expansion. The imperative here lies in fostering an

Scanned with OKEN Scanner

attractive investment environment to lure FDI, which injects not just capital but also crucial technology and managerial know-how into the economy's fabric (Kumar and Pradhan 2020). Equally significant are exports, which wield considerable influence on economic growth dynamics. Their contributions extend beyond generating foreign exchange to encompass expanding market horizons and stimulating domestic production. The relationship between exports and economic growth in India is a complex one, characterized by bidirectional causality. Policies tailored to boost exports are deemed instrumental in fostering sustainable economic development by propelling economic growth and broadening export markets (Mishra and Sahu 2019). This underscores the necessity for strategies such as trade liberalization, export promotion schemes, and targeted investments in export-oriented sectors. Inflation, gauged through the GDP deflator, emerges as a critical determinant of economic growth. Elevated inflation rates can impede economic expansion by eroding purchasing power and distorting investment patterns. Hence, adept management of inflation assumes paramount importance to uphold price stability and sustain the momentum of economic growth through judicious monetary and fiscal measures (Banerjee et al. 2018). The interplay among FDI, exports, GDP growth, and inflation adds layers of complexity to India's economic dynamics. While bidirectional causality exists between FDI and economic growth, as well as between exports and economic growth, the relationship between inflation and economic growth is less straightforward. Studies suggest that inflation, as proxied by the GDP deflator, may not exert a significant direct causal impact on economic growth in the Indian context (Chakraborty and Das 2021). Furthermore, long-term cointegration among these variables underscores a stable relationship over time. The consensus among studies highlights the affirmative influence of FDI and exports on India's economic growth trajectory. However, the interplay between inflation and economic growth appears

Scanned with OKEN Scanner

nuanced and context-dependent (Ghosh et al. 2017). These insights offer policymakers invaluable guidance in crafting strategies for fostering sustainable economic development. This entails prioritizing measures to attract FDI, promoting export-oriented policies, and adeptly managing inflationary pressures. By grasping the intricate dynamics among these variables, policymakers can formulate targeted interventions to nurture inclusive and sustainable economic growth in India. In sum, the synthesis of various scholarly perspectives elucidates the complex tapestry of factors that shape India's economic landscape. Each element – FDI, exports, GDP growth, and inflation – plays a distinct yet interconnected role in driving economic progress (Chakraborty and Das 2021). Acknowledging the interdependencies and nuances within these relationships is crucial for devising effective policy frameworks that steer the nation towards sustained prosperity. Through meticulous analysis and strategic foresight, policymakers can navigate the intricacies of India's economic dynamics and chart a course towards inclusive growth and development.

Objective of the Study

The objective of the study is to investigate the long-term relationship and dynamic interactions among Economic Growth, Foreign Direct Investment (FDI), Exports, and GDP Deflator in the context of the Indian economy.

Methodology

The methodology portion of this article provides a clear outline of the analytical framework used to study the link between Economic Growth, Foreign Direct Investment (FDI), Exports, and GDP Deflator. It describes the sequential processes required to conduct the investigation. The approach involves the use of diverse econometric tools, such as ADF, cointegration analysis, Vector Error Correction Model (VECM), Vector Autoregression (VAR), and Granger Causality Test. The data utilized in this study is sourced from reputable institutions including Statista,

Scanned with OKEN Scanner

Macro Trends, and the Reserve Bank of India (RBI), covering the period from 2001 to 2022.

The Augmented Dickey-Fuller (ADF) approach is a commonly used econometric technique used to evaluate the stationarity of a time series variable. The foundation of this approach is that time series that are not stationary have trends or random fluctuations that make meaningful analysis difficult. The ADF test determines if a particular variable exhibits a unit root, indicating non-stationarity, or whether it is stationary. The enhanced version of the Dickey-Fuller test incorporates autocorrelation and lagged data in the analysis, hence improving its robustness. The test entails doing a regression analysis where the variable is regressed on its previous values and potentially on the variable itself after differencing. The aim is to assess the significance of the coefficient linked to the delayed variable. If the coefficient is statistically significant, showing a value that is not zero, it means that the null hypothesis of the existence of a unit root cannot be rejected. This suggests that the data is non-stationary. On the other hand, if the coefficient is not statistically significant, we accept the null hypothesis of stationarity. If the variable is determined to be non-stationary, taking the initial difference may make it stationary, making it easier to do additional research. Hence, the ADF approach serves the purpose of assessing the stationarity of the variable and providing guidance on the necessary transformation for further econometric modelling. According to analysis(Table 1), the ADF test verifies that our variable achieves stationarity when taking the first difference. This enables us to conduct a legitimate and dependable examination of its behaviour and its interactions with other variables.

Table 1 Augmented Dickey-Fuller Unit Root Test Analysis

Variables	Augmented Dickey-Fuller Unit Root Test	
		At Level and First

Scanned with OKEN Scanner

		Difference
Economic Growth	T stat	-4.500603(I1)
	Prob value	0.0023
FDI	T stat	-4.120306(I1)
	Prob value	0.0051
GDP Deflator	T stat	-4.322019(I1)
	Prob value	0.0033
Exports	T stat	-3.605281(I1)
	Prob value	0.0153

Cointegration pertains to the stable and balanced connection over a long period of time between variables that do not exhibit a stationary behaviour. In economic and financial settings, this means that although individual variables may show trends or random changes, there is a consistent link between them across time. Cointegration analysis seeks to find stable correlations that are crucial for comprehending the underlying economic dynamics and generating significant predictions. A commonly used method for cointegration analysis is the Johansen Cointegration Test, which assesses the stationarity of linear combinations of the variables.

The Vector Error Correction Model (VECM) is a frequently used multivariate time series model for the analysis of cointegrated data. This approach expands on the idea of cointegration by considering both the immediate changes and the long-term balance between the variables. In a Vector Error Correction Model (VECM), the variables are represented in terms of their deviations from the equilibrium level, as well as the rate at which they return to equilibrium after a shock.

Scanned with OKEN Scanner

Δ Economic Growth$_t$ = α+ Γ_1 ΔExports$_{t-1}$ + Θ1 ΔFDI$_{t-1}$ + Λ1 ΔGDP Deflator$_{t-1}$ + ε_t

The coefficients Γ1 , Θ1 , and Λ1 capture the long-term relationships between Economic Growth and each of the independent variables. Specifically, Γ1 signifies the impact of one-period lagged changes in Exports on Economic Growth, Θ1 signifies the impact of one-period lagged changes in FDI on Economic Growth, and Λ1 signifies the impact of one-period lagged changes in GDP Deflator on Economic Growth. These coefficients represent the adjustment of Economic Growth towards its long-term equilibrium level in response to changes in Exports, FDI, and GDP Deflator. A positive coefficient indicates that an increase in the respective variable leads to a corresponding increase in Economic Growth in the long run, while a negative coefficient indicates the opposite.

After verifying that the variables are individually non-stationary yet cointegrated, study use the VECM model to represent the long-term equilibrium linkages among Economic Growth, Foreign Direct Investment (FDI), Exports, and GDP Deflator in our research. By including the initial change of the variables into the model, guarantee that they achieve a state of stability, enabling accurate estimate and interpretation of the VECM parameters. The VECM model incorporates both the interdependencies among variables and guarantees that the model's assumptions, such as stationarity, are satisfied for valid analysis and inference.

The Granger causality test is a statistical hypothesis test used to determine whether one time series is useful in forecasting another. It is based on the idea that if a variable X Granger-causes another variable Y, then the past values of X should contain information that helps in forecasting the future values of Y. The test involves regressing Y on its own lagged values and the lagged values of X, and then testing whether the coefficients of the lagged X values are statistically significant. If they are, it suggests that X Granger-causes Y, meaning that the past

Scanned with OKEN Scanner

values of X provide useful information for predicting the future values of Y. This test is widely used in economics and finance to analyse the causal relationships between time series variables, but it has limitations, such as not accounting for latent confounding effects and not capturing non-linear relationships.

$$GDP_t = \delta_0 + \sum_{i=1}^{k} \delta_1 \, GDP_{t-1} + \sum_{j=1}^{k} \gamma_j \, X_{t-j} + \varepsilon_1$$

$$X_t = \beta_0 + \sum_{i=1}^{k} \beta_1 \, X_{t-1} + \sum_{j=1}^{k} \gamma_j \, GDP_{t-1} + \varepsilon_2 t$$

The research employs a wide range of econometric tools to thoroughly examine the correlation between Economic Growth and the combination of Foreign Direct Investment (FDI), Exports, and GDP Deflator in India, objective is to give strong empirical evidence and significant insights.

Results and Discussion

The findings of the Augmented Dickey-Fuller (ADF) Unit Root Test analysis for several variables, such as Economic Growth, Foreign Direct Investment (FDI), GDP Deflator, and Exports, are shown in Table 1. The analysis is performed using both the levels and first differences of the variables. The test statistic (T stat) for Economic Growth is -4.500603 at the first difference (I1), with a corresponding probability value (Prob value) of 0.0023. This suggests that the stationarity of Economic Growth is statistically significant when considering the first difference level, with a high degree of confidence. Similarly, the T statistic for FDI is -4.120306 (I1) with a probability value of 0.0051, suggesting strong stationarity at the first difference level. The GDP Deflator has a T statistic of -4.322019 (I1) with a probability value of 0.0033, indicating considerable stationarity at the first difference level as well. These findings suggest that these variables have an

Scanned with OKEN Scanner

integration order of one (I(1)), suggesting that they are non-stationary in their original form but become stationary after being differenced once. However, in the case of Exports, the T statistic is -3.605281 (I1) and the corresponding probability value is 0.0153, is not statistically significant.

Table 2 Johansen Cointegration Test Results: Economic Growth and FDI, GDP Deflator & Exports

Hypothesized no. of CE	Test Statistics	0.05 Critical Value	Probability Value
Trace statistic			
None	159.4207	63.87610	0.00
At most 1	85.17361	42.91525	0.00
At most 2	39.79895	25.87211	0.0005
At most 3	11.41553	12.51798	0.0759

Table 2 displays the results of the Johansen Cointegration Test, specifically examining the correlation between Economic Growth and a composite of Foreign Direct Investment (FDI), Exports, and GDP Deflator. The test evaluates the existence of cointegration, which signifies a persistent connection between the variables over a lengthy period of time.

The table presents the test statistics for various hypothesised numbers of cointegrating equations (CE), together with the critical values and probability values at a significance level of 0.05. The Trace statistic is used to assess the null hypothesis that there is no cointegration.

The hypothesis of no cointegration (None) is rejected since the Trace statistic of 159.4207 greatly exceeds the critical value of 63.87610. The probability value associated with the test is 0.00, which strongly supports the rejection of the null hypothesis and suggests the existence of cointegration.

Scanned with OKEN Scanner

When examining the hypothesis that there is at most 1 cointegrating equation, the Trace statistic reduces to 85.17361, which is still higher than the critical threshold of 42.91525. The probability value stays unchanged at 0.00, providing more evidence to support the rejection of the null hypothesis.

In the case of the hypothesis that there are at most 2 cointegrating equations, the Trace statistic drops to 39.79895, which is higher than the critical limit of 25.87211. The likelihood value, however low at 0.0005, nonetheless presents compelling evidence against the null hypothesis.However, after examining the hypothesis that there are at most 3 cointegrating equations, the Trace statistic significantly decreases to 11.41553, approaching the critical threshold of 12.51798. The probability value associated with the data rises to 0.0759, indicating that there is less strong evidence against the null hypothesis compared to earlier occurrences.

Table 3 Johansen Cointegration Test Results: Economic Growth and FDI, GDP Deflator & Exports

Hypothesized no. of CE	Test Statistics	0.05 Critical Value	Probability Value
Maximum Eigen Statistic			
None	74.24709	32.11832	0.00
At most 1	45.37466	25.82321	0.00
At most 2	28.38342	19.38704	0.0019
At most 3	11.41553	12.51798	0.0759

Table 3 displays the results of the Johansen Cointegration Test, specifically using the Maximum Eigenvalue statistic. This test investigates the correlation between Economic Growth and a mixture of Foreign Direct Investment (FDI), Exports, and GDP Deflator. This test assesses the existence of cointegration, which suggests a durable connection between the variables over a long period of time.

Scanned with OKEN Scanner

The table presents the test statistics for various hypothesised numbers of cointegrating equations (CE), together with the critical values and probability values at a significance level of 0.05.

The Maximum Eigenvalue statistic for the hypothesis of no cointegration (None) is 74.24709, which is much higher than the critical value of 32.11832. The probability value associated with the test is 0.00, which strongly contradicts the null hypothesis and suggests the existence of cointegration.

Similarly, when examining the hypothesis that there is at most 1 cointegrating equation, the Maximum Eigenvalue statistic lowers to 45.37466, which is still higher than the critical value of 25.82321. The probability value stays at 0.00, which provides strong evidence to reject the null hypothesis.

When considering the hypothesis that there are at most 2 cointegrating equations, the Maximum Eigenvalue statistic reduces to 28.38342, which is still higher than the critical value of 19.38704. The likelihood value, however modest at 0.0019, offers evidence against the null hypothesis.

Nevertheless, when examining the hypothesis of having a maximum of 3 cointegrating equations, the Maximum Eigenvalue statistic stays at 11.41553, which is in close proximity to the critical value of 12.51798. The probability value associated with the data rises to 0.0759, indicating that there is less strong evidence against the null hypothesis compared to earlier occurrences.

In general, the results from the Maximum Eigenvalue statistic support the findings from the Trace statistic, suggesting substantial evidence of cointegration between Economic Growth and the combination of FDI, Exports, and GDP Deflator, especially when fewer cointegrating equations are included. This highlights the existence of a durable correlation between various economic factors.

Scanned with OKEN Scanner

VAR

GDP(-1)-12.08269+1.509606*EXPORTS(-1)-6.609084*FDI(-1)+9.725969*GDPDeflator(-1)=0

So now, reverse the signs,

GDP(-1)= 12.08269-1.509606*EXPORTS(-1)+ 6.609084*FDI(-1)-9.725969*GDPDeflator (-1)

With the sign reversal, both Exports and GDP Deflator exhibit negative coefficients, indicating that increases in their respective lagged values are associated with decreases in GDP at the current time period. Conversely, the coefficient for Foreign Direct Investment (FDI) shows positive sign, indicating that an increase in FDI at the previous time period continues to be associated with an increase in GDP at the current time period.

Table 4 Results of the Granger Causality Test

Null Hypothesis	Obs	F statistic	P-values
Exports does cause not Economic Growth	20	3.38076	0.0614
Economic Growth does cause not Exports	20	0.18501	0.8330
FDI does cause Economic Growth	20	0.68454	0.5194
Economic Growth does not cause FDI	20	0.10809	0.8982
GDP Deflator does not cause Economic Growth	20	2.10218	0.1567
Economic Growth does not cause GDP Deflator	20	0.23165	0.7960

Scanned with OKEN Scanner

The Granger Causality Test findings between Exports and Economic Growth suggest that there is insufficient evidence to reject the null hypothesis, which states that Exports do not affect Economic Growth. The F statistic is 3.38076 and the p-value is 0.0614. This indicates a lack of substantial evidence to substantiate the idea that Exports Granger directly leads to Economic Growth. On the other hand, when investigating the hypothesis that Economic Growth does not lead to Exports, the analysis produces a F statistic of 0.18501 and a significant p-value of 0.8330, which supports the conclusion that Economic Growth does not have a causal relationship with Exports. Similarly, when analysing the link between FDI (Foreign Direct Investment) and Economic Growth, as well as between Economic Growth and FDI, the null hypotheses remain unchanged. The p-values, which are above 0.05, indicate a lack of sufficient evidence to support the existence of causal relationships in either direction. The analysis of the GDP Deflator and its possible causal association with Economic Growth, as well as the reciprocal relationship, likewise produces non-significant p-values, indicating that neither indicator has a causal influence on changes in the other. These results highlight the lack of statistically significant causal relationships between the variables investigated in the analysed time series data.

In this study, the emphasis is placed on understanding and contextualising the findings gained within the framework of economic theory and the consequences for policy. The research begins by combining the primary results, highlighting the substantial evidence of cointegration between Economic Growth and the combination of Foreign Direct Investment (FDI), Exports, and Gross Domestic Product (GDP) Deflator. Although there is a consistent correlation between these variables, the Granger Causality Test shows that there is no statistically significant causal link between them. This disparity emphasises the intricacy of economic

Scanned with OKEN Scanner

dynamics and emphasises the need for sophisticated analytical methods when studying the interactions between variables in economic systems.

Upon comparing these findings with the current body of research, it becomes evident that whereas several studies may have reported comparable outcomes, others may have established distinct causal connections among economic indices. This variance highlights the diversity of economic situations and emphasises the need of taking into account the unique circumstances of individual countries and historical periods in economic research. Furthermore, the results of the research enhance economic theory by emphasising the relationship between cointegration and causation in comprehending the dynamics of Economic Growth, FDI, Exports, and GDP Deflator.

The results have several ramifications for economic policy. Although cointegration indicates a long-lasting link between economic variables, the lack of strong causal links shows that policymakers should take into account a wider range of elements when developing economic policies. For instance, while encouraging exports and attracting foreign direct investment (FDI) are crucial goals for economic development, policymakers may also need to consider other factors that influence economic growth, such as domestic investment, the development of human capital, and the quality of institutions.

Conclusion

This research offers a thorough examination of the correlation between Economic Growth, Foreign Direct Investment (FDI), Exports, and GDP Deflator in the specific context of India. By using the Johansen Cointegration Test and Granger Causality Test, study obtained significant knowledge on the dynamics of these economic variables.

The findings of the Johansen Cointegration Test suggest a durable relationship between Economic Growth and the combination of Foreign Direct Investment

Scanned with OKEN Scanner

(FDI), Exports, and GDP Deflator over a period of time. This implies that these variables exhibit a positive correlation over a prolonged period, indicating their interconnectedness within the Indian economy. Nevertheless, the Granger Causality Test findings indicate the absence of statistically significant causal connections among these variables, underscoring the intricate nature of economic processes and emphasising the need of meticulously considering various aspects.

These results have significant ramifications for economic theory and policy. Although cointegration indicates a long-lasting link between the variables, the lack of substantial causation emphasises that economic strategies targeting Economic Growth, FDI, and Exports should include other aspects outside these particular variables. When designing policies for sustainable economic growth, policymakers should take into account the wider economic environment, which includes factors such as domestic investment, the development of human capital, and the quality of institutions. The policy implication is to focus on improving exports by eliminating obstacles in the production process, increasing competitiveness, and promoting free trade might play a crucial role in promoting economic development. In addition, the attraction of more Foreign Direct Investment (FDI) to sectors that have technical disparities may lead to the spread of technology and the transfer of knowledge, which in turn enhances labour productivity and output growth. Crucial methods to do this include maintaining a clear and predictable framework for foreign direct investment (FDI) policy, liberalising FDI limitations in important industries, and enhancing the general business climate. India can increase its position in the global market and accelerate economic development by prioritising export promotion and strategically attracting foreign direct investment (FDI).

Ultimately, this research enhances our comprehension of the intricacies surrounding Economic Growth, Foreign Direct Investment (FDI), Exports, and GDP Deflator in India. By emphasising the intricate interaction among various

Scanned with OKEN Scanner

factors, it emphasises the need of embracing a comprehensive approach to economic research and policy development. These results have significant implications for policymakers, scholars, and stakeholders, highlighting the need of implementing comprehensive measures to foster sustainable economic growth in India and other regions.

References

1. Acaravci, A., & Ozturk, I. (2012). Foreign direct investment, Export and Economic Growth: Empirical Evidence from New EU Countries. Romanian Journal of Economic Forecasting, 2, 52–67.

2. Alexiou, C., & Tsaliki, P. V. (2007). Foreign direct investment-Led growth hypothesis: evidence from the greek economy. Zagreb International Review of Economics and Business, 10, 85–97.

3. Baltagi, B. H. (2005). Econometric analysis of panel data (3rd ed.). Chichester: John Wiley & Sons, Ltd.

4. Borensztein, E., Gregorio, J. D., & Lee, J. W. (1998). How does foreign direct investment affect economic growth? Journal of International Economics, 45, 115–135. doi:10.1016/S0022-1996(97)00033-0.

5. Breitung, J. (2000). The local power of some unit root tests for panel data. Advances in Econometrics, 15, 161–177. doi:10.1016/S0731-9053(00)15006-6.

6. Choi, I. (2001). Unit root tests for panel data. Journal of International Money and Finance, 20, 249–272. doi:10.1016/S0261-5606(00)00048-6.

7. Chowdhury, A., & Mavrotas, G. (2006). FDI and growth: what causes what? The World Economy, 29, 9–19. doi:10.1111/j.1467-9701.2006.00755.x.

8. Dickey, D. A., & Fuller, W. A. (1979). Distribution of the estimators for autoregressive time series with a unit root. Journal of the American Statistical Association, 7, 427–431. doi:10.2307/2286348.

Scanned with OKEN Scanner

9. Dickey, D. A., & Fuller, W. A. (1981). Likelihood ratio statistics for autoregressive time series with a unit root. Econometrica, 49, 1057–1072. doi:10.2307/1912517.

10. Engle, R., & Granger, C. W. J. (1987). Co-integration and error correction: representation, estimation, and testing. Econometrica, 55, 251–276. doi:10.2307/1913236.

11. Granger, C. W. J. (1981). Some properties of time series data and their use in econometric model specification. Journal of Econometrics, 16, 121–130. doi:10.1016/0304-4076(81)90079-8.

12. Hansen, H., & Rand, J. (2006). On the causal links between FDI and growth in developing countries.The World Economy, 29, 21–41. doi:10.1111/j.1467-9701.2006.00756.x.

13. Hsiao, C. (2003). Analysis of panel data (2nd ed.). Cambridge: Cambridge University Press.

14. Hsiao, F. S. T., & Hsiao, M. C. W. (2006). FDI, exports, and GDP in East and Southeast Asia – Panel data versus time-series causality analyses. Journal of Asian Economics, 17, 1082–1106. doi:10.1016/j.asieco.2006.09.011.

15. Im, K. S., Pesaran, M. H., & Shin, Y. (2003). Testing for unit roots in heterogeneous panels. Journal of Econometrics, 115, 53–74. doi:10.1016/S0304-4076(03)00092-7.

16. Kao, C. (1999). Spurious regression and residual-based tests for cointegration in panel data. Journal of Econometrics, 90, 1–44. doi:10.1016/S0304-4076(98)00023-2.

17. Katircioglu, S. (2009). Foreign direct investment and economic growth in turkey: an empirical investigation by the bounds test for co-integration and causality tests. Ekonomska Istraživanja,22, 1–9.

Scanned with OKEN Scanner

18. Kersan-Skabic, I., & Zubin, C. (2009). The influence of foreign direct investment on the growth of GDP, on employment and on export in Croatia. EKONOMSKI PREGLED, 60, 119–151.

19. Levin, A., & Lin, C. F. (1993). Unit root tests in panel data: Asymptotic and finite sample properties. University of California, San Diego, CA, Working papers.

20. Levin, A., Lin, C. F., & Chu, C. S. J. (2002). Unit-root test in panel data: asymptotic and finite sample properties. Journal of Econometrics, 108, 1–24. doi:10.1016/S0304-4076(01)00098-7.

21. Lim, E. G. (2001). Determinants of, and the relation between, foreign direct investment and growth: A summary of the recent literature. IMF Working Paper, No. WP/01/175.

22. Maddala, G. S., & Wu, S. (1999). A comparative study of unit root tests with panel data and a new simple test. Oxford Bulletin of Economics and Statistics, 61, 631–652. doi:10.1111/1468- 0084.0610s1631.

23. Makki, S. S., & Somwaru, A. (2004). Impact of Foreign Direct Investment and trade on economic growth: Evidence from developing countries. American Journal of Agricultural Economics, 86, 795–801. doi:10.1111/j.0002-9092.2004.00627.x.

24. Miankhel, A. K., Thangavelu, S. M., & Kalirajan, K. (2009). Foreign direct investment, exports, and economic growth in selected emerging countries: Multivariate VAR analysis. MPRA Paper, No. 22763.

25. Nath, H. K. (2009). Trade, foreign direct investment, and growth: Evidence from transition economies. Comparative Economic Studies, 51, 20–50. doi:10.1057/ces.2008.20.

26. Pedroni, P. (1999). Critical values for cointegration tests in heterogeneous panels with multiple regressors. Oxford Bulletin of Economics and Statistics, 61, 653–678. doi:10.1111/1468- 0084.0610s1653.

Scanned with OKEN Scanner

27. Pedroni, P. (2004). Panel cointegration: asymptotic and finite sample properties of pooled time series tests with an application to the PPP hypothesis. Econometric Theory, 20, 597–625. doi:10.1017/ S026646660420307 3.

28. Singh, V., Karol. S., and Dutt. G (2023). "An Historical Analysis of Principal Exports Sector, Industry 5.0 Integration, Future Opportunities and Challenges", IJHSSM, V 4, I 1, pp:552-560.

29. Singh, V., Sharma, S. and Karol, S (2024), EXPORT INSTABILITY, INVESTMENT, EXPORT GROWTH AND ECONOMIC GROWTH IN INDIA, Journal of Business and Econometrics Studies, V 1, I 2.

30. Tekin, R. B. (2012). Economic growth, exports and foreign direct investment in Least Developed Countries: A panel Granger causality analysis. Economic Modelling, 29, 868–878. doi:10.1016/j.econmod.2011.10.013.

31. Xing, Y., & Pradhananga, M. (2013). How important is exports and FDI for China's economic growth?Grips Discussion Paper, 13–04.

32. Yao, S., & Wei, K. (2007). Economic growth in the presence of FDI: The perspective of newly industrialising economies. Journal of Comparative Economics, 35, 211–234. doi:10.1016/j. jce.2006.10.007.

33. Zhang, K. H. (2001). Does foreign direct investment promote economic growth? Evidence from East Asia and Latin America. Contemporary Economic Policy, 19, 175–185.? doi: 10.1111/j.1465-7287.2001.tb00059.

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Role of Chat GPT in Supporting Students to Complete Media Production Assignments

Bhawna Solanki,
Research Scholar
Department of Journalism & Mass Communication,
Banasthali Vidyapith, Rajasthan
Dr. Lokesh Sharma, Associate Professor,
Department of Journalism & Mass Communication,
Banasthali Vidyapith, Tonk, Rajasthan

Abstract: **The** Iintegration of Artificial Intelligence (AI) tools into education is transforming the way students approach creative tasks in fields like media production. This study examines how ChatGPT, a state-of-the-art AI tool, affects media production assignments' originality, content quality, and efficiency. A total of 120 undergraduate students from Delhi University enrolled in a Media centric course with Media Production as a subject were randomly assigned to two groups: an experimental group (using ChatGPT) and a control group (not using ChatGPT). The study employs a comparative research design to evaluate differences between the two groups in terms of creativity, quality, and efficiency. The Cognitive Load Theory(CLT) serves as the theoretical framework, suggesting that AI can reduce cognitive load, enabling students to focus more on creative tasks. Data were collected through instructor evaluations, project submissions, student surveys, and efficiency measures. Results indicate that the experimental group produced more creative, original, and technically polished work, completing assignments faster than the control group. Additionally, 85% of students using ChatGPT reported positive experiences, appreciating the tool's ability to assist with brainstorming and overcoming writer's block. The findings highlight the potential of Artificial

Scanned with OKEN Scanner

Intelligence, particularly ChatGPT in enhancing creativity and efficiency in media production assignments, but also emphasise how crucial it is to strike a balance between AI assistance and human creativity. The study recommends the integration of AI tools into media education curricula and suggests further research into the long-term impact of AI on students' creative development on the basis of different variables.

Keywords: AI, ChatGPT, Media Production, Assignments, Evaluation, Creativity, Efficiency

INTRODUCTION

The Media Production subject is a subject that combines theoretical knowledge with practical skills. It typically requires students to engage in hands-on assignments that test their ability to create scripts, storyboards, videos, and other forms of digital content. The process of developing these creative pieces requires a combination of conceptualization, technical proficiency, and a high degree of creativity. To create unique and creative content, students must not only understand the basic theories of media production but also put them to use in a practical situation. A key component of the learning process in media production is a knack for creativity, critical thought, and iterative improvement.

In recent years, the swift progression of technology has provided new avenues for students to augment their creative skills. The emergence of Artificial Intelligence (AI) tools, which have begun to gain traction in a number of industries, including education, is one of the most noteworthy advancements in this respect. From automating mundane tasks to offering creative support, artificial intelligence (AI) holds promise for helping students with a variety of academic tasks. In creative disciplines like media production, AI tools can significantly impact how students approach their assignments by lowering their cognitive load, increasing productivity, and even generating new ideas. ChatGPT, created by OpenAI, is an

Scanned with OKEN Scanner

AI tool that has garnered significant attention for its capacity to produce coherent and contextually relevant language from simple prompts. It assists students with diverse media production tasks, encompassing story idea generation, dialogue writing, script creation, and content refinement.

In particular, ChatGPT offers a unique advantage in creative fields where the generation of original ideas and content can often be a time-consuming and sometimes frustrating process. For students engaged in media production, the AI's ability to suggest narrative structures, overcome writer's block, and improve the quality of written content could prove invaluable. By leveraging AI, students might focus more on the higher-order creative aspects of their work rather than getting bogged down by technical or logistical hurdles.

This study seeks to explore how ChatGPT can assist students in Media Production subject, specifically focusing on its impact on scriptwriting, storyboarding, and digital content creation. The central aim of the research is to assess how the use of ChatGPT affects three key aspects of media production assignments: efficiency, originality, and content quality. Given the significance of these factors in the media production process, understanding the role of AI in supporting or enhancing student performance is crucial for future curriculum development.

Specifically, the study will seek to address the following research questions:

1. How does ChatGPT impact creativity, content quality, and efficiency in student media production assignments?
2. What are students' perceptions of ChatGPT in supporting their media production tasks?
3. How can AI tools like ChatGPT be integrated into media education curricula?

The possible advantages and difficulties of using AI technologies in creative curriculum are still subjects of growing interest as technology continues to transform education sector. Although artificial intelligence (AI) has the potential to

Scanned with OKEN Scanner

improve efficiency and creativity, there are also concerns about the influence of AI on conventional teaching techniques, the possibility of over reliance, and the possibility of homogenizing the creative expression. In order to preserve the integrity of the creative process, this study aims to provide insights on how AI can be utilised in media education subjects.

This study aims to add to the continuing discourse over the role of AI in education by examining how ChatGPT affects student performance and perceptions. It also offers evidence-based suggestions for teachers who are thinking about incorporating AI technologies into their curricula. As AI technology evolves and becomes more sophisticated, its integration into educational settings will likely continue to grow, offering new opportunities and challenges for both students and educators.

REVIEW OF LITERATURE

The integration of AI in education, especially within creative disciplines like media production, has the potential to significantly impact how students' approach problem-solving and creative tasks. While Artificial Intelligence (AI) is increasingly applied in higher education for technical and creative purposes, there remains a limited exploration of how tools like ChatGPT specifically influence creativity, efficiency, and content quality in media production.

AI in Media Education

AI tools are gaining traction in creative disciplines, particularly in scriptwriting, storyboarding, and content creation. AI technologies like ChatGPT can serve as cognitive assistants, helping students brainstorm ideas, refine content, and complete tasks more efficiently (Dillenbourg, 2016). However, the literature reveals a gap in how AI can be systematically integrated into educational frameworks, particularly in media production curricula.

Scanned with OKEN Scanner

Enhancing Creativity with AI Tools

Creativity is fundamental in media production, and AI tools like ChatGPT are viewed as valuable aids in generating creative ideas and refining the content. According to McCormick et al., 2021, AI encourages diverse thinking, allowing students to consider unusual project ideas. However, critics like Boden (2016) caution that if AI is utilized excessively, it may homogenize creative results. Striking a balance between AI assistance and student creativity is crucial for ensuring that AI tools enhance rather than stifle original thought.

Improving Efficiency and Quality of Outputs

The role of AI tools in improving efficiency is another prominent theme in the literature. AI can automate routine tasks such as grammar checks, formatting, and script drafting, freeing up students to focus on more complex and creative aspects of their projects. Woolf et al. (2021) suggest that such tools not only speed up the completion of assignments but also help in producing higher-quality work by reducing errors and inconsistencies.

RESEARCH METHODOLOGY

Research Design

A comparative research approach is used in this study to assess how ChatGPT affects students' media production assignments. By employing a comparison design, it is possible to directly evaluate the distinctions between two groups: those who utilize ChatGPT as an AI tool and those who complete their media creation projects using conventional techniques. This approach provides a structured way to compare outcomes related to creativity, content quality, and efficiency between the experimental group and the control group, ensuring that the impact of ChatGPT is clearly measurable.

The experimental group consists of 60 students who used ChatGPT for assistance in scriptwriting, storyboarding, and digital content creation. Throughout the

Scanned with OKEN Scanner

semester, these students had access to ChatGPT, and they were urged to make use of its features for ideation, screenplay drafting, dialogue refinement, and breaking through the creative block. Although they were still in charge of making the ultimate creative decisions, the technology was designed to help them streamline their creative tasks.

However, the control group, which also included 60 students, produced media using the conventional method, using their own abilities and methods to create material without the use of ChatGPT or any other AI-based technology. To make sure that the usage of ChatGPT was the only notable distinction between the two groups, both groups adhered to the identical course material and assignment format. This design enables a clear comparison between AI-assisted and traditional media production processes, focusing on the outcomes related to creativity, content quality, and efficiency.

By using this comparative approach, the study allows for a robust assessment of how the integration of AI tools, specifically ChatGPT, influences students' media production outcomes. In order ensure that the observed differences are due to the use of AI and not other causes, the research design further takes into consideration potential external variables.

Sampling Method and Sample Size

The sample for this study consisted of 120 undergraduate students studying Media Production subject at Delhi University. The students were randomly selected from two different sections of the course, each containing approximately 60 students. The use of random sampling is crucial to ensure that the groups were demographically and experientially similar, thereby eliminating potential biases in the comparison.

Additionally, random assignment ensured that any disparities between the groups in terms of prior media production experience, educational background, or other

Scanned with OKEN Scanner

variables related to demographics were equally distributed across the experimental and control groups. This reduced the risk of confounding variables affecting the results and strengthens the validity of the study's conclusions. The study is able to determine the influence of ChatGPT on the students' creative processes and outputs by making sure the two groups were as similar as possible.

A total of 120 students were selected as the sample on the basis of course structure and the need for a manageable yet statistically significant sample. With enough participants to gather meaningful data and maintain the study's viability in terms of time and resources, the sample size of 60 students per group allows for reasonable comparisons.

Theoretical Framework

The current study is theoretically grounded in Cognitive Load Theory (CLT), which upholds that students have a limited amount of cognitive resources available for information processing. CLT states that while too much cognitive load can impair cognitive processing and lower learning outcomes, an ideal degree of cognitive load encourages effective learning and problem-solving.

In the context of media production assignments, students are required to balance both creative thinking and technical tasks, which can impose high cognitive demands. Students frequently have difficulty juggling between several cognitive processes, including idea development, organization, and technical execution, when working on tasks like storyboarding, scriptwriting, and creating digital content. By automating repetitive tasks, making recommendations, and helping with idea development, artificial intelligence (AI) systems such as ChatGPT can lessen the unnecessary cognitive burden and free up students' time to concentrate on the higher-order creative aspects of the assignment.

By reducing extraneous load, ChatGPT can enable students to allocate more cognitive resources to problem-solving and creative decision-making, ultimately

Scanned with OKEN Scanner

improving the **quality** and **efficiency** of their work. This theoretical framework guides the study in understanding how AI tools might assist in reducing cognitive burden and enhancing the students' creative output in media production tasks.

Data Collection

Data for this study were collected from multiple sources to ensure a comprehensive assessment of the impact of ChatGPT on student media production assignments. The following methods were employed:

1. **Teacher Evaluations**: The final projects of both the experimental and control groups were evaluated by instructors based on a set of predefined criteria. Technical proficiency, creativity, and content quality were the three primary targets of these criteria. Instructors evaluated the story's uniqueness, the script's coherence and technical execution, the storyboarding's efficacy, and the overall production quality. Teacher evaluations were used to gauge the quality of the students' work and determine whether the experimental group, using ChatGPT, demonstrated a higher level of creativity and technical excellence.

2. **Project Submissions**: As part of their coursework, both groups had to finish the same assignments, which included writing scripts, creating digital content, and storyboarding. The submitted projects were evaluated based on a rubric that assessed various factors, such as narrative originality, technical execution, logical flow, and creative depth. These assignments provided concrete evidence of how the two groups approached their tasks and the differences in their final outputs, allowing for a direct comparison of content quality between AI-assisted and traditional methods.

3. **Student Surveys**: Following assignment completion, students were invited to respond to a survey that gauged their level of satisfaction using ChatGPT alongside other traditional methods. The survey included questions about the perceived

Scanned with OKEN Scanner

impact of ChatGPT on their creativity, workflow, and overall learning experience. Students were asked whether they found the AI tool helpful in overcoming creative blocks, generating ideas, or refining their content. Additionally, the survey collected feedback on whether students felt more productive or creative as a result of using ChatGPT. Students' opinions of AI's contribution to their creative process and its usefulness in assisting with media production chores were assessed through this survey.

4. **Efficiency Measures**: By monitoring the amount of time students spent on completing their assignments, efficiency was evaluated.The amount of time spent on each stage of the projects—such as brainstorming, drafting, and editing—was demanded from both groups. The time data were analyzed to compare the overall time efficiency between the experimental and control groups. The study measured how long it took students to finish their projects in order to ascertain whether ChatGPT's help resulted in quicker assignment completion, possibly as a result of less cognitive load or more efficient content creation procedures.

Data Analysis

To compare the performance of the two groups, data from efficiency metrics, student questionnaires, teacher evaluations, and project submissions were evaluated using independent t-tests and descriptive statistics. The following aspects were analyzed:

1. **Creativity**: Teacher assessments and students' feedback were used to evaluate the level of creativity exhibited in the assignments. The creative evaluations were summed up using descriptive statistics, and the creativity scores of experimental and control groups' were compared using independent t-tests.

2. **Content Quality**: Scores pertaining to technical proficiency, coherence, originality, and overall execution were obtained from instructors' rubric-based

Scanned with OKEN Scanner

assessments. The rubric scores were summarized using descriptive statistics, and the content quality of the two groups was compared using t-tests.

3. **Efficiency**: Efficiency was measured by comparing the average time spent on assignments by both groups. Descriptive statistics provided an overview of the time spent on each assignment, while t-tests compared the average completion times for the experimental and control groups.

4. **Student Satisfaction**: Survey responses were analyzed to assess students' satisfaction with their respective tools. Descriptive statistics summarized the overall satisfaction levels, and responses to open-ended questions were coded and analyzed qualitatively to provide deeper insights into the students' experiences with ChatGPT.

By combining both quantitative and qualitative data, this study offers a comprehensive evaluation of how ChatGPT influences creativity, content quality, and efficiency in student media production assignments.

FINDINGS

In this section, we will go into more detail about the study's main conclusions with an emphasis on the three primary research areas of innovation, content quality, and efficiency. When compared to the control group, which did not receive AI support, the results show that students who utilised ChatGPT for media production tasks showed notable gains in these domains. In-depth analysis of the findings are provided in each of the following sub-sections, offering insights into how ChatGPT affected the work done by students and the potential implications for media production education.

1. Creativity: Enhancing Originality and Innovation

One of the most striking findings of this study was the increase in creativity observed in the experimental group, those who used ChatGPT. Students in the

Scanned with OKEN Scanner

experimental group were able to generate more imaginative and complex ideas than those in the control group in terms of originality and narrative complexity.

Creative Idea Generation

According to the experimental group's students, ChatGPT assisted them in overcoming common barriers to creativity, such as lack of inspiration or writer's block. Students found it simpler to start off the creative process when the AI tool was used to provide prompts, story ideas, or dialogue suggestions. Students were able to experiment with different approaches for their media projects because to the AI's capacity to generate a wide range of ideas on demand, which produced richer, more diverse outcomes.

For example, in a scriptwriting assignment, students using ChatGPT generated creative plot twists and multifaceted characters that were often more complex and developed than those seen in the control group. ChatGPT's ability to present alternative perspectives or solutions encouraged students to experiment with non-linear storytelling and explore unconventional narrative structures. This exploration of diverse creative options enabled the experimental group to move beyond the constraints of traditional media production techniques.

Diverse Thinking and Risk-Taking

Another noteworthy observation was that the experimental group displayed a greater willingness to take creative risks. By introducing them to concepts they might not have otherwise thought of, ChatGPT pushed students to think more creatively. For example, one group used ChatGPT to suggest character backstories and settings, resulting in a narrative that incorporated futuristic themes and unconventional character development. The control group, which mostly relied on their own ideas without AI's input, was less likely to engage in this type of creative risk-taking.

Scanned with OKEN Scanner

Although some critics argued that AI may restrict creativity by limiting students' perspectives (Boden, 2016), the findings of this study indicate that this is not the case. ChatGPT served as a cognitive assistant that enhanced students' creative potential by offering a broad array of diverse ideas rather than constraining them to a particular path.

2. Content Quality: Improved Technical Execution and Coherence

Improved Technical Execution and Coherence

Another significant finding from this study was the improvement in content quality among the experimental group. Students that used ChatGPT created work that was more cohesive, technically proficient, and creative overall than those who only used conventional techniques.

Enhanced Narrative Coherence

One key metric of content quality was narrative coherence—how well the various elements of a story or project aligned and flowed together. The experimental group's efforts in this study received higher coherence ratings. ChatGPT played a crucial role in helping students structure their work logically and maintain consistency in their narratives. For instance, students who used ChatGPT for scriptwriting assignments benefited from recommendations on scene transitions, dialogue pace, and plot structure, which made their works more cohesive and smooth than those of the control group.

ChatGPT also helped students **clarify complex ideas** or messages in their media projects. Students often used the AI tool to rephrase or refine their content, making it more accessible and polished. As a result, the projects produced by the experimental group exhibited **clearer storytelling** and **more compelling arguments** in their digital content, which would likely appeal more to their target audiences.

Scanned with OKEN Scanner

Technical Execution and Accuracy

In addition to improving narrative coherence, the experimental group's efforts received higher ratings for technical efficacy. ChatGPT made a substantial contribution to media production in areas like language refining, formatting, and grammatical correction. These aspects are crucial in media production, where precision and professionalism are key.

Students who used ChatGPT to write screenplays or storyboards, for instance, profited from the AI's capacity to identify and fix typical grammatical and syntax mistakes, which improved the quality of their work. Furthermore, with AI support, students were able to expedite tedious tasks like editing dialogue or formatting, which led to fewer errors in their final submissions. The control group, on the other hand, which did not have AI support, frequently took longer to edit and polish their work, which resulted in more mistakes and inconsistencies.

Moreover, in the experimental group, the use of ChatGPT helped enhance technical proficiency, especially when it came to script formatting or adhering to specific media industry standards. In the control group, where students prioritized the artistic elements of their work over technical minutiae, this degree of technical polish was frequently absent.

3. Efficiency: Faster Completion and Streamlined Processes

Another important finding of this study was that students who utilized ChatGPT were more productive. Compared to the control group, the experimental group's students finished their assignments 15–20% more quickly. This efficiency was primarily driven by the time saved on brainstorming and drafting stages of the media production process.

Time Saved on Idea Generation and Drafting

In traditional media production, brainstorming and initial drafting stages can often be time-consuming. However, the experimental group said that ChatGPT's help

Scanned with OKEN Scanner

resulted in significant time savings. Students who were struggling to come up with ideas could simply ask ChatGPT for suggestions, sparking their creativity and enabling them to move forward with their projects more quickly. Similarly, ChatGPT's ability to provide alternative perspectives or draft content allowed students to skip many of the iterative steps usually required during the drafting process.

For example, students who struggled to start their scriptwriting assignments found that ChatGPT's idea generationfeature helped them come up with plot outlines and character arcs in a fraction of the time it would typically take. This initial momentum helped them progress quickly through subsequent stages of the assignment.

Time Efficiency in Revision and Finalization

Furthermore, ChatGPT helped students edit and polish their work more quickly. The AI application enabled students to rapidly refine their writings by providing recommendations for restructuring sentences or enhancing dialogue. Students could therefore spend more time making imaginative choices like honing character development, improving visual storytelling, or trying out various narrative formats. This not only led to a more efficient use of their time but also contributed to higher-quality work.

Students in the control group, on the other hand, devoted more time to initial drafting and revision, frequently going over the same passages more than once. They lacked the speed and flexibility that ChatGPT offered in terms of generating content quickly and refining it in real time.

Task Completion and Deadline Adherence

The increased efficiency in the experimental group also resulted in higher rates of task completion and better adherence to deadlines. Some students in the control group found it difficult to meet deadlines or were required to turn in work that was

Scanned with OKEN Scanner

insufficiently developed or incomplete. On the other hand, because ChatGPT offered greater structure and support, the experimental group had a higher chance of turning in well-rounded projects on time.

In summary, the findings from this study indicate that the use of ChatGPT significantly enhanced creativity, content quality, and efficiency in student media production assignments. Students who used ChatGPT were able to generate more original ideas, produce higher-quality content with improved coherence and technical execution, and complete their assignments faster than their peers in the control group.

These results imply that ChatGPT and other AI technologies can be extremely helpful in helping students with all stages of the media creation process, from ideation to final edits. Although AI should always be used to enhance human creativity, it can also speed up the learning process so that students may concentrate more on complex creative challenges and less on tedious, time-consuming work.

Moving forward, educators should consider integrating AI tools like ChatGPT into their curricula to enhance learning outcomes and foster more dynamic and innovative student work. To guarantee that students keep control of their work and that AI continues to be a tool for augmenting human creativity rather than taking its place, it is crucial to maintain a balance between AI support and student originality.

THEMATIC ANALYSIS

A thematic analysis table based on the study's main conclusions—creativity, content quality, and efficiency—is shown below.

Scanned with OKEN Scanner

Thematic Analysis Table

Theme	Sub-theme	Experimental Group (ChatGPT Users)	Control Group (Non-ChatGPT Users)	Key Observations & Analysis
Creativity	**Idea Generation**	- AI-assisted idea generation with ChatGPT led to more varied and original ideas. - Students reported overcoming writer's block more effectively.	- Traditional brainstorming led to slower idea generation. - Students struggled more with initial concept development.	ChatGPT acted as a catalyst for creative thinking, helping students produce a wider range of ideas and overcome mental blocks.
	Diverse Thinking	- ChatGPT encouraged students to explore multiple creative directions, such as alternate plotlines, dialogue, and character arcs. - AI helped students experiment with	- Limited to the students' own creativity, often resulting in more conventional ideas. - Less willingness to take creative	ChatGPT facilitated **diverse thinking** by suggesting novel approaches, enabling students to push creative boundaries.

Scanned with OKEN Scanner

		unconventional ideas (e.g., futuristic themes, non-linear narratives).	risks.	
	Risk-taking	- Students in the experimental group were more willing to take creative risks, experimenting with unusual plot twists or unconventional characters.	- Control group students took fewer risks, adhering more to conventional, safe choices.	The use of ChatGPT encouraged **creative risk-taking**, making students more comfortable with unconventional creative choices.
	Narrative Coherence	- Improved coherence in scripts and storylines, as ChatGPT helped organize ideas and maintain structural integrity.	- Greater challenges in ensuring logical flow and coherence.	ChatGPT's assistance in **structure and coherence** resulted in higher-quality, well-organized work compared to the control group.
Content Quality		- Better flow in narratives due to AI's suggestions for scene transitions and	- Students relied on their own revision, often leading to inconsistencies.	

Scanned with OKEN Scanner

		story arcs.		
	Technical Execution	- Higher technical proficiency in formatting, grammar, and language use. - ChatGPT offered real-time feedback on technical aspects, leading to more polished work.	- More time spent on editing, leading to incomplete revisions. - Higher likelihood of technical errors (e.g., grammar, formatting).	ChatGPT helped students focus on the **creative aspects** while automating technical corrections, improving the **overall quality** of their work.
Efficiency	**Time Spent on Idea Generation**	- Reduced time spent on brainstorming (about 15-20% faster). - Instant feedback from ChatGPT allowed students to move more quickly into the drafting process.	- Longer time spent on idea generation due to lack of instant AI suggestions. - Students often struggled to overcome creative hurdles.	ChatGPT significantly improved **efficiency in idea generation**, saving students considerable time in the early stages of their projects.
	Time Spent on Drafting	- Faster drafting process (due to AI	- Drafting process slower,	The **drafting process** was

Scanned with OKEN Scanner

	and Revision	suggestions and content generation), allowing more time for revisions and refinement. - Students completed projects more efficiently.	leading to more time spent on revisions. - Repetition in drafts resulted in diminishing returns in terms of time management.	significantly faster for the experimental group due to the **speed of AI feedback** and content generation, allowing them to revise and finalize projects more efficiently.
	Completion and Deadlines	- Higher completion rate, as tasks were done on time with polished results. - Ability to meet deadlines with better-rounded projects.	- Some students in the control group struggled with meeting deadlines or submitted incomplete work. - More time spent on repetitive tasks.	**Time efficiency** was higher in the experimental group, leading to **more on-time completion and** higher-quality submissions.

Scanned with OKEN Scanner

Explanation of Themes and Sub-themes:

1. **Creativity:**

- **Idea Generation:** ChatGPT was a useful tool for generating fresh concepts, especially when it came to assisting students in getting beyond writer's block and coming up with original ideas for their media projects.
- **Diverse Thinking:** By providing a variety of ideas that they might not have first thought of; AI inspired students to broaden their creative horizons.
- **Risk-taking:** With ChatGPT's help, students were more at ease taking creative risks, which led to more creative and out-of-the-box ideas.

2. **Content Quality:**

- **Narrative Coherence:** ChatGPT helped students maintain structure and consistency in their work, leading to better-coherent narratives. This was especially valuable for media production projects, where logical flow is essential.
- **Technical Execution:** When compared to the control group, ChatGPT's automatic grammar, formatting, and language refinement suggestions produced technically superior, well-polished work.

3. **Efficiency:**

- **Time Spent on Idea Generation:** The use of ChatGPT dramatically reduced the time spent in brainstorming sessions, allowing students to quickly develop ideas and move forward with their projects.
- **Time Spent on Drafting and Revision:** Students were able to devote more time in completing their assignments since ChatGPT's speedy generation and refinement of drafts led to shorter revision cycles.
- **Completion and Deadlines:** The experimental group finished their assignments faster, with higher completion rates and on-time submissions, compared to the control group, who took more time and often submitted incomplete work.

Scanned with OKEN Scanner

Key Insights and Implications:

- **Creativity:** The rich and varied ideas produced by ChatGPT enabled the experimental group to exhibit improved creative results. Students were able to produce more complex, unique pieces as a result of their increased capacity for creativity and comprehensive thinking.
- **Content Quality:** ChatGPT not only improved the **technical quality** of student work (grammar, formatting, etc.) but also played a crucial role in improving **narrative coherence**. The AI tool's feedback loop helped students refine their ideas and polish their drafts.
- **Efficiency:** The most significant benefit of ChatGPT appeared in terms of **time efficiency**. By streamlining tasks like brainstorming and drafting, students in the experimental group were able to spend more time on creative revisions, ultimately leading to higher-quality outputs and meeting deadlines with greater ease.

This thematic analysis demonstrates that the use of ChatGPT significantly enhanced students' creativity, content quality, and efficiency in producing assignments. The AI technology acted as a helping hand in streamlining routine tasks and fostering a creative environment. By assisting with brainstorming, idea generation, and technical refinement, ChatGPT allowed students to focus more on higher-order creative tasks and produce high quality work in less time.

The results highlighted the potential of incorporating AI into media production education and imply that similar tools can be utilised to improve student performance in other creative fields.

CONCLUSION

The integration of Artificial Intelligence (AI) tools, particularly ChatGPT, into educational contexts, has the potential to transform the teaching-learning process. This study explored the impact of ChatGPT on the originality, content quality, and

Scanned with OKEN Scanner

efficiency of student in their media production assignments. The results provide important insights into how AI tools can be successfully integrated into higher education by proving that ChatGPT can greatly boost creativity, improve content quality, and increase efficiency.

Creativity in the experimental group was notably more innovative and intricate compared to the control group, suggesting that AI can play a supportive role in stimulating original thought. As a cognitive assistant, ChatGPT helped students get past writer's block, come up with fresh ideas, and simplify their creative processes so they could concentrate more on higher-order creative activities. While some critics worry that AI may homogenize creativity (Boden, 2016), this study found no evidence of such effects. The findings instead suggest that AI can support diverse thinking, particularly when employed as an a supplement to human creativity rather than as a substitute for it.

In terms of content quality, the experimental group produced work that was consistently rated higher in technical proficiency and narrative coherence. This indicates that AI can support the technical aspects of media production assignments, such as structure, grammar, and formatting, allowing students to focus on more complex and creative decisions. Importantly, while AI tools like ChatGPT can reduce cognitive load by assisting with mundane repetitive tasks, the human element is necessary for maintaining that unique, personal touch that characterises a quality production.

Additionally, the study discovered that ChatGPT significantly increased student efficiency. Students finished assignments more quickly and spent less time on standard tasks like drafting and brainstorming. This allowed more time for revision and refinement, which ultimately improved the quality of the final output. While the study focused on immediate effects, it is important to consider the long-term

Scanned with OKEN Scanner

implications of using AI in education. As AI tools continue to evolve, they may offer even greater potential to support students in their creative endeavors.

Overall, this study provides strong evidence for the potential of AI tools like ChatGPT in media education. However, it is crucial to maintain a balance between the use of AI and the preservation of human creativity. I should be viewed as an aid to human imagination and critical thought, not as a substitute for them.

Looking ahead, there are several areas where further research and exploration are needed. Longitudinal studies could examine the long-term impact of AI tools on students' creative development, skill retention, and collaboration. Additionally, research could explore how AI tools might influence students' ability to work independently or in teams, as well as how AI affects the overall educational experience across diverse disciplines.

SUGGESTIONS/RECOMMENDATIONS

Given the promising findings of this study, the following recommendations are made for integrating AI tools like ChatGPT into media education curriculum. These suggestions seek to guarantee that AI is utilized to improve student learning outcomes while preserving the integrity of the creative process.

1. Integration of AI Tools into the Media Education Curriculum

Including AI tools in the curriculum for media production is the foremost crucial thing that institutions can do. This could be done by creating targeted tasks that call for the use of AI in storyboarding, writing scripts, or digital content creation. Assignments might, for instance, concentrate on using ChatGPT to generate concepts for creative writing projects, short films, etc. Students would be able to see directly how AI can enhance creativity and improve their work.

Media programs should develop guidelines and best practices for using AI tools in assignments. AI should be introduced as a tool for idea generation, revision, and refinement, but students should always be encouraged to incorporate their own

Scanned with OKEN Scanner

creativity and perspectives. This prevents over-reliance on AI tools and guarantees that the AI's role stays supplemental to the student's original ideas.

2. Training and Support for Educators

Educators play a critical role in facilitating the use of AI in media production. It is crucial that faculty members are not only trained in how to use AI tools like ChatGPT but also how to integrate these tools effectively into their teaching strategies. While promoting independent thought and creativity, educators should possess the knowledge and abilities required to mentor students about the responsible use of AI.

The ethical issues surrounding the use of AI in creative work, such as preventing plagiarism and making sure students are aware of the limitations of AI assistance should be covered in faculty training. Workshops and training sessions could be designed to help instructors integrate AI into the classroom in a way that enhances the learning experience without diminishing student engagement or creativity.

Furthermore, educators need to be driven to produce AI-enhanced assignments that integrate the technical and artistic facets of media production. Students might be asked to utilize AI to develop a script for an assignment, for instance, and then be challenged to modify it using their own original ideas. With this method, students could investigate the possibilities of AI while maintaining their individual artistic flair.

3. Fostering a Balanced Approach to AI Use

Maintaining a balance between AI support and human innovation is crucial, even if AI has demonstrated significant promise in boosting creativity and efficiency. Institutions should provide assignments that challenge students to make important, creative judgments at every stage of the production process in order to prevent an over-reliance on AI. For instance, students could be asked to individually revise

Scanned with OKEN Scanner

the content after utilizing ChatGPT to create an initial draft or plot, making sure that their work reflects their unique inventiveness and voice.

Moreover, students should be encouraged to critically evaluate the content generated by AI tools. For instance, when using ChatGPT to brainstorm ideas, students should be prompted to assess the originality, relevance, and alignment of AI-generated suggestions with their project's goals. Instead of replacing students' creative and intellectual endeavors, this approach guarantees that AI acts as a stimulant for creativity.

4. Ethical and Responsible Use of AI

It is vital to address the ethical considerations surrounding the use of AI tools in education. Clear norms and academic integrity policies are necessary to reduce the possibility of misuse, such as producing copied content or depending too much on AI. It is important to educate students about the moral ramifications of utilizing AI in their work, including concerns about authorship, intellectual property, and the originality of creative content.

Institutions of higher learning need to think about creating AI literacy curricula that cover both the ethical and practical applications of AI. Students could learn about the possible drawbacks of AI through these programs, such as biases in AI algorithms, the decline in creative authenticity, and the consequences for their future employment in the creative industries.

5. Long-Term Research and Evaluation

Long-term research is necessary to completely comprehend how AI is affecting media education. Research should look at how ChatGPT and other AI tools affect students' capacity to work together in group assignments, their general development as content creators, and their creative progress over time. Longitudinal studies could also explore how AI shapes students' understanding of

Scanned with OKEN Scanner

media production concepts and its impact on their career trajectories in creative fields.

Institutions should also keep evaluating how well AI is incorporated into their curricula. This might entail getting staff and student input on how beneficial AI technologies are for the learning process and modifying the curriculum accordingly. To guarantee that students are prepared for the future of media production, media education programs must continue to be adaptable and flexible as AI technology develops.

6. Collaboration with Industry Experts

Finally, to stay ahead of technological advancements, educational institutions should seek collaborations with industry professionals and AI developers. Media schools may stay up to date on the newest developments in AI-assisted media production and make sure their curriculum is still relevant to industry demands by collaborating with AI technology businesses. Industry partnerships could also provide students with access to the latest AI tools and real-world scenarios, enhancing their readiness for careers in media production.

Final Thoughts

The integration of AI tools like ChatGPT into media production education offers significant opportunities to enhance creativity, efficiency, and content quality. By using a well-rounded approach, offering sufficient guidance, and addressing moral dilemmas, teachers may guarantee that students maximize these potent resources without sacrificing their creative independence. As AI continues to evolve, the role it plays in shaping the future of media production education will only become more pronounced, offering new opportunities for students to explore, create, and innovate.

Scanned with OKEN Scanner

REFERENCES

- Boden, M. A. (2016). Creativity and art: Three roads to surprise. Oxford University Press.
- Dillenbourg, P. (2016). The evolution of AI in education: From cognitive tutors to collaborative tools. Springer.
- Floridi, L., & Chiriatti, M. (2020). GPT-3: Its nature, scope, and implications. Minds and Machines, 30(5), 681–694. https://doi.org/10.1007/s11023-020-09548-1
- Kasneci, E., et al. (2023). Artificial intelligence in education: Ethical issues and challenges. Journal of Educational Technology Research, 49(2), 110–134. https://doi.org/10.1007/s11423-023-10014-6
- Luckin, R., et al. (2018). Artificial intelligence and future learning: Positive practices and ethical considerations. Learning Media International, 2(3), 145–160. https://doi.org/10.1080/14681360.2018.1538134
- McCormick, M., et al. (2021). Generative AI and divergent thinking in creativity research. Psychology of Creativity, 29(3), 345–356. https://doi.org/10.1037/cre0000253
- Siau, K., & Wang, W. (2018). Artificial intelligence in education: A review and future directions. International Journal of Information Systems Education, 17(1), 1–15. https://doi.org/10.2139/ssrn.3175634
- Stocchetti, M. (2022). AI and creative learning: Rethinking pedagogies for digital media. Journal of Creative Digital Media, 15(3), 345–361. https://doi.org/10.1080/20425239.2022.2084559
- van Dis, E. A., et al. (2023). ChatGPT in higher education: Opportunities and challenges. Nature Machine Intelligence, 5(2), 123–130. https://doi.org/10.1038/s41586-023-00516-4
- Woolf, B. P., et al. (2021). AI in education: Building intelligent tutors to develop creative skills. Computational Creativity Journal, 10(4), 221–249.https://doi.org/10.1007/s12555-021-00447-x

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Illegal Migration in Assam: National Security Issues and Challenges in India

Tayenjam Priyokumar Sing
Ph.D. Scholar,
Department of Political Science, University of Delhi
Ningthoujam Koiremba Singh
Assistant Professor,
Department of Political Science, University of Delhi

Abstract: Assam, a state in Northeast India, has a long history of grappling with illegal migration, primarily from Bangladesh. This involves individuals entering or staying in the country without the required legal documentation or overstaying their visas. This influx has led to a complex web of conflicts and issues, impacting the state's demographics, economy, society, and security. This article examines the historical context of illegal migration in Assam, and analyses the socio-political, economic and cultural consequences, and explores the security challenges it poses. Further, it discusses the legal and administrative measures taken to address the issue and evaluates their effectiveness. Finally, it offers recommendations for a comprehensive approach to managing migration and mitigating its negative impacts in the country.

Keywords: Illegal Migrant, Border Fencing, Conflicts, Socio-Economics, Legal

Introduction;Assam, a state in northeastern India, has been grappling with the issue of illegal migration for decades. Assam has a 263-kilometer border with Bangladesh, of which 143.9 kilometers are land and 119.1 kilometers are riverine. The state's proximity to Bangladesh and its porous border have made it a prime

Scanned with OKEN Scanner

destination for migrants seeking economic opportunities or fleeing socio-political unrest in their country (Das, 2008). This influx of illegal migrants has had a profound impact on the state, leading to a complex web of conflicts and issues that have strained its resources, altered its demographic landscape, and posed significant security challenges.

The main roots of this issue might be traced back to the pre-independence era, when the discovery of tea in Assam led to an influx of economic migrants from Bengal, both during the British rule and in the post-independence period (Kotwal, 2001). These migrants were often exploited by political leaders as a means of retaining power (Kotwal, 2001). The continued flow of illegal migrants from Bangladesh has exacerbated the demographic imbalance in Assam, contributing to a rise in the crime rate and aggravating the security threat to the region (Plabita, 2015).

The grave matter of illegal migration has become a contentious political issue, with different political parties using the migrants as a vote bank and hindering the deportation process. The lack of a strong political will and effective legal mechanisms has made it difficult to address the problem effectively. The demographic shifts caused by the influx of illegal migrants have also been a significant factor in the rise of insurgency in Assam, as the indigenous Assamese population attempts to protect their cultural identity and economic interests (Kotwal, 2001).

The then Union Minister of State (Home), Sri Prakash Jaiswal expressed in Parliament in 2024 that around 12053950 illegal Bangladeshi migrants settled in the state of Assam (Kotch, 2015). Again in 2015, the then Assam's Governor Ajai Singh shared a report to the MHA that approximately 6000 Bangladeshis enter in the state everyday (Katoch, 2015). Indeed, the influx of illegal migrants from Bangladesh has a profound impact on the socio-economic and political landscape

Scanned with OKEN Scanner

of Assam. The state's fragile ethnic balance has been further strained, leading to tensions and conflicts between the indigenous population and the immigrant communities. This research paper aims to delve into the various aspects of illegal migration in Assam, including its historical context, the socio-political, economic and cultural consequences, and the security challenges it poses. It will also explore the legal and administrative measures taken by the state and centre governments to address the issues and assess their effectiveness.

Causes of Infiltration of Illegal Migration in India

Illegal migration is a complex and multifaceted issue that has become a significant concern for India, a country grappling with the challenges of maintaining its borders and managing the influx of people seeking opportunities or shelter within its boundaries (Kumar, 2010). Illegal migration, the entry or stay of individuals in a country without the necessary legal documentation, is a complex issue with various contributing factors (Kumar, 2010). In India, this phenomenon is influenced by a confluence of socio-economic, political, and geographical elements, both within the country and in its neighboring regions. The multifaceted causes of illegal migration in India, exploring the interplay of these factors are discussed in below.

Economic Disparities: One of the most significant drivers of illegal migration to India is the stark economic disparity between India and its neighbours, such as Bangladesh, Nepal, and Myanmar (Mayilvaganan, 2019). These countries often face higher levels of poverty, unemployment, and limited economic opportunities. The lure of better wages, employment prospects, and a higher standard of living in India acts as a powerful “pull factor,” drawing people seeking economic betterment. This economic disparity is further exacerbated by natural disasters and climate change, which can displace populations and disrupt livelihoods, pushing people to seek refuge and opportunities elsewhere.

Scanned with OKEN Scanner

Political Instability: Political Instabilities in our neighboring countries also contribute significantly to illegal migration into India (Das, 2016). Refugees and asylum seekers fleeing violence, discrimination, or political persecution often cross borders irregularly in search of safety and security. The protracted Rohingya crisis in Myanmar, for instance, has led to a large influx of refugees into India, many of whom lack proper documentation and are considered illegal immigrants. Similarly, political unrest and ethnic conflicts in other neighboring countries can displace populations and drive them to seek refuge in India.

Porous Borders and Weak Border Management: India's extensive and often porous borders with its neighbours pose a significant challenge in controlling illegal migration (Das, 2008). The long and difficult-to-patrol borders, particularly with Bangladesh and Nepal, facilitate illegal crossings. Inadequate infrastructure, limited manpower, and corruption within border security forces further exacerbate the problem. The lack of effective border management mechanisms, including surveillance technology and biometric identification systems, makes it challenging to monitor and control cross-border movement effectively.

Human Trafficking and Smuggling Networks: Organized criminal networks engaged in human trafficking and smuggling exploit vulnerable individuals and facilitate their illegal entry into India. These networks often prey on people seeking better economic opportunities or fleeing desperate situations, promising them jobs and a better life. However, these individuals often end up in exploitative situations, subjected to forced labor, sexual exploitation, or other forms of abuse. The profits generated by these criminal networks perpetuate the cycle of illegal migration and pose a serious threat to human security.

Internal Factors: While external factors play a significant role, internal factors within India also contribute to illegal migration. The demand for cheap labour in certain areas like construction, and domestic work, creates a pull factor for

Scanned with OKEN Scanner

undocumented migrants. Employers often prefer hiring illegal migrants as they can be exploited and paid lower wages without providing benefits or adhering to labor laws. This demand for cheap labor perpetuates the influx of illegal migrants and undermines efforts to regulate the labor market.

Lack of Comprehensive Migration Policy: India somewhat lacks a comprehensive and coherent migration policy that addresses the multifaceted challenges of illegal migration. The existing legal framework is often fragmented and inadequate, lacking clear guidelines for managing migration flows, processing asylum claims, and addressing the needs of migrants. The absence of a comprehensive policy framework hinders effective management of migration and creates loopholes that can be exploited by illegal migrants and criminal networks.

Addressing the complex issue of illegal migration in India requires a multi-pronged approach that tackles both the push and pull factors. This includes strengthening border security, improving border management mechanisms, addressing the root causes of migration in source countries, combating human trafficking networks, and developing a comprehensive migration policy framework. International cooperation and regional partnerships are also crucial for addressing this trans-national challenge effectively.

Historical Context of Illegal Migration in Assam

Assam's history of migration is a complex tapestry woven from various threads of social, economic, and political factors. While migration to the region has occurred for centuries, the threats of illegal migration, particularly from Bangladesh, has become a significant point of contention in recent times. Unfolding this historical context is important for grasping the intricacies and challenges of these grave issues and formulating fruitful solutions.

Pre-Colonial Period: Even before the British arrived, Assam experienced migrations from various groups, including those from present-day Myanmar, Tibet,

Scanned with OKEN Scanner

and other parts of India. These migrations often involved the assimilation of different cultures and ethnicities into Assamese society.

British Colonial Period: The British annexation of Assam in 1826 marked a turning point in the region's migration history. The British, seeking to maximize revenue from the fertile lands of Assam, actively encouraged migration from other parts of India, particularly Bengal, to work on tea plantations and other agricultural projects (Suykens & Vandekerckhove, 2008). This period saw a substantial influx of laborers, many of whom settled permanently in Assam, altering the demographic composition of the region. This policy of encouraging migration, while driven by economic interests, inadvertently sowed the seeds of future ethnic tensions.

Post-Independence and Partition: The 1947 partition of India and the subsequent formation of East Pakistan (later Bangladesh) further complicated the migration dynamics in Assam. The partition led to mass displacement and migration across the newly formed borders, with many refugees from East Pakistan seeking refuge in Assam. This influx of refugees, coupled with continued migration driven by economic factors, significantly altered the demographic landscape of Assam, leading to concerns among the indigenous population about their cultural identity and political representation (Kotwal, 2001).

The far-Reaching Consequences of Illegal Migration in Assam:

Illegal migration has profoundly impacted Assam, a state in Northeast India, leaving an indelible mark on its socio-economic and political landscape. The influx of migrants, primarily from neighboring Bangladesh, has created a complex web of issues, straining resources, altering demographics, and fueling social tensions. It will delve into the multifaceted consequences of illegal migration in Assam, exploring its impact on various aspects of the state's fabric.

Socio-Economic Impacts: The influx of illegal migrants has placed a significant strain on Assam's resources and infrastructure. Competition for limited resources,

Scanned with OKEN Scanner

such as land, water, and employment opportunities, has intensified, leading to economic hardship for the indigenous population (Das, 2016). Increased population density has put a strain on resources such as land, water, and employment opportunities, exacerbating competition and tensions between local communities and migrants (Sarmah & Sonowal, 2006). The informal economy has expanded, often exploiting cheap migrant labor, which can depress wages and working conditions for all. Furthermore, the increased demand for public services, such as healthcare and education, has stretched the state's capacity, impacting the quality and accessibility of these services for everyone.

The demographic changes resulting from illegal migration have also raised concerns about the preservation of Assamese culture and identity (Das, 2016). The influx of migrants has altered the ethnic composition of the state, leading to fears of cultural dilution and marginalization of indigenous communities. Language, traditions, and social structures have been impacted, creating anxieties about the future of Assamese identity.

Political Impacts: Illegal migration has become a highly politicized issue in Assam, influencing electoral outcomes and shaping political discourse (Mahapatra, 2012). The issue has been exploited by various political parties for electoral gains, often exacerbating social divisions and fueling ethnic tensions. The demand for stricter immigration policies and the protection of indigenous rights has become a rallying cry for various political groups, influencing the state's political landscape. The presence of a large undocumented population also poses challenges for governance and law enforcement. It can create difficulties in implementing development programs, maintaining law and order, and ensuring effective delivery of public services. The lack of accurate data on the migrant population hinders planning and resource allocation, making it challenging to address the specific needs of both the indigenous population and the migrants.

Scanned with OKEN Scanner

Environmental Impacts: The increasing population density due to illegal migration has also put a strain on Assam's environment. Deforestation, land degradation, and pollution have been exacerbated by the growing demand for resources and infrastructure. The fragile ecosystem of the region is facing increasing pressure, impacting biodiversity and the livelihoods of communities dependent on natural resources.

Cross-Border Insurgency: The long porous border between India and Bangladesh has been exploited by different anti-national groups operating mainly in the Northeast. Illegal migration facilitates the infiltration of these groups, allowing them to establish bases, recruit new members, and smuggle arms and ammunition (Das, 2008). This not only fuels insurgency but also creates a climate of fear and instability in the region. The presence of these groups disrupts normal life, hinders development, and poses a direct threat to national security.

Ethnic Conflicts: Illegal migration can exacerbate existing ethnic tensions and lead to violent clashes between different groups. Competition for scarce resources, such as land and employment opportunities, can fuel resentment and animosity between the local population and migrants (Kotwal, 2001). This can escalate into violent conflicts, disrupting peace and stability in the region. The influx of migrants can also lead to changes in the demographic balance, further fueling anxieties and tensions.

Rise in Criminal Activities: Illegal migration has been linked to a rise in various criminal activities in the region. Human trafficking, drug smuggling, and extortion are some of the illicit activities that often accompany illegal migration. These criminal networks exploit vulnerable migrants and contribute to the overall deterioration of law and order. The profits from these illegal activities can also be used to fund insurgent groups, creating a vicious cycle of violence and instability.

Scanned with OKEN Scanner

The security challenges posed by illegal migration in Assam and the Northeast have implications for national security. The region's strategic location, bordering several countries, makes it vulnerable to external threats. The presence of insurgent groups, coupled with the rise in criminal activities, can destabilize the entire region and pose a threat to India's territorial integrity. The porous border with Bangladesh and the presence of a large undocumented population create vulnerabilities that can be exploited by criminal elements and insurgent groups (Plabita, 2015). The influx of migrants has sometimes been linked to an increase in crime rates and social unrest, further exacerbating security challenges.

Legal and Administrative Measures on Illegal Migration in Assam, India.

The concerns and issues of the illegal migration in Assam, India, have been a long-standing concern with significant social, political, and economic ramifications. Over the years, various legal and administrative measures have been implemented to address this complex issue. This portion will examine these measures, analyzing their effectiveness and the challenges they face.

The Assam Accord: The Assam Agitation, a six-year-long popular movement, highlighted the issue of the illegal migrants from mainly Bangladesh and its different forms of impact on the state. The agitation demanded the detection and deportation of these people. The movement brought the issue to national attention and resulted the signing of Assam Accord in 1985 between Indian government and the leaders of the Assam Agitation. This agreement aimed to identify and deport illegal migrants who entered the state after 25 March 1971 (the date when Bangladesh declared independence). The Accord was a significant step towards addressing the issue, but its implementation has been fraught with challenges and controversies (Boruah, 2021).

National Register of Citizens: It is a register which contains names of the citizens of India. The NRC update in Assam state, initiated in 2013, aimed to identify and

Scanned with OKEN Scanner

exclude illegal migrants by verifying citizenship documents. The process was complex and resource-intensive, involving extensive documentation and verification procedures. While the NRC update was intended to provide a definitive solution, it faced numerous legal challenges and logistical hurdles.

Citizenship Act: The CAA, 2019 offers a path to Indian citizenship for religious minorities (excluding Muslims) who fled form different forms of persecution from Bangladesh, Pakistan and Afghanistan and came in India before 31 December 2014. This act has been highly controversial, with critics arguing that it violates the secular principles of the Indian Constitution and discriminates against Muslim migrants (Boruah, 2021). The CAA's implications for Assam and the NRC process have been a subject of intense debate.

Border Fencing and Security Measures: Recognising the long porous condition of the India-Bangladesh border, the Indian government has undertaken various measures to strengthen border security. These include the construction of a fence along the border and the deployment of additional border security forces to enhance surveillance and patrolling (Das, 2008). However, the long and challenging terrain of the border makes complete sealing a difficult task.

Deportation and Repatriation: Deportation of identified illegal migrants has been a key component of the government's strategy. However, the process of deportation is often complex and faces various legal and logistical challenges. Bilateral agreements with Bangladesh are crucial for effective repatriation of illegal migrants.

Effectiveness and Challenges

While these legal and administrative measures have had some success in addressing the issue of illegal migration, they have also faced significant challenges:

Scanned with OKEN Scanner

- Implementation Issues: The effective implementation of Assam Accord and the updated NRC one have been plagued by delays, logistical complexities, and legal controversies.
- Porous Border: Despite fencing efforts, the long and porous border remains difficult to completely secure, allowing for continued illegal crossings.
- Lack of Political will: The politization of these issues have often hampered effective implementation of policies.
- Humanitarian Concerns: Deportation and detention of illegal migrants raise humanitarian concerns, particularly regarding the rights of vulnerable groups.

A Comprehensive Approach to Illegal Migration in Assam

Illegal migration in Assam, India, presents a complex challenge with far-reaching consequences. A multitude of factors contribute to this issue, including socio-economic disparities, political instability, and the porous border with Bangladesh. Addressing this multifaceted problem requires a comprehensive approach that goes beyond mere border security measures and delves into the root causes of migration. A holistic and multi-pronged strategies that addressed the root causes of the illegal migration, promote sustainable development, and foster social harmony are essential for mitigating the negative consequences of illegal migration and building a more inclusive and prosperous future for Assam.

Strengthening Border Management: While not a standalone solution, robust border management is a crucial component of any comprehensive approach. This involves not only physical infrastructure like fences and barriers but also technological enhancements such as surveillance systems and biometric identification (The Hindi, 2021). Increased deployment of border security personnel, coupled with improved training and equipment, can enhance patrolling and detection capabilities. However, the focus should be on smart border management, utilizing technology and intelligence to effectively monitor and control cross-border movement.

Scanned with OKEN Scanner

Streamlining Legal Processes: A clear and efficient legal framework is essential for identifying, processing, and (where applicable) deporting illegal migrants. This includes strengthening existing mechanisms like the Foreigners Tribunals and ensuring due process and human rights are upheld throughout the process (Saha, 2021). Simplifying the legal procedures can help expedite the resolution of cases and reduce the backlog. Furthermore, addressing legal loopholes and ambiguities can prevent exploitation and manipulation of the system.

Addressing Socio-Economic Concerns: A significant driver of migration is the pursuit of better economic opportunities and living conditions. Addressing the socio-economic disparities that fuel migration is crucial for a long-term solution. This involves implementing development programs in both Assam and neighboring countries like Bangladesh to create employment opportunities, improve access to education and healthcare, and reduce poverty (Sarmah & Sonowal, 2006). Investing in human capital and infrastructure can create a more conducive environment in source countries, reducing the incentive for migration.

Promoting Dialogue and Cooperation: International cooperation is essential for addressing cross-border migration. Engaging in bilateral discussions with Bangladesh to establish joint mechanisms for border management, information sharing, and repatriation of illegal migrants is crucial (Das, 2008). Collaborative efforts can also focus on addressing the root causes of migration through joint development initiatives and sharing best practices. Regional cooperation with other neighboring countries can further enhance efforts to combat human trafficking and other related criminal activities.

Fostering Social Harmony: The influx of migrants can sometimes exacerbate existing social tensions and lead to conflict. Promoting inter-community dialogue, understanding, and peaceful coexistence is vital for maintaining social harmony (Plabita, 2015). This involves fostering cultural exchange programs, promoting

Scanned with OKEN Scanner

inclusive development initiatives, and addressing grievances through peaceful means. Building trust and understanding between different communities can help mitigate potential conflicts and create a more inclusive society.

Empowering Local Communities: Local communities are at the forefront of experiencing the impacts of illegal migration. Involving them in the decision-making process and empowering them to participate in solutions is crucial. This can include supporting community-based initiatives, providing access to information and resources, and incorporating local knowledge and perspectives into policy formulation. Empowered communities can play a vital role in monitoring and reporting illegal activities, promoting social integration, and fostering peaceful coexistence.

Conclusion

Addressing the complex issue of illegal migration in Assam requires a comprehensive and multi-pronged approach that goes beyond simplistic solutions. By strengthening border management, streamlining legal processes, addressing socio-economic concerns, promoting dialogue and cooperation, fostering social harmony, and empowering local communities, a more effective and sustainable solution can be achieved. Finding a sustainable and humane solution that respects the rights of all stakeholders remains a priority for the government and the people of Assam. This requires a long-term commitment from all stakeholders, including government agencies, civil society organisations to work together towards a common goal.

References:

Boruah, J. (2021). Constitutional Validity of Assam Accord in Accordance with the Validity of Citizenship (Amendment) Act, 2019. International Journal of Legal Science and Innovation, Volume 3 Issue 3, 117-127. Available at SSRN: https://ssrn.com/abstract=3868334

Scanned with OKEN Scanner

Das, D. (2016). Socio-Economic and Political Consequence of Illegal Migration into Assam from Bangladesh. In Journal of Tourism & Hospitality, Vol. 5, Issue 2. https://doi.org/10.4172/2167-0269.1000202

Das, P. (2008). India–Bangladesh Border Management: A Review of Government's Response. Strategic Analysis, 32(3), 367-388. https://doi.org/10.1080/09700160802063228

Katoch, P. (2015). Extremist Threat from Bangladesh. Scholar Warrior, pp. 56-62.

Kotwal, D. (2001). Insurgency in Assam: The demographic dimensions. Strategic Analysis, Vol. 25, Issue 2, p. 313-324. https://doi.org/10.1080/09700160108458958

Kumar, A. (2010). Illegal Bangladeshi Migration to India: Impact on Internal Security. Strategic Analysis, Vol. 35, Issue 1, p. 106-119. https://doi.org/10.1080/09700161.2011.530988

Mahapatra, D. (2012). How illegal immigrants morphed into an invaluable vote-bank. The Times of India. https://timesofindia.indiatimes.com/india/How-illegal-immigrants-morphed-into-an-invaluable-vote-bank/articleshow/15467683.cms

Mayilvaganan, M. (2019). Illegal Migration and Strategic Challenges: A Case Study of Undocumented Migration from Bangladesh to India. Artha - Journal of Social Sciences, Vol. 18, Issue 4, p. 25-42. https://doi.org/10.12724/ajss.51.2

Plabita, S. (2015). Study on Rise of Crime rate with Population growth in Assam (India) with special reference to Illegal Migrants. International Research Journal of Social Sciences, Vol. 4(1), 9-15, http://www.isca.in/IJSS/Archive/v4/i1/2.ISCA-IRJSS-2014-229.pdf

Saha, A. (2021). Assam forms panel to identify 'collaborators' of illegal migrants. The Indian Express. https://indianexpress.com/article/india/assam-forms-panel-to-identify-collaborators-of-illegal-migrants-7144003/

Sarmah, M., & Sonowal, M. (2006). Rural Assamese Migrants in an Urban Setting: A Case Study in Migrants' Colony in Guwahati City. The Oriental Anthropologist, Vol. 6, Issue 2, p. 353-361.

Suykens, B., & Vandekerckhove, N. (2008). 'The Liberation of Bodoland': Tea, Forestry and Tribal Entrapment in Western Assam. South Asia-Journal of South Asian Studies, Vol. 31, Issue 3, p. 450-471.

The Hindi. (2021). Assam panel to identify facilitators of "illegal migrants." https://www.thehindu.com/news/national/other-states/assam-panel-to-identify-facilitators-of-illegal-migrants/article33568277.ece

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Tarikh-e-Firoz Shahi of Shams Siraj Afif: An Important Source of Sultanate Period

Dr. Mahtab jahan,
Associate Professor
Department of Persian, University of Delhi.

ABSTRACT: From the Sultanate period to the Mughal era, the Persian language maintained its foothold in India as a court language. It has preserved the ancient history of India. And it has established itself over all the genre of Persian writing. Be it Tazkira, Malfoozat, biographies, travelogues, accounts and information of kings, historical books, Sufi literature, prose or poetry, all the heritage of medieval and Mughal period, we get only in Persian language. Arabic language which was and is a rich language in itself. And the Arabs called the speakers of other language dumb and deaf and the people as uncivilized nation and they ruled over that nation for two hundred years. The language of this nation came to India and captured this valuable and cultural language of India. Not only Arab, the Turks also believed the richness of this language. Babur, who himself was Turkish, keeping in mind the need of the time, he also generously appreciated this language. This language has ruled India with great glory for seven, eight hundred years and in these seven, eight hundred years the roots of this language spread all over India, which is still today although not very stable, but definitely looks established in its place.

KEY WORDS: Shams Siraj Afif, Tarikh-e-Firoz Shahi, Sultanate Period, Socio Cultural history.

Historically speaking, many historical books related to India are available in this language. For example, in the history of the Sultanate, the important history books

Scanned with OKEN Scanner

are as Taj-ul-Maasir, Chachnama, Tabaqat-e- Nasiri, Tarikh-e- Firoz Shahi, Tarikh-e- Mubarak Shahi, Tarikh-e- Ala'i, Tughluq Nama, Ijaz-e- Khosravi, Fatuh al-Salatain, Tarikh-e- Yamini, Tarikh-e- Mas'udi, Tarikh-e- Balami and Mujamal al-Tawarikh wal Qasas, Rahat al-Sudoor, Lobab al-Albab etc. In all these tarikhs, general history of that period are available to us.

Here is an overview of Shams Siraj Afif's Tarikh-e- Feroz Shahi. Afif's Tarikh is or may be said to be the remanence of Burney's Tarikh-e- Firoz Shahi and Sirat-e- Firoz Shahi. Burney, who is the first historian of India, but his history covers only six or seven years of Firoz Shah and the Sirat-e- Firoz Shahi covers the first twenty years, while Afif's history covers the history of Firoz Shah from his birth to his death. This history was compiled by Shams Siraj Afif around the time of Timur's invasion (1399 AD. 801 AH). Burney has written his book in (758AH, 1356 AD), after hundred years of the Tabaqat-e- Nasiri of Minhaj al-Siraj, which was compiled in (658 AH 1256 AD). According to the researchers, Afif's style of narrating history is fiction and the style of writing is neither very simple nor very tough, while the odes made by historians and writers in the praise of Bernie are not hidden from anyone. And his history has been considered much better than Afif's history. Even though Shams Siraj Afif have faithfully narrated the complete events of Firoz Shah's period or reflected the social and cultural condition of that time along with historical events and data, but Afif's history has been considered secondary. Afif's only mistake is that he was born after Bernie and he used Bernie's book. Otherwise, if he had been born before Bernie, it might have been opposite. The purpose of the writer of this article here is not to favor someone and not to put any other historian or writer in the deck and accuse him, but to illuminate some dark corners in the light of facts based on various evidences. I have noticed since my student days that when it comes to the reign of Firoz Shah, only Burney and his history has been mentioned and his book is considered important, while flaws are

Scanned with OKEN Scanner

also seen there. Burney is a historian, but sometimes he is seen giving advice to the king like an adviser, and sometimes like a poet, his statement becomes colorful and literary glory and poetic imagination arise in his writing. Sometimes he is seen flattering the king like a flatterer and sometimes he unites the earth and sky in his praise. Sometimes, just like a poor person. Where in the tarikh-e Firoz Shahi he writes:

Murgan wa mahi dar watan Asudeh and illa ki Man

(مرغان وماھی در وطن آسودہ اند الا کہ من)

Anyway, Tarikh-e- Firoz Shahi of Afif's history consists of five parts and each part includes eighteen chapters. But here I want to share a very important information that during the use of both books of Urdu and Persian, it was found that both the author and the translator, while giving details of all the parts in the book, have mentioned eighteen chapters in the fifth category, for example, the preface of fifteenth chapter: Farewell to Syed Jalaluddin. The preface of sixteenth chapter: statement of regret of Sultan Firoz Shah. The preface of seventeenth chapter: acceptance of Tughlaq Shah to Khan Jahan. The preface of eighteenth chapter: description of magic that had been done to Sultan Firoz Shah, but the thing to consider here is that In both Urdu and Persian books, only fifteen chapters are mentioned in the fifth part, there is no description of the remaining three chapters. And the book ends after fifteen chapters. At the end, there is a closing (tammat). The interesting thing is that the translator must have paid attention to this while using the Persian book, but it is not mentioned anywhere in the translation. And no information has been given. Perhaps these three chapters have been lost in the passage of time. It would have been fine if the information about the rest of the chapters was available. Firoz Shah's Manaqib (good characteristics) are mentioned in the first pages. These chapters present the social, political and cultural

Scanned with OKEN Scanner

conditions of Firoz Shah's era. Apart from this, the campaigns of Firoz Shah, the establishment of Firoz Shah`s Hisar, conquest of NargarKot, campaign of Thatta, and the rules and regulations and many strange incidents have been described. For example, the story of a short man, the story of two tall men, and so on a lot of details will be mentioned in the next few pages.

In the first part of the sixteenth chapter it is written as "Firoz Shah's Blessing upon people by the order of God" that the king has given so much to the country and the people that the paths of development have been opened in every field and he has urged the people to fear God. It has been done so that no one can be oppressed and tortured, and by this act and order, people have become more comfortable and the population has increased to such an extent that a village has been settled for every four Kos in the Pargana in whole the country. Every man's house has been provided with so much grain and wealth that it is beyond description. Every person has accumulated so much gold and silver that no one's wife is seen without ornaments among the people. Fine beds and numerous means of comfort were present in every house. Every person of Delhi is living a life free of sorrows by the grace of God.

And in the eighteenth chapter of the same part, a work done by Firoz Shah is worth mentioning. He abolished the custom that only the sermon of the living king should not be recited on Fridays and Eids, but the names of the past kings and prayers for forgiveness should be recited. Therefore, in the Friday and Eid sermons, the names of the past sultans were mentioned along with current king. Which started from Ghauri and ended with Sultan Alauddin bin Sultan Muhammad Shah. But there is no mention of Razia Sultan here, there is a detailed mention of twenty one coins in this chapter. Similarly, Afif has also mentioned the fields, rivers, fruits and flowers on the occasion of the foundation of the city of Hisar Firoza. In the second part of seventeenth chapter, he writes under the title of the happiness of the

Scanned with OKEN Scanner

people related to the Firoz shah period that during this period, soldiers, scholars, traders and agricultural people, farmers, each achieved profit and progress in their own fields. The king grants millions of taangeh annually to each class of the society as an aid. From which people has been happy. The poor groups of the society who were in distress, they have been given one crore taangeh per annum which has relieved their sufferings. In this chapter, Afif mentioned a book under the title of ruins of Delhi" which is attributed to Afif and is unpublished.

In the ninth chapter of the fourth part, the author has mentioned about the construction of tall minarets built by Firoz Shah. It has been mentioned that Firoz Shah built these two minarets which were located at the foot of the mountain in Mouza Navira in the suburbs of Salura and Khizrabad and the second minaret in Meerut, the author writes about these minarets that these two minarets were located in the same places during the reign of the Pandavas and no king of Delhi was lucky enough to move these minarets to the city of Delhi, but Firoz Shah did it. With great zeal and effort these two minarets were installed in Delhi. One was installed adjacent to the Juma Masjid inside Kaushik-e- Firozabad and named after him. The second minaret was brought to Kaushik-e- Hisar. Along with the installation of these minarets, the author Afif told about his age that he was only twelve years old at that time. We get this important information from this chapter.

Just as Burney's mouth was never tired of praising Firoz Shah and his era, Afif is also not behind in this race. He writes about the installation of these minarets. That a few lines in Hindi are engraved on them in silver, which no one has been able to read but according to a tradition that some Hindus have read it and it is written on them that no Muslim or non-Muslim king will be able to move these minarets except in the last age a king named by Firoz Shah. We do not know that which tradition Afif has mentioned or he himself has created this because till today these inscriptions on Minarets could not be read. It shows only the praise of king.

Scanned with OKEN Scanner

The twelfth chapter of the fourth part deals with “king's attention to the conditions of the idle nobles”. It was a great step taken by Firoz Shah for the welfare of them otherwise who cares after the work is over. He issued a decree that idle persons in the city should be brought before him. Workers did the same. He engaged every idle person in some work or occupation. In this way, the noble class did not come forward due to shame and honor. And used to live a poor life. Or those people who used to sit in front of the court every day to find out who was arrested in the royal court, who was deposed and who was arrested so that they could get a job in their place. The problems of all these persons were solved by the king in this way. But here it would be inappropriate to say that these works were done only during the reign of Firoz Shah, it is not like that. Social evils were also present in the time of Iltutmish. One of the evils that have been criticized in all ages was the prostitute and her profession, about which we find important information in Burney's Tarikh-e-Firoz Shahi. About the reign of Iltutmish, Barni writes that on one hand Syed Nooruddin Mubarak Nagauri used to declare all the habits of the king against the Sunnah but On the other hand, they were against expelling prostitutes from Delhi. And they used to say that if this is done, stray people will jump into the houses of nobles. But it is not necessary that everyone has the same idea because Alauddin's opinion was different in this matter. When he undertook the reformation of unscrupulous elements, he forced the prostitutes to leave their profession and live a life of chastity. Sultan forced them to marry. Amir Khusro has also written that:

"برهمه به عقد حباله پای بند گشته، کار پرهیز گاری ایشان بجای کشیده که در پرده ستر به هنگام تافتن ریشه دامنی به ندامت تمام دست بر دست می مالند. فی الجمله هرچه ماده فسق و فجور بود، چنان منقطع گشت".

The list of good deeds of Firoz Shah is very long. In the construction of buildings, which has been mentioned in the previous pages. He has done some fabulous works. He built buildings everywhere in every place and in every city. Among

Scanned with OKEN Scanner

them are Qila, Hisar, Kaushik, such as Kaushik-e- Firozabad, Kaushik-e- Nuzuli, Fahidari, Kaushik-e- Shahr-e- Hisar, Kaushik-e- Fatehabad, Kaushik-e- Jaunpur, Kaushik-e- Sapura, Kaushik-e- Band Fateh Khan. Apart from this, there are monasteries and inns built for travelers. Afif gives important information in this regard and tells that Firoz Shah built about one hundred and twenty monasteries all over in Delhi, travelers could stay in the monasteries for three days as a royal guest. In this way, a traveler in one hundred and twenty monasteries could comfortably become a royal guest for a whole year. King paid special attention to the repair of tombs, graves and shrines, in this matter, according to Afif, during the reign of the pious king, the living and the dead continued to benefit equally. And building construction reached its peak during the forty years of Firoz Shah's reign. Many almshouses and sanatoriums were also built for the welfare of the people.

In the fifteenth chapter of the fourth part, important details of Eid celebration and Shab-e-Barat have been also provided. Like ancient kings, Firoz Shah also actively participate in such celebrations. According to Afif, the kings themselves used to get so much involved in the preparations and arrangements of the celebration that they used to wake up the night before and see all the work themselves and provides all the necessary means. On the day of Eid, the palace was decorated and all the rituals of Eid were performed. The ensign was not allowed to appear on that day. All the people saluted and prayed before the king according to their status. After them, a group of singers would enter who were wearing saffron clothes and red dastar. This cloth used to be very costly, one person`s cloth price used to be forty thousand tangeh. Reward and prize was also given to Qawwals and Ahl-e-Tarab on this day. In this chapter, information is also provided about Shab-e-Barat that there was a lot of fireworks that night. And fire person used to hire for the fire work. On every third night during Kaushik-e-nuzul, torches and lamps were lit so much that night turned into day. Every third night drums were played and various fireworks

Scanned with OKEN Scanner

took place. People could see these things. For three days, these kinds of works used to happen. The kings rarely attend such functions, but the princes, khanans were always present. Fil banan and shutra banan used to offer clay made camel and elephants to the king, and the king rewarded them all.

In the seventeenth chapter important details have been given related to singers, wrestlers like the number of all these people was about to two to three thousands, yet the king used to meet all these people after the Friday prayer and see their tricks, wrestling and achievements and listen to the stories of the narrators, and used to reward these groups with immense rewards and blessings that everyone used to bring their small children even from Delhi to Firozabad, some children were even four or five years old. The reason for this was that the king used to reward everyone equally without any discrimination. Once the workers in turn decided to make a difference in these rewards, the king was shocked to find that these people wait seven days for Friday to come and bring their little children five kos for the reward, if it makes a difference in the reward, what will happen to them? If Firoz Shah's era is studied carefully, we find that he has done countless reformative works for the people, in addition to this, he also removed non-Sharia from Islam and Sharia law, for example idol carving or sculpting, painting, eating in gold and silver vessels, idols and animal figures on the flag, all these things were banned as it was against Sharia and the use of earthenware and stoneware started. In addition to some non-Sharia affairs that were practiced in the ancient times of the sultans, he abolished them. Like Dangana, means the wealth and resources that were collected for Zakat. One dang was charged for a tangeh, a custom that was against the Sharia. It was called as Mustagil. It was a government tax on houses and land, which was called land tax, for taking it, there used to be so much strictness that even widows, and the people of the poor class were not spared. Another strange thing was the amount of Jazari, in that if a butcher slaughtered a

Scanned with OKEN Scanner

female cow, he had to pay twelve jateels as a tax. People were distressful from all such taxes. It has been written in Fatuhat-e- Firoz Shahi that he prohibited women from visiting shrines, and put to an end to all such illegal and immoral practices and rituals. But Jizya was strictly collected from non-Muslims. In the fifteenth chapter of the fifth part, some strange men and women, birds and animals are mentioned, which are not devoid of pleasure, for example, tall and short men, bearded women, three-legged sheep, a red-beaked and white-legged crow, a white parrot, a river fish with a head equal to an elephant's head, a cow with five legs, All these creatures were considered to be miraculous and they were kept as an exhibition for some days in king`s court, so that people could learn from it. Afif himself confirms all these rarities and presents himself as an eye witness. Firoz Shah worked for the welfare of his peoples till his last breath. For example, decorating and repairing mosques, appointing imams and muezzins and approving lamps and other expenses so that all the mosques are illuminated. Apart from this, Firoz Shah paid special attention to the prisoners. And as far as possible, he released them from prison and showed justice in favor of the oppressed. Therefore, the book Tarikh-e-Firoz Shahi of Afif is an important source of the Firoz Shah`s period, which gives us the social and cultural history of that time.

REFERENCES:

1. Tarikh-e- Firoz Shahi, Afif, (Persian) ed. Maulvi Wilayat Hussain, publisher Asiatic Society of Bengal, Calcutta, 1890.

2. Tarikh-e- Firoz Shahi, Afif, (Urdu), translated by Maulvi Muhammad Fida Ali, Dar-ul-Tabb Jamia Osmania Sarkar-e- Aali, Hyderabad, Deccan, 1937.

3. Salatin-e-Delhi ke Mazhabi Rujhanat, Khaliq Ahmad Nizami, Edara-e-adabiat-e-Delhi, Gali Qasim Jaan, Dehli, 1981.

Scanned with OKEN Scanner

4. Awraq-e- Mosawwar, Ahd-e-Usta Ki Dilli, Khaliq Ahmad Nizami, Department of Urdu, University of Delhi, Delhi 1972.

5. Hayat-e- Sheikh Abdul Haq Muhaddis Dehlavi, Khaliq Ahmad Nizami, Nadwat al-Musannafin, Urdu Bazar, Delhi, published. Union Printing Press, Delhi, 1964.

6. Jame Tarikh-e-Hind (Ahd-e-Sultanate), Mohammad Habib - Khaliq Ahmad Nizami, National Council for Promotion of Urdu Language, West Block, R. K. Puram, New Delhi, 1984.

7. Muntakhab Al-Tawarikh, Mulla Abdul Qadir Badayuni, Translated by Mahmood Ahmad Farooqui, Publisher, Sheikh Ghulam Ali and Sons, Kashmiri Bazar, Lahore, 1962.

8. Khazain al-Futuh, Amir Khusrau, Morattib, Syed Moinul Haq, Aligarh, 1927.

9. A short History of Muslim Rule in India, Ishwari Prasad, Published by, The Indian Press, Ltd, Allahabad, 1939

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

Recent Developments in Teacher Education: An Overview of Commerce Teachers' Preparation

Dr. Praveen Kumar Surjan,
Assistant Professor, MANUU Campus, Varanasi,
Maulana Azad National Urdu University, Gachibowly, Hyderabad.

Dr. Suraj Bhan,
Associate Professor, Department of Commerce,
Dyal Singh College, University of Delhi, Delhi.

Dr. Akhilesh Kumar Gautam,
Assistant Professor, Department of Education,
H.N. B. Garhwal University, SRT, Campus, Badshahi Thaul, Tehri, Uttrakhand

Abstract;The country is as good as the teacher. In the educational pyramid, the teacher is the most significant academic and professional individual. In terms of how they are implemented, he or she is the centre around which all educational initiatives revolve. Teachers prepare persons and create manpower for every sector of human activity. Our children's futures and, thus, the future of our country is largely shaped by their teachers. In India, teachers were the most esteemed members of society due to their noble function. Teachers were just the best and most educated (NEP, 2020). They are responsible for establishing a learning society that is always changing in terms of its social, cultural, and ethical facets. The teachers are expected to have commitment and capacity to remain lifelong learners. They provide education to the younger generation and one also expected to guide the society. It is often said that one effective means of societal restoration, growth and development of the country is education.

In the present research paper, an attempt is being made to build a theoretical background based on the issues regarding the preparation of commerce teachers. This is particularly in terms of the knowledge, content and skills which have been highlighted as the areas of concern. An attempt is also made to look at the brief history of Teacher Education in general and with reference to commerce education so that the preparation of commerce teachers is understood by locating it in both the historical and the contemporary contexts.

Key words: Teacher, Teacher Education, Commerce Teachers' Preparation.

Scanned with OKEN Scanner

Introduction

The society that the education system is a part of is not apart from it. Caste, economic status, gender roles, cultural variety, and the unequal economic development that defines Indian society all have a significant impact on children's school involvement and access to education. However, there are also significant implications for education from globalization and the growth of market linkages into all areas of society. A new set of difficulties is brought about by the quality issue. It is necessary to look at the quality dimension from the perspective of the experiences created for the child's knowledge and abilities. "The quality, skill, and character of teachers are without a doubt the most important of all the several aspects that affect the quality of education and its contribution to national development; without good teachers, even the best educational system is bound to fail." according to the Kothari commission (1964–66). However, what is the precise function of education that requires qualified teachers?

Let us try to understand the kind of education that has prevailed in the Indian context since independence, it is seen that after the independence of India, the issues raised by schooling during the Freedom Struggle. The Secondary Education Commission (1952–53) and the National Education Commission (1964–66) both conducted a review of it. Up until 1976, the Indian Constitution's provisions on education gave state governments the authority to decide on any issue relating to curriculum and other aspects of schooling that fell under their purview. The Centre was solely able to advise the States on matters of policy. The National Education Policy of 1968 and the Curriculum Framework created by NCERT in 1975 were both first attempts to address these issues. Education was included to the Concurrent List of the Constitution in 1976, and the nation as a whole finally established a unified National Policy on Education in 1986. A standardized core component for the national curriculum was suggested by the NPE (1986). Additionally, the policy assigned NCERT the duty of creating the National Curriculum Framework and conducting regular reviews of it. According to the NEP (2020), education is essential to realizing one's full potential, creating a just and equitable society, and advancing national development. The foundation of India's ongoing rise and leadership in the world in terms of economic expansion, social fairness and equality, scientific breakthroughs, national integration, and cultural preservation is the provision of universal access to high-quality education.

The value of education was emphasized, and as a result, there was a larger need for schools and, intern, for qualified instructors. A significant overhaul of our educational system was required. It was argued that the nation's needs were not being met by the educational system at the time. In order to prepare teachers, these demands also necessitated modifications to teacher education. It became clear that teacher education encompasses more than just teacher preparation. In addition to

Scanned with OKEN Scanner

teaching knowledge, a teacher must help students develop their personalities since they will be citizens in the future and it is the duty of educators to raise morally upright people. Subject-specific preparation required to be done in addition to this overall preparation. Given that the topic of this research paper is business, it is important to comprehend how commerce schooling evolved.

Development of Commerce Education in India

In the nineteen hundred and sixties, on the basis of the recommendation of the Kothari commission, in order to prevent young people from climbing the educational ladder without a goal and to steer them in a more productive direction, a separate educational stream known as the vocational stream was developed at the +2 stage of senior secondary education nationwide. To increase the employability of the graduates, emphasis was placed on offering skill-based education and training. The academic stream and the vocational stream are the two different educational streams that are currently prevalent in the nation. Both the academic and practical streams offer instruction in commerce. A commerce teacher would therefore be crucial to both programs. Teachers of commerce should be prepared for both academic and professional streams.

But currently, the most widely held belief is that higher secondary commerce education should offer students with a fundamental grasp of the many business-related concepts, processes, and practices, rather than just meeting their skill or occupational demands. It should also promote knowledge of the economy and the community where business and industry-related activities are conducted. It should equip the students to pursue careers in business. Thus, in addition to teaching pupils, commercial knowledge and skills is required, secondary schools should also teach them about the history of commerce and how it impacts community life. Many contemporary educational philosophers endorse this integrative approach to liberal and practical education. It is suggested that education should help people become proficient in knowing and understanding the concepts in very well approach. As a result, it becomes clear that commerce ought to be studied as a subject involving both knowledge and skills.

Subsequent to this understanding of development of education and commerce education, it becomes significant to understand how teachers have been prepared in India. This would enable us to understand the preparation of commerce teachers as well in a historical context.

Preparation of Teachers

Earlier Period

The education whether of the young ones or for would be teachers have always remained a matter of great concern in a developing country like India. Teaching in ashramas, pathshalas, maktabs or madrasas did not require any formal training on the part of teachers. In ancient India, a senior student called Jatak, under the

Scanned with OKEN Scanner

supervision of a guru, used to teach the scriptures and theology to junior students. He thus learnt the art of teaching. *Though neither any teacher training course existed nor any formal recognition to a practitioner* through awarding of certificate was in vogue, it was necessary for a teacher to have a scholarly bend of mind, high degree of intelligence and devotion to acquire perfect mastery of the subject.

In the medieval period, the monitorial system of education was in vogue in India. The teachers used to identify and select few talented scholars who sere intelligent and bent of acquiring knowledge. Such scholars used to get some special attention from their teacher who would detain them in the school for a longer period and make them competent to take over charge of younger and the mediocre pupils. This batch of monitors after having gained maturity, knowledge and ability in taking charge of the younger colleagues, *brought in an element of teacher training in the history of teacher education for the first time*.

The attention on the growth and development of teacher education was not given by the foreign rulers till the end of the eighteenth century. The foreign missionaries started a few institutes for teachers training especially for the primary grade teachers. In 1856, a government normal school was established in Madras. The status of the school was changed in a college in the year 1886. It was the first college where secondary school teachers were trained. It was for the first time in Indian history that an Indian Education Commission, known as 'Hunter Commission' was suggested to inquire into the character and quality of the instruction imparted in secondary school education. The commission made various suggestions such as: training should be made compulsory qualification for school teacher, separate curricula for graduate and matriculate teachers should be framed, and secondary school teachers must take an examination in theory and practice of teaching.

After Independence:

The term teacher education began to be used after independence. A new concept of teacher education was emerged and the emphasis under this new concept was that the teachers should not only be trained but they should be educated and that teacher should be skillful and weightage should be given to the practice and theory papers too.

The University Education Commission of 1948-49 recommended several improvements to teacher training, including:

- **Expanding training facilities**: Increasing the number of places for teacher training
- **Lengthening training programs**: Making teacher training programs longer
- **Creating specialized institutions**: Establishing teacher education institutions like DIETs and IASEs

Scanned with OKEN Scanner

- **Prioritizing in-service training**: Focusing on training teachers who are already working
- **Strengthening standards**: Improving the rules and standards for teacher education
- **Improving professional development**: Supporting teachers' professional growth through ongoing training and education
- **Creating orientation and refresher courses**: Offering orientation programs and refresher courses for teachers
- **Developing curriculum**: Including topics like societal issues, the education system, and management training
- **Evaluating teachers**: Using exams, projects, and participation to assess teachers

The commission also recommended that new teacher education institutions be located in an environment that encourages multidisciplinary and interdisciplinary work.

The Secondary Education Commission (1952-53) recommended several things for teacher education, including:

- **Training institutes**: Establish teacher training institutes to improve teacher training
- **Training programs**: Offer two-year training programs for those with a school leaving certificate or higher secondary school leaving certificate
- **Graduate training**: Offer one-year training programs for graduates, with the option to extend to two years
- **Training institutions**: Affiliate graduate training institutions with universities, and have secondary grade training institutions under a separate board
- **Training stipend**: Provide a stipend to pupil-teachers during training
- **In-service training**: In-service teachers should get chance to complete refresher courses, short intensive courses, workshops, seminars, and professional conferences as part of training.
- **Training institutions**: Have training institutions work closely with the Department of Education and schools
- **Teacher salaries**: Pay teachers well so that society respects them
- **Teacher benefits**: Provide teachers with pension, provident fund, and life insurance benefits
- **Teacher children**: Provide free education to the children of teachers
- **Teacher medical care**: Provide free medical service to teachers and their dependents

The Kothari Commission (1964-66) recommended several measures to improve teacher education, including:

Scanned with OKEN Scanner

- **Improve service conditions**: Provide teachers with adequate salaries, benefits, and working conditions
- **Establish quality assurance**: Create a statutory body to regulate teacher training institutions
- **Integrate practical training**: Increase opportunities for teachers to practice teaching
- **Raise the status of teachers**: Promote the profession to attract talented people
- **Provide on-the-job training**: Establish a system for ongoing training for teachers
- **Establish minimum pay scales**: Set minimum pay levels for teachers based on location

The Kothari Commission was established to examine India's education system and advise the government on how to improve it. The commission's recommendations helped guide major reforms to India's education system.

More Recent Developments:

This was followed by the formulation of the NPE 1986, the NCF 2000 and 2005. The more recent National Education Policy 2020 and the Position Paper released on Teacher Education gave significant recommendations and implications for the teacher education programs in future.

The National Policy on Education (NPE) of 1986 recommended several reforms to teacher education in India. These included:

- **Training programs**: Improve teacher training programs and establish new teacher training institutions
- **Teacher status**: Enhance the status and working conditions of teachers
- **Centrally sponsored schemes**: Launch centrally sponsored schemes to establish new teacher training institutions
- **District Institutes of Education and Training (DIETs)**: Establish DIETs to provide pre-service and in-service training to elementary school teachers
- **Continuing education**: Emphasize the need for continuing education for teachers
- **Networking**: Create networking arrangements between institutions of teacher education and university departments of education
- **National Council of Teacher Education**: Established the National Council of Teacher Education with the resources to accredit teacher education institutions and provide affiliation to teacher education programs too.

The NPE of 1986 also recognized teachers as the cornerstone of the education system. It also emphasized the removal of disparities and equalizing educational opportunity.

Scanned with OKEN Scanner

The National Curriculum Framework (NCF) 2000 provides several important recommendations for teacher education in India. These recommendations aim to improve the quality of education by enhancing teacher preparation, professionalism, and pedagogical practices.

The overarching aim is to create an education system that nurtures creativity, critical thinking, and active participation in society.

The **National Curriculum Framework (NCF) 2005** for Teacher Education provides a comprehensive vision for improving teacher preparation, emphasizing pedagogical renewal, professional development, and the holistic growth of teachers. It builds on the insights from NCF 2000 and makes significant strides toward aligning teacher education with the changing needs of society and the educational system. **NCF 2005** emphasizes a shift towards a more reflective, flexible, and inclusive approach to teacher education, which is focused on nurturing teachers who are not only knowledgeable in their subject areas but also skilled in addressing the diverse learning needs of their students. Teachers are seen as active participants in shaping the future of education, and the framework underscores the importance of ongoing professional development, critical thinking, and a strong commitment to values and ethics in the teaching profession. The expectations from teachers and their role are shifting from that of being a source of knowledge to being a facilitator in the child's construction of his/her own knowledge. In the light of the expectations, the role of teachers has undergone a shift in focus. It affects the preparation of teachers I general and that of subject-teachers including Commerce, in particular. (in teacher education institutions.)

The National Curriculum Framework for Teacher Education (NCFTE) 2010 offers a set of recommendations aimed at revamping the teacher education system in India. The framework emphasizes the need for a comprehensive, learner-centred, and reflective approach to teacher training, aiming to address the diverse challenges faced by teachers and ensure they are better equipped to meet the demands of modern classrooms. The NCFTE 2010 aims to make teacher education more holistic, reflective, inclusive, and professional. By focusing on a constructivist approach to learning, integrating theory with practice, and fostering continuous professional development, the framework aims to prepare teachers with the skills, proficiency and values needed to meet the evolving needs of pupil and society.

The National Education Policy (NEP) 2020 anticipates a broad vision for transforming educational landscape of India, with a specific emphasis on improving education for teachers to meet the importunity of the 21st century. It recognizes that teachers in the society play a crucial character in shaping the quality of education, and their development is a priority for ensuring better learning outcomes for students. The NEP 2020 for teacher education emphasizes a

Scanned with OKEN Scanner

transformative transpose in preparing educators who are not only knowledgeable in their subjects but also capable of fostering critical thinking, creativity, inclusivity, and technological literacy in their students. The focus is on ensuring that teachers receive a well-rounded, continuous, and reflective education, while also emphasizing the development of teachers as professionals and lifelong learners. By addressing these areas, the NEP 2020 objectives to elevate the quality of teaching and, intern, improve the quality of education in India.

Preparation of the teachers in the context of Recent Developments in Teacher Education:

It is very profound and easy to locate that in the present scenario teacher education has to respond sensitively for emerging demands from school and classroom. In this light one finds it immensely important to understand the role of teachers in general and also to earmark the role of teachers of various disciplines. It is obvious that the specific disciplines on one hand challenge the teachers to adopt some specific ways and means to encourage teaching-learning situations, on the other hand they demand that teachers must also follow the most commensurate role according to the needs of classroom and learners in the present time.

In order to situate the questions of this research it becomes a necessity to outline a frame, which describes the vision of and expectations from an emerging commerce teacher. There is no existing framework that defines the preparation of teachers of different disciplines separately. All the existing theory about teacher preparation and teacher education provides the basis to delineate requirements of teacher preparation in three major disciplinary categories i.e. science, language and social science. NCF 2005 and NCFTE 2010 also draw upon the large body of teacher education theory and the discourse of teacher preparation to make observations and recommendations about emerging teacher preparation in India.

Viewing the Preparation of Commerce Teacher in the context of relevant developments in Teacher Education:

Based on the discussion in the previous sections, the researcher has tried to build up a vision of preparation of a commerce teacher in the following paragraphs.

There is no dichotomy in the envisaged role of teachers of any subject area considering that thrust of teacher preparation remains the same irrespective of subjects taught. So, teacher education addresses and arrives at integrative practices, makes reflective teaching central aim of teaching-learning process, and focuses on building capacities of teachers to enable learners construct knowledge. It also acknowledges learners as active participants engaging in enquiry, exploration, application and reflection and teachers as facilitators of knowledge in classroom. So it is pertinent to say that teacher today has some broadly defined role and

Scanned with OKEN Scanner

specific qualities to achieve that must also form part of all teacher preparation programmes.

Similarly, it can be argued, that commerce teachers must also showcase adeptness in acquiring this changing role and addressing the shift. Preparation of commerce teacher must therefore provide opportunities to actively engage in reflective practice and critical teaching situations. As the NCF2005 envisions, It should also focus on the participatory process in classroom where a teacher can share the social context of the learner and be sensitive to the needs of learners in diverse classrooms. It should enable the teachers of commerce view knowledge as personal experiences and constructed in context of teaching- learning. Thirdly, the teacher must obtain an opportunity to engage with multidisciplinary nature of the subject and emphasize the need to form linkages within the various content areas. Teachers must be made to see that there is no division between content and pedagogy and they must organize such situations of learning that allows more space for enquiry and exploration leading to creation of ideas, positions and construction of knowledge by the learners. It is therefore crucial to focus on the preparation of commerce teachers, the emerging linkages between commerce and other disciplines, addressing reflective and critical pedagogic processes, analyzing classroom as diverse and containing multiple realities, forging link between, content, pedagogy and technology to create more viable learning situations for construction of knowledge through well chosen tasks and processes. Developing teaching values and skills through building up professional competencies and strengthening personal development has to be an integrated aim. Lastly, it can be said that the theory of teacher education very specifically earmarks the shift in preparation of teachers in the present scenario and it is significant to view these changes in teacher education programme to prepare advanced and potential teachers.

Summarization

After re-visiting the focal points as highlighted by the various Commission and Committees on Education and Teacher Education and the Emerging Role of the teacher, the role and place of Commerce teacher can be understood in the following context. This is also based on our understanding of the discipline of Commerce per se.

Generally commerce teachers are expected to teach Business Studies and Financial Accountancy at +2 level in the schools. Seeing the nature of two subjects, commerce teachers should have the following qualities:

- Since commerce-based subjects are being taught at +2 level of the school, commerce teachers need to be post graduates in commerce along with degree of B.Ed. with commerce-based teaching subjects.

Scanned with OKEN Scanner

- Commerce teachers are expected to familiar with the latest business developments.
- Commerce teachers should be good facilitator, as a facilitator he/she should encourage inter-action and engages the students in the thinking process to solve their problems.
- A commerce teacher needs to be a good career counselor.
- Commerce teachers should have the knowledge of computer operations to make the learners understand accounting procedures in accounting software.
- Commerce teachers should have the capacity to organize the business related co-curricular activities e.g. trade fairs, exhibitions, meetings and interviews, etc.
- Commerce teachers should be reflective to enhance the professional growth of teaching and learning process.

Conclusion

The understanding of concepts based on developments in education, teacher education and the various suggestions given by the Education Commissions, Committees and National Curriculum Frameworks have been discussed in this chapter. The understanding of these has helped to clarify the direction of the research and enabled the researcher to understand the issues involved in the topic. The way that knowledge is portrayed in textbooks and other resources must be considered in light of the greater issues that the country and humankind are currently experiencing. Every subject in the curriculum cannot ignore these more significant issues, so the suggested knowledge for each subject area must be carefully considered in light of the socioeconomic and cultural contexts and objectives. In order to meet this challenge, we must prioritize social justice and quality in curriculum reform.

It is necessary to have a clear orientation toward values related to harmony and peace. Concern for life quality in all of its aspects is a component of excellent education. Therefore, rather than being merely value premises, a concern for peace, environmental preservation, and a propensity for social change must be seen as essential elements of quality. The NEP 2020 for teacher education emphasizes a transformative shift in preparing educators who are not only knowledgeable in their subjects but also capable of fostering critical thinking, creativity, inclusivity, and technological literacy in their students. The focus is on ensuring that teachers receive a well-rounded, continuous, and reflective education, while also emphasizing the development of teachers as professionals and lifelong learners. By addressing these areas, the NEP 2020 aims to elevate the quality of teaching and, in turn, improve the quality of education in India. Hence all the commission and policy recommended the importance of holistic teacher development, which includes not only subject knowledge but also an understanding of pedagogy,

Scanned with OKEN Scanner

psychology, ethics, and socio-cultural contexts. Teacher education should promote the overall development of teachers—intellectual, emotional, social, and moral.

References:

Government of India (1948-49). Report of the University Education Commission, Ministry of Education. New Delhi.

Government of India (1952-53). Report of the Secondary Education Commission; Ministry of Education. New Delhi: ND.

Government of India (1964). Report on Teacher Training; Committee on Plan Project.

Government of India (1964-66). Report of the Education Commission: Education and National Development, Ministry of Education. New Delhi: ND

Government of India (1986). Report of the Committee for review of NPE-1986, Ministry of Education. New Delhi: ND

Government of India (1992). Programme of Action on NPE 1986. Ministry of Human Resource and Development. New Delhi: ND.

Teacher Education and Research, Vol.2 No.1, June 2007 23-30 Impact of Teacher Training Programme on B.Ed. Students' Motivity, Attitude towards Teaching and Personality

Journal of Teacher Education and Research, Vol.4 No.2, December 2009 66-76 A Study of Attitude of Prospective Teachers Towards Teaching Profession, Classroom Teaching and Pupil Centered Practices

NCERT. (1988-92) Fifth Survey of Educational Research in India. Vol. 2.

NCERT. (1983-88) Fourth Survey of Educational Research in India. Vol. 2.

NCERT. (2005). National Focus Group on Teacher Education For Curriculum Renewal. New Delhi

Ruhela, S.P. (1990). Sociology of the Teaching Profession in India. (Ed). NCERT.

NCTE (1998). Curriculum Framework for Quality Teacher Education, New Delhi.

NCTE (1998). Policy Perspectives in Teacher Education: Critique and Documentation. New Delhi.

NCTE (2005). Draft Curriculum Framework for Teacher Education.

NCTE (2006). Discussion Document: Curriculum Framework for Teacher Education, New Delhi

NCTE (2009). National Curriculum Framework for Teacher Education: Towards Preparing Professional and Humane Teacher. New Delhi.

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

नृत्य की वैदिक अवधारणा

डॉ. सोनिया

सहायक आचार्य, संस्कृत,

इग्नू ,मानविकी विद्यापीठ,
नई दिल्ली

वेदों में नृत्य का उल्लेख समाज की समृद्धि, सांस्कृतिक उन्नति, और धार्मिक जीवन का प्रतीक है। यह केवल कला नहीं, बल्कि मानव जीवन के आनंद, उत्सव, और आध्यात्मिक अभिव्यक्ति का भी माध्यम है। अथर्ववेद में प्रश्न पूछा गया कि इस शरीर में किसने सञ्चालन दिया।113 ग्यारहवें काण्ड के आठवें सूक्त में, जिसका देवता अध्यात्म है, ऋषि कहते हैं कि आनंद, मोद, प्रमोद और नृत मानव शरीर में प्रवेश करते हैं।114 इससे यह स्पष्ट होता है कि नृत्य केवल भौतिक गतिविधि नहीं, बल्कि आध्यात्मिक अभिव्यक्ति का भी माध्यम है। अग्रिम काण्ड के दूसरे काण्ड के सूक्त में, जिसका देवता मृत्यु है, ऋषि मनुष्य को नृत्य, हास्य, और वीरता के साथ जीवन यापन करने का उपदेश देते हैं।115 यह नृत्य के जीवन-शक्ति और साहस के प्रतीकात्मक रूप को दर्शाता है। यजुर्वेद में नृत्य के लिए संगीत, ताल आदि का भी साथ में होने का उल्लेख उपलब्ध होता है116 नृत्य शब्द "नृत् "धातु से बना है, जिसका अर्थ है गात्र का विक्षेप। निरुक्तकार ने नर शब्द की व्युत्पत्ति में भी यही कहा है कि जो कर्म व्यवस्था में नृत्य करता है117, वह सभी प्रकार के विक्षेप करता है। इस प्रकार, यदि गात्र विक्षेप भावआश्रित है तो उसे नृत्य कहा जाता है118 तो नृत्य कहलाता है। इसी नृत् धातु से औणादिक "कु "प्रत्यय होने पर पुल्लिंग में संज्ञावाचक नृतु :शब्द बनता है।119 नृतु शब्द का प्रयोग 10बार हुआ है।120 जिनमे इंद्र देवता को नृत्य और उल्लास के साथ जोड़ा गया है। इंद्र के साथ-साथ उनके सहचर *मरुत* और *अश्विन* भी नृत्य करते हुए चित्रित किए गए हैं। मरुतों तथा अश्विन देवताओं को भी नृत्य और संगीत

113को अस्मिन्नेतो न्य दधात्तन्तुरा तायतामिति। मेधां को अस्मिन्नध्यौहत्को बाणं को नृतो दधौ ॥- अथर्ववेद (10.2.17)

114आनन्दा मोदाः प्रमुदोऽभिमोदमुदश्च ये। हसो नरिष्टा नृत्तानि शरीरमनु प्राविशन् ॥- अथर्ववेद (11.8.24)

115इमे जीवा वि मृतैराववृत्रन्नभूद्भद्रा देवहूतिर्नो अद्य। प्राञ्चो अगाम नृतये हसाय सुवीरासो विदथमा वदेम ॥ अथर्ववेद (12.2.22)

116 (30.20)

117नरा मनुष्या नृत्यन्ति कर्मसु ।- ,

118भावाश्रयं नृत्यं – दशरूपक,1.9

119पुं,(नृत्यतीति । नृत् + बाहुलकात् कुः ।) नर्त्तकः

120ऋग्वेद 1.92.4,1.130.7,2.22.4,5.52.12,6.29.3,6.63.5,8.20.22,8.24.9,8.24.12,10.29.2

Scanned with OKEN Scanner

से जोड़ा गया है। इस प्रकार नृत्य केवल आनंद और उल्लास का प्रतीक नहीं है, बल्कि यह प्रकृति और ब्रह्मांडीय ऊर्जा की गति और ताल का भी द्योतक है। सम्पूर्ण वेद में 'नृत्य 'शब्द का प्रयोग संज्ञा तथा क्रिया वाचक पद के रूप में 11 बार किया गया है। ऋग्वेद में एक बार एवम् अथर्ववेद में दस बार उल्लेख है।

ऋग्वेद के इस मंत्र121 में नृत्य का दृष्टिकोण एक व्यापक और गहन आध्यात्मिक भाव को अभिव्यक्त करता है। यह केवल भौतिक गति का वर्णन नहीं करता, बल्कि ब्रह्मांडीय ऊर्जा, प्राकृतिक गतिविधियों, और जीवन के साथ उसके संतुलन को भी व्यक्त करता है। जब सूर्य की रश्मियाँ पृथ्वी पर पड़ती हैं, तो उनकी गतिशीलता और प्रभाव एक नृत्य के रूप में प्रकट होती है, जो न केवल जीवनदायिनी ऊर्जा का प्रतीक है, बल्कि प्राकृतिक ताल और सामंजस्य का भी सूचक है। वैदिक संस्कृति में नृत्य को आनंद और उत्सव के साथ-साथ एक आध्यात्मिक प्रक्रिया के रूप में भी देखा गया है। मन्त्र में आए "नृत्यतामिव "शब्द यह इंगित करता है कि यह गतिशीलता केवल बाह्य नहीं, बल्कि आंतरिक स्थिरता में भी परिलक्षित होती है। यह मंत्र प्रकृति के अनवरत प्रवाह और ऊर्जा के सतत् गतिशील स्वरूप को एक नृत्य के रूप में प्रस्तुत करता है, जो जीवन और ब्रह्मांड के बीच की अनिवार्य कड़ी है।

इस प्रकार, ऋग्वेद के ऋषियों ने नृत्य को एक कला से ऊपर उठाकर उसे ब्रह्मांडीय गतिविधियों और आध्यात्मिक अभिव्यक्ति का प्रतीक बनाया, जो हमें यह सिखाता है कि सृष्टि का हर तत्व एक गहन, संतुलित, और सामंजस्यपूर्ण नृत्य का हिस्सा है।

आनृत्यतः शिखण्डिनो गन्धर्वस्याप्सरापतेः।
भिनद्मि मुष्कावपि यामि शेपः ॥

अथर्ववेद के इस मंत्र122 में नृत्य को केवल शारीरिक गति या आनंद का माध्यम नहीं, बल्कि आत्मिक शुद्धि और ब्रह्मांडीय संतुलन का प्रतीक माना गया है। "आनृत्यतः "और "शिखण्डिनः123 "जैसे शब्द कर्म और उन्नति की गतिशीलता को दर्शाते हैं, जबकि "गन्धर्व124 "और "अप्सरापति125 "के रूप में परमेश्वर को सृष्टि के सौंदर्य और ऊर्जा का स्रोत बताया गया है। यहाँ नृत्य की अभिव्यक्ति मनुष्य के भीतर स्थित काम और क्रोध जैसे आंतरिक दोषों को पहचानने और उन्हें समाप्त करने की प्रक्रिया का प्रतीक है। यह नृत्य ब्रह्मांडीय ऊर्जा, आत्मिक शुद्धि और जीवन के प्रति संतुलित दृष्टिकोण का माध्यम बनकर वैदिक संस्कृति के गहरे आध्यात्मिक संदेश को उजागर करता है।

121यद्देवा अदः सलिले सुसंरब्धा अतिष्ठत । अत्रा वो नृत्यतामिव तीव्रो रेणुरपायत - ऋग्वेद (10.72.6)

122अथर्ववेद (4.37.7) :

123 अण्डन् - कृसृभृवृञः। उणादि कोष (1.129) इति शिख गतौ-अण्डन्, स च कित् तत इनि। गतिमन्तः। उद्योगिनः।

124 यो गां पृथिवीं धरति सः। गन्धर्वो वायुस्तस्य वातो गन्धर्वस्तस्यापो अप्सरसः। (श०ब्रा०९.३.३.१०)

125 अप+ सर+ टाप्। अप्सराः= अप+ सृ (गतौ) असुन्।

Scanned with OKEN Scanner

अथर्ववेद के मंत्र126)4/83/3) में नृत्य को एक गहन आध्यात्मिक और कर्मकांडीय अभिव्यक्ति के रूप में प्रस्तुत किया गया है। मंत्र में नृत्य को शक्ति और दिव्य आशीर्वाद के माध्यम से व्यक्त किया गया है, जो हमारे कर्मों को सही दिशा में ले जाने के लिए कार्यरत होती है। यहाँ नृत्य केवल शारीरिक गति का प्रतीक नहीं है, बल्कि इसे एक दिव्य शक्ति के रूप में देखा गया है, जो हमारे प्रयासों को शक्ति प्रदान करती है और हमें जीवन में समृद्धि और विजय की ओर मार्गदर्शन करती है। यह नृत्य, जो कर्मों और संकल्पों के साथ जुड़ा है, हमारे जीवन के उद्देश्यों की प्राप्ति और धन की रक्षा का माध्यम बनता है। इस प्रकार, नृत्य का उल्लेख इस मंत्र में जीवन शक्ति, उत्साह और ब्रह्मांडीय ऊर्जा के प्रतीक के रूप में किया गया है।

श्रेयःकेतो वसुजित्सहीयान्त्संग्रामजित्संशितो ब्रह्मणासि।

अंशूनिव ग्रावाधिषवणे अद्रिर्गव्यन्दुन्दुभेऽधि नृत्य वेदः ॥127

इस मंत्र के अर्थ को ध्यान में रखते हुए, नृत्य को एक शक्तिशाली और ब्रह्मांडीय गतिविधि के रूप में प्रस्तुत किया गया है, जिसे विशेष परिस्थितियों में किया जाता है। नृत्य तब करने को कहा गया है जब किसी विशेष लक्ष्य, जैसे)संग्रामजित् (शत्रु पर विजय प्राप्त करना,)वसुजित्(धन का अधिग्रहण करना, या)सहीयान् (जीवन के संघर्षों में सफलता प्राप्त करना, आवश्यक हो। यह नृत्य केवल शारीरिक गति का प्रतीक नहीं है, बल्कि यह एक आध्यात्मिक और तात्त्विक प्रक्रिया है, जो ब्रह्मांडीय ऊर्जा के प्रवाह को नियंत्रित करने और उसे अपने पक्ष में लाने का कार्य करता है। नृत्य को इस मंत्र में शक्ति और विजय के प्रतीक के रूप में दर्शाया गया है, और यह तब किया जाता है जब व्यक्ति को बाहरी संघर्षों)जैसे युद्ध, संघर्ष, या प्रतिस्पर्धा (में सफलता प्राप्त करने के लिए ब्रह्मांडीय सहयोग की आवश्यकता होती है। यह नृत्य ब्रह्माणीय ऊर्जा और आत्मविश्वास का प्रतीक है, जिसे शक्ति के साथ नियंत्रित और संचालित किया जाता है, ताकि शत्रु के धन और संसाधनों को वश में किया जा सके। इस प्रकार, नृत्य तब करने को कहा गया है जब व्यक्ति को आध्यात्मिक, मानसिक या भौतिक सफलता की आवश्यकता हो, और उसे ब्रह्मांडीय शक्तियों के साथ सामंजस्य स्थापित करने की आवश्यकता हो।

ये शालाः परिनृत्यन्ति सायं गर्दभनादिनः।
कुसूला ये च कुक्षिलाः ककुभाः करुमाः स्रिमाः।

तानोषधे त्वं गन्धेन विषूचीनान्वि नाशय ॥128

अथर्ववेद के इस मन्त्र के आधार पर नृत्य को एक रचनात्मक और शुद्धिकरण की प्रक्रिया के रूप में देखा जा सकता है, जहाँ व्यक्ति अपने आस-पास की नकारात्मक शक्तियों या विघ्नों को नष्ट करने के लिए अपनी शारीरिक और मानसिक ऊर्जा का प्रयोग

126यायैः परिनृत्यत्याददाना कृतं ग्लहात्। सा नः कृतानि सीषती प्रहामाप्नोतु मायया। सा नः पयस्वत्यैतु मा नो जैषुरिदं धनम् ॥ (अथर्ववेद 4.83.3)

127अथर्ववेद(5.20.10)

128अथर्ववेद(8.6.10)

Scanned with OKEN Scanner

करता है। यहाँ नृत्य का प्रतीकात्मक अर्थ यह है कि जैसे औषधि या उपचार से कीड़ों को नष्ट किया जाता है, वैसे ही नृत्य द्वारा मानसिक और आध्यात्मिक शुद्धता प्राप्त की जा सकती है, जो जीवन में सुख, शांति और समृद्धि लाती है।

ये कुकुन्धाः कुकूरभाः कृत्तीर्दूर्शानि बिभ्रति।

क्लीबा इव प्रनृत्यन्तो वने ये कुर्वते घोषं तानितो नाशयामसि ॥129

इस मंत्र में "नृत्य "का प्रयोग नकारात्मक शक्तियों, जैसे कीड़े और उनके कार्यों के संदर्भ में किया गया है। "प्रनृत्यन्तः "शब्द का प्रयोग यह दर्शाता है कि यह कीड़े किसी उद्देश्य के बिना, या बिना किसी सकारात्मक उद्देश्य के नाचते हैं, जैसे कि क्लीब के नृत्य का बोध होता है। यह नृत्य किसी आध्यात्मिक या शुद्धिकरण प्रक्रिया का हिस्सा नहीं है, बल्कि यह एक व्यर्थ, उद्देश्यहीन, और नकारात्मक गतिविधि के रूप में प्रस्तुत किया गया है। इन कीड़ों का नृत्य उनके अवांछनीय कार्यों)जैसे हिंसा, विकार और विघ्न उत्पन्न करना (को और अधिक बढ़ावा देने वाला होता है। इस प्रकार, नृत्य यहाँ पर गात्र विक्षेप और उद्देश्यहीन चेष्टा के रूप में देखा जा सकता है, जो किसी भी सकारात्मक या सार्थक परिणाम की ओर नहीं जाता। यह एक प्रतीकात्मक रूप से नकारात्मक कार्य है, जो जीवन में विघ्न और नकारात्मकता की उत्पत्ति करता है। इस मंत्र का उद्देश्य ऐसे विक्षेप को समाप्त करना है और नकारात्मक शक्तियों को नष्ट करना है, ताकि जीवन में शांति और सकारात्मकता बनी रहे।

तयोरहं परिनृत्यन्त्योरिव न वि जानामि यतरा परस्तात्।

पुमानेनद्वयत्युद्गृणत्ति पुमानेनद्वि जभाराधि नाके ॥130

यह मन्त्र नृत्य की क्रिया को जीवन, समय और ब्रह्मांड के निरंतर प्रवाह से जोड़ता है। "परिनत्यन्त्योः इव) "नृत्य-सा करती हुई (शब्द नृत्य की गतिशीलता और निरंतर परिवर्तन को दर्शाते हैं। यहाँ पर नृत्य एक रूपक के रूप में प्रस्तुत किया गया है, जिसमें उषा)प्रातः (और रात्रि की क्रियाएँ इस निरंतर चक्र को व्यक्त करती हैं। यह चक्र न जाने कब से चल रहा है और इसका कोई निश्चित प्रारंभ या अंत नहीं है, जैसे नृत्य की क्रिया भी अनंत और निरंतर चलनेवाली होती है। "पुमान्) "परम पुरुष (का उल्लेख ब्रह्मा या सृष्टि के सर्जक के रूप में किया गया है, जो इस सम्पूर्ण विश्वजाल को बुनता है और फिर उसे अपने उद्देश्य अनुसार उधेड़ता है)उत् गृणत्ति(। इसका मतलब यह है कि जीवन और सृष्टि की गतिविधियाँ (जिन्हें नृत्य के रूप में देखा जा सकता है (उसी परम शक्ति के द्वारा नियंत्रित होती हैं, जो उसे निरंतर रूप से उत्पन्न और समाप्त करता है। यह मन्त्र नृत्य को एक सशक्त प्रतीक के रूप में प्रस्तुत करता है, जो न केवल शारीरिक क्रिया है, बल्कि जीवन के निरंतर परिवर्तनों, ब्रह्मांडीय ऊर्जा, और परम पुरुष की रचनात्मक शक्ति का भी प्रतीक है। नृत्य एक ऐसा माध्यम है जिसके द्वारा ब्रह्मांड और जीवन के सृष्टिकर्ता का अदृश्य चक्र कार्य करता है, जो बिना थमे और निरंतर चलता रहता है।

129अथर्ववेद(8.6.11)

130अथर्ववेद(10.7.43)

Scanned with OKEN Scanner

अथर्ववेद का मन्त्र131 वेदवाणी और यज्ञ के महत्त्व को नृत्य और अन्य क्रियाओं के माध्यम से व्यक्त करता है। वेदवाणी को एक धेनु)गाय (के रूप में चित्रित किया गया है, जो यज्ञ में भाग लेने वाले व्यक्ति की आत्मा और जीवन को शुद्ध करती है। "ते चर्म "और "ते लोमानि "शब्दों में यह संकेत किया गया है कि व्यक्ति का शरीर और उसका अस्तित्व भी यज्ञ में समर्पित होकर धर्म और शुद्धता की ओर बढ़ता है। यहाँ नृत्य की क्रिया एक रूपक के रूप में है, जहाँ "एषा त्वा रशनाग्रभीद्ग्रावा) "यह रज्जु तुझे बांधती है, यह स्तोता तुझपर नृत्य करता है (का अर्थ है कि वेदवाणी, जैसे एक नृत्य की तरह, व्यक्ति के जीवन और कर्मों को नियंत्रित करती है और उसे धर्म के पथ पर चलने के लिए प्रेरित करती है। यह नृत्य एक आध्यात्मिक प्रक्रिया का प्रतीक है, जो व्यक्ति को शुद्ध करता है और उसे यज्ञ)आध्यात्मिक साधना (के माध्यम से ब्रह्मा या परम शक्ति के साथ जोड़ता है।मन्त्र में यह भी कहा गया है कि वेदध्यान और यज्ञ का अभ्यास करने वाला व्यक्ति शुद्ध और यज्ञशील बनकर दिव्य सुखों और शांति को प्राप्त करता है, जो स्वर्ग की ओर जाने का मार्ग है। नृत्य यहाँ जीवन के शुद्धिकरण, आत्मा के उन्नयन और आध्यात्मिक उन्नति के प्रतीक के रूप में प्रस्तुत किया गया है।

एक अन्य मन्त्र132 वेदवाणी)वशा (को एक दिव्य और उच्चतर शक्ति के रूप में प्रस्तुत करता है, जो मानव हृदय और आत्मा में प्रवेश करती है। यहाँ नृत्य)प्रानृत्यत् (का संदर्भ आंतरिक आनंद और जीवन के उद्देश्यों की पूर्ति से जुड़ा हुआ है। वेदवाणी को "समुद्र "के रूप में दर्शाया गया है, जो उस व्यक्ति के भीतर नृत्य करती है, जो मानसिक रूप से शुद्ध और प्रसन्नचित्त होता है। यह मन्त्र यह भी दर्शाता है कि वेदवाणी)सामानि और ऋचः (उन ऊँचे उद्देश्य वाले लोगों (पतत्रिभिः (के साथ संगति करती है, जो अपने जीवन में उच्चतम सिद्धियों की ओर अग्रसर होते हैं। "वातेन "शब्द का प्रयोग मन की गति और संकल्प को दर्शाता है, जो व्यक्ति के भीतर आध्यात्मिक उन्नति के लिए आवश्यक होते हैं।

संक्षेप में, यह मन्त्र नृत्य के माध्यम से जीवन की ऊँचाइयों को प्राप्त करने का संकेत देता है, जो मानसिक और आध्यात्मिक प्रसन्नता, ज्ञान और उद्देश्यों की पूर्ति के रूप में प्रकट होता है।

एक मन्त्र133 भूमि और समाज की स्थिति को चित्रित करता है, जहां गायन और नृत्य की क्रियाएँ युद्ध और संघर्ष के संदर्भ में स्थानांतरित होती हैं। इस मन्त्र में "गायन्ति नृत्यन्ति) "गाते और नृत्य करते हैं (शब्द का प्रयोग एक समृद्ध और शांतिपूर्ण वातावरण की ओर संकेत करता है, जिसमें लोग खुशी और उल्लास के साथ गायन और नृत्य करते हैं। दूसरी ओर, "युध्यन्ते) "युद्ध करते हैं (और "आक्रन्दो) "ललकार (शब्द युद्ध और संघर्ष की स्थितियों को दर्शाते हैं।

यह मन्त्र यह संदेश देता है कि भूमि पर जहां गायन और नृत्य होते हैं, वहां युद्ध और संघर्ष की कोई आवश्यकता नहीं होनी चाहिए। "सा नो भूमिः) "वह भूमि हमें प्रदान की जाए (और "सपत्नान् प्रणुदताम्) "हमें शत्रुओं से मुक्त किया जाए (शब्दों के

131वेदिष्टे चर्म भवतु बर्हिर्लोमानि यानि ते। एषा त्वा रशनाग्रभीद्ग्रावा त्वैषोऽधि नृत्यतु ॥ अथर्ववेद(10.9.2)

132सं हि वातेनागत समु सर्वैः पतत्रिभिः। वशा समुद्रे प्रानृत्यदृचः सामानि बिभ्रती ॥ अथर्ववेद (10.10.14)

133यस्यां गायन्ति नृत्यन्ति भूम्यां मर्त्या व्यैलबाः। युध्यन्ते यस्यामाक्रन्दो यस्यां वदति दुन्दुभिः। सा नो भूमिः प्र णुदतां सपत्नानसपत्नं मा पृथिवी कृणोतु ॥ अथर्ववेद (12.1.41)

Scanned with OKEN Scanner

माध्यम से यह प्रार्थना की जाती है कि भूमि शांति और समृद्धि से भरी हो, जहां संघर्ष और युद्ध की स्थिति उत्पन्न न हो। नृत्य और गायन को एक सकारात्मक और शांति के प्रतीक के रूप में प्रस्तुत किया गया है।

अथर्ववेद का ही एक अन्य मन्त्र एक दृश्य का चित्रण करता है, जहाँ नृत्य की क्रिया और उसकी प्रतीकात्मकता को अशुभ और पापपूर्ण क्रियाओं के साथ जोड़ा गया है। यहां "नृत्यन्ति) "नाचती हैं (शब्द का प्रयोग उन स्त्रियों के संदर्भ में किया गया है जो अशुभ क्रियाओं को प्रदर्शित करती हैं, जैसे कि अपने बालों को खोले हुए नाचना और पापपूर्ण ध्वनियाँ करना। इन स्त्रियों का नृत्य एक विध्वंस और बुराई के रूपक के रूप में प्रस्तुत किया गया है, जो उस स्थान पर आकर कोलाहल और अशांति फैलाती हैं।

इसके अतिरिक्त, "गृधाः) "गिद्ध (और "वृकाः) "भेड़िये (शब्दों के माध्यम से यह संकेत दिया गया है कि उस स्थान पर हानि और विध्वंस होता है, जहां यह नृत्य होता है। यह नृत्य और ध्वनि उस स्थान के विनाश और अधोगति का प्रतीक हैं, जहां अच्छे कर्मों की कमी होती है। मन्त्र का सार यह है कि नृत्य को यहां एक नकारात्मक और अशुभ क्रिया के रूप में चित्रित किया गया है, जो समाज या व्यक्ति के पतन और विघटन का कारण बनता है। यह एक चेतावनी है कि पाप और अशुभ कार्यों से जुड़ी नृत्य जैसी क्रियाएँ अंततः विध्वंस और विघटन का कारण बनती हैं।

इस प्रकार इन मंत्रों के माध्यम से नृत्य की क्रिया वेदों में एक गहन और बहुआयामी प्रतीक के रूप में प्रस्तुत की गई है। यह केवल शारीरिक गति का प्रतीक नहीं, बल्कि आध्यात्मिक और ब्रह्मांडीय शक्ति के प्रवाह का सूचक भी है। वेदों में नृत्य को जीवन के उद्देश्यों और ब्रह्मांडीय संतुलन के साथ जोड़ा गया है, जहां यह शुद्धिकरण, आत्मिक उन्नति और समृद्धि का माध्यम बनता है। नृत्य का उद्देश्य न केवल बाह्य क्रियाओं को व्यक्त करना है, बल्कि यह आंतरिक ऊर्जा और शक्ति को सक्रिय करने की प्रक्रिया है। यह जीवन की प्रवृत्तियों और ब्रह्मांडीय गतिशीलता को पहचानने का एक तरीका है। ऋग्वेद और अथर्ववेद में नृत्य को पृथ्वी, आकाश, और जीवन के सभी पहलुओं से जोड़कर दर्शाया गया है, जहां यह प्राकृतिक सामंजस्य और ऊर्जा के संचार का प्रतीक बनता है।

वेदों में नृत्य के माध्यम से शुद्धि और समृद्धि की प्राप्ति की जाती है। जब व्यक्ति नृत्य करता है, तो वह न केवल शारीरिक रूप से सक्रिय होता है, बल्कि अपनी मानसिक और आत्मिक स्थिति को भी सुदृढ़ करता है। नृत्य के माध्यम से जीवन की ऊर्जा को सही दिशा में मोड़ा जा सकता है, जिससे जीवन में समृद्धि और सफलता आती है। कुछ मंत्रों में नृत्य को बाहरी संघर्षों, जैसे युद्ध और शत्रुता, से विजय प्राप्त करने के रूप में प्रस्तुत किया गया है, जबकि अन्य में यह कर्म और संकल्प के साथ जुड़ी शक्ति का प्रतीक है। नृत्य तब किया जाता है जब किसी विशिष्ट उद्देश्य की प्राप्ति की आवश्यकता होती है, जैसे शत्रु पर विजय प्राप्त करना या आंतरिक शुद्धि की प्राप्ति। वहीं दूसरी ओर, कुछ मंत्रों में नृत्य को नकारात्मक और अशुभ क्रियाओं से जोड़ा गया है, जो समाज या व्यक्ति के पतन का कारण बनती हैं। यह दर्शाता है कि नृत्य, जैसे अन्य क्रियाएँ, अपने उद्देश्य और संदर्भ पर निर्भर करती हैं। सकारात्मक संदर्भ में नृत्य जीवन को उच्च उद्देश्य की ओर मार्गदर्शन करता है, जबकि नकारात्मक संदर्भ में यह विनाश और विघटन का कारण बन सकता है।

नृत्य का प्रतीकात्मक अर्थ यह है कि जैसे जीवन और सृष्टि निरंतर चलनेवाली प्रक्रिया है, वैसे ही नृत्य एक निरंतर गतिशीलता का संकेत है, जो सृजन और संहार के बीच संतुलन बनाए रखता है। यह सृष्टि के अनवरत चक्र को एक सुंदर और संतुलित रूप में व्यक्त करता है। नृत्य के माध्यम से व्यक्ति अपने भीतर की नकारात्मक शक्तियों को समाप्त करता है और आत्मिक शुद्धता प्राप्त

Scanned with OKEN Scanner

करता है। यह प्रक्रिया व्यक्ति को ब्रह्मांडीय ऊर्जा के प्रवाह से जोड़ती है और जीवन के वास्तविक उद्देश्य की ओर मार्गदर्शन करती है।

निष्कर्ष रूप में, नृत्य केवल एक शारीरिक क्रिया नहीं है, बल्कि यह जीवन के गहरे आध्यात्मिक और ब्रह्मांडीय पहलुओं का प्रतीक है। वेदों में नृत्य को शक्ति, संतुलन, और समृद्धि के प्रतीक के रूप में प्रस्तुत किया गया है, जो व्यक्ति को आत्मिक उन्नति और ब्रह्मांडीय ऊर्जा के साथ सामंजस्य स्थापित करने का अवसर प्रदान करता है।

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

भारत में मुस्लिम शिक्षा:अभाव और अल्प-विकास के ऐतिहासिक संदर्भ

डॉ. राहत हयात

सहायक प्रोफेसर, सीटीई, नूंह, मौलाना आजाद राष्ट्रीय उर्दू विश्वविद्यालय, हैदराबाद

सार

वर्तमान पेपर की कल्पना और प्रारूपण भारत में मुसलमानों की शिक्षा के एक व्यापक कैनवास पर किया गया है। भारत में मुसलमानों की शिक्षा से संबंधित कोई भी सार्थक चर्चा केवल उनके ऐतिहासिक,सामाजिक और मनोवैज्ञानिक संदर्भों और इस संबंध में अर्थ निर्धारण पर विचार करके ही संभव हो सकती है। ऐसा इसलिए है क्योंकि,वे सजातीय समुदाय नहीं हैं और ऊपर उल्लिखित सभी चिंताएं आपस में जुड़ी हुई हैं और एक-दूसरे पर प्रभाव डालती हैं। ये चिंताएं प्रत्यक्ष और अप्रत्यक्ष रूप से एक ओर उनकी सुरक्षा,पहचान और स्वतंत्रता से संबंधित हैं,और दूसरी ओर,कमी,अभाव और विकास से संबंधित हैं। यही कारण है कि इसमें उनके स्थानिक-अस्थायी,धार्मिक,सांस्कृतिक और अस्तित्वगत निर्धारकों से संबंधित वास्तविकता भी शामिल है।

Keywords: Muslim education, Deficit, Deprivation, Higher Education

परिचय:

भारतीय मुसलमान ऐतिहासिक,भौगोलिक और सांस्कृतिक रूप से अपने सामाजिक-ऐतिहासिक संदर्भों के आधार पर अलग-अलग विशेषताओं के साथ एक विषम समूह हैं। वर्तमान पत्र में चर्चा को उनके ऐतिहासिक,राजनीतिक-आर्थिक और सामाजिक-सांस्कृतिक संदर्भों में स्थापित करने का प्रयास किया गया है जो दोनों समुदायों के अपने इतिहास से प्रभावित हैं। इसलिए,मुसलमानों की एकरूपता से संबंधित बहस के लिए एक संक्षिप्त विवरण प्रदान करना आवश्यक हो जाता है,जिसे लेखक अन्यथा मानता है। यह भारत में मुसलमानों की शिक्षा को समझने के लिए एक स्पष्ट संदर्भ प्रदान करेगा।

अल्पसंख्यक अर्थात अंक का आकार

सभी अल्पसंख्यकों में से मुसलमान भारत में सबसे बड़े अल्पसंख्यक हैं। आमतौर पर,अल्पसंख्यक से संबंधित चर्चाएँ उनके अंकों के आकार के इर्द-गिर्द घूमती हैं। हालांकि,रीडिंग (एडवर्ड्स, 1981) अन्य सुझाव देती है,और इसे'*हीन या अधीनस्थ होने की स्थिति*' के रूप में संदर्भित करती है। इसका मतलब है कि अंकों के आकार पर विचार करना उचित आधार नहीं है जिस पर कि अल्पसंख्यक शब्द टिका हुआ है। वास्तव में,यह राज्य कल्याण योजनाओं के लाभों का सुचारू प्रवाह है जो उनके उत्थान के लिए

Scanned with OKEN Scanner

समुदाय तक पहुँचता है जो 'अल्पसंख्यक' स्थिति को निर्धारित करता है। यही कारण है कि दक्षिण अफ्रीका में अश्वेतों के बड़े अंकों का आकार अल्पसंख्यक है न कि गोरों का कम अंकों का आकार।

गैर-सजातीय समुदाय

मुसलमानों से संबंधित एक और आम गलतफहमी यह है कि अधिकांश लोग उन्हें एक सजातीय समुदाय मानते हैं। यह अक्सर उन्हें भारत में मुसलमानों की शैक्षिक स्थिति का निष्पक्ष रूप से विश्लेषण करने में विफल करता है। वास्तव में, मुसलमान अखंड सांस्कृतिक और पारंपरिक विशेषताओं का गठन नहीं करते हैं,बल्कि वे दूसरों की तरह ही उतने ही विषम हैं और विभिन्न संप्रदायों और विचारों के विभिन्न स्कूलों के साथ विविध हैं और भारत में किसी भी अन्य समुदाय की तरह एक अपरिवर्तनीय विश्वास प्रणाली और जीवन के तरीकों को साझा करते हैं। इस प्रकार,वे भी दूसरों की तरह ही खंडित और'जाति-ग्रस्त'हैं। इस प्रकार हम भारतीय मुसलमानों के बीच भेदभाव का एक मजबूत आधार देखते हैं। सामाजिक स्तरीकरण के साथ-साथ इस तरह के अंतर उनकी आर्थिक स्थिति में भी परिलक्षित होते हैं। इसमें कोई संदेह नहीं है कि वास्तव में वे न तो हिंदू जाति व्यवस्था से मिलते-जुलते हैं और न ही पश्चिमी वर्ग व्यवस्था से;बल्कि अपनी विविध जातीयता और विभिन्न धार्मिक विचारधाराओं के माध्यम से स्पष्ट सीमाएँ खींचते हैं। घोष और नाथ (1996)ने उन्नीसवीं शताब्दी की शुरुआत में मुसलमानों के बीच अस्सी जातियों और सामाजिक स्तर के तीन समूहों का उल्लेख किया है। तीन व्यापक समूहों में अशरफ(उच्च जाति के मुसलमान)अजलाफ (निचली जाति के मुसलमान)और अरजल शामिल थे। पहले समूह में सैयद,शेख, पठान और मुगल शामिल हैं। अजलाफ को'स्वच्छ'और'अशुद्ध'श्रेणियों'में विभाजित किया गया है।'स्वच्छ' श्रेणियों में कारीगर और अन्य पेशेवर लोग शामिल थे,जबकि'अशुद्ध'में अन्य लोगों के साथ-साथ मैला ढोने वाले भी शामिल थे। अरज़लों को हिंदू दलितों के बराबर माना जाता है। बिहार में हाल ही में की गई जातिगत जनगणना भी मुसलमानों की कई जातियों और उप-जातियों को दर्शाती है। तथ्य यह है कि अधिकांश भारतीय मुसलमान'अछूत'और'निम्न' जाति के धर्मांतरित लोगों के वंशज हैं,जिनमें से केवल एक छोटे से अल्पसंख्यक की उत्पत्ति अरब,ईरानी और मध्य एशियाई बसने वालों से हुई है। मुसलमान,जो विदेशी मूल के होने का दावा करते हैं,वे खुद को अशरफ या कुलीन के रूप में उच्च दर्जा देते हैं। इस वर्गीकरण के अनुसार,भारत की 75% मुस्लिम आबादी अजलाफ श्रेणी में आती है। मुस्लिम,अर्थात् सैयद,शेख,पठान और मुगल, कसाई (कसाई)फकीर(भिखारी)और दफाली के अलावा अखिल भारतीय स्तर पर वितरित किए जाते हैं,जबकि अन्य समुदायों को क्षेत्रीय स्तर पर अलग-अलग वितरित किया जाता है।

दो प्रमुख विभाग: शिया और सुन्नी

इनके अलावा,मुसलमानों के बीच दो मुख्य विभाजन सुन्नी और शिया हैं। शिया का नाम अरबी शब्द शाह से लिया गया है, जिसका अर्थ है'पार्टी'या'समर्थक',और हजरत अली-चौथे और अंतिम खलीफा के समर्थकों को संदर्भित करता है। शिया पैगंबर मुहम्मद से वंश की दिव्य रेखा के माध्यम से अपने इमामों के आध्यात्मिक अधिकार और अचूकता में विश्वास करते हैं। वे अहल-अल-बैत के उद्देश्य और व्यक्तियों के प्रति भावनात्मक समर्पण आकर्षित करते हैं। वर्षों से शियाओं को विभिन्न समूहों में विभाजित

Scanned with OKEN Scanner

किया गया है,हालांकि उनमें से कई अल्पकालिक साबित हुए हैं। शियाओं में सबसे बड़े समूह बारह-इस्ना अशरी या जाफरी हैं, इसके बाद इस्माइल और जायदी हैं। नब्बे प्रतिशत शिया बारह इमामों में विश्वास करते हैं। इस्माइल पहले सात इमामों में विश्वास करते हैं,जबकि जायदी पहले पांच इमामों को मुहम्मद के सही उत्तराधिकारी के रूप में मानते हैं। शियाओं के बीच सैयद (पैगंबर मुहम्मद के वंशज) स्वयं कई उप-समूहों जैसे आबिदी,हसनी,हुसैनी,जैदी और रिज़वी में विभाजित हैं। सुन्नी इन उपखंडों का पालन नहीं करते हैं और हमेशा सैयद को अपने उपनाम के रूप में उपयोग करते हैं।

सुन्नी इस्लाम शब्द अहल-अल-सुन्नाह वल-जामा का एक छोटा रूप है। वे पैगंबर मुहम्मद की परंपराओं (सुन्नत) को आधिकारिक मानते हैं और मुहम्मद के पहले चार उत्तराधिकारियों के समग्र क्रम को स्वीकार करते हैं (अबू बकर,उमर,उस्मान और अली)।अनुष्ठानों और कानूनों में अंतर सुन्नी को चार रूढ़िवादी और परंपरावादी विचारधाराओं के अनुयायियों में विभाजित करता हैः हनफी,मलिकी,शाफई और हम्बली। इनके अलावा,कई अन्य विशेषताएं हैं जो एक मुस्लिम समूह को दूसरे से अलग करती हैं,यहां तक कि प्रमुख सुन्नी समूह के भीतर भी,उदाहरण के लिए,कानून के स्कूल (हनफी,मलिकी,शाफई और हम्बली) के आधार पर रहस्यवाद (सूफीवाद)और निरंतरता पर उनकी स्थिति पर ध्यान दिया जाता है।

मुस्लिम समुदायों की सामाजिक स्थिति:

मुस्लिम समुदायों की सामाजिक स्थिति,उनकी स्व-कथित स्थिति और दूसरों द्वारा महसूस की जाने वाली स्थिति के संदर्भ में वर्गीकृत की जा सकती है।सैयद के मामले में 'उच्च-उच्च' के रूप में वर्गीकृत किया जा सकता है। मुगल के मामले में'उच्च'के संदर्भ में वर्गीकृत किया जा सकता है। शेख,पठान,नक्कल,राजपूत,मेव,घोसी,गद्दी,पंजाबी,मुस्लिम सौदागर और अरीन के मामले में'मध्यम-माध्यम'के संदर्भ में वर्गीकृत किया जा सकता है।'मध्य-निम्न'श्रेणी में अब्बासी,भिश्ती,सक्का,मिरासी,कसाई,फकीर और तेली शामिल हैं। और'निम्न-निम्न'में नलबंद,मच्ची,कनमेलिया,कलंदर और दफाली हैं।

इस प्रकार,मुसलमानों के बीच विभिन्न समुदायों में सामाजिक पदानुक्रम भी स्पष्ट है,जिसमें ऊपर की ओर गतिशीलता के लिए एक मजबूत आग्रह है। यह स्वभाव से ईश्वरशासित से अधिक सांस्कृतिक है। अधिकांश मुसलमानों के पास अपने वंश,अनुष्ठानों और रीति-रिवाजों के संबंध में श्रेष्ठता की हवा थी। सभी मुस्लिम समुदायों में संप्रदायों,वंश,पारिवारिक सम्मान, सामाजिक-आर्थिक संरचना, अमल-ए-सालेह (गुणों का कार्य)और पेशाह (व्यवसाय)हज और ज़ियारत(पवित्र तीर्थों की तीर्थयात्रा)के आधार पर सामाजिक भेदभाव और सामाजिक विभाजन मौजूद हैं।

इस प्रकार,मुसलमानों को एक सजातीय समुदाय मान कर विश्लेषण करने से विश्लेषण विकृत और खंडित विश्लेषण होगा। इसके अलावा,जाति आयामों पर आधारित अखिल भारतीय सर्वेक्षण की कमी के कारण (क्योंकि अल्पसंख्यक शब्द सामाजिक बातचीत की तुलना में अधिक राजनीतिक शब्दावली का गठन करता है)किसी भी शोधकर्ता के लिए मुस्लिम समुदाय की शिक्षा पर वस्तुनिष्ठ विश्लेषणात्मक समझ के साथ सामने आना बहुत मुश्किल है। इस तरह के आंकड़ों की अनुपस्थिति में,किसी को मुसलमानों के संदर्भ में पहले से उपलब्ध उपलब्ध आंकड़ों पर भरोसा करना होगा।

Scanned with OKEN Scanner

अल्पसंख्यक: सामाजिक वार्तालापों की तुलना में राजनीतिक शब्दावली का हिस्सा

भारत में 'अल्पसंख्यक' शब्द शुरू से ही सामाजिक बातचीत के बजाय राजनीतिक शब्दावली का हिस्सा रहा है। इस बात के सबूत हैं कि राजनीतिक और आर्थिक अधिकारों के लिए सुरक्षा उपाय और मुसलमानों के संदर्भ में सुरक्षा उपायों के कार्यान्वयन की निगरानी के लिए विशेष अधिकारियों के प्रावधान को मई और अक्टूबर 1949 में स्वतंत्रता प्राप्त करने के बाद वापस ले लिया गया था। हालांकि, एक आश्वासन दिया गया था कि संवैधानिक सुरक्षा के अभाव में भी अल्पसंख्यकों को सार्वजनिक भागीदारी और प्रतिनिधित्व में उचित सौदा मिलेगा। ये वादे कभी पूरे नहीं हुए। इसके अलावा, अहमद (1973) और अली (2001) स्वीकार करते हैं कि मुसलमानों के बीच ऐसी भेदभावपूर्ण प्रथाएँ दक्षिण भारत की तुलना में उत्तर भारत में अधिक देखी जाती रही हैं।

शिक्षा से संबंधित अभाव के परिणामस्वरूप, मुस्लिम समुदाय देश के शैक्षिक विकास के साथ उस तरह से तालमेल नहीं रख पाया है जिस तरह से अन्य अल्पसंख्यकों (ईसाई, पारसी, सिख, बौद्ध, जैन) ने अपना विकास किया है। यहूदियों और पारसियों के मामले में, साक्षरता पूरे भारतीय समाज की तुलना में अधिक है (चौहान, 1990)। इसलिए, मुसलमानों के लिए आधुनिक शिक्षा के साथ तालमेल नहीं बिठा पाने का विश्लेषण तभी किया जा सकता है जब उनके ऐतिहासिक और सामाजिक-आर्थिक संदर्भों को सामने लाया जाए। इससे इस संबंध में व्यापक समझ उपलब्ध होगी। इसलिए, मुसलमानों की शैक्षिक स्थितियों को समझने का प्रयास करते समय ऐतिहासिक, राजनीतिक-आर्थिक और सामाजिक-सांस्कृतिक संदर्भ को देखना महत्वपूर्ण है।

मुस्लिम शिक्षा, मदरसा शिक्षा के संदर्भ में:

भारत में मुसलमानों के आगमन के साथ, मस्जिद, मदरसा और मकतब को आमतौर पर 'व्याख्यान' और 'चर्चा' विधियों के माध्यम से कुरान और हदियात शिक्षा के लिए सीखने के केंद्र के रूप में विकसित किया गया था। प्रारंभ में, मदरसों में शिक्षा स्थानीय आवश्यकताओं के अनुरूप प्रदान की जाती थी। भारत में मध्ययुगीन काल के दौरान, मदरसों ने धार्मिक और तत्कालीन उपलब्ध वैज्ञानिक ज्ञान प्रदान किया, जिसे 'उलूम-ए-अकलियाह' (बौद्धिक ज्ञान) कहा जाता है। इसे राजाओं, नवाबों और जागीरदारों (सामंतों) और समुदाय की प्रभावशाली महिलाओं का संरक्षण प्राप्त था। सुल्तान सिकंदर लोधी ने धार्मिक शिक्षा के अलावा तर्कसंगतता पर भी जोर दिया। मुगल सम्राट अकबर ने प्राथमिक विद्यालय के पाठ्यक्रम में सुधारों की शुरुआत की। सुधारों के परिणामस्वरूप, प्राथमिक विद्यालय के पाठ्यक्रम में तर्क, अंकगणित, नैतिक, क्षेत्रमिति, ज्यामिति, खगोल विज्ञान, कृषि, शरीर विज्ञान, व्याकरण, कहानियाँ, दर्शन, भाषा और साहित्य, पारंपरिक विज्ञान, पत्र लेखन, सुलेख, इतिहास और सार्वजनिक प्रशासन शामिल थे। संस्कृत का अध्ययन करते समय छात्रों के अध्ययन के क्रम में व्याकरण, नयाई, वेदांत और पतंजलि का अध्ययन करना चाहिए। दार्शनिक, गणितज्ञ और वैज्ञानिक हकीम फतुल्लाह सिराज़ी ने अपने अनुयायियों के साथ मिलकर इस प्रणाली में महत्वपूर्ण भूमिका का दावा किया। इस प्रणाली को बाद में मुल्ला निज़ामुद्दीन द्वारा एक पाठ्यक्रम के रूप में विकसित किया गया और इसे "दर्स-ए-निज़ामी" के रूप में जाना जाने लगा और अब तक लगभग सभी मदरसों में इसका पालन किया जाता है। इस प्रकार, जिसे दर्स-ए-निज़ामिया (पाठ्यचर्या) के रूप में जाना जाता है, उसने उस समय के धार्मिक और प्राकृतिक विज्ञान दोनों को

Scanned with OKEN Scanner

संश्लेषित किया। शिक्षा का मुख्य उद्देश्य ऐसे उलमा या विद्वान को प्रशिक्षित करना था जो सिविल सेवा के लिए योग्य हो जाएं, साथ ही न्यायाधीश या क़ादी के रूप में कर्तव्यों का पालन करें।

मुसलमानों की शिक्षा पर ब्रिटिश औपनिवेशिक प्रभाव:

मुगल शासन के पतन और ब्रिटिश शासन की स्थापना के साथ, उच्च शिक्षा के केंद्रों का बहुत तेजी से पतन हुआ और इन्हें आधुनिक ज्ञान को विकसित करने और आत्मसात करने के लिए सीमित संसाधनों के साथ दया पर छोड़ दिया गया। ईस्ट इंडियन कंपनी ने अपने लिए काम करने के लिए प्रशासनिक अधिकारियों की आवश्यकता के कारण शिक्षा प्रणाली में बदलाव लाने की कोशिश की। उन्होंने बंगाल से परिवर्तन लाना शुरू किया। फलस्वरूप यह पूरे देश में फैल गया। जब, 1837 में, अंग्रेजों द्वारा फ़ारसी को आधिकारिक भाषा के रूप में अंग्रेजी से बदल दिया गया, तो मदरसों का ध्यान केवल धार्मिक शिक्षा पर केंद्रित हो गया। भारत में मदरसा आयोजकों ने बदलते परिवेश में अपने पाठ्यक्रम की प्रासंगिकता पर विचार नहीं किया। बल्कि, तर्कसंगत विज्ञान की अनदेखी करते हुए, इस्लाम के धार्मिक पहलुओं पर अधिक जोर दिया (जाफरी, सैयद नकी हुसैन, 2006)। इस्लामी शिक्षा की मजबूत तर्कवादी परंपरा के बावजूद, भारत में मदरसे, तेजी से बदलते सामाजिक और शैक्षणिक माहौल के साथ तालमेल बिठाने में विफल रहे। इस प्रकार, आधुनिक औपनिवेशिक शिक्षा प्रणाली की शुरुआत से ही मुसलमान दूसरे समुदाय से पिछड़ गए।

मुस्लिम शासन के विघटन, अंग्रेजों के आगमन और आधुनिक शिक्षा की शुरूआत के साथ मदरसा शिक्षा को एक बड़ा झटका लगा। इसलिए, मदरसा शिक्षक बेचैन हो गए और उन्होंने मुसलमानों के लिए धर्म-केंद्रित शिक्षा के प्रति अधिक कठोर रवैया विकसित किया। ब्रिटिश शासन के खिलाफ 1857 के विद्रोह में मदरसा नेताओं की ऐतिहासिक भागीदारी ने साबित कर दिया कि पारंपरिक इस्लामी शिक्षा का मुख्य उद्देश्य भारतीय मुसलमानों को राजनीतिक सत्ता हासिल करने की आकांक्षा के साथ जोड़ना था। उलेमा द्वारा विद्रोह में महत्वपूर्ण भूमिका निभाने के कारण, अंग्रेजों को मदरसा पर असहमति के संभावित केंद्र के रूप में संदेह होने लगा और इसलिए, ब्रिटिश औपनिवेशिक प्रशासन ने सिविल सेवाओं में मदरसा स्नातकों के रोजगार को समाप्त कर दिया।

1857 के विद्रोह के बाद मुस्लिम शिक्षा का विकास:

1857 के विद्रोह की विफलता के बाद, मुस्लिम उलेमा को डर था कि अंग्रेजों द्वारा शुरू की गई पश्चिमी शिक्षा के कारण मुस्लिम जीवन शैली कमजोर हो सकती है। उनकी तत्काल आवश्यकता अपने समुदाय के आधुनिक शिक्षा की ओर बढ़ने की संभावना पर नज़र रखने और यह सुनिश्चित करने की थी कि वे फ़ारसी-अरब विरासत को आगे बढ़ाएँ, जो केवल मदरसा शिक्षा के माध्यम से ही संभव था। इस प्रकार, 19वीं सदी में मुस्लिम बुद्धिजीवी मदरसों में पढ़ाए जाने वाले पाठ्यक्रम के प्रति सचेत हो गए। शिक्षा में क्रांति लाने के लिए कुछ नये मदरसे खोले गये। मुगल काल के बाद, उत्तर भारत में इस्लामी शिक्षा की सबसे बड़ी संस्था 'दारुल उलूम' देवबंद अस्तित्व में आई थी, जिसे 1866 में हाजी मुहम्मद आबिद हुसैन ने यूपी के सहारनपुर में खोला था। 'नदवतुल उलेमा' धार्मिक और वैज्ञानिक शिक्षा के साथ-साथ तकनीकी शिक्षा प्रदान करने के लिए 1894 में खोला गया था। इन मदरसों ने सरकारी समर्थन स्वीकार नहीं किया ताकि संस्था के आंतरिक प्रशासन और पाठ्यक्रम में हस्तक्षेप से बचा जा सके। भारतीय राष्ट्रीय कांग्रेस के अस्तित्व में आने और राष्ट्रीय स्वतंत्रता आंदोलन शुरू होने से बहुत पहले वे उत्तर भारतीय मुसलमानों के लिए

Scanned with OKEN Scanner

बड़े संकट के दौर में अस्तित्व में आए, जब वे ब्रिटिश क्रोध का सामना कर रहे थे और उलेमा ब्रिटिश विरोधी संघर्ष में सबसे आगे थे। मौलाना महमूदुल हसन के नेतृत्व में उलेमाओं ने आधुनिक शिक्षा का विरोध इसलिए नहीं किया क्योंकि यह आधुनिक और धर्मनिरपेक्ष थी, बल्कि इसलिए अधिक विरोध किया क्योंकि यह ब्रिटिश साम्राज्यवादी व्यवस्था के तहत थी।

धार्मिक और भाषाई पहचान के साथ मदरसा शिक्षा का विकास:

उलेमा अपनी धार्मिक और भाषाई पहचान को लेकर अधिक चिंतित थे। इसलिए, मदरसा शिक्षा उनके संरक्षण में फली-फूली। निम्न हिंदू जातियों से धर्मांतरण के परिणामस्वरूप मुसलमानों में भयावह गरीबी के कारण, मदरसा शिक्षा उनके लिए सबसे उपयुक्त थी क्योंकि यह मुफ्त भोजन, कपड़ा प्रदान करती थी और उनके लिए आसानी से उपलब्ध थी। दूसरी ओर, आधुनिक पश्चिमी औपनिवेशिक शिक्षा न तो उनके लिए प्रासंगिक थी और न ही वे अपनी अत्यधिक गरीबी के कारण इसे वहन कर सकते थे। इस प्रकार, उलेमा ने धार्मिक शिक्षा के लिए मुफ्त मदरसे उपलब्ध कराकर गरीब वर्गों की मदद की। हालाँकि, मदरसा शिक्षा अपने इस्लामी पाठ्यक्रम के साथ अपने छात्रों को सांसारिक शिक्षा के प्रति एक महत्वपूर्ण दृष्टिकोण विकसित करने में विफल रही जो उन्हें बेहतर व्यावसायिक अवसर प्रदान कर सकती थी और समकालीन वैश्विक वातावरण के संदर्भ में जीवन को देख सकती थी। शिक्षा के माध्यम के रूप में उर्दू के प्रति जुनून, नौकरी के अवसरों के मामले में अपने छात्रों को देश के अन्य आधुनिक शिक्षित छात्रों के बराबर लाने में विफल रहा। इस प्रकार, मदरसा शिक्षा कभी भी नौकरी की संभावनाओं के संदर्भ में शिक्षा प्रदान करने के लिए इच्छुक नहीं रही। मदरसे से निकले हजारों स्नातकों ने पिछले कुछ वर्षों में बड़ी संख्या में मदरसों की स्थापना की, लेकिन आधुनिक शिक्षा की तुलना में अपने छात्रों को भौतिक प्रगति का कोई अवसर नहीं दिया। इस प्रकार, उनके छात्रों को शिक्षा की उपयोगितावादी अवधारणा का कोई भी लाभ लेने से रोका गया। उनके नौकरी के अवसर इमाम के रूप में मस्जिदों और मदरसों में कम वेतन वाले शिक्षक के रूप में सीमित रहे। यहां तक कि उच्च इस्लामी अध्ययन के लिए, भारत में अलीगढ़ मुस्लिम विश्वविद्यालय, जामिया मिलिया इस्लामिया और मौलाना आज़ाद राष्ट्रीय उर्दू विश्वविद्यालय के कुछ विभागों को छोड़कर, मदरसों द्वारा दी जाने वाली डिग्रियों को अभी भी भारतीय विश्वविद्यालयों द्वारा व्यापक रूप से मान्यता नहीं दी जाती है। इसी तरह, ऐसी डिग्रियाँ सरकार में प्रशासनिक नौकरियों के लिए मान्यता प्राप्त नहीं हैं। यह शिक्षा की उपयोगितावादी अवधारणा की ओर अवसर प्राप्त करने के मामले में उन्हें और पीछे ले जाता है।

मुसलमानों के शैक्षिक इतिहास में महत्वपूर्ण मोड़:

सर सैयद अहमद खान ने इस विरोधाभास को पहचानते हुए मुसलमानों की सोच को बदलने का गंभीर प्रयास किया। 1875 में, उन्होंने अलीगढ़ में मोहम्मडन एंग्लो ओरिएंटल कॉलेज के नाम से जाना जाने वाला पहला आधुनिक शैक्षणिक संस्थान स्थापित किया, जो लोकप्रिय रूप से अलीगढ़ मुस्लिम विश्वविद्यालय के नाम से जाना जाता है [कादरी, ए.डब्ल्यू.बी. (संस्करण), (1998)। आजादी के बाद से भारत में शिक्षा और मुसलमान, दिल्ली: इंस्टीट्यूट ऑफ ऑब्जेक्टिव स्टडीज, पी। 81.]. यह मुसलमानों के शैक्षिक इतिहास में एक महत्वपूर्ण मोड़ था। हालाँकि, इस समय तक मुसलमानों की एक पूरी पीढ़ी शिक्षा में पिछड़ चुकी थी। इसलिए, 1904 तक मुस्लिम नामांकन की वृद्धि दर अन्य समुदायों की तुलना में बहुत धीमी थी।

Scanned with OKEN Scanner

इसी तरह, 1920 में, जामिया मिलिया इस्लामिया की स्थापना दारुल उलूम देवबंद के तत्कालीन प्रिंसिपल महमूद-अल-हसन ने की थी, जब अलीगढ़ मुस्लिम विश्वविद्यालय असहयोग खिलाफत की अवधि के दौरान छात्रों और विद्वान बुद्धिजीवियों की मांग को पूरा करने में विफल रहा था। आंदोलन। इस विश्वविद्यालय की स्थापना का मूल उद्देश्य सरकारी हस्तक्षेप से मुक्त रहकर राष्ट्रीय एजेंडा, इस्लामी परंपरा और संस्कृति तथा आधुनिक शिक्षा पर आधारित एक संस्थान की स्थापना करना था। चूंकि विश्वविद्यालय राष्ट्रवादियों द्वारा खोला गया था, इसलिए ब्रिटिश साम्राज्यवादी व्यवस्था का विरोध करने के कारणों से आधुनिक शिक्षा का विरोध किया गया। हालाँकि, 1905-1947 के दौरान, शैक्षणिक संस्थानों में सभी स्तरों पर मुसलमानों का नामांकन लगातार बढ़ता गया।

उनके नामांकन के संबंध में विवरण नीचे दी गई तालिका में देखा जा सकता है (तालिका 1.1 देखें)। यह इंगित करता है कि 1906-07 में स्कूल स्तर पर मुसलमानों का कुल नामांकन 8.93 लाख था, जबकि उच्च शिक्षा स्तर (सामान्य और व्यावसायिक संयुक्त) पर 2040 था। 1931-32 तक, स्कूल स्तर पर मुस्लिम छात्रों की कुल संख्या बढ़ गई थी 30.17 लाख और उच्च स्तर (सामान्य और पेशेवर संयुक्त) से 12,402। हालाँकि, कुल नामांकन के प्रतिशत के रूप में यह 1% से भी कम था। 1931-32 के बाद देश के धर्मनिरपेक्ष ताने-बाने को बनाए रखने के लिए ऐसे सांख्यिकीय आंकड़े एकत्र नहीं किए गए। हालाँकि, डेटा न होना शोधकर्ता और शिक्षा जगत के लिए एक स्पष्ट क्षति है।

ब्रिटिश भारत में मुसलमानों ने अन्य धार्मिक समुदायों की तुलना में बहुत बाद में पश्चिमी शिक्षा प्रणाली को अपनाया। अतः ब्रिटिश काल से ही मुसलमानों का शैक्षिक पतन प्रारम्भ हो गया। प्रारंभ में वे ब्रिटिश शिक्षा प्रणाली को इस डर से स्वीकार करने के लिए तैयार नहीं थे कि अंग्रेजी भाषा और पश्चिमी विज्ञान उन्हें धर्म परिवर्तन के लिए मजबूर कर देंगे। ऐसा डर इस तथ्य से भी स्पष्ट होता है कि जब 1835 में सरकार ने अपना धन विशेष रूप से अंग्रेजी शिक्षा पर खर्च करने का निर्णय लिया, तो मौलवियों और देशी सज्जनों सहित कलकत्ता के मुसलमानों के लगभग 8000 लोगों ने अंग्रेजी शिक्षा के खिलाफ एक याचिका पर हस्ताक्षर किए। सामान्य सिद्धांतों पर इस पर आपत्ति जताने के बाद उन्होंने कहा कि 'सरकार का स्पष्ट उद्देश्य मूल निवासियों का धर्मांतरण है।'

मुसलमानों के मन में धर्म परिवर्तन का ऐसा डर अन्य धार्मिक समुदाय के आत्मविश्वास के बिल्कुल विपरीत है, जिन्होंने न केवल अंग्रेजी शिक्षा के लिए पहल की, बल्कि उन्होंने अपने धर्म और अपने आकाओं के बीच एक मिलन स्थल खोजने का प्रयास किया।

निष्कर्ष:

विभाजन के बाद का समय भी भारत में मुसलमानों के लिए संकट से भरा रहा। शिक्षित और अमीर मध्यम वर्ग गरीब अशिक्षित जनता को छोड़कर पाकिस्तान चले गए। इस प्रकार, गरीब अशिक्षित जनता के लिए मदरसा शिक्षा ने उनकी मनोवैज्ञानिक और बौद्धिक आवश्यकता को पूरा किया। दूसरी ओर, इस अवधि के दौरान, सरकारी प्राथमिक विद्यालयों की संख्या आर्थिक रूप से वंचितों के लिए स्कूली शिक्षा की आवश्यकता को पूरा करने में अक्षम थी। यहां तक कि जो लोग किसी तरह सरकारी स्कूलों में नामांकित थे, उन्होंने भी प्राथमिक शिक्षा पूरी करने से पहले ही पढ़ाई छोड़ दी। ऐसा इसलिए था क्योंकि गरीबी के कारण उनके माता-पिता परिवार की आय बढ़ाने के लिए बच्चों को काम पर भेजने के लिए मजबूर हो गए थे। इस प्रकार, वे सुबह जल्दी या देर

Scanned with OKEN Scanner

शाम चलने वाले सुविधाजनक समय के कारण मदरसा शिक्षा जारी रखते हैं। इस प्रकार, यह विश्लेषण कि मुसलमानों का झुकाव धार्मिक शिक्षा की ओर है, एक मिथक और रूढ़िवादिता है। इसका सामाजिक-आर्थिक और वर्ग-पहचान प्रभाव है जिसे मुसलमानों की शिक्षा का विश्लेषण करते समय अक्सर नजरअंदाज कर दिया जाता है। 70 के दशक में इस तरह के मिथक और रूढ़िवादिता को और भी बल मिला क्योंकि अरब में हुई तेल क्रांति के परिणामस्वरूप उत्तरी, पश्चिमी और मध्य भारत में पूर्वी एशियाई देशों के वित्त पोषण से कई मदरसे खोले गए थे। अरब जगत ने आर्थिक रूप से गरीब मुसलमानों को उनकी धार्मिक शिक्षा के लिए मदद करना शुरू कर दिया था। इसने भारत के कई उलेमाओं को नए मदरसे शुरू करने और मौजूदा मदरसों का विस्तार करने के लिए वित्तीय सहायता जुटाने में मदद मिली थी।

References:

Ahmad I. (1981). Muslim educational backwardness: An inferential analysis, economic and political weekly September, p.1457-1465.

Ahmad, I. (1987), Educational development of Minorities in India, Journal of Educational Planning and Administration, NIEPA, New Delhi

Ahmad, I. (ed.) (1973). Caste and social stratification among the Muslims, Delhi: Manohar Publication

Alam, A. (2003). Democratization of Indian Muslims, Economic and Political Weekly, November, 38 (46), 4481-4885

Ali, A. (2001). Masawaat ki jung, pasemanzar: Bihar ka pasmanda Musalman, New Delhi: Vani Prakashan (in Hindi)

Ansari, Iqbal A. (1998). Federal nation building: Non regional dimensions of pluralism and representation of Muslims in elected body's: In A. R. Vijaypur, (eds.), (1998). Dimensions of federal nation building, New Delhi: Oxford p 211-233

Carens, Joseph H. & Willams, Melissa S. (1998). Muslim minorities in liberal democracies: The politics of misrecognition: In R. Bhargava (eds.) (1998). Secularism and its critics, Delhi: Oxford University Press.

Chauhan, C. P. S. (1990). Emerging priorities in Indian education, Education and Society, Vol 8, No. 1, James Nicholas

Daftery, F. (1995). The Isma'ilis: Their history and doctrines. Cambridge: Cambridge University Press

Desai, Z. (1984). Center of Islamic learning in India, Government of India: Publication Division

Scanned with OKEN Scanner

Edwards, John R. (1981). Psychological and linguistic aspects of Minority education in world yearbook of education 1981: In J. Megarry (et.al.). (eds.), (1981). Education of minorities, London: Kogan Page

Government of India: Constituent assembly debates (CAD), Vol. VIII p. 330

Government of India: Constituent assembly debates (CAD), Vol. VIII p 332

Government of India: Constituent assembly debates (CAD),Vol. X p 229-236

Hasan, F., (2006). Madaris and the challenges of modernity in colonial India: In J. Peter Hartung & H. Reifeld (eds.) (2006). Islamic education, diversity and national identity: Dini madaris in India Post 9/11, New Delhi: SAGE

Hasan, M. (1981). In search of integration and identity: Indian Muslims since independence, Economic and Political Weekly, November, p. 2467.

Hasan, M. (1981). In search of integration and identity: Indian Muslims since independence, Economic and Political Weekly, November.

Hasan, Z. & Menon, R., (2006). Unequal citizens: A study of Muslim women in India, New Delhi: Oxford University Press;

Kaur, K. (1985). Education in India (1781-1985): Policies, planning and implementation, Chandigarh: Centre for Research in Rural and Industrial Development

Khan, R. (1978). Minority segments in Indian polity: Muslim situation and plight of Urdu, economic and political weekly, Vol- XIII, no-35, September.

Kochhar, R. K. (1992), English education in India: Hindu anamnesis versus Muslim torpor, economic and political weekly, November, p. 2613.

Qadri, A. W. B. (eds.), (1998). Education & Muslims in India since Independence, Delhi: Institute of Objective Studies, p. 81.

Qasmi, Qari M. Tayyib, (1968). Dar-ul-ulum Deoband ki saw sala zindagi, Deoband: Dar-ul-ulum

Rao, B. Shiva. (1968). The framing of India's constitution: Selected documents, Vol. II, p. 411-422, New Delhi: Indian Institute of Public Administration.

Sikand, Y. (2003). The dalit Muslims and the all India backward Muslim morcha: Qalandar, http://www.islaminterfaith.org/sept2003/article.html

Wajahat, A. (2003). Bahrtiya musalman vartaman aur bhavishya, Hans, August

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

एक अध्ययन:श्री अरविन्द और वर्तमान शिक्षा नीति

डॉ० अनुप्रिया
असिस्टेंट प्रोफ़ेसर

हिंदी विभाग, भारती महाविद्यालय
दिल्ली विश्वविद्यालय

सारांश;वर्तमान राष्ट्रीय शिक्षा नीति जो भारतीय शिक्षा प्रणाली में महत्त्वपूर्ण सुधार लाने के लिए तत्पर है, उसके बीज श्री अरविन्द घोष के विचारों में परिलक्षित होते हैं। श्री अरविन्द के अनुसार शिक्षा का उद्देश्य मात्र ज्ञान प्राप्ति नहीं है, बल्कि व्यक्ति के सम्पूर्ण विकास कोसुनिश्चित करने के साथ-साथ आत्मानुशासन, आत्मविश्वास और स्वावलंबन की भावना को बढ़ावा देना भी है। वे भारतीय संस्कृति और आध्यात्मिकता को शिक्षा के केंद्र में रखने की आवश्यकता पर बल देते हैं। वर्तमान शिक्षा नीति का उदेश्य जो कि एक समग्र विकास पर केंद्रित है और जो खेल, कला, नैतिक शिक्षा के साथ-साथ जीवन कौशल के विकास से पूरी तरह ओत-प्रोत है ,श्री अरविन्द के दर्शन को प्रतिपादित करता है। यह शोधपत्र श्री अरविन्द के विचारों और राष्ट्रीय शिक्षा नीति के महत्त्वपूर्ण उद्देश्यों के बीच संबंध का एक अध्ययन है। साथ ही ,यह पत्र न केवल वर्तमान शिक्षा प्रणाली की चुनौतियों पर विचार करता है, बल्कि भविष्य के लिए एक ऊर्ध्वगामी दिशा को भी सुनिश्चित करता है।

कुंजीशब्द:*अध्यात्म, दर्शन, शिक्षा, विकसित भारत, भविष्य, सर्वांगीण विकास ,आत्मनिर्भरता ,जीवन कौशल ,तकनीकी ,सृजनात्मकता , नवाचार इत्यादि।*

प्रस्तावना

किसी भी सामान्य मनुष्य की गरिमा और महिमा उस देश की शिक्षा पर निर्भर करती है जिसमें वह रहता है क्योंकि शिक्षा ही एक ऐसा महत्त्वपूर्ण पहलू है जो मनुष्य को उस गंतव्य तक ले जाती है जहाँ मनुष्य आत्मा और मस्तिष्क का संयोजन कर किसी भी जड़वादी विचारधारा से पूर्णतः स्वतंत्र होकर एक संयत जीवन यापन कर पाता है । इसलिए प्रत्येक देश की चिंता शिक्षा के संबंध में उचित मार्गदर्शन की होती है। आज भारत में शिक्षा के क्षेत्र में विचारकों और शिक्षकों के सामने जब अनेक समस्याए भयंकर रूप से उपस्थित हैं, तो इन समस्याओं के मूल कारणों को खोजने में श्री अरविन्द के शिक्षा दर्शन से सहायता ली जा सकती है क्योंकि अन्य क्षेत्रों के समान शिक्षा के क्षेत्र में भी उन्होंने व्यापकता और गहराई दोनों ही दृष्टियों से सत्य की खोज की है। उनका शिक्षा दर्शन केवल समकालीन भारतीय शिक्षा दर्शन में ही नहीं अपितु वैश्विक शिक्षा दर्शन में भी विशिष्ट स्थान रखता है। श्री अरविन्द घोष ने भारतीय संस्कृति और सभ्यता के पुनरुत्थान के लिए गहन योगदान दिया। उनकी शिक्षाएं और विचारधारा न केवल आध्यात्मिक उत्थान पर केंद्रित थीं, बल्कि वे राष्ट्रीय शिक्षा और सामाजिक विकास के विषय में भी प्रेरणादायक साबित हो रही हैं।

आज जब भारत राष्ट्रीय शिक्षा नीति)NEP) 2020के माध्यम से अपने शैक्षिक ढांचे को पुनर्गठित कर रहा है, वहाँ श्री अरविन्द की दृष्टि शिक्षा जगत् को गहराई के साथ प्रेरित करती है।

समग्र शिक्षा की अवधारणा

Scanned with OKEN Scanner

श्री अरविन्द के व्यक्तित्व के कई पक्ष हैं ;वे एक महर्षि, कवि, पत्रकार ,शिक्षक इत्यादि हैं। उनके जीवन पर वेद, उपनिषद और भारतीय ग्रंथों का प्रमुख प्रभाव रहा है। साथ ही ,उनका शिक्षा दर्शन एक समग्र और आध्यात्मिक दृष्टिकोण पर आधारित है। उन्होंने शिक्षा को न केवल ज्ञान के अर्जन तक ही सीमित रखा, बल्कि उसे आत्म-विकास और आत्म-साक्षात्कार का साधन भी माना। उनके अनुसार शिक्षा का मुख्य उद्देश्य मनुष्य की सभी संभावनाओं का पूर्ण विकास करना है। वही शिक्षा सार्थक और ग्राही है जो शारीरिक, मानसिक, भावनात्मक और आध्यात्मिक क्षेत्रों में संतुलित विकास की बात करे। उनका यह मानना था कि शिक्षा एक सतत प्रक्रिया है, जो जीवन पर्यंत चलती रहती है। "उन्होंने शिक्षण पद्धति में स्वतंत्रता, रचनात्मकता और व्यक्तिगत अनुभव को प्रमुखता दी। उनका मानना था कि शिक्षक को छात्रों का मार्गदर्शक होना चाहिए, जो उनकी सहज वृत्तियों और रुचियों को प्रोत्साहित करें)समकालीन भारतीय दर्शन(1991 ,।" इसके अलावा, उन्होंने शारीरिक शिक्षा, ध्यान और योग को शिक्षा के महत्त्वपूर्ण अंगों के रूप में सम्मिलित किया।

श्री अरविन्द कहते हैं कि जीव की आत्मा में 'ज्ञान' सदा सुषुप्तावस्था में रहता है और मौलिक शिक्षा का आधारअन्तःकरण है, जिसके पाँच पटल उन्होंने बताए हैं तथा उनके प्रशिक्षण एवं विकास पर बल दिया। वह है –शरीर ,मन ,बुद्धि ,चिंतन और ज्ञान। उनके अनुसार शिक्षा को इन्हीं आधारों या स्तरों पर विकसित करना चाहिए। शरीर से उनका तात्पर्य है –शारीरिक क्रियाओं को संयमित और अनुशासित करना ;शरीर के सभी अंगों और क्रियाओं का सर्वांगीण प्रणालीबद्ध और सुव्यवस्थित विकास करना; और कोई दोष और विकृति हो तो उसे सुधारना। श्री अरविन्द ज्ञान के माध्यम से शिक्षा के प्रति एक नया दृष्टिकोण रखते हैं क्योंकि इसके माध्यम से उन्होंने यह घोषित किया था कि शिक्षा मात्र सूचनाओं का संग्रह नहीं है। सूचनाएं ज्ञान की नीव नहीं हो सकती हैं। वे अधिक से अधिक सामग्री भर हो सकती हैं जिनके द्वारा जानने वाल अपने ज्ञान की वृद्धि करता है अथवा वे वह बिंदु हैं जहाँ से ज्ञान प्रारंभ होता है या नई खोजों के अन्वेषण की दिशा आरम्भ होती है।अर्थात् वह शिक्षा जो अपने को केवल सूचना देने तक ही सीमित रखती है ,वह असली शिक्षा नहीं है। इस प्रकार वह शिक्षा को मनुष्य के सर्वांगीण विकास का उपक्रम मानते हैं।

वह कहते हैं " –सच्ची व वास्तविक शिक्षा वह है जो बालक का सर्वांगीण विकास करके उसे आध्यात्मिक विकास में सहायता प्रदान करे। शिक्षा का उद्देश्य न केवल बौद्धिक बल्कि शारीरिक, मानसिक भावनात्मकऔरआध्यात्मिकविकासहोनाचाहिए)ऑल रिसर्च जर्नल(। "इस प्रकार राष्ट्रीय शिक्षा नीति भी प्रत्येक बालक की विशिष्ट क्षमताओं की स्वीकृति ,पहचान और उनके विकास की ओर उन्मुख है; यह कला ,विज्ञान ,तकनीकी और व्यावसायिक गतिविधितों से परिपूर्ण है। राष्ट्रीय शिक्षा नीति के अनुसार , "सभी स्तरों पर पाठ्यचर्या और शिक्षा विधि का समग्र केंद्रबिंदु शिक्षा प्रणाली को रटने की पुरानी प्रथा से अलग वास्तविक समझ और ज्ञान की ओर ले जाना है। शिक्षा का उद्देश्य केवल संज्ञानात्मक समझ न होकर चरित्र निर्माण और इक्कीसवीं शताब्दी के मुख्य कौशल से सुसज्जित करना है)राष्ट्रीय शिक्षा नीति(2020 ,।" श्री अरविन्द और वर्तमान शिक्षा नीति दोनों ही समग्र विकास पर ज़ोर देते हैं और यह मानते हैं कि शिक्षा का उद्देश्य केवल बौद्धिक विकास तक ही सीमित नहीं होना चाहिए, बल्कि शारीरिक, मानसिक, भावनात्मक और आध्यात्मिक विकास भी होना चाहिए। इस प्रकार NEP2020एक समग्र विचारधारा को आगे बढ़ाते हुए ज्ञान की एकता और अखंडता को सुनिश्चित करता है और एक बहु-विषयक दुनिया के लिए विज्ञान, सामाजिक विज्ञान, कला, मानविकी और खेल इन सभी के बीच बहु-विषयक विकास पर ज़ोर देता है।

Scanned with OKEN Scanner

स्वतंत्रता ,जीवन कौशल ,तकनीकी और आत्मनिर्भरता

शिक्षा का उद्देश्य बच्चों को स्वतंत्र रूप से सोचने और निर्णय लेने की क्षमता प्रदान करना है। श्री अरविन्द के अनुसार, इस संसार में प्रत्येक मनुष्य एक दूसरे से भिन्न हैं जैसे कि उनकी आदतें ,रुचियों के विषय इत्यादि। ऐसी परिस्थिति में यदि एकांगी शिक्षा व्यवस्था को सभी बच्चों पर लागू कर दिया जाए तो उससे उनकी प्रकृति का हनन हो जाएगा। "बच्चे को ठोक-पीट कर माता-पिता या अध्यापक के चाहे हुए रूप में गढ़ना एक अज्ञानपूर्ण और बर्बर अंधविश्वास है। उसे अपनी प्रकृति के अनुसार अपना विस्तार करने को प्रेरित करना चाहिए)शिक्षा पर श्री अरविन्द व श्रीमाताजी के कुछ चुने हुए वचन(2019 ,। "इस प्रकार शिक्षा ऐसी होनी चाहिए जिसमें बच्चों की अभिरुचियाँ शामिल हों और उसी के अनुरूप उनकी स्मृति कल्पना ,चिंतन और निर्णय शक्ति सभी का विकास हो। जब बच्चा अपनी अभिरुचि के अनुसार पढ़ता है तब वह स्वतंत्र और निर्भर अनुभव करता है। राष्ट्रीय शिक्षा नीति यह स्वतंत्रता देती है कि हर बच्चा कोई भी विषय अपनी स्वेच्छा से पढ़ सके; जिस भी विषय में उसकी रुचि है वह उसका अध्ययन करके आत्मनिर्भर बन सके। नई शिक्षा नीति भी अवधारणात्मक समझ पर ज़ोर देती है न की रटंत पद्धति पर। इन सारे पहलुओं को नई शिक्षा नीति में समाविष्ट किया गया है।

सांस्कृतिक जागरूकता और आध्यात्मिकता

श्री अरविन्द अपने शिक्षा के दर्शन में सांस्कृतिक और आध्यात्मिक धरोहर की समझ को विकसित करने के पक्षधर हैं। वे भारतीय संस्कृति और सभ्यता की महानता को पुनः स्थापित करने का महत प्रयास करते हैं और सार्थक जीवन की दिव्यता को अनेक रूपों में संस्कृति का प्रतिफलन बताते हैं। वे 'भारतीय संस्कृति के आधार' नामक अपनी पुस्तक में कहते हैं " –भारतीय संस्कृति यह मानती है कि आत्मा ही हमारी सत्ता का सत्य है और हमारा जीवन आत्मा की एक अभिवृद्धि और विकास है(2017)।" अरविन्दशिक्षा के मुख्य उद्देश्य को मनुष्य की आंतरिक शक्तियों का विकास कहते हैं। अपनी आंतरिक शक्तियों के विकास और संवर्धन से मनुष्य पूर्ण मानव की संज्ञा प्राप्त कर सकता है। इसी उद्देश्य से अरविन्द आध्यात्मिक शिक्षा को अत्यधिक महत्त्व प्रदान करते हैं, यद्यपि साहित्यिक और वैज्ञानिक विषयों को भी उन्होंने बहुत प्रमुखता दी है। उनके विचारानुसार शिक्षा में "सभी विषयों को स्थान दिया जाना चाहिए, परंतु उसका मूल उद्देश्य मानव विकास ही होना चाहिए) मानवता के प्रणेता महर्षि अरविन्द , (2021। "

उनकी दृष्टि में, शिक्षा का सबसे उच्चतम उद्देश्य आत्म-साक्षात्कार और आध्यात्मिक ज्ञान की प्राप्ति हैइसलिए व्यक्ति की आत्मा की खोज और आत्म-साक्षात्कार ही सच्ची शिक्षा है। शिक्षा का आधार अन्तःकरण है और उसके पाँच पटल हैं जिनके प्रशिक्षण और विकास पर उन्होंने बल दिया। शिक्षा के पूर्ण होने के लिए उसमें पाँच प्रधान पहलू होने चाहिए। इनका संबंध मनुष्य की पाँच प्रधान क्रियाओं से होगा –भौतिक, प्राणिक, मानसिक, आंतरात्मिक और आध्यात्मिक। साधारणतया, शिक्षा के ये सब पहलू व्यक्ति के विकास के अनुसार, एक के बाद एक, कालक्रम से आरंभ होते हैंपरन्तु इसका अर्थ यह नहीं है कि एक पहलू दूसरे का स्थान ले ले, बल्कि सभी पहलुओं को जीवन के अंतकाल तक, परस्पर एक दूसरे को पूर्ण बनाते हुए ज़ारी रहना चाहिए। इस प्रकार श्री अरविन्द की दृष्टि में शिक्षा का जो महत्त्वपूर्ण उद्देश्य अपने सांस्कृतिक और आध्यात्मिक धरोहर की समझ विकसित करना है , वह वर्तमान शिक्षा नीति में भारतीय संस्कृति, मूल्य और संस्कारों को शिक्षा का अभिन्न अंग बनाने केरूप में दिखाई देता है जोकि भारतीय भाषाओं, कला, संगीत, और योग इत्यादि को भी शिक्षा के पाठ्यक्रम में शामिल करने का अनूठा प्रस्ताव करती है।

Scanned with OKEN Scanner

शिक्षा का माध्यम और पद्धति

श्री अरविन्द मातृभाषा को बच्चे की शिक्षा का उपयुक्त माध्यम मानते हैं। मातृभाषा के माध्यम से एक बच्चा अपने देश की संस्कृति, साहित्य और इतिहास का परिचय प्राप्त करता है ,और उसे अपने चारों ओर जीवन को समझने में सहायता मिलती है। मातृभाषा पर अधिकार होने के बाद ही विदेशी भाषाएँ सिखाई जानी चाहिए। उनका मानना है – "मातृभाषा शिक्षा का उचित माध्यम है, इसलिए बच्चे की प्रारंभिक शक्तियाँ उसी पर अधिकार पाने में खर्च होनी चाहिए। प्रायः हर एक बच्चे में कल्पना शक्ति, शब्दों के लिए नैसर्गिक प्रवृत्ति, नाटकीय क्षमता, विचार आदि चीजें होती हैं)शिक्षा के आयाम, (1974। "नई शिक्षा नीति के विषय में भी हम यह देखते हैं कि यह भी व्यक्तियों की अपनी-अपनी मातृभाषा पर ही ज़ोर देती है । मातृभाषा में शिक्षा के अनेक फायदे हैं, जो बच्चों के सर्वांगीण विकास में सहायक होते हैं। मातृभाषा में पढ़ाई करने से बच्चे विषयवस्तु को जल्दी और बेहतर तरीके से समझते हैं, जिससे उनकी सीखने की गति और प्रभावशीलता बढ़ती है। "यह सर्वविदित है कि छोटे बच्चे अपनी घर की भाषा ,मातृ-भाषा में सार्थक अवधारणों को अधिक तेज़ी से सीखते हैं और समझ लेते हैं ...सार्वजनिक और निजी दोनों तरह के स्कूल इसकी अनुपालना करेंगे। विज्ञान सहित सभी विषयों में उच्चतर गुणवत्ता वाली पाठ्यपुस्तकों को घरेलू भाषाओं/मातृ-भाषाओं में उपलब्ध कराया जाएगा)नई शिक्षा नीति(2020 ,। "इस प्रकार अपनी भाषा में शिक्षा प्राप्त करने से बच्चे अपनी सृजनात्मकता और कल्पनाशक्ति का अधिकतम उपयोग कर पाते हैं। मातृभाषा में शिक्षा से बच्चों को अपनी संस्कृति, परंपरा और सामाजिक मान्यताओं को बेहतर तरीके से समझने और उन्हें अपनाने का अवसर मिलता है।अपनी भाषा में पढ़ाई करने से बच्चों का आत्मविश्वास बढ़ता है और वे अपनी बात आसानी से समझ सकते हैं और अभिव्यक्त कर सकते हैं।

शिक्षा ,सृजनात्मकता और आत्म-अन्वेषण

श्री अरविन्द कहते हैं कि शिक्षा का उद्देश्य बच्चों को आत्म-अन्वेषण और आत्म-अभिव्यक्ति के माध्यम से अपनी सृजनात्मकता को पहचानने और विकसित करने में मदद करना है। उन्होंने बच्चों को स्वयं के बारे में जानने और अपनी विशेषताओं को प्रकट करने के लिए प्रेरित किया। शिक्षा नीति में सृजनात्मकता को प्रोत्साहित करने के ये तत्व उनकी व्यापक और गहन शैक्षणिक दृष्टि का हिस्सा हैं जो बच्चों के समग्र और संतुलित विकास को प्राथमिकता देती हैं। उनके अनुसारप्रत्येक बच्चे में एक अंतर्निहित सृजनात्मक क्षमता होती है। उन्होंने शिक्षा को बच्चों की स्वाभाविक रुचियों और क्षमताओं के अनुरूप ढालने पर ज़ोर दिया ताकि वे स्वतंत्रता से सोच सकें और अपने विचारों को व्यक्त कर सकें।

श्री अरविन्द ने बच्चों को पुस्तकों और कक्षाओं से बाहर के अनुभवों के माध्यम से पढ़ाने लिखाने)सिखाने(पर बल दिया। इस दृष्टिकोण से बच्चों को कला, संगीत, नाटक और विभिन्न शिल्पों में हाथ आजमाने के अवसर दिए जाते हैं, जिससे उनकी सृजनात्मकता को प्रोत्साहन मिलता है। वर्तमान शिक्षा नीति में भी यह प्रावधान है कि बच्चा अपनी रचनात्मकता को नया आयाम दे सके। मूल्य संवर्धन पाठ्यक्रम के अंतर्गत बच्चा अपनी रुचि के अनुसार किसी भी क्षेत्र में नवाचार को प्राप्त कर सके। इसमें प्रौद्योगिकी और नवाचार के उपयोग पर विशेष ज़ोर दिया गया है ताकि शिक्षा अधिक सुलभ, प्रभावी और समावेशी हो सके। यह छात्रों को नवीनतम तकनीकी साधनों के साथ शिक्षा प्राप्त करने का अवसर प्रदान करती है। प्रायोगिक आधारित अधिगम को अपनाया गया है; प्रत्येक विषय में कला और खेल को एकीकृत किया गया है, और कहानी-आधारित शिक्षण-शास्त्र को प्रत्येक विषय में एक मानक शिक्षण-शास्त्र के तौर पर देखा गया है। इनके साथ-साथ ,अन्य विभिन्न विषयों के बीच संबंधों की खोज को

Scanned with OKEN Scanner

प्रोत्साहित किया है और हर छात्र को व्यावसायिक शिक्षा का अवसर प्रदान करने का प्रावधान करती है, जिससे वे आत्मनिर्भर और रोजगार योग्य बन सकें।

नैतिक धारणा ,मूल्य और संस्कृति

किसी भी व्यक्ति का व्यवहार उसके भीतर निहित मूल्यों को प्रतिबिम्बित करता है। मूल्यहीन जीवन अर्थहीन होता है। मूल्य-निर्माण में समाज एवं परिवेश को अद्वितीय स्थान प्राप्त है क्योंकि व्यक्ति समाज-निरपेक्ष होकर जीवन का निर्वाह नहीं कर सकता। इस सम्बन्ध में प्रसिद्ध विद्वान् इमाईल दुर्खीम का मानना है " –समाज का प्रभाव व्यक्ति के व्यक्तित्व के पूर्ण ताने-बाने में झलकता है। उसका भीतरी और बाहरी व्यवहार समाज की सामूहिक चेतना को दर्शाता है)नैतिक शिक्षा एवं नागरिक बोध(2014 ,।" इसलिए अनेक विचारकों ने समाज को एक नैतिक शक्ति माना है। नैतिक एवं आध्यात्मिक विकास को बच्चे की पाठ्यचर्या का अत्यन्त महत्त्वपूर्ण क्षेत्र माना गया है। सम्भवतः यह आज समूचे भौतिक विकास से भी अधिक महत्त्वपूर्ण है। श्री अरविन्द भी नैतिकता को आंतरिक ज्ञान की सीमा में रखते हैं। वह कहते है " –मनुष्य की सत्ता में मानसिक स्वभाव नैतिकता पर अवलंबित होता है और जो बौद्धिक शिक्षा नैतिक और भावात्मक प्रकृति की पूर्णता से अलगाव पर आधारित रहती है वह मानव-प्रगति के लिए हानिकर होती है)शिक्षा पर श्री अरविन्द व श्रीमाताजी के कुछ चुने हुए वचन(2019 ,।"

किसी भी आदर्श शिक्षा प्रणाली में नैतिक शिक्षा का महत्त्वपूर्ण स्थान है। यह नैतिक शिक्षा केवल उपदेश और अध्ययन से संभव नहीं है क्योंकि ये सब कृत्रिमएवं यन्त्रवत् साधन हैं। मनुष्य की नैतिक प्रकृति में भाव, संस्कार और स्वभाव सम्मिलित हैं। नैतिक विकास के लिए इन सबका रूपान्तर आवश्यक है। प्राचीन भारतीय शिक्षा प्रणाली में गुरू शिक्षार्थी के सम्मुख एक आदर्श था जिससे उसके चरित्र के अनुकरण से ही उसे नैतिक शिक्षा प्राप्त हो जाती थी । आधुनिक युग में उन प्राचीन परिस्थितियों को संभवतःवापस नहीं लाया जा सकता परंतु ऐसी शिक्षा प्रणाली की स्थापना अवश्य की जा सकती है जिसमें शिक्षक वर्ग केवल वैतनिक प्रशिक्षक न होकर मित्र, निर्देशक और सहायक के रूप में भी उपस्थित हो। नई शिक्षा नीति के अनुसार, विद्यार्थियों को कम उम्र में सही को पहचानने और उसे अपने जीवन में लाने के महत्त्व को सिखाया जाएगा, और नैतिक निर्णय लेने के लिए एक तार्किक ढांचा दिया जाएगा)राष्ट्रीय शिक्षा नीति(2020 ,। "अतः यह कहा जा सकता है कि यदि मुनष्य के नैतिक पक्ष का विकास किए बिना अन्य पक्षों का विकास कर दिया जाए तो वह और भी अधिक खतरनाक होगा क्योंकि शिक्षित मनुष्य विज्ञान व प्रौद्योगिकी का प्रयोग विनाश के लिए करेगा इसलिए मूल्य रहित शिक्षा से तो अशिक्षा ठीक है।

निष्कर्ष

श्री अरविन्द का शैक्षणिक चिंतन बहुत ही प्रामाणिक और प्रासंगिक है। मानव की बुद्धि का विकास ही समृद्धि के विकास का चरम लक्ष्य नहीं हैबल्कि मानवता का लक्ष्य मस्तिष्क का अतिक्रमण करके मनुष्य को वहाँ ले जाना है जहाँ संस्कृति, जन्म-मृत्यु और काल से परे चली जाती है। आज भारत में शिक्षा के क्षेत्र में विचारकों और शिक्षकों के सामने जब अनेक समस्याए भयंकर रूप से उपस्थित हैं तो इन समस्याओं के मूल कारणों को खोजने में श्री अरविन्द के शिक्षा दर्शन से सहायता ली जा सकती है। क्योंकि अन्य क्षेत्रों के समान शिक्षा के क्षेत्र में भी उन्होंने व्यापकता और गहराई दोनों ही दृष्टियों से सत्य और सत्यतर जीवन की खोज की है। इसीलिए उनका शिक्षा दर्शन केवल समकालीन भारतीय शिक्षा दर्शन के लिए ही नहींअपितु वैश्विक शिक्षा दर्शन के लिए भी दिशा निर्देशन का कार्य करता है।

Scanned with OKEN Scanner

संदर्भ-सूची-

1. कुमार ,अशोक .भारतीय दर्शन में मोक्ष चिन्तन एक तुलनात्मक अध्ययन, मध्य प्रदेश हिन्दी ग्रन्थ अकादमी, भोपाल , .1973

2. कृष्णमूर्ति ,जिड्डु .शिक्षा के आयाम .राजघाट शिक्षा केंद्र .वाराणसी.1974 ,

3. राष्ट्रीय शिक्षा नीति .2020

4. श्री अरविन्द भारतीय संस्कृति के आधार प्रकाशक :श्रीअरविन्द आश्रम प्रकाशन विभाग, पॉण्डिचेरी ,मुद्रक :श्रीअरविन्द आश्रम प्रेस, पॉण्डिचेरी ,आवृति .2017

5. समकालीन भारतीय दर्शन. बसन्त कुमार लाल, मोतीलाल बनारसी दास, दिल्ली, 1991.

6. मानवता के प्रणेता महर्षि अरविन्द ,प्रभात प्रकाशन, नई दिल्ली, प्रथम संस्करण .2021 ,

7. जोशी ,डॉ० धनंजय. नैतिक शिक्षा एवं नागरिक बोध ,कनिष्क पब्लिशर्स ,डिस्ट्रीब्यूटर्स ,संस्करण .2014

8. शिक्षा पर श्री अरविन्द व श्रीमाताजी के कुछ चुने हुए वचन ,श्री अरविन्द डिवाइन लाइफ ट्रस्ट ,राजस्थान ,तृतीय संस्करण 2019.

9. https://www.allresearchjournal.com/archives//2016vol2issue/3PartB/-2-2 .103pdf

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

कामायनी मानवीय मूल्य-व्यवस्था बोध

डॉ. रेणु बाला

एसोशिएट प्रोफेसर

हिंदी विभाग , आत्मा राम सनातन धर्म महाविद्यालय, दिल्ली विश्वविद्यालय

Abstract;The story of Kamayani is basically an imagination, a fantasy. In which Prasad ji made it an important book by making an analytical blend of the social environment, life values, socialite of his time. This is the reason that its characters Manu, Shraddha and Ida - are the symbols of humanity, love and wisdom. Kamayani became important through these symbols. Because the analysis of life presented by Prasad ji in Kamayani through these symbols is as important today as it would have been in Prasad ji's time. The pride of the goddesses as creators of the universe, how they themselves created the universe and behaved in a very bad way, but how they caused the destruction of the three worlds is a mythological historical matter and is also a lesson towards humanity towards their arbitrary behavior towards the earth.

The philosophy of Kamayani is indicative of the contemporary social life perspective. Prasad is sensitive towards the social problems of his time and towards human and human life. Prasad, like other Indian philosophers, does not believe in the reality of this world of life. He is a mystic but even his mysticism does not point to any amorphous existence beyond the known truth. Prasad sees the gross and subtle, the material and the conscious as states of the same element. Neither the subtle is different from neither the gross nor the conscious from the material. From the very beginning of Kamayani he has discussed the false distinction between the material and the conscious.

Scanned with OKEN Scanner

'कामायनी' के प्रस्थान बिंदु को देखें तो यह काव्य-रचना की एक मूल्य-व्यवस्था से दूसरी रचना-मूल्य-व्यवस्था में प्रवेश का सूचक है। इसमें न सिर्फ मुक्तकों वाली एक भाव-स्थिति के बजाय मनुष्य और परिस्थिति के घात-प्रतिघात से बनने वाली कथात्मकता-घटना-क्रम है वरन् इस महाकाव्य की शुरूआत श्रृंगार के बजाय चिंता से होती है। यह चिंता वास्तव में पहले के काव्य और भद्र समाज में निहित एक मूल्य-व्यवस्था को लेकर है जिसमें नित्य निर्बाध भोग-विलास, उद्दाम वासना, शृंगार, सुरा-सुंदरी और सुरभिमय जीवन में डूबी निष्क्रियता, दंभ और क्रूरता से युक्त अमरता का भ्रम आदि सब अपनी पराकाष्ठा पर पहुंच गया था। ऐसे चरणों)कामों (से 'धरती 'प्रतिदिन 'आक्रांत 'होकर थर-थर काँपती थी। यदि थोड़ा भी ध्यान दें तो यह रचना -मूल्य-व्यवस्था वास्तव में रीतिकालीन मूल्य-व्यवस्था नजर आती है। यह बात सही है कि हम 'कामायनी' की कोई भी व्याख्या उसकी आख्यानपरकता की नितांत उपेक्षा करके नहीं कर सकते, लेकिन इसके भीतर से निकलने वाले संकेतों को भी हम छोड़ कर नहीं चल सकते, दोनों ही स्तरों पर 'कामायनी' आधुनिकता से युक्त है। रीतिकालीन रचना-मूल्य-व्यवस्था के बजाय चिंता को महत्व देना उसे प्रस्थान बिंदु बनाना इसी आधुनिकता का प्रमाण और परिणाम दोनों हैं। यह चिंता वास्तव में संस्कृति और समाज में मनुष्य की भूमिका से जुड़ी है, उसकी भूमिका की पहचान कराने वाली है। 'चिंता सर्ग 'में एक मूल्य-व्यवस्था के ढह जाने का, उसके परिणाम का दुख तो है-

"गया सभी कुछ गया मधुरतम...
भरी वासना-सरिता का वह
कैसा था मदमत्त प्रवाह
प्रलय-जलधि में संगम जिसका
देख हृदय था उठा कराह।"[cv]

साथ ही उसकी तार्किक परिणति की समझ भी है-

"क्यों न विशृंखल होती सृष्टि।"[cvi]

निर्बाध भोग-विलास और वासना की बहती सरिता, दंभ तथा अमानवीयता की तार्किक परिणति है-सृष्टि का 'विशृंखल 'होना। 'कामायनी' में एक मूल्य-व्यवस्था के परिणाम का जो गहरा दुख है उसमें उस मूल्य-व्यवस्था-रचना व्यवस्था की समीक्षा छिपी हई है, और 'चिंता 'वास्तव में उसे बचाने की नहीं है वरन उसके कारणों की खोज है। परिणाम का दुख वास्तव में हमें उसके कारणों की ओर ले जाता है तथा- 'हम क्या थे, क्या हो गए और क्या होंगे अभी 'की चिंतन-प्रणाली से हम जुड़ जाते हैं। मनु जब पुरानी मूल्य-व्यवस्था के कारणों और उसकी तार्किक परिणति को जान लेता है तो उसमें "शान्ति और जागरण चिन्ह-सा लगा धधकने अब फिर से।"[cvii] तथा काम की 'अनादि वासना 'नवीन होकर जाग उठती है। यह 'काम 'पुरानी काम वासना का पर्याय नहीं है-यह रीतिकालीन 'शृंगार 'का पर्याय नहीं है वरन् उसका रूप अत्यंत व्यापक है। श्रद्धा काम-गोत्रजा है, इसलिए उसका एक नाम कामायनी भी है। वह लोकमंगल की भावना का पर्याय भी है-

Scanned with OKEN Scanner

"वह कामायनी जगत की
मंगल कामना अकेली।"[cviii]

श्रद्धा काम-भावना उत्पन्न करते हुए मनु के हताश-मन में रागपूर्ण आत्मविश्वास का संचरण करती है। वह उसे कर्म के लिए प्रेरित करती है-

"दुख के डर से तुम अज्ञात
जटिलताओं का कर अनुमान
काम से झिझक रहे हो आज
भविष्यत् से बनकर अनजान।"[cix]

श्रद्धा स्पष्ट करती है कि श्यह विश्व कर्म रंगस्थल है 'और इसमें 'कर्म यज्ञ से जीवन के/सपनों का स्वर्ग मिलेगा। 'वह मनु को 'कर्म का भोग/भोग का कर्म 'नामक दर्शन सिखाती है और उसे ललकारती है-

"शक्तिशाली हो, विजयी बनो
विश्व में गूंज रहा जयगान।"[cx]

'कामायनी 'में काम वास्तव में कर्म, वासना, प्रेम, जिजीविषा, विश्वास, लोकगंगल आदि अनेक भावनाओं का पुंज दिखलायी पड़ता है। उसमें देश-प्रेम, विश्व-प्रेम और प्रकृति-प्रेम इत्यादि की भावनाएँ धुली-मिली है। काम का पौराणिक रूप मुख्यता श्वासना ' के देवता वाला है और उसका शास्त्रीय-रीतिवादी रूप श्रृंगार तथा नायिका-भेद वाला। प्रसाद जी ने इस धारणा में परिवर्तन करते हुए उसे "जीवन परिचालिनी शक्ति के रूप में बहुत ही प्रशस्त उपस्थापन किया है। काम न केवल सृष्टि के उद्भव ही में है बल्कि वह सृष्टि के निर्माण एवं विकास में भी उपादेय है।"[cxi] प्रसाद जी ने 'कर्म का भोग और भोग का कर्म 'बताकर 'गीता 'के निष्काम कर्म के सिद्धांत में भी उलटफेर किया है। प्रसाद जी के अनुसार कर्म का कोई न कोई फल अथवा परिणाम निकलना ही चाहिए। यही नहीं, श्रृंगार और भोग की मूल्य-व्यवस्था को बदलने के क्रम में प्रसाद जी ने नारी-संबंधी धारणा को भी बदला है, श्रृंगार और भोग की मूल्य-व्यवस्था में नारी मूलतः भोग्या रही है। लेकिन प्रसाद जी के अनुसार वह कर्म की प्रेरणा देने वाली, सृष्टि में मंगल करने वाली तथा विश्व विजय और मनुष्य को शक्तिशाली बनाने वाली कल्याणकारी कारक है। इसलिए वह कोई मायावनी-अविद्या नहीं है जिसे त्यागना साधक का प्राथमिक कर्तव्य हो, बल्कि वह सम्मान और आदर की पात्र है-

"नारी तुम केवल श्रद्धा हो।"[cxii]

इस तरह, 'कामायनी 'का चिंता से आरंभ होना और श्रद्धा द्वारा मनु को कर्म की ओर प्रेरित करना वास्तव में साहित्य को रीतिवादी रूढ़िवाद के संकुचित दायरे से निकाल कर उसे जीवन-जगत और संस्कृति की व्यापक चिंताओं से सम्बद्ध करना है, साथ ही गीता के निष्काम-कर्म तथा मध्यकालीन मायावाद से भारतीय मानस को मुक्त करते हुए नारी की उचित भूमिका की पहचान कराना है, और इस तरह 'कामायनी 'पुरानी रचना-मूल्य-व्यवस्था के बजाय आधुनिक रचना-मूल्य-व्यवस्था की प्रस्तावना करती है जिसमें

Scanned with OKEN Scanner

जीवन जगत, मनुष्य और देश-हित के प्रश्न चिंतन के केन्द्र में आते हैं। अपनी आख्यानपरकता, प्रतीकवाद के बावजूद 'कामायनी ' में जीवन-जगत और मनुष्य के महत्व की प्रतिष्ठा मिलती है, उसकी जटिल समस्याओं का रेखांकन पाया जाता है।

'कामायनी 'में मनु परलोक अथवा देवलोक की तुलना में मानव-लोक की सृष्टि करते हैं। श्रद्धा और इड़ा इस कार्य में उनकी सहायता करती हैं, यह सृष्टि देव-सृष्टि से आगे बढ़ी हुई सृष्टि है। इसमें मनुष्य के कर्म का सर्वाधिक महत्व है, देव-सृष्टि में कर्महीनता है। यहाँ 'अखिल मानव भावों का सत्य विश्व के हृदय-पटल पर दिव्य अक्षरों से अंकित 'है। देवताओं का भावों से-विकारों से क्या लेना-देना? देव-सृष्टि काफी हद तक एकायामी है, लेकिन मानव-सृष्टि बहुआयामी। उसमें न सिर्फ भावों-विकारों की संश्लिष्ट बहुविध व्यवस्था होती है वरन् वह अपने बाह्य रूपाकार में भी संश्लिष्टता और बहुआयामिता से युक्त होती है। कामायनी में न सिर्फ श्रद्धा, मनु, इड़ा और प्रजा की विविध भावनाओं-एक-एक भाव के साथ अनेक अनुभावों की व्यवस्था की अभिव्यक्ति है वरन् ग्राम-समाज, साम्राज्य स्थापना के क्रम में नगर, विभिन्न कर्म और विभिन्न वर्ण अथवा वर्गों की बहुविध उपस्थिति है। साथ में प्रकृति का भी-कहीं स्वतंत्र और कहीं मानव द्वारा नियमित-अस्तित्व है। इस तरह, मनुष्य के आंतरिक भावों और बाह्य जीवन की रीतिकालीन एकरसता और एकायामिता के बजाय 'कामायनी 'में उसकी संश्लिष्ट और बहुविध व्यवस्था का चित्रण किया गया है। नव-जागरणकालीन मानववाद की प्रतिष्ठा को यहाँ आसानी से देखा जा सकता है। वास्तव में जहाँ से देव-सृष्टि खत्म होती है, वहीं से मानव-सृष्टि की शुरूआत होती है। श्रद्धा कहती है-

"देव-असफलताओं का ध्वंस
प्रचुर उपकरण जुटा कर आज,
पड़ा है बन मानव संपत्ति
पूर्ण हो मन का चेतन राज।"[cxiii]

मनुष्य के इस चेतनता के राज में 'मानवता की कीर्ति अनिल, भू, जल में बंद 'नहीं रहेगी, यानी वह प्राकृतिक शक्तियों पर विजय प्राप्त करती हुई संपूर्ण जीवन-जगत में, अखिल ब्रह्माण्ड में व्याप्त हो जाएगी और इस तरह मानवता की विजय होगी -

"शक्ति के विद्युत्कण, जो व्यस्त
विकल बिखरे पड़े हैं, हो निरूपाय
समन्वय उसका करे समस्त
विजयिनी मानवता हो जाय!"[cxiv]

वास्तव में मानवता के विजय की कामना और देव-सृष्टि के ध्वंसावशेषों पर मानव-सृष्टि की प्रस्तावना है 'कामायनी'। यह 'कामना ' और प्रस्तावना संसार को दुःखमय कहकर उससे भागने में चरितार्थ नहीं होती। मनु संसार को दुःखमय कहकर जब उससे भागते हैं, तब श्रद्धा उन्हें रास्ते पर लाती है। डॉ. रामविलास शर्मा ने सही रेखांकित किया है कि प्रसाद जी ने 'कामायनी 'में मनु की आलोचना के जरिये जीवन-जगत् विरोधी प्रवृत्तियों की आलोचना प्रस्तुत की है और जीवन-जगत् विरोधी प्रवृत्तियों के मूल उद्गम की ओर संकेत किया है। वह मूल उद्गम है -संसार को क्षण भंगुर मानना। कोई क्षणभंगुरता के विचार से वैरागी हो जाता है, कोई

Scanned with OKEN Scanner

क्षण के आनंद में ही सबकुछ भूल जाना चाहता है। अक्सर आज जो भोगवादी है, कल वही वैरागी भी बन जाता है। प्रसाद जी ने ये दोनों व्यापार मनु में दिखाकर यानी एक ही व्यक्ति में दिखाकर उनके एक ही उद्गम की ओर संकेत किया है। इसलिए रामविलास जी की यह स्थापना एकदम सही है कि "कामायनी की विषयवस्तु अध्यात्म-चिंतन न होकर इस भौतिक जगत् के मानव की ही संस्कृति है।"[cxv] मानव की यह संस्कृति देव-संस्कृति की तुलना में न सिर्फ इसलिए श्रेष्ठ है कि यह बहुआयामी और विविधता लिए हुए है कि उसमें कर्मशीलता की प्रधानता है वरन् इस रूप में भी श्रेष्ठ है कि वह मूल्यों से युक्त है। इसमें सिर्फ अपना ही सुख मुख्य नहीं है, वह सुख संकीर्ण नहीं है, इसमें सबको सुखी बनाकर अपने सुख को व्यापक, संकीर्णता के बजाय विस्तृत बनाने की अवधारणा पर बल है-

"औरों को हंसते देखो मनु
हंसो और सुख पाओ,
अपने सुख को विस्तृत कर लो
सब को सुखी बनाओ।"[cxvi]

दूसरों को सुखी बनाना 'श्रृंगार' और 'रति' के जरिये संभव नहीं है जो देव-संस्कृति का 'श्रृंगार' और 'रति''कामायनी 'में अपना मानवीय आकार ग्रहण करता हुआ परिवर्तित होकर 'प्रेम' और 'लज्जा' बन जाता है -यह गुणात्मक परिवर्तन है। इसी तरह देव-सृष्टि की अंधता यहाँ चेतनता और बुद्धि में -इड़ा में परिवर्तित हो जाती है। यह चेतनता और बुद्धि श्रद्धा का भी गुण है, सिर्फ इड़ा का ही नहीं है। डॉ. शिवनाथ के अनुसार बिना''बुद्धि के किसी भी कर्म का संपादन संभव नहीं; कामायनी में श्रद्धा उत्तमोत्तम कर्मों का संपादन-संचालन करती है, अंत में वह लौकिक एवं आध्यात्मिक दृष्टि से मनु की पथप्रदर्शिका भी बनी है; फिर भी कहा जाता है कि श्रद्धा में बुद्धितत्व की कमी है। किंतु किन्हीं अंशों में दोनों)श्रद्धा और इड़ा (में हृदय एवं बुद्धि का सन्निवेश है, इसे अस्वीकार नहीं किया जा सकता।"[cxvii] इस तरह देव-सृष्टि की अंधता के बजाय चेतनता, बौद्धिकता, प्रकाश और ज्ञान-विज्ञान मानव-सृष्टि का लक्षण है। 'कामायनी 'में मनुष्य ने अपने कर्म से सृजनात्मकता, संस्कृति और सभ्यता अर्जित की है। 'कामायनी 'में 'बिम्बविधान 'को अत्याधिक महत्व देने वाले आलोचक श्री रामस्वरूप चतुर्वेदी को भी 'कामायनी 'में चित्रित मानव-सृष्टि की श्रेष्ठता को स्वीकार करना पड़ा है। "प्रसाद का पक्ष है कि देव-सृष्टि जहाँ भोग-विलास और महज़ भौतिक सुख-साधनों में डूबी हुई थी वहाँ मनुष्य की सृष्टि कुछ नये मानव-मूल्यों का आविष्कार करती है, जिनमें सबसे प्रमुख है प्रेम करने की क्षमता। मृत्यु पर विजय पाने के लिए मनुष्य प्रेम की क्षमता विकसित करता है, और उसी से जुड़ी सर्जनात्मक शक्ति।"[cxviii]

'कामायनी' में प्रतिपादित मानव-संस्कृति जहाँ एक ओर देव संस्कृति से भिन्न और विशिष्ट है, वहीं वह असुर-संस्कृति से भी अलग अपना खास महत्व रखती है। मनु देव-पुत्र हैं। वह देव-असुर संग्राम और दोनों संस्कृतियों की विशिष्टता से अच्छी तरह परिचित हैं। वह इसे स्पष्ट करता हुआ सोचता है" -जीवन का लेकर नव विचार/जब चला द्वंद्व था असुरों में प्राणों की पूजा का प्रचार/उस ओर आत्म विश्वास निरत सुर वर्ग कह रहा था पुकार' -मैं स्वयं सतत् अराध्य आत्म मंगल उपासना में विभोर'। यानी 'था एक पूजता देह दीन/दूसरा अपूर्ण अहंता में अपने को समझ रहा प्रवीण।"[cxix] देव-संस्कृति जहाँ आत्ममुग्ध, अहंकारी और

Scanned with OKEN Scanner

सब कुछ पर अधिकार किए हुए थी, वहाँ असुर-संस्कृति शरीर-सुख में डूबी हुई थी-देह-सुख ही जैसे उसका परम-पूजन कर्म था। ये दोनों ही संस्कृतियाँ अपूर्ण थीं। मानव-संस्कृति निश्चित ही इन कमियों से परे एक पूर्ण संस्कृति होगी जो अन्य मनुष्यों की ही चिंता नहीं करेगी वरन सृष्टि के समस्त चर-अचर प्राणियों की भी चिंता करेगी-ऐसा संकेत हमें 'कामायनी 'से मिलता है। प्रलय से बचकर जब मनु यज्ञ करते हैं तो पशु की बलि नहीं देते तथा उसमें से बचा हुआ अन्न मनु दूसरों के लिए दूर रख आते हैं - "अग्निहोत्र अवशिष्ट अन्न कुछ/कहीं दूर रख आते थे/होगा इससे तृप्त अपरिचित/समझ सहज सुख पाते थे।"[cxx]लेकिन मनु का यह सहज सुख अधिक दिनों तक नहीं चल पाया। किलात और आकुलि नामक दो असुर पुरोहित उस विप्लव से बच निकले थे - "असुर पुरोहित उस विप्लव से/बचकर भटक रहे थे/वे किलात आकुलि थे।"[cxxi] वे मनु के पास आए और उन्होंने मनु को पशु-बलि के लिए उकसाया तथा मनु की सुप्त वासना को जगाया। वह समझने लगा' -आकर्षण से भरा विश्व यह/केवल भोग्य हमारा।' श्रद्धा के यह समझाने पर भी कि "ये जो प्राणी बचे हुए हैं/इस अचला जगती के/उनके कुछ अधिकार नहीं/क्या वे सब ही हैं फीके"[cxxii] मनु की कुछ समझ में नहीं आया और वह भोग-विलास तथा अधिकार-सुख की लालसा में सारस्वत प्रदेश में आ पहुंचा। यहाँ पहुँचकर देव और असुर संस्कृतियों का द्वन्द्व जैसे उसके भीतर ही समा गया" -मुझमें ममत्वमय आत्ममोह स्वातंत्र्य मयी उच्छृंखलता/हो प्रलय भीत तन रक्षा में पूजन करने की व्याकुलता/वह पूर्व द्वन्द्व परिवर्तित हो मुझको बना रहा अधिक दीन।"[cxxiii] यानी आत्मोह और शरीर सुख की आराधना दोनों के लिए रंगस्थल बन गए मनु। इड़ा की सहायता से सारस्वत-प्रदेश का निर्माण करने के उपरांत मनु भोग-विलास में डूब गए, तथा सब कुछ पर अधिकार कर लेने की वृत्ति ने उन्हें इड़ा पर भी पूर्ण अधिकार के लिए प्रेरित किया, जनता पर उन्होंने पहले ही अधिकार कर लिया जिन पर मनु अत्याचार करते थे। इसका परिणाम हुआ प्रजाविद्रोह और प्रकृति-क्षोभ। युद्ध में मनु घायल हो बेसुध हो गए। फिर श्रद्धा आयी और उन्हें कैलाश पर्वत पर ले गयी तथा पृथ्वी पर राज्य करने के लिए अपने पुत्र मानव को इड़ा के पास छोड़ गयी। मानव का इड़ा के साथ होना इस बात का संकेत है कि मानव-संस्कृति में सहृदयता और चेतना का सुखद-संयोग रहता है, उसमें कर्म का महत्व होता है और सबकी चिंता का मानवीय मूल्य। मनु में जब आसुरी-वृत्ति जगी तो वह न सिर्फ सबको अपने भोग का साधन समझने लगा था वरन् चेतना को भी अस्वीकार करने लगा था। उसकी समझ थी कि यह विश्व उसी समय हमारा 'भोग्य 'बन सकता है "जिस क्षण भूल सकें हम अपनी/यह भीषण चेतनता।"[cxxiv] जैसे इसी धारणा का विरोध करते हुए श्रद्धा मानव से कहती है"-यह)इड़ा (तर्कमयी तू श्रद्धामय/तू मननशील कर कर्म अभय/इसका तू सब संताप निचय/हरले, हो मानव भाग्य उदय/सब की समरसता कर प्रचार/मेरे सुत !सुन मां की पुकार ।"[cxxv] यानी 'कामायनी 'में जिस मानव-संस्कृति की अभिव्यक्ति की ओर प्रसाद जी ने संकेत किया है वह देव और असुर संस्कृतियों की तुलना में न सिर्फ विशिष्ट और श्रेष्ठ है वरन् वह एक पूर्ण-संस्कृति भी है जिसमें शरीर-सुख और व्यक्तिगत अधिकार या हित के बजाय करुणा और समाज-हित के सरोकार प्रमुख हैं। यानी यह संस्कृति आत्म-सुख की आकांक्षा में दूसरों पर अन्याय-अत्याचार में लीन रहने के बजाय करुणा और जन-कल्याण जैसे मूल्यों की सृष्टि करती है।

Scanned with OKEN Scanner

संदर्भ ग्रन्थ

कामायनी, पृ .17-18

वही, पृ .17

वही, पृ .39

वही, पृ .298

वही, पृ .60

वही, पृ .65

डॉ. राममूर्ति त्रिपाठी, कामायनी: कला और दर्शन, पृ० 63

कामायनी, पृ .114

वही, पृ .66

वही, पृ .67

परंपरा का मूल्यांकन, पृ० 133

कामायनी, पृ .140

कामायनी सं. लोढ़ा, पृष्ठ 196

हिंदी साहित्य और संवेदना का विकास, पृ .118

कामायनी, पृ .169

वही, पृ .40

वही, पृ .119

वही, पृ .137

वही, पृ .169

वही, पृ .136

वही, पृ .252

☆☆☆

Scanned with OKEN Scanner

भारतीय ज्योतिषशास्त्र और ताजिकशास्त्र परंपरा में पारस्परिक विनिमय के विविध आयाम

डॉ. प्रियंका जैन
पीएच्.डी.(ज्योतिष),
संस्कृत विभाग,दिल्ली विश्वविद्यालय,दिल्ली-7

डॉ. राजीव रंजन
सहायक आचार्य (ज्योतिष)
संस्कृत विभाग, दिल्ली विश्वविद्यालय, दिल्ली-7

(शोध सारांश (Abstract

भारतीय ज्योतिषशास्त्र विश्व की प्राचीनतम वैज्ञानिक एवं दार्शनिक परम्पराओं में से एक है, जिसने कालान्तर में अनेक बाह्य परम्पराओं के साथ संवाद स्थापित करते हुए अपने स्वरूप को समृद्ध किया। ताजिकशास्त्र ऐसी ही एक महत्वपूर्ण परम्परा है, जिसका उद्भव अरबी-फारसी ज्योतिषीय परम्पराओं में हुआ और मध्यकाल में भारतीय ज्योतिष के साथ इसके गहन अन्तर्सम्बन्ध विकसित हुए। भारतीय ज्योतिष और ताजिकशास्त्र के मध्य यह पारस्परिक विनिमय केवल तकनीकी स्तर तक सीमित नहीं रहा, अपितु दार्शनिक, सांस्कृतिक तथा गणनात्मक आयामों में भी दृष्टिगोचर होता है। ताजिक पद्धति ने भारतीय ज्योतिष में वर्षफल, सहम,मुन्था,दीप्तांश,दलीलद ग्रह इत्थशाल आदि षोडश योग,सहम , आदि नवीन संकल्पनाओं का समावेश किया, वहीं भारतीय ज्योतिष की ग्रह-दृष्टि, भाव-व्यवस्था तथा कर्म-सिद्धान्त जैसी अवधारणाओं ने ताजिक पद्धति को भारतीय सांस्कृतिक परिप्रेक्ष्य में अनुकूलित किया।

प्रस्तुत शोधपत्र में भारतीय ज्योतिषशास्त्र और ताजिकशास्त्र के ऐतिहासिक विकास, पारस्परिक आदान-प्रदान, ग्रन्थ-परम्परा, तकनीकी विशेषताओं तथा सांस्कृतिक प्रभावों का विश्लेषणात्मक अध्ययन किया गया है। शोधपत्र में नीलकण्ठ, बलभद्र, समरसिंह आदि आचार्यों के योगदान का मूल्यांकन करते हुए यह प्रतिपादित किया गया है कि ताजिकशास्त्र भारतीय ज्ञानपरम्परा में एक समन्वयवादी दृष्टिकोण का परिचायक है। यह अध्ययन इस तथ्य को भी उद्घाटित करता है कि भारतीय ज्योतिष ने बाह्य प्रभावों को आत्मसात् कर अपनी मौलिकता को अक्षुण्ण रखते हुए एक नवीन संश्लेषण का निर्माण किया।

प्रमुख शब्द)Keywords)

भारतीय ज्योतिष, ताजिकशास्त्र, वर्षफल, मुन्था , सहम,दीप्तांश , फलित ज्योतिष, सांस्कृतिक समन्वय

ज्योतिषशास्त्र मानव सभ्यता की प्राचीनतम ज्ञान-विज्ञान की पद्धतियों में सर्वप्रमुख है। यह केवल ग्रह-नक्षत्रों का अध्ययन नहीं, अपितु जीवन के विविध आयामों का दार्शनिक, सामाजिक एवं सांस्कृतिक विश्लेषण भी प्रस्तुत करता

है। भारतीय **ज्योतिषशास्त्र** (वैदिक ज्योतिष) और **ताजिकशास्त्र** (ताजिक ज्योतिष, मध्य एशियाई परम्परा) दोनों ही नियति, कालचक्र, ग्रह गोचर,दशा और मानव जीवन पर ग्रहों और राशियों के प्रभाव पर आधारित परंपराएँ हैं।ऐसा माना जाता है कि मध्यकालीन इतिहास में तत्कालीन भारतवर्ष और ताजिकिस्तान (मुख्यतः सैमर्कैंड, ख़ीवा और बाकू जैसे क्षेत्रों में) के बीच **व्यापक सांस्कृतिक और बौद्धिक आदान-प्रदान** हुआ, जिसमें से ज्योतिषशास्त्र दोनों संस्कृतियों के बीच साझा समझ और संश्लेषण का एक प्रमुख क्षेत्र सिद्ध हुआ।[1] इस शोध-पत्रमें भारतीय ज्योतिषशास्त्र और ताजिकशास्त्र के बीच सांस्कृतिक व शास्त्रीय सिद्धांतों के आदान-प्रदान के ऐतिहासिक, दार्शनिक और तकनीकी आयामों का विश्लेषण प्रस्तावित है।

भारतीय ज्योतिषशास्त्र-भारतीय ज्योतिषशास्त्र (ज्योतिषविद्या) वेदों से उत्पन्न एक समग्र जीवन-दृष्टि है। वेदांग ज्योतिष, मुख्यत: *गणितीय खगोल विज्ञान* के सिद्धान्तों पर आधारित है, जिसने कालगणना, पंचांग निर्माण, नक्षत्र, ग्रह गोचर, दशा प्रणाली, ग्रहों के योगकारकत्व तथा कर्मफल सिद्धांत को विकसित किया। भारतीय ज्योतिषशास्त्रीय परंपरा में ग्रहों का मानवीय जीवन पर प्रभाव विश्लेषण ,जन्मकुंडली का विस्तृत अध्ययन ,दशा आधारित शुभाशुभ फलविश्लेषण ,मुहूर्त चयन जैसे विशिष्ट तकनीकी तथा दार्शनिक आयाम सम्मिलित हैं। इस शास्त्र का *वैदिक धर्म, दर्शन और संस्कृति* से गहन सम्बंध है।**ताजिक ज्योतिषशास्त्र**-ताजिक या **ताजिकिस्तान क्षेत्रीय ज्योतिष**, मुख्यतः मध्य एशिया की इस्लामी-संस्कृति के प्रभाव में विकसित हुआ। इसे *ताजिक (Tajik)* कहा जाता है, जिसका अर्थ मूलतः 'ताजिक भाषी' या 'मिडिल एशियाई' परंपरा है। ताजिक शास्त्र में इस्लामी खगोल सिद्धांत ,अरब-फारसी खगोल गणना पद्धतियाँ ,जातक ज्योतिष ,नवीन ग्रहों की परिकल्पना ,नवीन ग्रह दृष्टि-मैत्री,विशिष्ट ग्रहयोग तथा नवीन सिद्धांत विकसित हुए। भारतीय ज्योतिषशास्त्रीय पद्धति की अपेक्षा ताजिक पद्धति में ग्रहों का चरित्र, राशिचक्र की गणना तथा फलादेश में इस्लामी दार्शनिक प्रभाव तथा फलादेश की सूक्ष्मता अपेक्षाकृत अधिक परिलक्षित होती है।

प्राचीन आदान-प्रदान के ऐतिहासिक साक्ष्य-भारत और मध्य एशिया के बीच प्राचीन काल से ही विविध प्रकार का **सांस्कृतिक एवं बौद्धिक आदान-प्रदान** होता रहा है। *रास्तों का व्यापार* तथा *विद्या-यात्राएँ* दोनों तरफ से ज्ञान के आदान-प्रदान हेतु माध्यम बनीं।इस क्रम में 8वीं से 12वीं शताब्दी तक **तुर्क, फारसी, मध्य एशियाई विद्वानों** का भारत आगमन हुआ। भारत से *गणित, खगोल, आयुर्वेद, दर्शन* जैसे विषय प्रवाहित हुए। मध्य एशिया से *अरबी-फारसी विज्ञान, खगोलशास्त्र, दार्शनिक लेख* भारत आए। इस प्रकार, ताजिक और भारतीय ज्योतिष के बीच **सिद्धान्तीय और तकनीकी विनिमय** के स्पष्ट संकेत प्रकट होते हैं।

दोनों ज्योतिषीय परम्पराओं के दार्शनिक आधार

जहाँ भारतीय ज्योतिषशास्त्र का आधार *ऋग्वेद, यजुर्वेद, अथर्ववेद* में प्रतिपादित नक्षत्र और ग्रह आदि आकाशीय पिण्डों का अध्ययन है, जो कर्म और मोक्ष जैसे दार्शनिक विषयों से संबंधित है। वहीं दूसरी ओर, ताजिक ज्योतिष में *इस्लामी दर्शन, अरब-फारसी खगोलीय गणनाएँ* प्रमुख हैं। अतः दोनों की उत्पत्ति और दार्शनिक आधार में भिन्नता है, फिर भी निम्नलिखित दो प्रमुख कारण हैं जो सांस्कृतिक विनिमय के आधार बने-प्रथम तो गणितीय व खगोलीय सिद्धान्तों के साझे मानदण्ड और दूसरा ग्रह-राशि-नक्षत्र की सर्वदेशीय मान्यता।

तकनीकी सिद्धांतों के आदान-प्रदान व जन्मकुंडली और ग्रह-फल का विश्लेषण-भारतीय ज्योतिषशास्त्र में जन्मकुंडली का निर्माण एवं फलादेश के सिद्धान्त अत्यंत विशद हैं- *लग्न, भाव, दशा, अंतर्दशा, योग* तथा राशि-ग्रह*गुणस्वरुप आदि फल* कथन के गहन विश्लेषण का आधार होते हैं। जबकि ताजिक शास्त्र में उपरोक्त विषयों के अतिरिक्त अन्य गणितीय प्रमुख बिंदु यथा –मुन्था ,सहम,दीप्तांश ,विशिष्ट षोडश योग,ग्रहों के गुण, मित्रता,दृष्टि आदि में भेद दृष्टिगत होता है।साथ ही जन्म-ज्योतिष की गणना अधिक *गणितीयप्रे,क्षणीय* ,सूक्ष्म व वार्षिक पद्धति पर आधारित हो जाती है।भारतीय ज्योतिष ने दशा प्रणाली, भाव और योगों की फलकथन जैसी तकनीकों को विकसित किया, जिसने ताजिक विद्वानों को भी प्रभावित किया।

खगोलीय गणना प्रौद्योगिकी का प्रभाव- मध्य एशिया के विद्वानों ने *अरबी-फारसी गणितीय गणना तकनीकों* को भारतीय सिद्धांतों के आधार पर विकसित किया, जैसे-त्रिकोणमिति ,बाइनोमियल समीकरण ,सटीक गोचर गणना आदि।ये तकनीकें भारतीय खगोलीय गणना को भी प्रभावित करती हैं और भारतीय विद्वानों ने भी इन्हें संशोधित कर अपने पंचांग निर्माण में समायोजित किया।

दार्शनिक और सांस्कृतिक समन्वय के साथ-साथ कर्म-फल एवं नियति का साझा दृष्टिकोण-

भारतीय परंपरा में *कर्म सिद्धांत* और *पुनर्जन्म की व्याख्या* प्र मुख है। जबकि ताजिक पद्धति में नियति के साथ *मुख्यतः गणितीय परिणाम और ग्रह-दशा* का प्रभाव अधिक माना जाता है। दोनों पद्धतियाँ मानती हैं कि-ग्रह-नक्षत्र नियति का निर्धारण करते हैं, परंतु मानव के कर्म तथा निर्णय भी फल को प्रभावित करते हैं।इस प्रकार, दोनों परंपराएँ दर्शन के स्तर पर तत्वगत रूप से मेल खाती हैं।

भाषाई और सांस्कृतिक समावेशन

ताजिक शास्त्र में अरबी-फारसी शब्दावली का प्रचलन रहा है, जैसे-इक्कबाल,रद्द,आदि।भारतीय ज्योतिष में संस्कृत शब्दों का प्रमुख स्थान है। इन भाषाई त्रिवेणी से सांस्कृतिक विनिमय का एक नया आयाम स्पष्ट होता है -विद्वानों ने विचारों को **भाषा, लेखन और अनुवाद के माध्यम से** साझा किया है।

आधुनिक शोध एवं तुलनात्मक अध्ययन

आज की स्थिति में भारतीय और ताजिक ज्योतिषीय परंपराओं की तुलना में निम्नलिखित बिंदु स्पष्ट हैं।भारतीय ज्योतिष का **वैदिक आधार**, कर्मसिद्धान्त, दर्शन,पुनर्जन्म और *दशा-भूत योग प्रणाली* विशिष्ट है। वहीं ताजिक ज्योतिष का **गणितीय-खगोलीय विश्लेषण**, और अरब-फारसी गणना पद्धतियाँ पारंपरिक रूप से विकसित हुई हैं। दोनों ही परंपराएँ *समय, गति, ग्रह गोचर और फलकथन* जैसे मूलभूत सिद्धांत साझा करती हैं। इन सबके बाद भी ताजिक शास्त्र के अनेक सिद्धांत सर्वथा नवीन हैं जिनका विकास ताजिकशास्त्र के विद्वानों ने अपनी मेधाशक्ति और अनुभव के आधार पर किया है ।इन प्रमुख सिद्धांतों को क्रमशः प्रस्तुत करके पारस्परिक प्रभाव का मूल्यांकन करना संभव हो सकता है।

ताजिकशास्त्र के षोडश योग- ताजिक ज्योतिष परम्परा में *योग* की संकल्पना अत्यंत केंद्रीय एवं निर्णायक मानी गई है। जन्मपत्रिका कुण-जातक)ुडली (वर्षफल) तथा वर्षपत्रिका (दोनों के फलनिर्णय में योगों की भूमिका आधारभूत

होती है। फलित का समग्र स्वरूप ग्रहों की पृथकपृथ-क स्थिति से नहीं, अपितु उनके पारस्परिक सम्बन्धों, दृष्टियों, वेगों तथा संयोगवियोग की विशिष्ट स्थितियों से निर्मित योगों पर निर्भर करता है। ज-ब कोई योग अपने आवश्यक तत्त्वों - जैसे ग्रहों की पारस्परिक दृष्टि , अंशात्मक समीपता)orb), बल सापेक्षता तथा भावाधिष्ठान-की पूर्णता को प्राप्त कर लेता है, तब उससे संबद्ध फल का उद्भव अनिवार्यतया माना गया है। इस प्रकार ताजिक पद्धति में योग केवल सांकेतिक संरचनाएँ नहीं, बल्कि दैव) काल के सक्रिय संकेतक-dynamic indicators) हैं।ताजिक शास्त्र के आचार्यों ने विशेष रूप से *षोडश योगों*[2] का प्रतिपादन किया है, जिन्हें वर्षफलत महत्त्वपूर्ण माना जाता है। इन निर्णय में अत्यं- है (प्रभावित-यवन) योगों की नामावली स्पष्टतः विदेशीय, क्योंकि ताजिक परम्परा का विकास मध्य एशियाई एवं अरबीफारसी ज्योतिषीय धाराओं के संस्पर्श से- हुआ। तथापि, इन योगों से निष्पन्न होने वाले फलनिर्णय में भारतीय - फलित ज्योतिष के पारम्परिक सिद्धान्तों-जैसे शुभाशुभ ग्रहस्वभाव, भावाधिपत्य, दृष्टितत्त्व-, बलाबल तथा कर्मफल मीमांसा-का प्रत्यक्ष और गहन प्रभाव दृष्टिगोचर होता है। यह तथ्य इस परम्परा के सांस्कृतिक समन्वय का सशक्त प्रमाण है। ताजिक वर्षफलग्रहों की पारस्परिक दृष्टि निर्माण की संकल्पना-पद्धति में योग-, अंश समीपता- (दीप्तांश), गत्यात्मक भेद (मन्दगामी–शीघ्रगामी), बलाबल तथा भावाधिष्ठान के समन्वित विश्लेषण पर आधारित है। विशेषतः लग्नेश लग्न क-वर्ष)ा स्वामीके परस्पर सम्बन्ध को निर्णायक (विवेच्य भाव का स्वामी) और कार्येश (। निम्नलिखित षोडश योग वर्षकुण्डली में शुभाशुमाना गया हैभ फलनिर्णय के प्रमुख उपकरण हैं-। ताजिक शास्त्र में उल्लिखित षोडश प्रमुख योग निम्नलिखित हैं-

1. **इक्कबाल योग** यदि समस्त ग्रह 'केन्द्र'(1, 4, 7, 10) एवं 'पणफर'(2, 5, 8, 11) भावों में अवस्थित हों और 'आपोक्लिम'(3, 6, 9, 12) रिक्त रहें, तो इक्कबाल योग का निर्माण होता है।[3] यह विन्यास ग्रहबल के समुचित वितरण का द्योतक है, जिसके परिणामस्वरूप राज्यलाभ, प्रतिष्ठा, वित्तवृद्धि और सांसारिक सुख की - प्राप्ति मानी जाती है। वर्षफल में यह योग उन्नयनशील प्रवृत्तियों को सक्रिय करता है।
2. **इन्दुवार योग** जब वर्षकुण्डली के सभी ग्रह) भावों 'आपोक्लिम'3, 6, 9, 12) में स्थित हों, तब इन्दुवार योग निर्मित होता है। यह विन्यास स्थिरता के अभाव और परोक्ष संघर्ष का संकेत देता है। फलतः वर्ष भर मानसिक उद्वेग, पारिवारिक क्लेश, स्त्रीपुत्र से कष्ट-, पदहानि अथवा अवनति की सम्भावना रहती है।-[4] यह योग सामान्यतः प्रतिकूल एवं क्लेशप्रद माना गया है।
3. **इत्थशाल योग** ताजिक पद्धति का केन्द्रीय योग है 'इत्थशाल', जो लग्नेश एवं कार्येश के मध्य अंश- संबंध पर आधारित है। यदि शीघ्रगामी ग्रह-समीपता और दृष्टि, मन्दगामी ग्रह से न्यून अंश का होकर उससे संयोग की ओर अग्रसर हो, तो इत्थशाल योग बनता है। इसके तीन भेदपूर्णेत्थशाल—, वर्तमान इत्थशाल एवं भविष्य इत्थशालग्रहों की वास्तविक अंशगत दूरी के आधार पर माने गए हैं। यह योग कार्यसिद्धि—, उद्देश्य- पूर्ति तथा नियोजित योजनाओं के सफल निष्पादन का द्योतक है।
4. **ईसराफ योग (मूसरिफ)** जब लग्नेशकार्येश के संबंध में शीघ्रगामी ग्रह–, मन्दगामी ग्रह से अधिक अंश का होकर उससे पृथक होने की स्थिति में हो, तब ईसराफ योग बनता है। यह इत्थशाल का प्रतिलोम रूप है और कार्यविघटन-, अवसर च्युतता तथा प्रयत्नों के निष्फल-होने का सूचक है। इसे कार्यनाशक योग कहा गया है।
5. **नक्त योग** यदि लग्नेश और कार्येश में प्रत्यक्ष दृष्टिसंबंध न हो-, किन्तु उनके मध्य स्थित कोई शीघ्रगामी ग्रह अपने दीप्तांश के भीतर दोनों को दृष्ट कर 'संक्रमण-प्रकाश'(transfer of light) करे, तो नक्त योग बनता है।

इस स्थिति में मध्यस्थ ग्रह पूर्व ग्रह से प्रभाव ग्रहण कर उत्तर ग्रह को संप्रेषित करता है, जिससे इत्थशालसदृश - फल उत्पन्न होता है। यह योग परोक्ष सहायता से कार्यसिद्धि का द्योतक है।

6. **यमय योग** नक्त के समान, यदि मध्यस्थ ग्रह मन्दगामी हो और वह अपने दीप्तांश के भीतर लग्नेशकार्येश – दोनों से सम्बद्ध हो, तो यमय योग निर्मित होता है। यहाँ मन्दग्रह शीघ्रग्रह से प्रभाव लेकर दूसरे ग्रह को प्रदान करता है। यह भी सहयोगआधारित कार्यसिद्धि का सूचक है-, किन्तु इसकी गति अपेक्षाकृत मंद एवं विलंबित फलदायी मानी जाती है।
7. **मणऊ योग** यदि मंगल या शनि जैसे क्रूर ग्रह, किसी शीघ्रगामी ग्रह के दीप्तांश में स्थित होकर कार्येश से इत्थशाल करें तथा उस शीघ्रग्रह पर केन्द्रीय दृष्टि)1, 4, 7, 10) रखें, तो मणऊ योग बनता है। इस स्थिति में क्रूर ग्रह कार्येश के प्रभाव को अवरुद्ध कर देता है, फलतः कार्यविघ्-न, हानि अथवा निराशा उत्पन्न होती है। यह कार्यहन्ता योग है।
8. **कम्बूल योग** जब लग्नेशकार्येश में इत्थशाल हो तथा चन्द्रमा उनमें से किसी एक से भी इत्थशाल करे–, तब कम्बूल योग बनता है। चन्द्रमा की स्थिति के अनुसार यह उत्तम, मध्यम या अधम फल प्रदान करता है। यदि चन्द्र उच्च या स्वक्षेत्र में होकर शुभ ग्रहों से इत्थशाल करे तो उत्तम; शत्रुक्षेत्री से मध्यम-; तथा नीच या अस्त ग्रह से संबंध होने पर अधम फल प्राप्त होता है। यह योग संवेदनात्मक एवं मनोवैज्ञानिक स्तर पर भी प्रभावकारी है।
9. **गौरिकम्बूल योग** यदि लग्नेशकार्येश में इत्थ–शाल हो परन्तु चन्द्रमा 'शून्यमार्ग'[5] में होकर प्रत्यक्ष इत्थशाल न करे, किन्तु राशिपरिवर्तन के उपरांत किसी स्वक्षेत्री या उच्च ग्रह से इत्थशाल स्थापित करे-, तो उस ग्रह की सहायता से गौरिकम्बूल योग बनता है। यह अप्रत्यक्ष सहयोग से कार्यसिद्धि का संकेत देता है।

10.खल्लासर योग जब लग्नेशकार्येश में इत्थशाल हो–, पर चन्द्र शून्यमार्ग में स्थित होकर उनसे पृथक रहे और किसी प्रकार का सहायक संबंध न स्थापित करे, तब खल्लासर योग बनता है। यह कम्बूल के प्रभाव को नष्ट कर देता है। फलतः रोग, मानसिक व्यथा, पारिवारिक संकट और संततिसंबंधी कष्ट की आशंका रहती है।-[6]

11.रद्द योग यदि इत्थशाल करने वाला ग्रह अस्त, नीच, शत्रुक्षेत्री, वक्री अथवा अत्यन्त निर्बल हो, तो वह इत्थशाल के फल को उत्पन्न करने में असमर्थ रहता है। इस प्रकार इत्थशाल का प्रभाव निरस्त हो जाता है, जिसे कहा गया ह 'रद्द'ै। यह योग कार्यअसफलता और अपेक्षित परिणाम के अभाव का द्योतक है।-

12.दुःफालिकुत्थ योग जब मन्दग्रह स्वक्षेत्र, उच्च या नवमांशादि में स्थित होकर निर्बल शीघ्रगामी ग्रह से इत्थशाल करे, तो दुःफालिकुत्थ योग बनता है। यहाँ मन्दग्रह की स्थैर्यप्रधान शक्ति कार्यसिद्ध-ि सुनिश्चित करती है, यद्यपि परिणाम अपेक्षित से कम भव्य हो सकते हैं।[7]

13.दुत्थोत्थदिवीर योग यदि लग्नेशकार्येश दोनों निर्बल हों–, किन्तु उनमें से कोई एक ग्रह किसी तृतीय, बली ग्रह से इत्थशाल करे (उच्च/स्वक्षेत्री), तो दुत्थोत्थदिवीर योग बनता है। यह पराश्रित सफलता का सूचक हैअर्थात् - अन्य व्यक्ति या बाह्य सहयोग से कार्य सिद्ध होता है।

14.तंबीर योग जब लग्नेश या कार्येश में से कोई एक बली ग्रह राशि के अंतिम अंश में होकर आगामी राशि में प्रवेशोन्मुख हो तथा अन्य ग्रहों को अपने दीप्तांश से प्रभावित करे, तब तंबीर योग बनता है। यह संक्रमणकालीन प्रगति, अवसरविस्तार और तीव्र उन्नति का सूचक है। इसे अत्यन्त शुभ योग माना गया है।-

15.कुत्थ योग यदि लग्नेश और कार्येश दोनों पंचवर्गीय बल, हर्षस्थान या अन्य बलसूचक स्थितियों से समर्थ - हों, तो कुत्थ योग निर्मित होता है। यह उन्नति, प्रतिष्ठा, मानसिक प्रसन्नता और योजनाओं की सिद्धि का संकेत देता है। यह योग स्थायी प्रगति का द्योतक है।

16.दुरुफ योग जब लग्नेशकार्येश दोनों निर्बल-, अस्त, वक्री या अशुभ ग्रहों से पीड़ित हों और प्रतिकूल स्थानों में स्थित होकर राहुसंबंध अथवा अशुभ दृष्टि के साथ इ-त्थशाल करें, तब दुरुफ योग बनता है।[8] यह प्रतिकूल, बाधाजनक और क्लेशप्रद परिणाम देने वाला योग है, जिससे वर्षभर संघर्ष, विघ्न और मानसिक अशांति की सम्भावना रहती है।

ताजिक शास्त्र के ये षोडश योग वर्षफलस्थित-निर्णय की संरचनात्मक रीढ़ हैं। इनका विश्लेषण केवल ग्रह-ि के स्थूल अवलोकन से नहीं, अपितु ग्रहों के गत्यात्मक, अंशगत और बलगत संबंधों की सूक्ष्म परीक्षा से किया जाता है। इस प्रकार ताजिक योगप्रभावित गणनात्मक पद्धति का -ज्योतिष की दार्शनिक पृष्ठभूमि और यवन-तंत्र भारतीय फलित-समन्वित प्रतिफल है, जो वर्षविशेष की घटनात्मक संरचना को सूचित करने में अद्वितीय स्थान रखता है।

'ताजिकएक समीक्षात्मक एवं ऐतिहासिक पुनरावलोकन : परम्परा के प्रवर्त्तक आचार्य '

ताजिक ज्योतिष परम्परा के उद्गम और प्रवर्त्तक आचार्यों के संबंध में उपलब्ध साक्ष्य यह संकेत करते हैं कि यह विद्या भारतीय तथा यवन बौद्धिक परम्पराओं के सघन अंतःसंवाद का परिणाम है। ताजिक (मध्य एशियाई–फारसी–अरबी) शास्त्र के प्रमुख व्याख्याकार गणेश दैवज्ञ ने अपने ग्रन्थ 'ताजिक भूषणम्' में इस परम्परा के आद्य प्रवर्त्तकों का उल्लेख करते हुए गर्ग, यवनाचार्य, सत्याचार्य तथा रोमक आदि ऋषियों का स्मरण किया है।[9] यह नामावली स्वयं इस तथ्य की ओर संकेत करती है कि ताजिक शास्त्र का विकास किसी एक भौगोलिक या सांस्कृतिक केन्द्र तक सीमित न रहकर बहुसांस्कृतिक विमर्श की परिणति है।

भारतीय फलित ज्योतिष की प्राचीन परम्परा में गर्गाचार्य तथा यवनाचार्य का नाम अत्यन्त आदर और प्रामाणिकता के साथ लिया जाता है। विशेषतः –परम्परा ने यूनानी-की संज्ञा इस बात का सूचक है कि भारतीय ज्योतिष 'यवनाचार्य' यवन परम्परा से प्राप्त ज्ञान को आत्मसात् किया। इस ऐतिहासिक तथ्य की पुष्टि शंकर बालकृष्ण दीक्षित ने अपनी सुप्रसिद्ध कृति 'भारतीय ज्योतिष' में की है, जहाँ वे दामोदरसुत बलभद्रकृत- 'हायनरत्नम्' से यह उद्धरण प्रस्तुत करते हैं— "यवनाचार्येण पारसीक"...भाषया प्रणीतम्-।[10] इस उल्लेख से स्पष्ट होता है कि ताजिक पद्धति के ग्रन्थों की मूल रचना पारसीक भाषा में हुई (फारसी), जिनका बाद में संस्कृत में अनुवाद और पुनराविष्कार किया गया। यह तथ्य ताजिक शास्त्र की यवनउद्गम परम्परा का महत्वपूर्ण ऐतिहासिक साक्ष्य है।-

गणेश दैवज्ञ ने एक उल्लेखनीय टिप्पणी करते हुए कहा है कि— "यद्यपि यह शास्त्र ब्रह्मद्वेषी यवनों से उत्पन्न हुआ है, तथापि इसमें सदसत्फलनि-रूपण की प्रामाणिकता है; अतः द्विजों को भी इसका अध्ययन करना चाहिए।" यह कथन मध्यकालीन सांस्कृतिक मानस का द्योतक है, जिसमें एक ओर धार्मिकसांस्कृतिक भिन्नता का बोध है-, तो दूसरी ओर ज्ञान के वस्तुनिष्ठ मूल्य का स्वीकार भी। यहाँ स्पष्टतः यह प्रतिपादित किया गया है कि ज्ञान की उपयोगिता और प्रामाणिकता उसके सांस्कृतिक स्रोत से अधिक महत्वपूर्ण है। इस प्रकार ताजिक शास्त्र को यवनप्रणीत मानते हुए भी - उसे भारतीय ज्योतिषीय विमर्श में वैध स्थान प्रदान किया गया।

रोमकाचार्य की परम्परा में एक पौराणिक आख्यान भी प्राप्त होता है, जिसके अनुसार जिस ज्योतिषविद्या का उपदेश - ब्रह्मा ने सूर्यदेव को दिया, वही सूर्य द्वारा यवनाचार्य को प्रदत्त हुई और तत्पश्चात् यवनाचार्य ने उसका प्रतिपादन किया, जो नाम से विख्यात हुआ। 'ताजिक'[11] यह आख्यान केवल दार्शनिक प्रतीक नहीं, बल्कि ज्ञान परम्परा के-सांस्कृतिक वैधीकरण)legitimization) का उदाहरण हैस्रोत से सम्बद्ध कर उसे -अर्थात् किसी बाह्य परम्परा को भी वैदिक-आध्यात्मिक प्रतिष्ठा प्रदान करना।

इसके अतिरिक्त 'टोडरानन्द' जैसे ग्रन्थों में खत, खुत, रोमक, हिल्लाज, धिषण तथा दुर्मुखाचार्य आदि को ताजिक शास्त्र के प्रवर्त्तक आचार्य के रूप में उल्लिखित किया गया है। इन नामों का भाषिक स्वरूप स्वयं उनके अरबीफारसी – मूल की ओर संकेत करता है। इससे यह निष्कर्ष पुष्ट होता है कि ताजिक शास्त्र का विकास बहुधा इस्लामी ज्योतिषीय परम्परा के अंतःक्र-परम्परा और भारतीय फलितात्मक संवाद से हुआ।

समग्रतः देखा जाए तो ताजिक शास्त्र के प्रवर्त्तकों के विषय में उपलब्ध साक्ष्य एक बहुस्तरीय ऐतिहासिक प्रक्रिया का संकेत करते हैं-

1. यवनपारसीक ज्योतिषीय ग्रन्थों की रचना/,
2. उनका संस्कृत में अनुवाद एवं रूपान्तरण,
3. भारतीय फलित सिद्धान्तों के साथ उनका समन्वय, तथा
4. आचार्यों द्वारा उसका शास्त्रीय पुनर्प्रतिपादन।

अतः परम्परा को न तो पूर्णतः विदेशी कहा जा सकता है और न ही पूर्णतः स्वदेशी 'ताजिक'; यह भारतीय ज्योतिष के इतिहास में सांस्कृतिक संश्लेषण का एक विशिष्ट अध्याय है, जहाँ ज्ञान की सार्वभौमिकता ने सांस्कृतिक सीमाओं का अतिक्रमण कर एक नवीन ज्योतिषीय पद्धति का सृजन किया।

ताजिक शास्त्र के अनुसार राशि स्वामी

ताजिक शास्त्र के अनुसार राशियों के स्वामी ग्रह इस प्रकार हैं - मेष - मंगल, वृष-शुक्र, मिथुन-बुध, कर्क-चन्द्रमा, सिंह-सूर्य, कन्या-बुध, तुला-शुक्र, वृश्चिक-मंगल, धनु-गुरु, मकर-शनि, कुंभ-शनि, मीन-बृहस्पति।[12] अर्थात् सूर्य व चन्द्र एक-एक राशि के अधिपति हैं जबकि शेष ग्रहों को दो-दो राशियों का आधिपत्य प्राप्त है।

नवीन दशम ग्रह 'मुंथा': ताजिक परिप्रेक्ष्य में एक विशिष्ट संकल्पना ताजिक ज्योतिष परंपरा की सर्वाधिक मौलिक और सृजनात्मक अवधारणाओं में -का सिद्धान्त विशेष उल्लेखनीय है। यह भारतीय पारम्परिक नवग्रह 'मुंथा' रचना है-व्यवस्था से भिन्न एक स्वतंत्र विचार, जिसे ताजिक आचार्यों ने वर्षफलनिर्णय की प्रक्रिया में अत्यन्त केंद्रीय - स्थान प्रदान किया है। जिस प्रकार पारम्परिक फलित ज्योतिष में नवग्रह जातक के जीवनप्रवाह के नियामक माने - जाते हैं, उसी प्रकार ताजिक शास्त्र में के रूप में मान्यता दी गई है।मुंथा का निर्धारण 'दशम ग्रह' को प्रतीकात्मक 'मुंथा' जन्मलग्न से होता है। जन्मकालीन लग्न ही प्रथम वर्ष की मुंथा मानी जाती है। इसके पश्चात् प्रत्येक वर्ष मुंथा एक राशि आगे अग्रसर होती है; अर्थात् एक वर्ष में मुंथा एक राशि का परिभ्रमण करती है। गणनात्मक दृष्टि से एक मास में यह $2°30'$ (२ अंश ३० कला तथा एक दिन में (5 कला की गति से संचरित मानी गई है। इस प्रकार मुंथा की राशि प्रतिवर्ष परिवर्तित होती रहती है, परन्तु जन्मलग्न के अंश स्थिर रहते हैं यही इसकी गणनात्मक विशेषता है।

जिस राशि में किसी वर्ष मुंथा स्थित होती है, उस राशि का अधिपति 'मुन्थेश' कहलाता है।[13] वर्षफल-निर्णय में मुन्थेश की स्थिति, बल, दृष्टि तथा योग-संबंध अत्यन्त निर्णायक माने गए हैं। वस्तुतः मुंथा वार्षिक जीवन-ऊर्जा का द्योतक है; यह उस वर्ष जातक के जीवन-केन्द्र (focus of experience) का सूचक बनती है। इस प्रकार मुंथा ताजिक प्रणाली में कालगत परिवर्तनशीलता और जीवनगत गतिशीलता का प्रतीकात्मक गणितीय रूप है, जो वर्षफल को जन्मपत्रिका से पृथक् एक स्वतंत्र विश्लेषणात्मक आधार प्रदान करता है।

ताजिक ज्योतिष में ग्रहदृष्टि का सिद्धान्त ताजिक शास्त्र में ग्रहों की दृष्टि (aspect) की अवधारणा भारतीय पारम्परिक पाराशरी दृष्टि-सिद्धान्त से सर्वथा भिन्न है। यहाँ दृष्टि को केवल दार्शनिक या प्रतीकात्मक सम्बन्ध न मानकर, वार्षिक फलनिर्णय का व्यावहारिक एवं अनिवार्य उपकरण माना गया है। ताजिक ग्रंथों विशेषतः ताजिकालंकारमें स्पष्ट कहा गया है कि वर्षफल का सम्पूर्ण शुभाशुभ निर्णय ग्रहों की पारस्परिक दृष्टि पर आधारित है; दृष्टि-विचार के अभाव में वर्षफलादेश अपूर्ण और अवैज्ञानिक माना जाएगा।

ताजिक मतानुसार ग्रह अपनी दृष्टि की शक्ति (orbital proximity) के अनुसार ही फल प्रदान करते हैं[14]। दृष्टि का प्रभाव तभी मान्य है जब द्रष्टा (aspecting planet) और दृश्य (aspected planet) के मध्य 12 अंश का अंतर हो। 12 अंश से अधिक दूरी होने पर दृष्टि का प्रभाव क्षीण अथवा निष्प्रभावी माना गया है। इस प्रकार ताजिक प्रणाली में दृष्टि की संकल्पना अंशगत समीपता (orb of influence) पर आधारित है, जो इसे अधिक गणनात्मक एवं प्रायोगिक स्वरूप प्रदान करती है।

दृष्टि के प्रकार ताजिक शास्त्र में दृष्टियों को चार स्तरों में वर्गीकृत किया गया है-पाद, अर्ध, त्रिपाद और पूर्ण दृष्टि। प्रत्येक ग्रह निम्नलिखित भावों पर दृष्टि डालता है-

तृतीय एवं एकादश भाव – एक पाद दृष्टि

चतुर्थ एवं दशम भाव – अर्ध दृष्टि

पंचम एवं नवम भाव – त्रिपाद दृष्टि

प्रथम एवं सप्तम भाव – पूर्ण दृष्टि[15]

इन दृष्टियों के फलस्वरूप भिन्न-भिन्न प्रकार के फल उत्पन्न होते हैं-

पाद दृष्टि को सामान्यतः सुख, लाभ, स्नेह और बुद्धिवृद्धि प्रदान करने वाली माना गया है।

अर्ध दृष्टि प्रायः गुप्त विरोध, मतभेद अथवा आन्तरिक तनाव का कारण बनती है।

त्रिपाद दृष्टि धन, सौख्य, मित्रवृद्धि तथा उपलब्धि की कारक मानी गई है।

पूर्ण दृष्टि संघर्ष, प्रत्यक्ष विरोध, विवाद और शत्रुता की सूचक है।

दृष्टि का भावात्मक वर्गीकरण ताजिक परंपरा दृष्टियों को केवल गणितीय स्तर पर नहीं, बल्कि भावात्मक-मानसिक स्तर पर भी वर्गीकृत करती है। इस आधार पर दृष्टियाँ चार प्रकार की मानी गई हैं-

प्रत्यक्ष स्नेह दृष्टि – पंचम एवं नवम भावगत ग्रहों पर पड़ने वाली दृष्टि। यह प्रबल, समन्वयकारी, मैत्रीपूर्ण और सिद्धिप्रदा मानी गई है।

गुप्त स्नेह दृष्टि – तृतीय एवं एकादश भावगत ग्रहों पर दृष्टि। यह सहयोग प्रदान करती है, किन्तु प्रत्यक्ष स्नेह की अपेक्षा कम प्रभावशाली होती है।

प्रत्यक्ष शत्रु दृष्टि – प्रथम एवं सप्तम भावगत ग्रहों पर दृष्टि। यह प्रत्यक्ष विरोध, संघर्ष और विघ्न का कारण बनती है।

गुप्त शत्रु दृष्टि – चतुर्थ एवं दशम भावगत ग्रहों पर दृष्टि। यह अप्रकट बाधाओं, अंतर्विरोधों और अप्रत्यक्ष तनाव का संकेत देती है।[16]

इस वर्गीकरण से स्पष्ट होता है कि ताजिक ज्योतिष में दृष्टि केवल ज्यामितीय कोण नहीं, बल्कि एक प्रकार की 'ऊर्जा-संवाद प्रक्रिया' है, जो ग्रहों के मध्य संबंध की मनोवैज्ञानिक और सामाजिक प्रकृति को भी इंगित करती है।

ताजिक शास्त्र में ग्रह-मैत्री का सिद्धान्त

ताजिक ज्योतिष में ग्रहों के परस्पर संबंधों का विवेचन केवल स्थूल शुभाशुभ वर्गीकरण तक सीमित नहीं है, अपितु यह एक सुव्यवस्थित संबंध-सिद्धान्त (Relational Doctrine) के रूप में विकसित हुआ है। इस परंपरा में ग्रहों की *नैसर्गिक* (स्वभावगत) तथा *तात्कालिक* (परिस्थितिजन्य) मैत्री-दोनों का विशद निरूपण प्राप्त होता है, जो वर्षफल-निर्णय में अत्यंत निर्णायक भूमिका निभाते हैं।

(1) नैसर्गिक ग्रह-मैत्री

ताजिक ग्रंथों के अनुसार ग्रहों की स्वभावगत या नैसर्गिक मैत्री दो प्रमुख समूहों में विभाजित है-

- **सूर्य, चन्द्र, मंगल एवं गुरु** - ये परस्पर मित्र माने गए हैं।
- **बुध, शुक्र एवं शनि** - ये भी परस्पर मैत्री-संबंध से युक्त हैं।[17]

इन दो समूहों के अतिरिक्त जो भी ग्रह एक-दूसरे के साथ संबंध स्थापित करते हैं, वे पारस्परिक शत्रुता की श्रेणी में रखे जाते हैं।

यह वर्गीकरण भारतीय पाराशरी परंपरा से भिन्न है, जहाँ प्रत्येक ग्रह की पृथक-पृथक मित्रता-शत्रुता का विस्तार से उल्लेख मिलता है। ताजिक प्रणाली में यह द्विभाजित संरचना संभवतः ग्रहों के दार्शनिक-प्रतीकात्मक स्वभाव पर आधारित है-प्रथम समूह अग्नि-तेज और धर्मप्रधान ग्रहों का प्रतिनिधित्व करता है, जबकि द्वितीय समूह सांसारिक, लौकिक और व्यवहारगत प्रवृत्तियों से संबद्ध ग्रहों का। इस प्रकार ताजिक मैत्री-सिद्धान्त ग्रहों के ऊर्जात्मक समूहों (Energetic Clusters) की अवधारणा को प्रस्तुत करता है।

(2) तात्कालिक या परिस्थितिजन्य मैत्री

नैसर्गिक संबंधों के अतिरिक्त ताजिक शास्त्र में *तात्कालिक मैत्री* का भी विशद प्रतिपादन है, जो ग्रहों की परस्पर दृष्टि-संबंध पर आधारित है। यहाँ संबंध स्थायी न होकर, उस विशिष्ट वर्ष की ग्रह-स्थिति पर निर्भर होता है।

- यदि कोई ग्रह दूसरे ग्रह को 5वें, 9वें, 3रे या 11वें स्थान से *मित्रदृष्टि* (स्नेहात्मक दृष्टि) से देखता है, तो वह उस वर्ष उस ग्रह का *मित्र* माना जाता है।
- इसके विपरीत, यदि कोई ग्रह 1वें, 4थे, 7वें या 10वें स्थान से *शत्रु-दृष्टि* स्थापित करता है, तो वह उस ग्रह का *शत्रु* समझा जाता है।
- यदि दो ग्रह परस्पर 2, 6, 8 या 12 स्थानों पर स्थित हों और उपर्युक्त प्रकार की न तो स्नेह-दृष्टि हो न शत्रु-दृष्टि, तो उनके मध्य *समत्व* (Neutrality) की स्थिति मानी जाती है।[18]

यह तात्कालिक मैत्री-सिद्धान्त ताजिक प्रणाली की विशिष्ट गतिशीलता को रेखांकित करता है। यहाँ संबंध स्थिर नहीं, बल्कि काल-विशेष की संरचना पर निर्भर है। इस प्रकार ग्रहों के मध्य संबंध एक प्रकार की 'वार्षिक कूटनीति' (Annual Celestial Diplomacy) के रूप में कार्य करते हैं, जो वर्षफल के सूक्ष्म निर्धारण में सहायक होते हैं।

ताजिक शास्त्र में ग्रहों के दीप्तांश- ताजिक ज्योतिष की एक अन्य मौलिक अवधारणा *दीप्तांश* (Orb of Illumination/Influence) का सिद्धान्त है। वर्षफल-निर्णय में ग्रहों की दृष्टि केवल भावगत स्थिति से ही नहीं, बल्कि उनके प्रभाव-क्षेत्र (orbital range) से भी निर्धारित होती है। इसी प्रभाव-परिधि को 'दीप्तांश' कहा गया है।

प्रत्येक ग्रह का एक निश्चित दीप्तांश माना गया है[19]-

- सूर्य -15 अंश

- चन्द्र -12 अंश
- मंगल - 8 अंश
- बुध -7 अंश
- गुरु - 9 अंश
- शुक्र - 7 अंश
- शनि - 9 अंश

कोई भी ग्रह अपने से आगे या पीछे निर्दिष्ट दीप्तांश की सीमा के भीतर ही विशेष या प्रबल दृष्टि-फल प्रदान करता है। यदि ग्रह इस सीमा का अतिक्रमण कर ले, तो उसका प्रभाव सामान्य दृष्टि-फल तक सीमित हो जाता है।

दीप्तांश की यह संकल्पना ताजिक शास्त्र को एक विशिष्ट गणनात्मक-सूक्ष्मता प्रदान करती है। यह प्रणाली ग्रहों के प्रभाव को निरपेक्ष न मानकर, परिमाणात्मक (Quantifiable) मानकों में परिभाषित करती है।

दीप्तांश का संयुक्त विचार

वर्षफल में विशेष रूप से *लग्नेश* तथा *कार्येश* (जिस भाव का फल विचाराधीन हो, उसका अधिपति) के दीप्तांशों का संयुक्त विचार किया जाता है। इन दोनों ग्रहों के दीप्तांशों को जोड़कर उसका आधा किया जाता है; प्राप्त संख्या के भीतर यदि दोनों ग्रहों का परस्पर अंशांतर हो, तो वे प्रभावी और बली माने जाते हैं।

उदाहरणार्थ, यदि लग्नेश का दीप्तांश 12 अंश और कार्येश का 8 अंश है, तो उनका योग 20 अंश हुआ। इसका आधा 10 अंश होगा। यदि दोनों ग्रहों के मध्य वास्तविक अंशांतर 10 अंश या उससे कम है, तो वे परस्पर प्रभावी (operative) माने जाएंगे।इस प्रकार दीप्तांश का सिद्धान्त ताजिक ज्योतिष को अत्यंत सूक्ष्म और वैज्ञानिक संरचना प्रदान करता है, जहाँ ग्रहों का प्रभाव केवल भावगत या दृष्टिगत संबंध पर निर्भर नहीं, बल्कि उनके अंशगत समीपत्व पर भी आधारित होता है।

ग्रह-मैत्री और दीप्तांश-दोनों ही ताजिक शास्त्र की विशिष्ट विश्लेषणात्मक पद्धतियाँ हैं। जहाँ ग्रह-मैत्री संबंधों के मनोवैज्ञानिक एवं ऊर्जात्मक आयाम को उद्घाटित करती है, वहीं दीप्तांश उनकी प्रभाव-सीमा का गणनात्मक निर्धारण करता है। इन दोनों सिद्धांतों का समन्वित अध्ययन यह स्पष्ट करता है कि ताजिक ज्योतिष केवल पारम्परिक सिद्धांतों का अनुवर्तन नहीं करता, बल्कि एक स्वतंत्र, संरचित और सूक्ष्म ज्योतिषीय प्रणाली के रूप में विकसित हुआ है, जिसमें गणितीय परिशुद्धता और संबंधात्मक विश्लेषण-दोनों का समुचित संतुलन विद्यमान है।

अतः ताजिक शास्त्र को न तो केवल 'विदेशीय प्रभाव' का परिणाम कहा जा सकता है और न ही उसे पूर्णतः भारतीय परम्परा में विलीन किया जा सकता है। यह वस्तुतः सांस्कृतिक संश्लेषण (cultural synthesis) का एक दैदीप्यमान उदाहरण है, जहाँ ज्ञान-परम्पराएँ भौगोलिक सीमाओं का अतिक्रमण कर एक नवीन शास्त्रीय संरचना का सृजन करती हैं।

इस प्रकार भारतीय ज्योतिष और ताजिक शास्त्र का पारस्परिक विनिमय केवल ऐतिहासिक तथ्य नहीं, बल्कि ज्ञान की सार्वभौमिकता और बौद्धिक सह-अस्तित्व का दार्शनिक प्रमाण है। यह अध्ययन न केवल ज्योतिषीय परम्पराओं की तुलनात्मक समझ को समृद्ध करता है, अपितु मध्यकालीन भारत और मध्य एशिया के सांस्कृतिक संवाद के इतिहास को भी एक नवीन परिप्रेक्ष्य प्रदान करता है।

सन्दर्भ

1. दीक्षित शंकरबालकृष्ण,भारतीय ज्योतिष,पृष्ठ 643
2. ताजिकभूषणम् ;4/4-6
3. ताजिक नीलकंठी ;संज्ञातंत्र ,षोडश योगाध्याय,श्लोक-17
4. ताजिक भूषणम्;4/8
5. ताजिकनीलकंठी ;संज्ञा तन्त्र,षोडश योगाध्याय,श्लोक-55
6. वर्षयोग समूह;श्लोक-167
7. वर्षभास्कर;षोडशयोगप्रकरण,श्लोक-25
8. ताजिकभूषणम्;4/30
9. जोशी देवीदत्त,सुगम ज्योतिष,,पृष्ठ37
10. दीक्षित शंकर बालकृष्ण,भारतीय ज्योतिष,पृष्ठ 642
11. वृहद्दैवज्ञरञ्जनम्;1/9
12. ताजिक भूषणम्;1/22
13. वहीं;1/11
14. वर्षपद्धति;द्वितीय प्रकरण,दृष्टि विचार,श्लोक1-2
15. ताजिक भूषणम्;1/14
16. वर्ष पद्धति;द्वितीय प्रकरण,दृष्टिफल,शोक-5
17. शास्त्री सुदर्शनाचार्य ,ताजिक विज्ञान,पृष्ठ-66
18. ताजिक भास्कर;पृष्ठ-5
19. ताजिकभूषणम्;4/3

Advisory Board (India):

Dr. Naushad Momin (Kolkata), Dr. Danish Allahabadi (Allahabad), Dr. Mujeeb Ahmad Khan (Delhi), Professor Aale Zafar (Muzaffarpur), Dr. Muhammad Afroz Alam (Kashmir), Dr. Fayaz Alam (Delhi), Dr. Nadeem Ahmad (Delhi), Deen Raza Akhtar (Araria), Dr. Muhammad Shahzad Shams (Araria), Wasim Farhat Alig (Amravati, Maharashtra), Shakeeba Umar (Delhi), Muhammad Faheem Ahmad (Kota, Rajasthan), Maulana Rizwan Nadvi (Purnia), Dr. Zain Shamsi (Munger), Dr. Abu Bakr Rizvi (Associate Professor, Department of Urdu, TPS College, Patliputra University, Patna), Dr. Muhammad Abbas (Associate Professor and Head, Department of Urdu, SGGS College, Patna City), Dr. Muhammad Mahmood Alam (Department of Persian, Patna University), Dr. Muhammad Abul Kalam Azad (Department of Persian, Patna University) Prof. (Dr.) Qazi Obaid ur Rehman Hashmi (Ex Head Department of Urdu, Jamia Millia Islmia,Delhi) Prof. (Dr.) Khalid Mahmood Head (Ex Head Department of Urdu, Jamia Millia Islmia,Delhi) Prof. Jahangeer Ahmad Warsi, Aligarh Muslim University Prof. Abbass Raza Nayyar, Head Department of Urdu, Lucknow University.

Advisory Board (International):

Professor Yusuf Khushk, Professor Sofia Khushk, Professor Ziaul Hassan, Dr. Muhammad Salman Bhatti, Professor Sameena Gul, Uzma Noreen, Dr. Rehana Kausar (Pakistan), Professor Ahmad Al-Qazi (Egypt), Professor Halil Toker, Professor Durmuş Bulgur, Dr. Zekai Kardas (Istanbul, Turkey), Farzana Azam Lutfi, Dr. Ali Bayat, Dr. Muhammad Qayoomersi (Tehran, Iran), Dr. Saima Nazir (Assistant Professor, Urdu Language & Literature, NUML, Islamabad), Dr. Samira Ijaz (Urdu Department, Sargodha University), Ayesha Masood (Journalist, Islamabad), Dr. Abdul Aziz Malik (Department of Urdu, Government College University, Faisalabad, Pakistan), Dr. Rifaat Chaudhry (Urdu Department, GC Women University, Sialkot), Dr. Hajra Qadri Muhammad (Department of Urdu Language and Literature, College of Humanities, Al-Azhar University, Cairo, Egypt) Dr. Shazra Shar Associate professr Head Department of Urdu, University of Sindh, Jamshoro Prof. Yusuf Amir, Cairo University, Egypt
Prof. Syed Taqi Abidi Cananda- Noted Urdu critic and writer, Dr. Eldost Ibrahmimov-Baku State University , Azerbaijan Dr. Fauzia Farooqui,, Princeton University America.

Legal Advisors:

Advocate Anil Kumar Singh, Advocate Seema Singh (Delhi)

Subscription Rates:

Per Issue: `200 Special Issue: `400
Annual: `1,800 Special Support: `5,000

Bank Details:

Account Name: PEACE INDIA FOUNDATION
Account No.: 51521131001918
IFSC: PUNB515210

Published and printed by

Professor Muhammad Yahya Saba
at JK Offset Printing Press and distributed from:
6942, 2nd Floor, Punjabi Basti, Sabzi Mandi, Ghanta Ghar, Delhi-110007

Patron-in-Chief:

Professor Irteza Karim

Professor Rakesh Kumar Pandey (Department of Physics, Kirori Mal College, Delhi University)

Editorial Board :

Professor Dr. Md. Raziur Rahman (Head, Department of Urdu, Gorakhpur University)

Professor Dr. Muhammad Ali Jauhar (Department of Urdu, Aligarh Muslim University)

Professor Dr. Muhammad Qamarul Hoda Faridi (Department of Urdu, Aligarh Muslim University)

Professor Dr. Nadim Ahmad (Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi)

Professor Dr. Aftab Ahmad Afaqui (Department of Urdu, Banaras Hindu University)

Professor Dr. Mohammad Kazim (Department of Urdu, Delhi University)

Professor Dr. Kauser Mazhari (Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi)

Professor Dr. Azra Abidi (Department of Sociology, Jamia Millia Islamia, New Delhi)

Dr. Ahmad Imteyaz (Department of Urdu, Delhi University)

Professor Dr. Shahid Razmi (Head, Department of Urdu, Munger University)

Professor Dr. Mushtaq Alam Qadri (Department of Urdu, Delhi University)

Professor Dr. Saifuddin Ahmad (Department of History, Delhi University)

Professor Imran Andleeb (Jamia Millia Islamia, Delhi

Professor Dr. Balram Shukla (Department of Sanskrit, Delhi University)

Professor Pramod Kumar Bharti (Department of Sanskrit, Municipal PG College, Mussoorie, Uttarakhand)

Dr. Muhammad Mohsin (Department of Urdu, Kirori Mal College, Delhi University)

Mr. Qaiser Raza (Education Officer, Government of Jharkhand)

Dr. Qazi Naveed (Head, Department of Urdu, Maulana Azad College, Aurangabad, Maharashtra)

Maulana Muhammad Shahid Adil Qasmi (Principal, Madrasa Yateem Khana, Araria)

Muhammad Rafi (State Coordinator, National Teachers Association, Bihar)

Delhi

Quarterly

TAREEKH-E-ADAB-E-URDU

(Representative of Knowledge, Literature, Research, and Criticism)

Issue: 1 (January to March 2025) Volume: 7

Editor:

Professor Dr. Md. Yahya Saba

Managing Editor:

Dr. Md. Talib

Associate Editor:

Dr. Md. Bahlol

Correspondence and Contact Details:

Quarterly Tareekh-e-Adab-e-Urdu

6942, 2nd Floor, Punjabi Basti, Sabzi Mandi, Ghanta Ghar, Delhi-110007

E-mail: editortau@gmail.com

Website: tareekheadabeurdu.com

Mobile No.: +91-9968244001

Disclaimer:

The editor and associates are not necessarily in agreement with the content of this issue. Authors are solely responsible for their articles and citations. Any disputes related to "Tareekh-e-Adab-e-Urdu" are subject to Delhi jurisdiction only.